اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

جلد ہفتم

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور • کراچی • پاکستان

إنّ هذا العلم دين فانظروا عمّن تأخذون دينكم (صحيح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد ہفتم

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد ہفتم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
	چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
	صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
کمپوزنگ	مولانا یاسر رحمان
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	باراول دسمبر 2014ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ7C

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔37221953 فیکس:۔042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔37247350۔فیکس042-37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔021-32212011-32630411۔فیکس:۔021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

ziaulquranpublications@gmail.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

انتساب!!!

ضیاء الرحمٰن مرحوم کے نام جس نے طویل اور صبر آزما علالت کے دکھ جھیلنے کے بعد 20 مئی 2014ء کو عین نمازِ عشاء کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے خالق عزوجل سے واصل ہوئے۔ اللہ عزوجل اپنے حبیب مکرم ﷺ کے طفیل اس کی جملہ خطاؤں کو معاف فرمائے، حسنات کو قبول فرمائے، درجات بلند فرمائے، قبر کو اس کے لیے راحت کدہ بنائے، حضور ﷺ کی شفاعت مقبولہ مرضیہ کے طفیل جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے بصد عجز و نیاز دعا ہے کہ اس کے سات سالہ فرزند محمد انیس الرحمٰن اور تین سالہ بیٹی نور العین کی حفاظت فرمائے، اپنی بارگاہِ غیب سے ان کی کفالت و نگہداشت اور تعلیم و تربیت کے بہتر اسباب مقدر فرمائے، انہیں حصولِ علم کا ذوق و شوق عطا فرمائے اور انہیں اطاعت گزار بندوں اور اپنے حبیب مکرم ﷺ کے محبین صادقین میں شامل فرمائے۔ آمین ثم آمین

العبد المفتقر الی اللہ الغنی

منیب الرحمٰن

آغازِ تکلّم

الحمد للہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رحمۃ للعٰلمین سیدنا ومولانا محمدٍ وعلیٰ الہ الطیبین الطاہرین، وعلیٰ صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلیٰ اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقہاء المجتہدین والمحدثین والمفسرین اجمعین۔

الحمد للہ علیٰ احسانہٖ! تفہیم المسائل کی ساتویں جلد پیشِ خدمت ہے۔ میرے مختلف النوع مشاغل کی وجہ سے اس میں تاخیر ہوگئی، تاہم ربِ ذوالجلال کا شکر ہے کہ تسلسل کو قائم رکھنے میں کامیابی نصیب ہوئی۔

اس جلد کی تدوین وتبویب اور حوالہ جات نکالنے میں مفتی عبدالرزاق نقشبندی کا تعاون گرانقدر ہے اور میں اس کے لئے ان کا شکر گزار ہوں۔ کمپوزنگ اور تصحیح کے لئے مولانا یاسر رحمٰن کی مساعی قابلِ قدر ہیں، میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مسودے کے تبییض کے آخری مرحلے میں، میں ہمیشہ حضرت علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی زید مجدہم کو زحمت دیتا ہوں۔ مسائل پر ان کی نظر بڑی عمیق ہے اور فقہی جزئیات انہیں مستحضر ہیں۔ حضرت مفتی صاحب زبان وبیان کی بھی تصحیح کرتے ہیں اور معنوی اعتبار سے بھی عرق ریزی سے کام لیتے ہیں، تمام حوالہ جات کو ایک ایک کر دیکھتے ہیں اور اصل سے ملاتے ہیں۔ میں اُن کے علمی تعاون پر تہ دل سے اُن کا شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کے علم وعمل اور عمرِ صالح میں مزید برکات عطا فرمائے۔

المفتقر الی اللہ الغنی

منیب الرحمٰن

عقائد کے مسائل

یہ بے دینی ہے

سوال:

دریافت طلب سوال یہ ہے کہ زید بکر کے پاس آیا اور کہا کہ میرا باپ گم ہو گیا ہے، آپ بتائیں کہ وہ کہاں ہے؟، بکر جو آلِ رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، کہتا ہے کہ: ''آپ کو میں ایسا وظیفہ بتاؤں گا کہ آپ پڑھیں، اگر آپ کا باپ قبر میں بھی ہوگا، تو ایک مرتبہ باہر آ جائے گا اور پھر دوبارہ قبر میں چلا جائے گا۔ پھر زید نے کہا کہ آپ حساب وکتاب کریں اور مجھے یہ بتائیں کہ میرا باپ زندہ ہے یا مر گیا؟، تو بکر نے زید کا نام ایک پیپر پر لکھا پھر اُس کی دادی کا نام لکھا پھر زید کا نام لکھا اور حساب کرتا رہا، کچھ دیر بعد کہتا ہے کہ آپ کا باپ زندہ ہے اور وہ اس وقت کس حال میں ہے، مجھے معلوم ہے، آپ کسی نیک آدمی سے یہ وظیفہ پڑھوالیں، آپ کا باپ قبر میں بھی ہوگا، تو وہ ایک مرتبہ واپس آ جائے گا۔ زید چلا گیا، اُسی مجلس میں عمرو بھی بیٹھا ہوا تھا (جو تھوڑا سا دین سے بھی واقف ہے)، اُس نے کہا: حضرت زید کا باپ کس حال میں ہے، آپ کو معلوم ہے؟، بکر نے کہا کہ: ''میاں یہ جاہل لوگ ہوتے ہیں، ان کو یہ کہنا پڑتا ہے، لہٰذا میں نے ایسے ہی کہہ دیا ہے، یہ کوئی پکی بات نہیں ہے''۔ از روئے شرع کیا یہ ساری باتیں صحیح ہیں، بکر کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟۔

(ظفر الحق تونسوی، امام جامع مسجد طیبہ، معین آباد، لانڈھی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکور شخص بکر نے اپنے جھوٹ اور فریب کا اعتراف خود ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ: ''میاں یہ جاہل لوگ ہوتے ہیں، ان کو یہ کہنا پڑتا ہے، لہٰذا میں نے ایسے ہی کہہ دیا ہے، یہ کوئی پکی بات نہیں ہے''۔ بکر کا یہ جھوٹ وفریب محض لوگوں کے ساتھ ہی مذاق نہیں، بلکہ دین کا بھی مذاق بنانا ہے کہ کسی کے متعلق کچھ بھی دین سے منسوب کر کے کہہ دیا جائے اور اُنہیں اپنی عقیدت کے جال میں پھنسانے کے لئے قرآنی آیات و وظائف کا نام لے کر دین کا سہارا لیا جائے۔ تاہم ہمارے معاشرے میں اس طرح کے

لوگ چپے چپے پر پائے جاتے ہیں اور سادہ لوح عوام اُن کے مکروفریب سے ناواقف ہیں، جس کے سبب وہ اُن کی اندھی عقیدت سے ہر طرح کے فوائد حاصل کررہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝

ترجمہ: ''اور ہرگز تمہیں اللہ کے علم پر دھوکا نہ دے وہ بڑا فریبی، بے شک اللہ کے پاس ہے قیامت کا علم اور اتارتا ہے مینہ اور جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹ میں ہے اور کوئی جان نہیں جانتی کہ کل کیا کمائے گی اور کوئی جان نہیں جانتی کہ کس زمین میں مرے گی، بیشک اللہ جاننے والا بتانے والا ہے، (لقمان: 34-33)''۔ مذکور شخص کا یہ دعویٰ ''اگر آپ کا باپ قبر میں بھی ہوگا، تو ایک مرتبہ باہر آجائے گا اور پھر دوبارہ قبر میں چلا جائے گا''، غُلو اور دین پر سخت بے باکی ہے، جسے شریعت قطعاً جائز نہیں رکھتی۔ مفتی محمد نور اللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ ''فتوح الغیب'' کے حوالے سے لکھتے ہیں: حضرت سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں: كُلُّ حَقِيْقَةٍ رَدَّتْهَا الشَّرِيْعَةُ فَهِيَ زَنْدَقَةٌ ترجمہ: ''ہر وہ حقیقت جس کو شریعت رَد کرے، وہ بے دینی ہے (یعنی ایسا شخص زندیق ہے)، (فتاویٰ نوریہ، جلد 5، ص: 108)''۔

بعض اولیاء اللہ کو خرقِ عادت کے طور پر کشف ہوتا ہے، لیکن وہ ان لوگوں کی طرح جھوٹ نہیں بولتے، دین کو مذاق نہیں بناتے، لوگوں کو دھوکا دے کر اپنے دامِ تزویر میں نہیں پھنساتے، ان کا تدیُّن، تشرُّع، تقویٰ اور صفائے باطن ان کے ظاہر سے عیاں ہوتا ہے، لیکن شریعت میں اس طرح کا مکاشفہ غیر کے لئے حُجت نہیں ہے۔ ان باتوں کو قطعی اور یقینی ماننا جائز نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنا

سوال:

آج کل ربیع الاول کے حوالے سے موبائل فونز پر ایک SMS چل رہا ہے،

جس میں لکھا ہے کہ: ''حدیثِ مبارک میں ہے کہ: جس نے ربیع الاول کی سب سے پہلے مبارک باد دی، اُس پر جنت واجب ہوگئی''۔ اس SMS کا شرعی حکم کیا ہے اور کیا ایسی کوئی حدیث موجود ہے؟، (قاری بہادر خان، دار العلوم نعیمیہ، کراچی)۔

جواب:

ہماری معلومات کے مطابق حدیث کی مستند اور معتبر کتابوں میں ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''جس شخص نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کی، اُسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے، (صحیح بخاری: 110، 6197، صحیح مسلم: 4)''۔

ایک اور حدیثِ پاک میں ہے: كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ

ترجمہ: ''کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ (تحقیق کئے بغیر) ہر سنی سنائی بات لوگوں کے سامنے بیان کرتا پھرے، (صحیح مسلم: 7)''۔

دوسری قباحت یہ ہے کہ اس قسم کے SMS کا فروغ لوگوں کو عمل سے دور لے جانے کے مترادف ہے اور محض ربیع الاول کی آمد کی مبارک باد دینے پر جنّت کو واجب قرار دینا، منشائے شریعت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

ترجمہ: ''کیا تم نے یہ گمان کرلیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہوجاؤ گے؟، حالانکہ ابھی تک تم پر ایسی آزمائشیں نہیں آئیں جو تم سے پہلے لوگوں پر آئی تھیں، (البقرہ: 214)''۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۝

ترجمہ: ''کیا تم نے یہ گمان کرلیا ہے کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں

سے مجاہدوں اور صبر کرنے والوں کو (دوسروں سے) ممتاز نہیں کیا، (آلِ عمران: 142)''۔
حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
فَاِنَّ حَقَّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ اَنْ لَّا يُعَذِّبَ مَنْ لَّا يُشْرِكُ بِهٖ، قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ! اَفَلَا اُبَشِّرُ النَّاسَ، قَالَ: لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اُس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب نہ دے، جنہوں نے کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرایا، حضرت معاذ فرماتے ہیں: میں نے عرض کی: حضور میں لوگوں کو یہ خوش خبری نہ سناؤں! فرمایا: نہیں ورنہ وہ اسی پر توکل کر کے بیٹھ جائیں گے، (صحیح مسلم: 51)''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے ایک باغ میں پہنچے، رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اپنی نعلین مبارک دیں اور فرمایا: اے ابو ہریرہ! میری یہ جوتیاں لے کر چلے جاؤ اور باغ کے باہر جو شخص تم کو کلمہ طیبہ کی دلی یقین سے شہادت دیتا ہوا ملے، اس کو جنت کی بشارت دے دو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ باغ کے باہر سب سے پہلے میری ملاقات حضرت عمر سے ہوئی، میں نے اُنہیں سارا ماجرا بیان کیا، آپ نے مجھے کہا کہ واپس جاؤ، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت عمر نے عرض کی: فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّيْ اَخْشٰى اَنْ يَّتَّكِلَ النَّاسُ فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُوْنَ قَالَ: فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: فَخَلِّهِمْ۔

ترجمہ: ''حضور ایسا نہ کریں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ پھر کلمہ پر ہی بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے (اور بے عملی اختیار کرلیں گے)، ان کو عمل کرنے دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا پھر انہیں عمل کرنے دو''۔ (صحیح مسلم: 54)

اسلام میں بدشگونی منع ہے

سوال:

عرفِ عام میں یہ توہم پرستی پائی جاتی ہے کہ 3 کا ہندسہ نحوست کی نشانی ہے۔دو بچیوں کی شادی دو سگے بھائیوں کے ساتھ یعنی دونوں بچیوں کا نکاح اور بیٹے کا ولیمہ اُسی دن ہورہا ہے،یعنی 3 عدد بچے بچیوں کی شادی کی تقریب ایک ہی دن ہونے کی وجہ سے تین کا ہندسہ بن رہا ہے،کیا یہ درست ہے؟،(سید محمد فیاض،سرجانی ٹاؤن،کراچی)۔

جواب:

اسلام میں بدشگونی کرنا منع ہے،اس کی کوئی حیثیت نہیں،قرآن مجید میں ہے کہ کفار بدشگونی کیا کرتے تھے،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَإِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ:''تو جب اُنہیں بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ ہماری وجہ سے ہے اور اگر اُنہیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو (اسے) موسیٰ اور اُن کے اصحاب کی نحوست قرار دیتے ہیں،سنو! ان (کافروں) کی نحوست،اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقدر ہے،لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے،(الاعراف:131)''۔

شیخ عبدالحق مُحدِّث دہلوی لکھتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا:''لَا طِيَرَةَ'' یعنی حصولِ نفع اور دفعِ ضرر میں بدشگونی کے لئے کوئی تاثیر اور دخل نہیں اور بدشگونی نہیں کرنا چاہئے اور نہ اس کا اعتبار کرنا چاہئے جو کچھ ہونا ہے،وہ ہوکر رہے گا،شریعت نے اس کو سبب نہیں بنایا''۔۔۔ مزید لکھتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا:''لَا صَفَرَ'' بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد ماہِ صفر ہے جو محرم کے بعد آتا ہے۔عام لوگ اس ماہ کو مصیبتوں،بلاؤں،آفات اور حادثات کا مہینہ قرار دیتے تھے،یہ اعتقاد بھی باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے''۔

(اَشِعَّۃُ اللَّمعات،جلد 3،ص:620)

تین کا ہندسہ جمع ہونے کو نحوست یا بدشگونی قرار دینا شرعاً جائز نہیں اور اس نظریے کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''ماہِ صفر کو لوگ منحوس جانتے ہیں، اس میں شادی بیاہ نہیں کرتے، لڑکیوں کو رخصت نہیں کرتے اور بھی اس قسم کے کام کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور سفر کرنے سے گریز کرتے ہیں، خصوصاً ماہِ صفر کی ابتدائی تیرہ تاریخیں بہت زیادہ نحس مانی جاتی ہیں اور ان کو تیرہ تیزی کہتے ہیں، یہ سب جہالت کی باتیں ہیں، حدیث میں فرمایا: صفر کوئی چیز نہیں یعنی لوگوں کا اسے منحوس سمجھنا غلط ہے، اسی طرح ذیقعدہ کے مہینہ کو بھی بہت لوگ برا جانتے ہیں اور اس کو خالی کا مہینہ کہتے ہیں یہ بھی غلط ہے اور ہر ماہ میں 28-18-8/23-13-3 کو منحوس جانتے ہیں، یہ بھی لغویات ہے، (بہارِ شریعت، حصہ 16، ص:242)''۔

شُش کلمات، ایمان مُفصّل و مُجمل کی شرعی حیثیت

سوال:

بچوں کو جو کلمے اور ایمانِ مُفصّل اور ایمانِ مُجمل یاد کرائے جاتے ہیں، اس کی اہمیت تحریر فرمائیں، (محمد فرقان، بلاک 16، گلبرگ کراچی)۔

جواب:

ایمان کے معنی ہیں: کسی بات کی دل سے تصدیق کرنا، دنیا کے ہر ''مذہب''، ''ازم''، ''مت'' اور ''دھرم'' میں کچھ عقائد اور مُسلّمات ہوتے ہیں، جن پر غیر مشروط اور پختہ یقین رکھنا اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد اور ایمانیات یہ ہیں:

۱۔توحید ۲۔رسالت ۳۔ملائکہ پر ایمان ۴۔آخرت اور جزاوسزا پر ایمان

۵۔تمام الہامی کتب پر ایمان ۶۔تقدیر پر ایمان

۷۔موت کے بعد کی زندگی پر ایمان

ان عقائد کا ذکر متفرق طور پر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے لیکن ایک ساتھ دو مقامات

پر آیا ہے، جو یہ ہیں:

(1) لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ

ترجمہ: ''نیکی (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم اپنا رخ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرلو بلکہ (کامل) نیکی اس شخص کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، یومِ آخرت پر، ملائکہ پر، کتابوں پر اور نبیوں پر، (البقرہ:177)''۔

(2) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ: ''ایمان لائے (اللہ کے) رسول اس (کتاب اور پیغامِ ہدایت) پر جو اللہ کی جانب سے ان پر نازل ہوا اور تمام مومن بھی (اس پر ایمان لائے)، سب نے دل سے تسلیم کیا اللہ کو، اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو (اور وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں میں (ایمان لانے کے مسئلے میں) کوئی امتیاز نہیں برتتے اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور اطاعت کی، ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں، اے ہمارے رب! (ہم کو) تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے (یعنی آخرت پر بھی ہمارا ایمان ہے)، (البقرہ:285)''۔

اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا ذکر کیا ہے کیونکہ ہر ذی عقل سب سے پہلے وجودِ صانع پر استدلال کرتا ہے۔ اس کے بعد فرشتوں اور پھر (آسمانی) کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر فرمایا۔

قرآن مجید میں آخرت کا بیان متعدد مقامات پر کیا گیا، جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(1) مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ

ترجمہ: ''جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور نیک عمل کرتے رہے ان کیلئے

ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے"، (البقرہ:62)۔

(2) وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ۝

ترجمہ: "اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں"۔ (المومنون:74)

(3) قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى

ترجمہ: "(اے رسول!) آپ کہہ دیجئے کہ متاعِ دنیا تھوڑی سی ہے اور آخرت اس کے لئے بہتر ہے جو پرہیزگاری اختیار کرے"، (النساء:77)۔

(4) تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۗ

ترجمہ: "تم لوگ دنیا چاہتے ہو اور اللہ (تمہارے لئے) آخرت کی بھلائی چاہتا ہے"۔ (الانفال:67)

(5) وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: "اور یہ دنیا کی زندگی کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں اور بے شک آخرت کا گھر یقیناً وہی (اصل) زندگی ہے، کاش! وہ جانتے، (العنکبوت:64)"۔

حدیث شریف میں عقائد کی بابت رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر تعلیم و تربیت فرمائی، ایک طویل حدیث میں ہے: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ ﷺ بَارِزًا يَوْمًا لِلنَّاسِ، فَاَتَاهُ جِبْرِيْلُ فَقَالَ: مَا الْاِيْمَانُ؟، قَالَ: اَلْاِيْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَبِلِقَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ،

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی ﷺ لوگوں کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، آپ کے پاس جبریل آئے، آپ سے پوچھا: ایمان کی تعریف کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور فرشتوں پر اور اللہ سے ملاقات پر اور رسولوں پر ایمان لاؤ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان

لاؤ، (صحیح بخاری:50)"۔

ایمانِ مُفصّل میں اُن اسلامی عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ وہ عقائد یہ ہیں:

(1) اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی وحدانیت (Oneness) پر ایمان، اسے عقیدۂ توحید کہتے ہیں۔

(2) ختم المرسلین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے پہلے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام انبیاءِ کرام ورُسُلِ عظام علیہم السلام کی رسالت کے حق ہونے پر ایمان۔

(3) قرآن مجید اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی تمام کتابوں پر ایمان، کیونکہ قرآن پر ایمان اس بات کو لازم ہے کہ سب الہامی کتابوں کو، جو وہ اصل مُنزّل شکل میں تھیں، حق مانا جائے، کیونکہ قرآن اُن تمام کتابوں کا مُصدِّق ہے۔

(4) فرشتوں پر ایمان (5) تقدیر پر ایمان

(6) بَعث بعد الموت (موت کے بعد قیامت کے دِن دوبارہ زندہ کئے جانے) پر ایمان، اسے عقیدۂ آخرت، جزاوسزا، قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ سے ثابت ان عقائد کی مرتب شکل ایمانِ مُفصّل ہے اور ایمانِ مُجمل میں اختصار ہے اور وہ یہ ہے: "(ترجمہ) میں اللہ پر ایمان لایا جیسا کہ وہ اپنی ذات وصفات میں ہے اور میں نے اُس کے تمام احکام کو قبول کیا، میں اس کا زبان سے اقرار کرتا ہوں اور دل سے تصدیق کرتا ہوں۔" شش کلمات کی صورت میں کلمۂ طیبہ، کلمۂ شہادت، اللہ کی تسبیح وتحمید وتوحید وتکبیر، صفات باری تعالیٰ، تمام دانستہ، نادانستہ، علانیہ اور غیر علانیہ گناہوں سے استغفار اور کفر کے رد اور اس سے اظہارِ براءت کو جمع کیا گیا تاکہ تفصیلی اور اجمالی طور پر ہر شخص کو ایمانیات اور عقائد کے متعلق بنیادی ضروریات کا علم ہوجائے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف گانا سننے کی نسبت کرنا

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ ایک شخص نے یہ کہا کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ راستے سے گزر رہے تھے کہ ایک گھر سے گانا گانے کی آواز آئی، آپ ﷺ وہاں ٹھہرے اور طوائف گانا گا رہی تھی، آپ ﷺ نے اُسے گانا گاتے سنا اور پھر جب آپ ﷺ رات کو سوئے تو خواب میں اسی طوائف کو گانا گاتے سنا اور ناچتے دیکھا۔ (العیاذ باللہ!) ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟، (فرحان، کراچی)۔

جواب:

مذکور شخص کا یہ قول جھوٹا اور رسول اللہ ﷺ پر بہتان ہے جبکہ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گانے بجانے کی کسی محفل کے پاس سے گزر ہوا تو اپنے کانوں میں انگشتِ مبارک داخل فرمالیں: عَنْ نَافِعٍ قَالَ: سَمِعَ ابْنُ عُمَرَ مِزْمَارًا قَالَ: فَوَضَعَ اِصْبَعَیْهِ عَلٰی اُذُنَیْهِ وَنَاٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَقَالَ لِیْ: یَانَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَیْئًا؟، قَالَ: فَقُلْتُ: لَا، قَالَ: فَرَفَعَ اِصْبَعَیْهِ مِنْ اُذُنَیْهِ وَقَالَ: کُنْتُ مَعَ النَّبِیِّ ﷺ، فَسَمِعَ مِثْلَ هٰذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هٰذَا۔

ترجمہ: ''حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے موسیقی (کی آواز) سنی اور اپنے کانوں میں انگلیاں داخل فرمالیں اور آپ نے وہ راستہ چھوڑ دیا اور (کچھ دیر کے بعد) مجھ سے پوچھا: اے نافع! کیا تم کچھ سن رہے ہو؟، نافع فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: نہیں، آپ نے کانوں سے انگلی ہٹالیں اور فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، پس آپ ﷺ نے اسی کے جیسی آواز سنی اور یونہی کیا (یعنی کانوں میں انگلیاں داخل فرما لیں اور راستہ بدل دیا)، (سُنن ابوداؤد: 4924)''۔

حدیثِ مبارک سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گانے کی آواز سن کر کانوں میں انگشتِ مبارک داخل فرمالیں، نہ اُس مقام پر ٹھہرے اور نہ ہی اُس کے بعد کسی خواب کا ذکر

ہے۔ مذکور شخص رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھ رہا ہے، سخت گنہگار اور گمراہ ہے۔ حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ

ترجمہ: ''جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنالے''۔

(صحیح بخاری:110، 6197)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''اہلسنت کسی کبیرہ کے ارتکاب کو کفر نہیں کہتے جب تک استحلال وغیرہ مکفرات کے ساتھ نہ ہو (یعنی حرام فعل کو حلال جان کر کرے)، مگر رسول اللہ ﷺ پر افتراء کو امام ابومحمد الجوینی والد امام الحرمین نے کفر بتایا، خصائص کبریٰ میں ہے: قَالَ النَّوَوِیُّ وَغَیْرُهٗ اَلْکَذِبُ عَلَیْهِ ﷺ مِنَ الْکَبَائِرِ وَلَایُکَفَّرُ فَاعِلُهٗ عَلَی الصَّحِیْحِ وَقَوْلِ الْجُمْهُوْرِ وَقَالَ الْجُوَیْنِیُّ هُوَ کُفْرٌ۔

ترجمہ: ''امام نووی و دیگر علماء نے فرمایا: حضور ﷺ کی نسبت جھوٹ بولنا کبیرہ گناہ ہے، تاہم صحیح قول اور جمہور فقہاء کرام کے مطابق اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی اور امام جوینی نے کہا کہ یہ کفر ہے''۔ اور درمختار وغیرہ میں ہے: مَایَکُوْنُ کُفْرًا اِتِّفَاقًا یُبْطِلُ الْعَمَلَ وَالنِّکَاحَ وَاَوْلَادُهٗ اَوْلَادُ زِنَا وَمَافِیْهِ خِلَافٌ یُؤْمَرُ بِالْاِسْتِغْفَارِ وَالتَّوْبَةِ (أَیْ تَجْدِیْدِ الْاِسْلَامِ) وَتَجْدِیْدِ النِّکَاحِ۔

ترجمہ: ''جن اُمور کے کفر ہونے پر اتفاق ہے، ان کے ارتکاب پر اعمال خیر اور نکاح باطل ہو جائے گا اور اولاد، اولادِ زنا قرار پائے گی اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو، وہاں توبہ واستغفار کا حکم کیا جائے گا (یعنی تجدید اسلام کرنا ہوگی) اور تجدید نکاح بھی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 15، ص:159، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔ کسی حدیث یا دینی بات کو مکمل علم اور یقین کے بغیر بیان نہیں کرنا چاہیے اور بالخصوص رسول اللہ ﷺ کی طرف کسی بات کو منسوب کرنے میں زیادہ احتیاط لازم ہے۔ کسی بات کو بغیر تحقیق بیان کرنا قطعاً درست نہیں، بلکہ حدیث مبارک میں فرمایا: کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا أَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ۔

ترجمہ: ''آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ (ہرسنی سنائی) بات کو (بغیر تحقیق) آگے بیان کردے، (صحیح مسلم:7)''۔ مذکور شخص پر لازم ہے کہ توبہ کرے اور آئندہ احتیاط برتے اور احتیاطاً تجدیدِ نکاح کرے، تو بہتر ہے۔

منقبت کے ایک شعر کا شرعی حکم

سوال:

ایک سنّی اسٹیج سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں ایک منقبت پڑھی گئی، جس کے دو مصرعے یہ ہیں:

کاندھوں سے گرنے نہیں دیتے نواسے کو
لگتا ہے نبیوں کا امام بھی حسینی ہے
ہرقاری کی زباں پر قرآن بھی حسینی ہے

ایسے اشعار پڑھنا ازروئے شریعت کیسا ہے؟۔

(محمد جان نعیمی، قاری عبدالقدیر، مانسہرہ)

جواب:

جولوگ اس طرح کے اشعار پڑھتے ہیں، وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حُسَيْنٌ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْ حُسَيْنٍ'' ترجمہ: ''حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں (سُنن ترمذی، رقم الحدیث:3775)''۔ ''أَنَا مِنْ حُسَيْنٍ'' کے معنی یہ ہیں کہ میرے کمالات کا ظہور حسین سے ہوگا، یعنی امام حسین رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے کمالات کا مظہر ہیں۔ اس کا یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ امام حسین اصل ہیں اور امام الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ اُن کی فرع ہیں یا رسول اللہ ﷺ کی فضیلت کا مدار معاذ اللہ! آپ ﷺ کی امام حسین سے نسبت پر ہے۔ ہمارے عرف میں علوی، حسینی، صدیقی اور فاروقی وغیرہ کلمات کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ یا تو وہ شخص ان معزز ومکرم شخصیات کی اولاد میں سے ہے یا اُن سے نسبتِ عقیدت رکھتا ہے یا اُن کا متبع ہے یا

وہ اُن کا مُحِبّ ہے۔لیکن ہر محبوب کے لئے افضل ہونا لازمی نہیں ہے اولادِ صالح والدین کی محبوب ہوتی ہے لیکن افضل والدین کا مقام ہے۔ان میں سے آخری معنی (یعنی مُحِبّ) کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کو حسینی کہنا اگرچہ درست ہے اور یہ تاویل کی جاسکتی ہے۔لیکن بقیہ تین معانی کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ پر حسینی کا اِطلاق ممنوع وناجائز ہے۔عرف وعادت میں یہی معانی زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور ان معانی میں رسول اللہ ﷺ کو ''حسینی'' کہنے سے رسول اللہ ﷺ پر امام حسین کی فضیلت کا ایہام ہوتا ہے،لہٰذا اس سے منع کیا جائے۔علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَمُجَرَّدُ اِیْھَامِ اللَّفْظِ مَالَایَجُوْزُ، کَافٍ فِی الْمَنْعِ۔

ترجمہ:''لفظ سے کسی ایسے معنی کا ایہام (یعنی تاثر) پیدا ہونا جو (شرعاً) ناجائز ہے،اُس لفظ کے استعمال سے منع کرنے کے لئے کافی (دلیل) ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9،ص: 484)''۔اگر کسی درجے میں ایسے کلمات کا جواز بھی کوئی صاحبِ علم بطور تاویل ثابت کرے،پھر بھی عام جلسوں اور اجتماعات میں اس کی حوصلہ شکنی کرنی ضروری ہے تاکہ دینی معاملات میں بے اعتدالی اور ابتذال کا رُجحان ختم ہو۔تاہم اگر''لگتا ہے نبیوں کا امام بھی حسینی ہے'' سے کوئی شخص تاویل کے طور پر ''مُحِبِّ حسین'' کے معنی مراد لیتا ہے،تو''لگتا ہے'' کا کلمہ تشکیک کے معنی پیدا کرتا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ تو یقیناً مُحِبِّ حسین ہیں،یعنی آپ ﷺ یقیناً حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے محبت فرماتے تھے۔

''ہر قاری کی زباں پر قرآن بھی حسینی ہے'' ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ سے اظہارِ محبت یا اُن کی فضیلت کے بیان کے لئے اس طرح کا پیرایۂ بیان کیوں اختیار کیا جاتا ہے جو اُمّت میں انتشار کا باعث ہو،بعد میں جس کی طرح طرح کی تاویلات کرنی پڑیں۔کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ صحیح و مستند روایات سے اہلِ بیتِ اَطہار اور حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے جو فضائل ثابت اور مُسلّم ہیں،اُن کا بیان کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے لئے آسمان والا کہنا

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس حدیث پاک کے بارے میں جو بہت سنائی جاتی ہے کہ: ''تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا''۔ کیا یہ حدیث صحیح ہے اور کیا اللہ تعالیٰ کو آسمان والا یا اوپر والا کہنا درست ہے؟۔

(طالب حسین احراری، ٹنڈوالہ یار)

جواب:

یہ حدیثِ مبارک درجِ ذیل ہے: عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ، الرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ، فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلَهُ اللهُ وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعَهُ اللهُ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رحم کرنے والوں پر رحمٰن (اللہ) رحم فرماتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، (اللہ) آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا، ''رَحِم'' (بمعنی رشتۂ قرابت) اللہ (کی صفت) الرحمٰن سے مشتق ہے (یعنی اس کا پرتو اور عکس ہے) جو قرابت کے رشتے کو جوڑے رکھے گا، اللہ تعالیٰ اُسے اپنی ذات کریم سے ملائے رکھے گا اور جو اِسے توڑے گا، اللہ تعالیٰ اُسے اپنی نگاہ کرم ولطف سے جدا کر دے گا، (سُنن ترمذی: 1924، سُنن ابوداؤد: 4941)''۔

اس کے علاوہ قرآنِ مجید کی دو آیت مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے لئے ''مَنْ فِي السَّمَآءِ'' (جو آسمان میں ہے یا آسمان والا) کے کلماتِ مبارکہ آئے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۙ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا

ترجمہ: ''کیا تم آسمان والے سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے پھر

اچانک وہ زمین لرزنے لگے۔کیا تم آسمان والے سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تم پر سنگباری کرنے والی تیز ہوا بھیج دے،(الملک:17-16)''۔

ان کے علاوہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے لئے ''یَدُاللہ''،''وَجۡہُ اللہ''،''نفس''اور''اِسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡش'' کے کلمات بھی آئے ہیں۔

(۱)بِیَدِکَ الۡخَیۡرُ، (آل عمران:26)،(۲) قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ، (آل عمران: 73)(۳)وَ قَالَتِ الۡیَہُوۡدُ یَدُ اللّٰہِ مَغۡلُوۡلَۃٌ، (المائدہ:64)

(۴) یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ، (الفتح:10)، (۵)وَ اَنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ، (الحدید:29)

(۶)فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ، (البقرہ: 115) (۷)یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ، (روم:38)، (۸) وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ، (آلِ عمران : 28،30) اِس کے علاوہ بقرہ:29 میں ''عَلَی الۡعَرۡشِ اِسۡتَوٰی''، اعراف:54، یونس:3، رعد:2 اور طٰہٰ:5 میں ''عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی'' کے کلمات آئے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنۡ نُوۡرٍ، عَنۡ یَمِیۡنِ الرَّحۡمٰنِ عَزَّ وَ جَلَّ، وَ کِلۡتَا یَدَیۡہِ یَمِیۡنٌ، اَلَّذِیۡنَ یَعۡدِلُوۡنَ فِیۡ حُکۡمِہِمۡ وَ اَہۡلِیۡہِمۡ وَ مَا وَلُوۡا۔

ترجمہ:''انصاف کرنے والے(قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ کے نزدیک اللہ عزّ وجلّ کے دائیں جانب نوری منبروں پر ہوں گے اور اللہ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں،(یہ وہ لوگ ہیں) جو اپنے فیصلوں، اپنے اہل وعیال اور اپنے زیرِ حکومت لوگوں کے معاملات میں عدل کرتے ہیں،(صحیح مسلم:4718)''۔

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اَقدس جہت(Direction)، زمان ومکان(Time & Space) حرکت وسکون(Motion & Stillness)، شکل وصورت(Hologram,Shape)، الغرض جسم وجسمانی تقاضوں اور ہر قسم کے عوارض سے پاک اور منزّہ ہے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ کو اوپر والا اور آسمان والا کہنا درست نہیں ہے،''اوپر والا'' سے عظمت وبزرگی اور رفعتِ شان

کے معنی مراد لئے جاسکتے ہیں، لیکن ان کلمات کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہئے۔ قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں جن مقامات پر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے لئے اس طرح کے کلمات آئے ہیں، اُن کے قطعی معنی و مصداق کے تعین کے بغیر اُن پر ایمان لانا فرض ہے۔ اُن کے معانی و مطالب اور مصداق کے بارے میں بحث کرنا عام مسلمانوں کے لئے نہ مناسب ہے اور نہ ضروری۔ ایسی تمام آیات واحادیث متشابہات میں سے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات مبارکہ کی دو اقسام خود قرآن مجید نے بیان فرمائی ہیں، ان میں سے ایک ''آیاتِ محکمات'' ہیں، یعنی ایسی آیات جن کا معنی و مفہوم اور مصداق بالکل واضح، محکم اور قطعی ہے۔ اِن آیات پر لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے ایمان لانا ضروری ہے۔ اور دوسری قسم ''آیاتِ مُتشابہات'' ہیں، ان پر ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، حق ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی جو بھی مراد ہے، وہ حق ہے۔ مسلمانوں کے لئے ان کے معنی و مصداق کا تعین ضروری نہیں ہے۔ اس مسئلے کے تفصیلی دلائل حسبِ ذیل ہیں:

مُفسّرین کرام نے اِن آیات کی مختلف تاویلات بیان کی ہیں، لیکن یہ معنی ظنّی ہیں، قطعی نہیں ہیں۔ اگر آسمان والے سے اللہ عزّ وجل ہی کی ذات مراد ہو تو اِس کا محمل یہ ہے کہ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کسی سَمت اور جہت کے ساتھ مخصوص اور مقید نہیں ہے، لیکن چونکہ آسمان کی سَمت اور جہت کو باقی جہات پر فوقیت حاصل ہے، اس لئے جب اللہ تعالیٰ کی طرف کسی جہت سے اشارہ کرنا ہو تو آسمان کی جہت سے اشارہ کیا جاتا ہے، اس لئے عرف میں آسمان والے سے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو مراد لیا جاتا ہے۔ مذکورہ حدیث میں ''آسمان والا'' کے کلمات کو ''رِفعتِ شان'' کے معنی میں لیا جائے گا یا یہ متشابہات میں سے ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز آیاتِ مُتشابہات کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''(اقول) میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اتارا ہے، ہدایت فرمانے اور بندوں کو جانچنے آزمانے کو، يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِیْ بِهٖ كَثِيْرًا (البقرہ:26) یعنی اسی قرآن سے بہتوں کو گمراہ فرمائے اور بہتیروں کو راہ دکھائے۔ اس ہدایت وضلالت کا بڑا منشا قرآن

عظیم کی آیتوں کا دو قسم ہونا ہے: مُحکمات: جن کے معنی صاف بے دِقّت ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کی پاکی و بے نیازی و بے مثلی کی آیتیں اور دوسری مُتشابہات جن کے معنی میں اشکال ہے یا تو ظاہر لفظ سے کچھ سمجھ ہی نہیں آتا جیسے حُروفِ مُقطّعات الٓمٓ وغیرہ یا جو سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ عزوجل پر محال ہے جیسے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (وہ بڑا مہر والا اس نے عرش پر استواء فرمایا) یا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (پھر اُس نے عرش پر استواء فرمایا) پھر جن کے دلوں میں کجی وگمراہی تھی وہ تو ان کو اپنے ڈھب کا پا کر ان کے ذریعے سے بے علموں کو بہکانے اور دین میں فتنے پھیلانے لگے کہ دیکھو قرآن میں آیا ہے: ''اللہ عرش پر بیٹھا ہے، عرش پر چڑھا ہوا ہے، عرش پر ٹھہر گیا ہے''۔ اور آیاتِ محکمات جو کتاب کی جڑ تھیں ،اُن کے ارشاد، دِل سے بُھلا دیئے، حالانکہ قرآن عظیم میں تو استواء آیا ہے اور اس کے معنی چڑھنا، بیٹھنا، ٹھہرنا ہونا کچھ ضرور نہیں یہ تو تمہاری اپنی سمجھ ہے جس کا حکم خدا پر لگا رہے ہو، مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ (اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی دلیل نازل نہ فرمائی)، اگر بالفرض قرآن مجید میں یہی الفاظ چڑھنا، بیٹھنا، ٹھہرنا آتے تو قرآن ہی کے حکم سے فرض قطعی تھا کہ اُنہیں ان ظاہری معنی پر نہ سمجھو جو ان لفظوں سے ہمارے ذہن میں آتے ہیں کہ یہ کام تو اجسام کے ہیں اور اللہ تعالیٰ جسم نہیں''۔۔۔۔۔ پھر آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: یہی اَنسب ہے کہ اُن (عوام) کی افکار ایک مناسب وملائم معنی کی طرف کہ محکمات سے مطابق محاورات سے مُوافق ہوں، پھیر دی جائیں کہ فتنہ وضلال سے نجات پائیں، یہ مسلک بہت علمائے متاخرین کا ہے کہ نظر بحال عوام اسے اختیار کیا جائے، اسے مسلکِ تاویل کہتے ہیں ،یہ علماء بوجوہ کثیرہ تاویل آیت فرماتے ہیں، ان میں چار وجہیں نفیس وواضح ہیں:

اوّل: استواء بمعنی قہر وغلبہ ہے، یہ زبانِ عرب سے ثابت وپیدا ہے، عرش سب مخلوقات سے اوپر اور اونچا ہے، اس لئے اس کے ذکر پر اکتفا فرمایا اور مطلب یہ ہوا کہ اللہ تمام مخلوقات پر قاہر وغالب ہے۔

دوم: استواء بمعنی عُلُوّ ہے اور عُلُوّ، اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی صفت ہے، نہ عُلُوِّ مکان بلکہ عُلُوِّ مالکیت

وسُلطان (یعنی اس کی حاکمیت اور اقتدار سب پر غالب ہے)۔ یہ دونوں معنی امام بیہقی نے ''کتاب الاسماء والصّفات'' میں ذکر فرمائے۔

سوم: استواء بمعنیٰ قصد وارادہ ہے، ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یعنی پھر عرش کی طرف متوجہ ہوا اور اُس کی آفرینش کا ارادہ فرمایا، یعنی اُس کی تخلیق شروع کی۔ یہ تاویل امام اہلسنت امام ابوالحسن اشعری نے افادہ فرمائی۔ امام اسماعیل ضریر نے فرمایا: اِنَّهُ الصَّوَابُ یہی ٹھیک ہے، نَقَلَهُ الْاِمَامُ جَلَالُ الدِّیْنِ السُّیُوْطِیُّ فِی الْاِتْقَانِ (اس کو امام جلال الدین سیوطی نے اتقان میں نقل کیا ہے)۔

چہارم: استواء بمعنیٰ فراغ وتمامی کار ہے، یعنی سلسلہ خلق وآفرینش کو عرش پر تمام فرمایا، اُس سے باہر کوئی چیز نہ پائی، دنیا وآخرت میں جو کچھ بنایا اور بنائے گا، دائرۂ عرش سے باہر نہیں کہ وہ تمام عظیم مخلوق کو حاوی ہے۔ قرآن کی بہتر تفسیر وہ ہے جو قرآن سے ہو۔ استواء بمعنی تمامی خود قرآن عظیم میں ہے: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰی (جب اپنی قوت کے زمانے کو پہنچا اور اُس کا شباب پورا ہو) اسی طرح قولہ تعالیٰ: كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ (جیسے پودا کہ اس کا خوشہ نکلا تو اس کو بوجھل کیا، تو وہ موٹا ہوا، تو وہ اپنے تنے پر درست ہوا) میں استواء حالتِ کمال سے عبارت ہے، یہ تاویل ''امام حافظ الحدیث ابن الحجر عسقلانی'' نے امام ''ابوالحسن علی بن خلف بن بطال'' سے نقل کی اور یہ کلام ''امام ابوطاہر قزوینی'' کا ہے کہ ''سراج العقول'' میں افادہ فرمایا اور امام عبدالوہاب شعرانی کی کتاب ''الیواقیت'' میں منقول''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 29، ص: 122 تا 126، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: يُكَفَّرُ بِاِثْبَاتِ الْمَكَانِ لِلّٰهِ تَعَالٰی فَلَوْ قَالَ: ''از خدا ہیچ مکان خالی نیست''، يُكَفَّرُ وَلَوْ قَالَ: ''اَللّٰهُ تَعَالٰی فِی السَّمَاءِ''، فَاِنْ قَصَدَ بِهٖ حِكَايَةَ مَا جَاءَ فِيْهِ ظَاهِرُ الْاَخْبَارِ لَا يُكَفَّرُ وَاِنْ اَرَادَ بِهِ الْمَكَانَ يُكَفَّرُ وَاِنْ لَمْ تَكُنْ لَهٗ نِيَّةٌ يُكَفَّرُ عِنْدَ الْاَكْثَرِ وَهُوَ الْاَصَحُّ وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰی۔ وَيُكَفَّرُ بِقَوْلِهٖ اَللّٰهُ تَعَالٰی

جَلَسَ لِلْاِنْصَافِ أَوْ قَامَ لَهُ بِوَصْفِهِ اللهِ تَعَالٰى بِالْفَوْقِ وَالتَّحْتِ كَذَا فِي الْبَحْرِ الرَّائِقِ۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے لئے مکان ماننے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ پس اگر کسی نے یہ کہا: ''کوئی جگہ خدا سے خالی نہیں ہے''، وہ کافر ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہے: ''اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے''، پس اگر اس سے اُس نے اس کی حکایت کا ارادہ کیا ہے جو روایات کے ظاہری کلمات میں ہے، تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اور اگر اس سے مکان کی نیت کی، تو اس کی تکفیر کی جائے گی، اور اگر اس کی کوئی نیت نہ ہو تو اکثر فقہاء کے نزدیک اس کی تکفیر کی جائے گی، یہی صحیح ترین قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اور اگر کسی نے کہا: ''اللہ تعالیٰ انصاف کے لئے بیٹھا ہے یا کھڑا ہے''، جو اللہ تعالیٰ کو اوپر یا نیچے قرار دے تو اُس پر حکمِ کفر لگایا جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 259)''۔

علامہ مفتی جلال الدین امجدی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا: اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے اوپر والا بولنا کیسا ہے؟، اس جملے سے جہت کا ثبوت ہوتا ہے یا نہیں؟، اگر کوئی یہ جملہ بول کر بلند و بالا اور برتری کے معنی میں استعمال کرے تو اس کی تاویل مسموع (قابلِ قبول) ہوگی یا نہیں؟، آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''خدائے تعالیٰ کی ذات کے لئے اوپر والا بولنا کفر ہے کہ اس لفظ سے اس کے لئے جہت کا ثبوت ہوتا ہے اور اُس کی ذات جہت سے پاک ہے، جیسا کہ حضرت علامہ سعد الدین تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں: اِذَا لَمْ يَكُنْ فِي مَكَانٍ لَمْ يَكُنْ فِي جِهَةٍ لَا عُلُوٌّ وَّلَا سِفْلٌ وَّلَا غَيْرُهُمَا (ترجمہ: اللہ تعالیٰ مکان میں ہونے سے پاک ہے اور جب وہ مکان میں ہونے سے پاک ہے تو جہت سے بھی پاک ہے اور اوپر، نیچے ہونے سے بھی پاک ہے)، (شرح عقائد نسفی، ص: 33)۔ اور حضرت علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں: يُكَفَّرُ بِوَصْفِهٖ تَعَالٰى بِالْفَوْقِ أَوْ بِالتَّحْتِ (جو اللہ تعالیٰ کو اوپر یا نیچے قرار دے تو اُس پر حکمِ کفر لگایا جائے گا)، (البحر الرائق جلد پنجم، ص: 120)، لیکن اگر کوئی شخص یہ جملہ بلندی و برتری کے معنی میں استعمال کرے تو قائل پر حکمِ کفر نہ کریں گے مگر اس قول کو برا ہی کہیں گے اور قائل کو اس سے روکیں گے، (فتاویٰ

فیض الرسول، حصہ اول، ص:3-2)''۔

نعت میں بعض کلمات کے استعمال کا جواز

سوال:

نعتیہ کلام یا اَشعار میں جو شعراء رسول اللہ ﷺ کے بارے میں لفظ ''تو''، ''تیری'' یا ایسا کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟۔

(ریاض احمد، G-11 نیو کراچی)

جواب:

نعتیہ کلام ہو یا بیان، تحریر ہو یا تقریر کا انداز، سب جگہ رسول اللہ ﷺ کے اسمِ مبارک کی تعظیم فرض ہے۔ ایسا کوئی لفظ جو عامی انداز میں مخلوق کے لئے استعمال ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے لئے مناسب نہیں۔ اگر تعظیم کے ترک کئے جانے کے ارادے سے ہو تو کفر ہے اور اگر بلاضرورت ہو تو برکات سے محرومی کا سبب۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''حقیقۃً نعت شریف لکھنا نہایت مشکل کام ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں اِس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے، اگر بڑھتا ہے تو اُلوہیت میں پہنچا جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص (یعنی شان میں کمی یا گستاخی) ہوتی ہے، (ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ دوم، ص: 227)''۔ ایک اور مقام پر امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ ''رسول مقبول ﷺ کا ذکر ہو تو صرف یہ کہنا کہ رسول نے ایسا کیا، رسول نے ایسا کہا، کیا مناسب ہے؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''نام اقدس تعظیم کے ساتھ لینا فرض ہے، خالی رسول کہنا اگر بقصدِ ترکِ تعظیم ہو تو کفر ہے ورنہ بلاضرورت ہو تو برکات سے محرومی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 15، ص:99)''۔

عربی زبان میں واحد مذکر مخاطب کے لئے ''اَنْتَ'' یا انگریزی میں You کا کلمہ بولنا اُن کے عرف میں خلافِ ادب نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ اردو میں بزرگ شخصیات کے لئے ''تو''، ''تم''، ''تیرا'' اور ''تمہارا'' ایسے کلمات نثر میں لکھنا یا عام گفتگو میں بولنا خلافِ ادب سمجھا

جاتا ہے، یہ ہمارا عرف ہے، ان کلمات کے بجائے احترام اور اِکرام کے طور پر ''آپ'' بولا جاتا ہے۔ تاہم ضرورت شعری کی بنا پر (یعنی وزنِ شعر کو قائم رکھنے کے لئے) ''تو'' یا ''تم'' یا ''تیرا'' یا ''تمہارا'' کے کلمات خلافِ ادب کے زُمرے میں نہیں آئیں گے، مثلاً

(۱) تیری سرکار میں لاتا ہے رضا اُس کو شفیع
جو میرا غوث ہے اور لاڈلا بیٹا تیرا

(۲) کریم اپنے کرم کا صدقہ لئیمِ بے قدر کو نہ شرما
تو اور رضا سے حساب لینا، رضا بھی کوئی حساب میں ہے

(۳) یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

قرآن مجید کی توہین

سوال:

ایک شخص نے اپنی والدہ سے جھگڑے کے دوران شدید غصے میں آکر قرآن پاک کو جلا دیا، پھر ایک گھنٹہ بعد اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ندامت ہوئی، تو دوبارہ کلمہ پڑھا اور اپنے اس فعلِ قبیح سے توبہ کی اور اب بھی اپنے اس فعل پر نادم ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حل کیا ہے؟ کیا شخص مذکور کی کوئی شرعی سزا ہے، کیا عنداللہ اُس شخص کیلئے معافی کی گنجائش ہے جبکہ ماضی میں اُس سے ایسا کوئی عمل سرزد نہیں ہوا، جو دین یا قرآن وحدیث سے بیزاری پر دلیل ہو، یہ سب کچھ اچانک ہوا۔ اس وقت وہ شخص جیل میں ہے، اُس کا مقدمہ قاضی کی عدالت میں ہے، مقامی لوگ اُس کی پھانسی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔
(قاری محمد حسین آرائیں، کراچی)

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَمَنْ هَزَلَ بِلَفْظِ كُفْرٍ اِرْتَدَّ، وَاِنْ لَمْ يَعْتَقِدْهُ لِلِاسْتِخْفَافِ فَهُوَ كَكُفْرِ الْعِنَادِ۔

ترجمہ: ''اور جس نے مذاق میں کلمۂ کفر بولا، وہ مرتد ہوگیا، خواہ وہ (اس کلمے کے) توہین

والے معنی کا عقیدہ نہ رکھتا ہو، یہ کفر عناد کی طرح ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: أَیْ تَکَلَّمَ بِاِخْتِیَارِہٖ غَیْرَ قَاصِدٍ مَعْنَاہُ، وَھٰذَا لَایُنَافِیْ مَامَرَّ مِنْ أَنَّ الْاِیْمَانَ ھُوَ التَّصْدِیْقُ فَقَطْ أَوْمَعَ الْاِقْرَارِ، لِأَنَّ التَّصْدِیْقَ وَاِنْ کَانَ مَوْجُوْدًاحَقِیْقَۃً لٰکِنَّہٗ زَائِلٌ حُکْمًا، لِأَنَّ الشَّارِعَ جَعَلَ بَعْضَ الْمَعَاصِیْ أَمَارَۃً عَلٰی عَدَمِ وُجُوْدِہٖ کَالْھَزْلِ الْمَذْکُوْرِ، وَکَمَا لَوْسَجَدَ لِصَنَمٍ أَوْ وَضَعَ مُصْحَفًا فِیْ قَاذُوْرَۃٍ فَاِنَّہٗ یُکَفَّرُ وَاِنْ کَانَ مُصَدِّقًا، لِأَنَّ ذَالِکَ فِیْ حُکْمِ التَّکْذِیْبِ، کَمَا أَفَادَہٗ فِیْ ''شَرْحِ الْعَقَائِدِ''، وَأَشَارَاِلٰی ذَالِکَ بِقَوْلِہٖ ''لِلْاِسْتِخْفَافِ'' فَاِنْ فَعَلَ ذَالِکَ اِسْتِخْفَافٌ وَاسْتِھَانَۃٌ بِالدِّیْنِ فَھُوَأَمَارَۃٌ عَدَمُ التَّصْدِیْقِ۔

ترجمہ: ''یعنی اپنے اختیار سے کلمۂ کفر بولا (خواہ) اس کے معنی کا ارادہ نہ بھی کیا ہو، یہ مسئلہ اس بحث کے منافی نہیں ہے کہ ایمان فقط تصدیق قلبی کا نام ہے یا تصدیق مع الاقرار کا، کیونکہ تصدیق اگرچہ حقیقتاً موجود ہے لیکن حکماً زائل ہے۔ کیونکہ شارع نے بعض معاصی کو تصدیق قلبی نہ ہونے کی علامت قرار دیا ہے، جیسا کہ مذاقاً کلمۂ کفر بولنا اور جیسے کہ کسی نے بت کو سجدہ کیا یا قرآن کریم کو کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دیا، خواہ وہ ضروریات دین پر تصدیق قلبی رکھتا ہو، اس کی بہر حال تکفیر کی جائے گی (یعنی یہاں نیت کا اعتبار نہیں ہے) کیونکہ یہ عمل بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا ایمان نہیں ہے، جیسا کہ شرح عقائد میں بیان کیا اور اشارہ کیا اس مضمون کی طرف اپنے قول ''للاستخفاف'' سے، پس اگر کوئی شخص استخفاف اور اہانتِ دین کی نیت سے ایسا کرے تو اس کا یہ عمل عدمِ تصدیق قلبی کی علامت ہوگی، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص: 270، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ شامی کی مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں اُس شخص کا قرآن مجید کو جلانا، اس کے کفر کے ثبوت کے لئے کافی ہے، خواہ اس کی نیت اہانت کی ہو یا نہ ہو، یہ عمل بجائے خود اہانت قرآن کی دلیل ہے اور اہانت قرآن مجید کفر ہے، اس لئے نیت پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا وہ شخص اس عمل کے ذریعے دین سے خارج ہو گیا اور اس پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح لازم

ہے۔اگر اس نے صدقِ دل سے توبہ کر کے کلمہ پڑھ لیا ہے اور تجدیدِ ایمان کرلیا ہے تو یہ کافی ہے، اگر شادی شدہ ہے تو تجدیدِ نکاح بھی کرے۔اگر خدانخواستہ اُس نے مغلوب الغضب ہوکر قرآن مجید کو زمین پر پھینک دیا ہوتا اور یہ عمل اہانت کی نیت سے نہ ہوتا، تو انتہائی کبیرہ گناہ ہوتا اور اگر اہانت کی نیت سے ہوتا تو کفر قرار پاتا۔حاکم تعزیراً کچھ سزا دینا چاہے تاکہ دوسروں کے لئے عبرت ہو، تو یہ اُس کی حکمت اور صوابدید پر منحصر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف بھول کی نسبت

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اِس شعر کے بارے میں کہ جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا گیا ہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ؎

جاں کنی کے وقت آنا چہرۂ انور دکھانا حشر میں نہ بھول جانا اپنے دامن میں چھپانا

معترض کہتا ہے کہ یہ جملہ ''حشر میں نہ بھول جانا'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شایانِ شان نہیں ہے کیونکہ اس میں بھولنے کا ذکر ہے، جو عیب ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام عیوب ونقائص سے پاک ہیں، (محمد اسحاق، کراچی)۔

جواب:

نعت یا سلام کا یہ شعر خلافِ ادب نہیں ہے اور نہ ہی اس میں اہانتِ رسول یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف عیب کی نسبت کا کوئی شائبہ ہے۔عربی میں ''سَہو'' اور ''ذُہول'' (Absence of Mind or Absentmindness) کے معنی ہیں کہ کوئی بات انسان کی قوتِ حافظہ (Memory) میں موجود ہو، لیکن اس کی طرف سے وقتی طور پر توجہ ہٹ جائے، جیسے ہم اپنے گھر میں کوئی چیز رکھتے ہیں اور کسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا، مگر بعد میں یاد آجاتی ہے۔اس کے برعکس کوئی بات یا کوئی چیز حافظہ سے نکل جائے تو اس کو نسیان (Forgetting) کہتے ہیں۔انبیاءِ کرام کو ذہول اور سہو لاحق ہوسکتا ہے، مگر وحیِ ربانی اور احکامِ الٰہی کے ابلاغ

میں اللہ کے نبی اور رسول کو قطعاً کوئی ذھول، سہو اور نسیان لاحق نہیں ہوسکتا۔ البتہ دیگر امور میں یا اللہ تعالیٰ کی حکمت سے نبی کو نسیان ہوسکتا ہے۔ ہم اس مسئلے پر تفصیلی کلام کریں گے۔

قرآن مجید میں نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی گئی ہے، لیکن عربی میں ایک لفظ کئی معانی کے لئے آتا ہے، تو جب کسی لفظ کی نسبت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو تو اُس کے وہ معنی مراد ہوتے ہیں جو ان کے شایانِ شان ہوں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۚ فَالْیَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾

ترجمہ: ''جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنالیا تھا اور جن کو دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا، تو آج کے دن ہم انہیں نظر انداز کردیں گے جس طرح انہوں نے اِس دن (قیامت) کی ملاقات کو بھلا رکھا تھا اور وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے''۔

(الاعراف:51)

۲۔ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: ''تم نے جو اِس دن (اللہ تعالیٰ سے) ملاقات کو بھلا دیا تھا، تو اب تم اس کا مزہ چکھو، بے شک ہم نے (بھی) تم کو فراموش کردیا ہے اور تم جو کچھ کرتے تھے اس کی سزا میں دائمی عذاب چکھو، (السجدہ:14)''۔

۳۔ وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰی وَ قَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰی ﴿۱۲۶﴾

ترجمہ: ''اور جس نے میرے ذکر سے اعراض کیا تو یقیناً اس کی زندگی بہت تنگی میں گزرے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے، وہ کہے گا: اے میرے رب! تو نے

مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟، حالانکہ میں (دنیا میں) دیکھنے والا تھا، اللہ فرمائے گا: اسی طرح تیرے پاس (دنیا میں) میری نشانیاں آئی تھیں، تو تو نے ان کو فراموش کر دیا تھا اور اسی طرح آج تجھے بھی فراموش کر دیا جائے گا، (طٰہٰ: 124-126)"۔

۴۔ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

ترجمہ: "اور (ان سے) کہا جائے گا آج ہم تمہیں اسی طرح فراموش کر دیں گے جس طرح تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے، (الجاثیہ: 34)"۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسیان کی نسبت کے معنی کے بارے میں علامہ فخر الدین رازی لکھتے ہیں: (فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا) وَفِيْ تَفْسِيْرِ هٰذَا النِّسْيَانِ قَوْلَانِ: (اَلْقَوْلُ الْاَوَّلُ) اِنَّ: النِّسْيَانَ هُوَ التَّرْكُ، وَالْمَعْنٰى: نَتْرُكُهُمْ فِيْ عَذَابِهِمْ كَمَا تَرَكُوا الْعَمَلَ لِلِقَاءِ يَوْمِهِمْ هٰذَا، وَهٰذَا قَوْلُ الْحَسَنِ وَمُجَاهِدٍ وَالسُّدِّيِّ وَالْاَكْثَرِيْنَ۔ (وَالْقَوْلُ الثَّانِيْ): اِنَّ مَعْنٰى نَنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوْا اَيْ نُعَامِلُهُمْ مُعَامَلَةَ مَنْ نَسِيَ، نَتْرُكُهُمْ فِي النَّارِ كَمَا فَعَلُوْهُ فِي الْاِعْرَاضِ بِاٰيٰتِنَا، وَبِالْجُمْلَةِ فَسَمّٰى اللّٰهُ جَزَآءَ نِسْيَانِهِمْ بِالنِّسْيَانِ كَمَا فِيْ قَوْلِهٖ، "وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" وَالْمُرَادُ مِنْ هٰذَا النِّسْيَانِ اَنَّهٗ لَا يُجِيْبُ دُعَائَهُمْ وَلَا يَرْحَمُهُمْ۔

ترجمہ: "" "الجاثیہ: 34" میں نسیان کی تفسیر میں دو قول ہیں: (۱) نسیان ترک کرنے (یعنی نظر انداز کرنے) کے معنی میں ہے، آیت کے معنی یہ ہیں: ہم ان کو عذاب میں مبتلا چھوڑ دیں گے، جیسا کہ انہوں نے دنیا میں اللہ کے حضور قیامت کی جوابدہی کے تصور کو نظر انداز کر دیا تھا، یہ حسن، مجاہد، سُدّی اور بہت سے مفسرین کا قول ہے۔ (۲) اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُنہیں نظر انداز کر دیں گے جیسا کہ انہوں نے (ہمارے احکام کو) نظر انداز کر دیا، یعنی ہم ان کے ساتھ اُس شخص کی طرح معاملہ کریں گے جسے بھلا دیا جاتا ہے، جس طرح

اُنہوں نے دنیا میں ہماری آیات سے منہ موڑ لیا تھا، اسی طرح ہم انہیں جہنم میں چھوڑ دیں گے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ انہوں نے جو (دنیا میں) اللہ تعالیٰ کی آیات کو بھلا دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کی سزا کو نسیان سے تعبیر فرمایا، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ''اللہ نے برائی کے بدلے کو اس جیسی برائی قرار دیا، (الشوریٰ:40)''۔ اور اس نسیان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول نہیں فرمائے گا اور ان پر رحم نہیں فرمائے گا، (التفسیر الکبیر، جلد:13، ص:94)''۔

علامہ محمود آلوسی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: نَفْعَلُ بِهِمْ فِعْلَ النَّاسِ بِالْمَنْسِيِّ مِنْ عَدَمِ الْاِعْتِدَادِ بِهِمْ وَتَرْكِهِمْ فِي النَّارِ تَرْكًا كُلِّيًّا، فَالْكَلَامُ خَارِجٌ مَخْرَجَ التَّمْثِيْلِ، وَقَدْ جَاءَ النِّسْيَانُ بِمَعْنَى التَّرْكِ كَثِيْرٌ۔۔۔۔ وَعَنْ مُجَاهِدٍ اَنَّهُ قَالَ نُؤَخِّرُهُمْ فِي النَّارِ، وَعَلَيْهِ فَالظَّاهِرُ اَنَّ ''نَنْسَاهُمْ'' مِنَ النَّسْءِ لَا مِنَ النِّسْيَانِ۔

ترجمہ: ''یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم ان کے ساتھ ایسا معاملہ کریں گے، جس طرح کا معاملہ بھولے ہوئے شخص کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی اُن کی طرف نظرِ کرم نہیں ہوگی اور انہیں مکمل طور پر جہنم میں چھوڑ دیا جائے گا، یہ کلام تمثیل کے طور پر ہے اور نسیان ترک کے معنی میں اکثر آتا ہے اور مجاہد کا قول ہے کہ ہم انہیں زیادہ دیر تک جہنم میں رکھیں گے اور اس معنی کے اعتبار سے ''ننساھم''، ''نسأ'' (مُؤخّر کرنا) کے معنی میں ہے، نسیان کے معنی میں نہیں ہے، (روح المعانی، جلد:05، ص:27-126)''۔

نسیان کے جو لغوی معنی ہیں یا عرف میں مراد ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف ان کی نسبت درست نہیں ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى (طٰہٰ:52)۔

ترجمہ: ''(موسیٰ نے) کہا: اس کا علم میرے رب کے پاس لوحِ محفوظ میں ہے، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے''۔

رسول اللہ ﷺ کو ''ذُھول'' اور ''سہو'' تو ہو سکتا ہے، جس طرح اور بشری عوارض لاحق ہوتے ہیں، جیسے بیمار ہونا، نیند وغیرہ اور یہ عوارض واَحوال مقامِ نبوت کے منافی نہیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی وحی اور دینی احکام کے ابلاغ میں ذُھول، سَہو اور نِسیان لاحق نہیں ہوسکتا، البتہ عام اَحوال میں ایسا ہوسکتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا
ترجمہ: ''سو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا کوئی عزم نہیں پایا، (طٰہٰ: 115)''۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے فرمایا: لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ
ترجمہ: ''میرے بھولنے کی وجہ سے مجھ سے مواخذہ نہ کریں، (الکہف: 73)''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ
ترجمہ: ''اور جب آپ بھول جائیں تو (یاد آتے ہی) اپنے رب کا ذکر کیجئے، (الکہف: 24)''۔
اللہ تعالیٰ کی طرف نسیان کی نسبت سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے عصیاں شعار بندوں کو نظر انداز کر دینا، ان کی طرف اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کا متوجہ نہ ہونا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت میں ''لَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ'' سے یہی معنی مراد ہے: إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝
ترجمہ: ''بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت لیتے ہیں، ان لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ ان سے کلام کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف نظرِ (رحمت) فرمائے گا اور نہ ان کو پاکیزہ کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، (آل عمران: 77)''۔
بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے ذکر وفکر میں مستغرق ہوتے ہیں، تو دنیا کے بعض معاملات سے اُن کی توجہ ہٹ جاتی ہے، اسی طرح جب آپ خَلق کی حاجات میں مشغول ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ آپ کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنا چاہتا ہے، تو اسی کیفیت کا ذکر سورۂ کہف کی آیت میں ہے۔
حدیث پاک میں ہے:

(۱) قَالَ عَبْدُ اللهِ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ، قَالَ إِبْرَاهِيمُ: لَا أَدْرِي زَادَ أَوْ نَقَصَ، فَلَمَّا سَلَّمَ، قِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللهِ، أَحَدَثَ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ؟، قَالَ: وَمَا ذَاكَ؟، قَالُوا: صَلَّيْتَ كَذَا وَكَذَا، فَثَنَى رِجْلَيْهِ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَلَمَّا أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ قَالَ: إِنَّهُ لَوْ حَدَثَ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ لَنَبَّأْتُكُمْ بِهِ، وَلَكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ، أَنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ، فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ ثُمَّ لِيُسَلِّمْ، ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھائی، (ابراہیم کہتے ہیں کہ) اُس میں آپ نے کچھ زیادتی یا کمی کی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ سے کہا گیا، نماز میں کوئی نیا حکم آیا ہے؟، آپ نے پوچھا: کیا ہوا؟، صحابہ نے کہا: آپ نے اِس اِس طرح نماز پڑھائی ہے، آپ نے پیر موڑے اور قبلہ کی طرف منہ کیا دو سجدے کیے، پھر سلام پھیر دیا۔ پھر ہماری طرف منہ کر کے فرمایا: اگر نماز میں کوئی نیا حکم آیا ہوتا تو میں ضرور تم کو خبر دیتا، لیکن میں محض تمہاری طرح بشر ہوں، میں اسی طرح بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو۔ پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلایا کرو اور جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک ہو تو وہ صحیح امر پر غور کرے، نماز پوری کرے، پھر سلام پھیرے، پھر (سہو کے) دو سجدے کرلے، (صحیح بخاری: 401)''۔

(۲) قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنِّي لَأُنْسَى أَوْ أُنَسَّى لِأَسُنَّ

ترجمہ: ''امام مالک نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں بھول جاتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں تاکہ (تمہاری بھول بھی) میری سنت قرار پائے، (مؤطا امام مالک: 228)''۔

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ بعض معاملات میں رسول اللہ ﷺ کو سہو اور نسیان ہوسکتا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت آپ کو سہو یا نسیان لاحق فرما دیتا ہے تاکہ امتی جب اپنے تساہل، تغافل، تکاسل یا بشری کمزوری کے تحت نماز میں بھول جائے، تو اس

کی بھول کی تلافی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت قرار پائے۔

یہ کہنا کہ:''نہ شریعت پر میرا ایمان ہے اور نہ کبھی تھا''

سوال:

میرا نام ساجدہ ملک ہے، میں امریکہ میں رہتی ہوں۔ میرے شوہر نے کہا کہ ''اگر چہ میں ایک مسلمان ہوں، (مگر) نہ شریعت پر میرا ایمان ہے اور نہ کبھی تھا''، میرا آپ سے یہ سوال ہے کہ کیا میرا نکاح باقی ہے یا نہیں؟، (ساجدہ ملک، حورا پارٹمنٹ)۔

جواب:

آپ نے اپنے شوہر کا تحریری حلفیہ بیان (Statement) منسلک کیا ہے جو اُس نے اپنے وکیل کے توسط سے امریکی عدالت میں پیش کیا ہے، اُس میں وہ لکھتے ہیں: Although I am a muslim, I do not, nor have I ever believed in Shariah. ''یعنی اگر چہ میں ایک مسلمان ہوں، (مگر) نہ شریعت پر میرا ایمان ہے اور نہ کبھی تھا''، تو شریعت کا صریح انکار کر کے اُس نے صریح کفر کا ارتکاب کیا ہے اور اس کے نتیجے میں آپ دونوں کا نکاح قائم نہیں رہا۔ لہٰذا اُس پر لازم ہے کہ فوراً توبہ کرے، تجدیدِ ایمان کرے اور اگر آپ رضامند ہوں تو تجدیدِ نکاح کرے، جب تک وہ توبہ اور تجدیدِ ایمان وتجدیدِ نکاح نہیں کرتا، آپ پر لازم ہے کہ اُس سے علیحدگی اختیار رکھیں۔ کیونکہ مذکورہ جملے میں شریعت کا صریح انکار ہے اور شریعت کا منکر اجماعاً کافر، مرتد، زندیق ملحد ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن بن محمد بن سلیمان کلیبولی المعروف داماد آفندی متوفّٰی 1078ھ لکھتے ہیں: وَيُكَفَّرُ بِقَوْلِهٖ: مَاذَا أَعْرِفُ الشَّرْعَ، أَوْقَالَ: مَاذَا أَصْنَعُ بِالشَّرْعِ

ترجمہ:''(کسی شخص نے) یہ کہا:''میں شریعت کو نہیں جانتا''، یا یہ کہا:''میں شریعت کا کیا کروں؟''، (تو اپنے اِس قول کے سبب) وہ کافر ہو جائے گا''۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَيُكَفَّرُ بِقَوْلِهٖ: لَاتَوْحِيْدَ فِيْ عِلْمِ الشَّرِيْعَةِ، أَوْ عِلْمُ الْحَقِيْقَةِ

أَعْلٰى مِنْ عِلْمِ الشَّرِيْعَةِ، أَوْلَاحَقِيْقَةَ عِلْمِ الشَّرِيْعَةِ أَوْعِلْمُ الْحَقِيْقَةِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الشَّرِيْعَةِ۔

ترجمہ: ''(کسی شخص نے) یہ کہا: علمِ شریعت میں توحید نہیں ہے، یا یہ کہا: علمِ حقیقت، علمِ شریعت سے اعلیٰ ہے، یا یہ کہا کہ علمِ شریعت یا علم حقیقت کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یا علمِ حقیقت میرے نزدیک شریعت سے زیادہ پیارا ہے، (تو اپنے اس قول کے سبب) وہ کافر ہوجائے گا، (مجمع الانہر، جلد 2،ص: 511-510)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ متوفّٰی 1161ھ لکھتے ہیں: رَجُلٌ عَرَضَ عَلَيْهِ خَصْمُهٗ فَتْوَى الْأَئِمَّةِ فَرَدَّهَا وَقَالَ: چہ بار نامہ فتوی آوردہ، قِيْلَ يَكْفُرُ لِأَنَّهٗ رَدَّ حُكْمَ الشَّرْعِ، وَكَذَا لَوْلَمْ يَقُلْ شَيْئًا وَلٰكِنْ أَلْقَى الْفَتْوٰى عَلَى الْأَرْضِ وَقَالَ: این چہ شرع است کفر۔

ترجمہ: ''ایک شخص پر اس کے فریقِ مخالف نے ائمۂ فقہ کا فتویٰ پیش کیا، اس نے اسے رَد کر دیا اور کہا: کتنی بار فتویٰ کا نام لوگے؟، ایک قول کے مطابق وہ کافر ہوجائے گا، کیونکہ اُس نے شریعت کے حکم کو رَد کیا ہے، اسی طرح اگر اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن (حقارت سے) فتویٰ زمین پر پھینک دیا اور کہا کہ یہ کیسی شریعت ہے؟، اس طرح اس نے کفر کیا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2،ص: 272، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''زید اور خالد دونوں بھائی حقیقی ہیں، مُسمّی زید بقضائے الٰہی فوت ہوگیا اور اس کا برادر خالد موجود ہے اور زید مرحوم کی دو بیویاں اور دو بیٹیاں موجود ہیں۔ زید کے داماد نے خالد کو کہا: بموجب شریعت مبارکہ حصہ تقسیم ہونا چاہئے کیونکہ ہم تم اہلِ اسلام پابند شریعت کے ہیں، شرع محمدی پر فیصلہ ہونا چاہئے، خالد نے، جو متروکۂ زید پر قابض وجابر ہے، صاف کہہ دیا کہ ''ہم کو شریعت نامنظور ہے بلکہ رواج منظور''، اب فرمائیے کہ عندالشریعت خالد کا کیا حکم ہے، نکاح رہا یا فسخ ہوگیا؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: اگر یہ بیان واقعی ہے تو خالد پر حکمِ کفر ہے اور اس کا نکاح فسخ ہوگیا، اس پر توبہ فرض ہے، نئے سرے سے اسلام لائے، اس کے بعد اگر عورت راضی

ہو اس سے دوبارہ نکاح کرے، عالمگیری میں ہے:

اِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِغَیْرِہٖ حُکْمُ الشَّرْعِ فِیْ ھٰذِہِ الْحَادِثَۃِ کَذَا، فَقَالَ ذَالِکَ الْغَیْرُ: ''من برسم کار می کنم نہ بشرع'' یَکْفُرُ عِنْدَ بَعْضِ الْمَشَائِخِ

ترجمہ: ''جب کسی شخص نے دوسرے سے کہا: اس معاملہ میں شریعت کا حکم یہ ہے، تو دوسرا جواباً کہتا ہے: میں تو رسم کے مطابق کروں گا نہ کہ شرع کے مطابق، تو بعض مشائخ کے نزدیک کافر ہوجائے گا''۔ اَقُوْلُ وَصُوْرَۃُ النَّازِلَۃِ اَشَدُّ مِنْ ھٰذَا بِکَثِیْرٍ، فَاِنَّ ھٰذَا اِخْبَارٌ عَنْ عَمَلِہٖ وَالرَّجُلُ رُبَّمَا یَعْمَلُ بِالْمَعْصِیَۃِ وَھُوَلَا یَرْضَاھَا فَیَکُوْنُ عَاصِیًا لَا کَافِرًا لِعَدَمِ الْاِسْتِحْسَانِ وَالْاِسْتِحْلَالِ بِخِلَافِ مَاثَمَّۃَ فَاِنَّہٗ صَرِیْحٌ فِیْ عَدَمِ قُبُوْلِ الشَّرْعِ وَتَرْجِیْحِ الرَّسْمِ عَلَیْہِ فَکَانَ کَالْمَسْأَلَۃِ قَبْلَھَا، رَجُلٌ قَالَ لِخَصْمِہٖ اِذْھَبْ مَعِیْ اِلَی الشَّرْعِ، قَالَ: بیادہ بیار تا بروم بے خبر نروم، یَکْفُرُ لِاَنَّہٗ عَانَدَ الشَّرْعَ۔

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں: درپیش صورتِ حال اس سے بہت زیادہ شدید ہے کیونکہ اس میں عمل کی اطلاع ہے اور بسا اوقات آدمی ناپسندیدگی کے ساتھ معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ گناہگار قرار پاتا ہے نہ کہ کافر، کیونکہ اس نے گناہ کو پسندیدہ یا حلال نہیں سمجھا۔ بخلاف سوالیہ صورت کے یہاں واضح طور پر قبولِ شرع کا انکار ہے اور رسم کو اس پر ترجیح دے رہا ہے، یہ اس سے قبل والے مسئلے جیسا ہے کسی نے مخالف سے کہا: میرے ساتھ شریعت کی طرف چل، تو وہ کہنے لگا: پیغامِ شریعت لا دے تاکہ میں چلوں، بغیر جبر کے میں نہیں جاؤں گا، تو وہ کافر ہوجائے گا کیونکہ اس نے شریعت سے عناد کو روا رکھا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 14، ص: 692-691، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ارتداد طلاق نہیں بلکہ فسخِ نکاح ہے لہٰذا (عقدِ ثانی کی صورت میں) شوہر کے پاس تین طلاقوں کا حق رہے گا۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اِرْتَدَّ اَحَدُ الزَّوْجَیْنِ عَنِ الْاِسْلَامِ وَقَعَتِ الْفُرْقَۃُ بِغَیْرِ طَلَاقٍ فِی الْحَالِ قَبْلَ الدُّخُوْلِ وَبَعْدَہٗ ثُمَّ اِنْ کَانَ الزَّوْجُ ھُوَ الْمُرْتَدُّ فَلَھَا کُلُّ الْمَھْرِ

دَخَلَ بِهَا وَنِصْفُهُ إِنْ لَمْ يَدْخُلْ بِهَا۔

ترجمہ: ''زوجین (شوہر و بیوی) دونوں میں سے کوئی ایک مرتد ہوگیا، طلاق کے بغیر فوری علیحدگی ہوجائے گی، دخول سے قبل ہو یا بعد، پھر اگر شوہر مرتد ہوا، عورت مدخولہ ہے تو شوہر پر پورے مہر کی ادائیگی لازم ہے اور اگر غیر مدخولہ ہے تو نصف مہر کی ادائیگی لازم ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد:1، ص:339)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَارْتِدَادُ أَحَدِهِمَا) أَيِ الزَّوْجَيْنِ (فَسْخٌ) فَلَا يَنْقُصُ عَدَدًا (عَاجِلٌ) بِلَا قَضَاءٍ۔

ترجمہ: ''اور شوہر بیوی میں سے کوئی ایک مرتد ہوگیا، تو نکاح فوری ختم ہوجائے گا حکمِ قاضی کی ضرورت نہیں''۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فَلَوِ ارْتَدَّ مِرَارًا وَجَدَّدَ الْإِسْلَامَ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَجَدَّدَ النِّكَاحَ عَلَى قَوْلِ أَبِي حَنِيفَةَ تَحِلُّ امْرَأَتُهُ مِنْ غَيْرِ إِصَابَةِ زَوْجٍ ثَانٍ۔ ''بَحْرٌ'' عَنِ ''الْخَانِيَةِ''۔ قَوْلُهُ: (بِلَا قَضَاءٍ) أَيْ بِلَا تَوَقُّفٍ عَلَى قَضَاءِ الْقَاضِي، وَكَذَا بِلَا تَوَقُّفٍ عَلَى مُضِيِّ عِدَّةٍ فِي الْمَدْخُولِ بِهَا كَمَا فِي ''الْبَحْرِ''۔

ترجمہ: ''(خدانخواستہ) اگر کوئی ایک سے زائد بار مرتد ہوا اور ہر بار اپنے اسلام کی تجدید کر کے ازسرِ نو (اسی عورت سے) نکاح کیا، تو امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق اس عورت سے براہِ راست نکاح اس کے لئے جائز ہوگا، ''البحر الرائق'' میں فتاویٰ ''خانیہ'' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ مرتد ہونے سے نکاح ازخود فوراً فسخ ہوجاتا ہے، یہ قاضی کے فیصلے پر موقوف نہیں ہے، اسی طرح اگر اُس عورت سے پہلے شوہر کی قربت بھی ہوئی، تو بھی تجدیدِ نکاح کیلئے عدت گزارنا شرط نہیں ہے، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:272، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

طہارت کے مسائل

پانی کے پاک یا ناپاک ہونے کی شرائط

سوال:

ہم جس فلیٹ میں رہتے ہیں وہاں تقریباً تمام فلیٹوں میں جو پانی آرہا ہے، وہ بدبودار ہے، پانی کا رنگ صحیح ہے، لیکن ذائقہ تبدیل ہے۔ کیا اُس پانی کو استعمال کرسکتے ہیں اور وضو اور غسل اُس پانی سے ہوجائے گا یا نہیں؟۔

(قاری ہدایت اللہ، اسلام پورہ مسجد، رنچھوڑ لائن، کراچی)

جواب:

پانی کے تینوں اوصاف یا کوئی ایک وصف (یعنی رنگ، ذائقہ اور بُو) کسی نجاست کے سبب تبدیل ہوجائے یا وہ ماءِ مستعمل (یعنی ایسا پانی جسے طہارت کے لئے استعمال کیا گیا ہے) ہو، تو قابلِ استعمال (یعنی وضو اور غسل کے قابل) نہیں رہتا اور اس سے وضو غسل کرنا جائز نہیں۔

حدیث پاک میں ہے: عَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنَّ الْمَاءَ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ اِلَّا مَا غَلَبَ عَلٰى رِيْحِهٖ وَطَعْمِهٖ وَلَوْنِهٖ۔

ترجمہ: ”حضرت ابوامامہ باہلی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پانی پاک ہے، اُس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرسکتی، مگر وہ (ناپاک چیز) جو اُس کے رنگ، مزے یا بُو پر غالب آگئی (یعنی تینوں اوصاف میں سے کسی بھی وصف کو تبدیل کردیا)“۔

(سُنن ابن ماجہ: 521)

لیکن یہ یاد رہے کہ ناپاکی کا حکم اس وقت لگے گا جب یہ یقین یا ظنِ غالب ہو کہ پانی کے اوصاف کسی نجاست کے ملنے کی وجہ سے تبدیل ہوئے ہیں، کیونکہ اوصاف کا تبدیل ہونا کسی پاک چیز کے ملنے یا کیچڑ یا طویل عرصے تک پڑے رہنے کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے، لہٰذا جب تک نجاست کے ملنے کا یقین نہ ہو، پانی کو پاک قرار دیا جائے گا، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: فَلَوْ عَلِمَ تَنَتُّنَهٗ بِنَجَاسَةٍ لَمْ يَجُزْ، وَلَوْ شَكَّ فَالْاَصْلُ الطَّهَارَةُ۔

ترجمہ: ''اگر پانی میں بُو کسی نجاست کی وجہ سے ہونے کا یقین ہے تو اس سے طہارت جائز نہیں اور اگر شک ہو تو پانی میں اصل طہارت ہے (یعنی اس کے پاک ہونے کا حکم دیا جائے گا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 1، ص:297)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''خانیہ'' میں ہے: بڑے حوض میں اگر بدبو ہو تو بھی اس سے وضو جائز ہے بشرطیکہ اُس میں نجاست معلوم نہ ہو، کیونکہ پانی کے ٹھہرے رہنے کی وجہ سے بھی کبھی بُو پیدا ہو جاتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں: چھوٹے حوض کا بھی یہی حکم ہے، بڑے کی قید محض اس لئے لگائی گئی ہے کہ بڑے حوض کا پانی جب نجاست کی وجہ سے متغیر ہو جائے اور اس کا کوئی وصف بدل جائے، تو نجس ہے۔ اگر بڑے حوض میں بدبُو پائی جائے تو وہمی شخص اس سے پرہیز کرسکتا ہے کہ شاید اس کی بدبو نجاست کے باعث ہے، لیکن اس عبارت سے یہ بتادیا کہ یہ وہم معتبر نہیں ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 2، ص:476، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: فِیْ جَامِعِ الْجَوَامِعِ اِذَا تَنَجَّسَ الْمَاءُ الْقَلِیْلُ بِوُقُوْعِ النَّجَاسَةِ فِیْهِ، اِنْ تَغَیَّرَتْ أَوْصَافُهٗ لَایُنْتَفَعُ بِهٖ مِنْ کُلِّ وَجْهٍ کَالْبَوْلِ وَاِلَّا جَازَ سَقْیُ الدَّوَابِّ وَبَلُّ الطِّیْنِ وَلَایُطَیَّنُ بِهِ الْمَسْجِدُ کَذَا فِی ''التَّتَارِخَانِیَةِ''۔

ترجمہ: '''' جامع الجوامع '' میں ہے: جب تھوڑے پانی میں نجاست گر جائے، جیسے پیشاب، اور وہ اُس پانی کے اوصاف (رنگ مزہ، بُو) کو بدل دے، تو اس کو کسی بھی طرح اپنے استعمال میں لانا ناجائز ہے، البتہ جانوروں کو پلانا جائز ہے اور گارے وغیرہ کے کام میں لاسکتے ہیں، مگر اس گارے کو مسجد کی دیوار میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ ''تاتارخانیہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:25)''۔

کسی پاک چیز کے گرنے یا کافی عرصے تک محض پانی کے ٹھہرے رہنے کی وجہ سے اس کے اُوصاف تبدیل ہو جائیں، تو وہ پانی ناپاک یا ناقابلِ استعمال نہیں ہوتا، امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز لکھتے ہیں: ''رنگ یا بُو یا مزہ اگر کسی پاک چیز کے گرنے یا زیادہ دیر ٹھہرنے

سے بدلے تو پانی خراب نہیں ہوتا، ہاں نجاست کی وجہ سے تغیر آجائے تو نجس ہوگا اگرچہ کتنا ہی کثیر کیوں نہ ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 3ص:250، مطبوعہ: رضافاؤنڈیشن، لاہور)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''اگر پانی میں ایسی کوئی چیز گر جائے، جس سے پانی کا ذائقہ یا اُس کا رنگ یا اُس کی بُو متغیر ہوجائے، اگر وہ ایسی چیز ہے جس سے پانی کو محفوظ رکھنا بہت مشکل ہے، جیسے کیچڑ، مٹی اور درختوں کے پتے تو اس پانی سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے، جیسے اگر کسی جگہ پانی کافی عرصہ تک ٹھہرا رہے تو اس کے اوصاف متغیر ہوجاتے ہیں۔ اس طرح اگر پانی میں کوئی ایسی چیز گر جائے جو پانی میں سرایت اور حلول نہ کرے، مثلاً تیل وغیرہ، تو خواہ اس کی بُو یا مزہ تبدیل ہوجائے، پھر بھی اس سے وضو کرنا جائز ہے۔ اور اگر پانی میں کوئی پاک چیز گر جائے اور اس سے پانی کے اوصاف (رنگ، بُو اور مزہ) تبدیل نہ ہوں تو پانی کا طہور ہونا باقی رہے گا، خواہ پانی قلیل ہو یا کثیر اور اگر پانی کی مقدار ''دَہ دَردَہ'' سے کم ہو اور اس میں کوئی نجس چیز گر جائے تو وہ پانی نجس ہوجائے گا اور اگر پانی کی مقدار ''دَہ دَردَہ'' سے زیادہ ہو یا وہ پانی جاری ہو تو اس پانی میں نجاست کے گرنے سے پانی نجس نہیں ہوگا اور طہور ہی رہے گا، جب تک کہ پانی کا رنگ یا بُو یا مزہ تبدیل نہ ہو جائے''۔ (تفسیر تبیان القرآن، جلد 8، ص:249)

صورتِ مسئولہ میں پانی میں بُو ہونے میں دو احتمال ہیں (۱) کسی نجاست کے ملنے کی وجہ سے، جیسے بعض اوقات سیوریج لائن کا واٹر سپلائی لائن میں رساؤ آجاتا ہے، جس کی وجہ سے سیوریج کا ناپاک پانی واٹر سپلائی لائن میں مل جاتا ہے۔ اگر کسی نجاست کے اثر سے متغیر ہوا ہے تو اُس سے وضو وغسل کرنا جائز نہیں ہے۔ (۲) کیچڑ یا زیادہ عرصے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے۔ ہمارے شہر کراچی میں واٹر سپلائی جن نہروں یا تالاب یا جھیل یا ڈیم کے ذریعے ہوتی ہے، اُن کی تہہ میں بہت زیادہ کیچڑ ہوتی ہے، جب پانی کی کمی ہوتی ہے تو تہہ کی کیچڑ سپلائی لائن میں آجاتی ہے اور پانی میں بُو کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا جب تک یہ یقین یا ظنِ غالب نہ ہوجائے کہ اس میں سیوریج کا پانی مل گیا ہے یا کسی نجاست کے گرنے کے سبب

پانی کا وصف متغیر ہوا ہے، پانی کے ناقابلِ استعمال ہونے کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔آج کل لیبارٹری میں پانی کی ٹیسٹنگ کرائی جاسکتی ہے اور پاکستان کونسل آف سائینٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (PCSIR) کے ذریعے بھی پانی کا کیمیکل تجزیہ کرایا جاسکتا ہے۔

وضو کے دوران سلام کا جواب دینا

سوال:

وضو کے دوران سلام کا جواب دینا چاہئے یا نہیں؟۔

(محمد رمیز، سیکٹر D-11 نارتھ کراچی)

جواب:

وضو کے دوران سلام کا جواب دیا جاسکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ اعضائے وضو دھوتے وقت مسنون دعائیں پڑھنا مستحب ہے۔لیکن اگر کسی نے سلام کیا تو جواب دے سکتا ہے۔ہاں! بلاضرورت دنیا کی باتیں کرنا مکروہ ہے۔امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:''وضو، وظیفہ، تلاوتِ قرآن مجید میں کوئی شخص سلام علیک کرے، اس کا جواب دے یا نہیں؟''، آپ جواب میں لکھتے ہیں:''وضو میں جواب دے اور وظیفہ وتلاوت میں جواب نہ دینے کا اختیار رکھتا ہے کہ اس حال میں اس پر سلام مکروہ ہے''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 22،ص:569)

نماز کے مسائل

مختلف طُرُقِ قراءت پر مشتمل قرآن مجید کے نسخوں کی طباعت

سوال:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ایسے لوگوں کے بارے میں جو سبعہ اور عشرہ کے قراء اور اُن کے 20 اختلافی قراءات پر مبنی علیحدہ علیحدہ مستقل مَصاحف (قرآنی نسخے) چھاپنے کا پروگرام رکھتے ہیں۔ قرآن کریم کے اختلافی مَصاحف چھپوانا دشمنانِ اسلام کی ہمیشہ خطرناک سازش رہی ہے۔ اب یہ کام بعض نادان مسلمان کررہے ہیں، جس سے تمام مسلمانوں میں یقیناً تشویش پھیلے گی، کیا اِس طرح اختلافی قراءات کے یہ مصاحف چھاپنا درست ہوگا؟، (امین ہارون، کراچی)۔

جواب:

قرآن کریم کی ساتوں قراءتیں جائز حق اور مُنزَّل من اللہ ہیں۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے صحیح بخاری میں ''أُنزِلَ القُرآنُ عَلٰی سَبعَۃِ أَحرُفٍ'' کے عنوان سے مستقل ایک باب باندھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أَقرَأَنِي جِبرِيلُ عَلٰی حَرفٍ، فَرَاجَعتُهُ، فَلَم أَزَل أَستَزِيدُهُ وَيَزِيدُنِي، حَتّٰی انتَهٰی إِلٰی سَبعَةِ أَحرُفٍ۔

ترجمہ: ''جبریل نے مجھے ایک حرف (لہجہ) پر قرآن پڑھایا، میں نے ان سے رجوع کیا اور مسلسل زیادتی طلب کرتا رہا اور وہ حرف زیادہ کرتے رہے حتّٰی کہ سات حرفوں (لہجات Accents) پر انتہا ہوگئی''۔ (صحیح بخاری: 4991)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِنَّ هٰذَا القُرآنَ أُنزِلَ عَلٰی سَبعَةِ أَحرُفٍ، فَاقرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنهُ۔

ترجمہ: ''یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے، جو حرف تم کو آسان لگے، اُس پر قرآن پڑھو، (صحیح بخاری: 4992)''۔

عَن أُبَيِّ بنِ كَعبٍ قَالَ: كُنتُ فِي المَسجِدِ، فَدَخَلَ رَجُلٌ يُصَلِّي فَقَرَأَ قِرَاءَةً أَنكَرتُهَا

عَلَيْهِ، ثُمَّ دَخَلَ اٰخَرُ، فَقَرَأَ قِرَاءَةً سِوٰى قِرَاءَةِ صَاحِبِهٖ، فَلَمَّا قَضَيْنَا الصَّلَاةَ دَخَلْنَا جَمِيْعًا عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقُلْتُ: اِنَّ هٰذَا قَرَأَ قِرَاءَةً أَنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ، وَدَخَلَ اٰخَرُ، فَقَرَأَ قِرَاءَةً سِوٰى قِرَاءَةِ صَاحِبِهٖ، فَأَمَرَهُمَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَقَرَا، فَحَسَّنَ النَّبِيُّ ﷺ شَأْنَهُمَا، فَسُقِطَ فِيْ نَفْسِيْ مِنَ التَّكْذِيْبِ، وَلَا اِذْ كُنْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، فَلَمَّا رَاٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا قَدْ غَشِيَنِيْ، ضَرَبَ فِيْ صَدْرِيْ فَفِضْتُ عَرَقًا، وَكَأَنَّمَا أَنْظُرُ اِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ فَرَقًا، فَقَالَ لِيْ: يَا أُبَيُّ: أُرْسِلَ اِلَيَّ أَنِ اقْرَاِ الْقُرْاٰنَ عَلٰى حَرْفٍ، فَرَدَدْتُّ اِلَيْهِ أَنْ هَوِّنْ عَلٰى أُمَّتِيْ، فَرَدَّ اِلَيَّ الثَّانِيَةَ، اِقْرَأْهُ عَلٰى حَرْفَيْنِ، فَرَدَدْتُّ اِلَيْهِ أَنْ هَوِّنْ عَلٰى أُمَّتِيْ، فَرَدَّ اِلَيَّ الثَّالِثَةَ: اِقْرَأْهُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، فَلَكَ بِكُلِّ رَدَّةٍ رَدَدْتُّكَهَا مَسْأَلَةٌ تَسْأَلُنِيْهَا، فَقُلْتُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأُمَّتِيْ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأُمَّتِيْ، وَأَخَّرْتُ الثَّالِثَةَ لِيَوْمٍ يَرْغَبُ اِلَيَّ الْخَلْقُ كُلُّهُمْ، حَتّٰى اِبْرَاهِيْمُ۔

ترجمہ: ''حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا، ایک شخص آکر نماز پڑھنے لگا اور نماز میں قرآن مجید کی ایسی قراءت کی جو میرے لئے غیر مانوس تھی، پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے ایک اور طرح سے قرآن شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ جب ہم لوگ نماز سے فارغ ہوگئے، تو ہم سب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، میں نے عرض کی: اس شخص نے اس طرح قرآن مجید پڑھا، جو میرے لئے غیر مانوس تھا اور دوسرا شخص آیا تو اس نے اس کے علاوہ ایک اور قراءت کی، (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے اُن دونوں کو پڑھنے کا حکم فرمایا۔ اُنہوں نے پڑھ کر سنایا اور رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کی قراءت کی تحسین فرمائی، جس سے میرے دل میں انکار پیدا ہوا، حالانکہ اُس وقت میں زمانۂ جاہلیت میں نہیں تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے میری اس کیفیت کو محسوس فرمایا، تو میرے سینے پر ہاتھ مارا، جس سے میں پسینہ پسینہ ہوگیا اور مجھ پر خوفِ الٰہی کے سبب ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ گویا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں، پھر آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے اُبی! پہلے مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں قرآن مجید ایک لہجے (Dialect)

پر پڑھوں۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: (اے اللہ!) میری اُمّت پر آسانی فرما۔ پھر مجھ پر وحی کو دہرایا (اور) اور مجھے دو لہجوں پر پڑھنے کا حکم دیا گیا، میں نے پھر عرض کی: (اے اللہ!) میری اُمّت پر آسانی فرما، پھر مجھ پر تیسری بار وحی کا نزول ہوا (اور مجھے) سات لہجوں پر پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا: تم نے جتنی بار اُمّت پر آسانی کے لئے دعا کی ہے، ہر بار کے عوض تم ہم سے ایک دعا مانگ لو! میں نے عرض کی: اے اللہ! میری اُمّت کی مغفرت فرما، اے اللہ! میری اُمّت کی مغفرت فرما، اور تیسری بار کی دعا میں نے اُس دن کے لئے محفوظ کر لی، جس دن ساری مخلوق حتّٰی کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی (طلبِ شفاعت کے لئے) میری طرف متوجہ ہوں گے، (صحیح مسلم:1902)''۔

علامہ بدرالدین ابومحمد محمود بن احمد عینی لکھتے ہیں: وَفِيْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ: فَرَدَدْتُ إِلَيْهِ أَنْ هَوِّنْ عَلٰى أُمَّتِيْ، وَفِيْ رِوَايَةٍ: إِنَّ أُمَّتِيْ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ، قَوْلُهٗ: إِلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ أَيْ: سَبْعِ قِرَاءَاتٍ أَوْ سَبْعِ لُغَاتٍ۔

ترجمہ: ''صحیح مسلم کی ایک روایت ہے: میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ میری امت پر آسانی فرما، اور دوسری روایت میں ہے: میری اُمّت اِس کی طاقت نہیں رکھے گی۔ سات حروف سے مراد سات قراءتیں یا سات لغات ہیں''۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد 20، ص:29)

امام یحییٰ بن شرف النووی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَذَكَرَ الطَّحَاوِيُّ: أَنَّ الْقِرَاءَةَ بِالْأَحْرُفِ السَّبْعَةِ كَانَتْ فِيْ أَوَّلِ الْأَمْرِ خَاصَّةً لِلضَّرُوْرَةِ، لِاخْتِلَافِ لُغَةِ الْعَرَبِ وَمَشَقَّةِ أَخْذِ جَمِيْعِ الطَّوَائِفِ بِلُغَةٍ، فَلَمَّا كَثُرَ النَّاسُ وَالْكِتَابُ وَارْتَفَعَتِ الضَّرُوْرَةُ كَانَتْ قِرَاءَةً وَاحِدَةً۔

ترجمہ: ''امام طحاوی علیہ الرحمہ نے فرمایا: (قرآن مجید کو) سات لغات پر پڑھنے کی اجازت ابتدا میں خاص طور پر ضرورت کی بنا پر تھی، کیونکہ لغاتِ عرب میں اختلاف تھا اور تمام قبائل کو کسی ایک لغت پر جمع کرنا دشوار تھا، پس جب (اسلام میں) لوگوں کی کثرت ہوگئی کتاب (یعنی قرآن مجید) کی بکثرت اشاعت ہوگئی تو یہ ضرورت باقی نہیں رہی اور

قرآن مجید کو ایک لغت میں منحصر کردیا، (صحیح مسلم بشرح النووی، جلد 3،ص:139)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: يَجُوْزُ بِالرِّوَايَاتِ السَّبْعِ، لٰكِنِ الْاَوْلٰى اَنْ لَّا يُقْرَأَ بِالْغَرِيْبَةِ عِنْدَ الْعَوَامِّ صِيَانَةً لِّدِيْنِهِمْ

ترجمہ: ''ساتوں قراءتیں جائز ہیں، لیکن اَولیٰ یہ ہے کہ عوام جس (قراءت) سے ناآشنا ہوں، وہ نہ پڑھی جائے کہ اس میں اُن کے دین کا تحفظ ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: لِاَنَّ بَعْضَ السُّفَهَاءِ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَعْلَمُوْنَ فَيَقَعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالشَّقَاءِ، وَلَا يَنْبَغِيْ لِلْاَئِمَّةِ اَنْ يُّحْمِلُوا الْعَوَامَّ عَلٰى مَا فِيْهِ نُقْصَانُ دِيْنِهِمْ، وَلَا يُقْرَأُ عِنْدَهُمْ مِثْلُ قِرَاءَةِ اَبِيْ جَعْفَرٍ وَابْنِ عَامِرٍ وَّعَلِيِّ بْنِ حَمْزَةَ وَالْكِسَائِيِّ صِيَانَةً لِّدِيْنِهِمْ، فَلَعَلَّهُمْ يَسْتَخِفُّوْنَ اَوْ يَضْحَكُوْنَ، وَاِنْ كَانَ كُلُّ الْقِرَاءَاتِ وَالرِّوَايَاتِ صَحِيْحَةً فَصِيْحَةً، وَمَشَايِخُنَا اخْتَارُوْا قِرَاءَةَ اَبِيْ عَمْرٍو وَّحَفْصٍ عَنْ عَاصِمٍ۔

ترجمہ: ''بعض بیوقوف وہ کچھ کہیں گے جو وہ جانتے نہیں ہیں، تو گناہ اور بدبختی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور ائمہ کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ عوام کو ایسے عمل پر اُبھاریں، جس میں اُن کے دین کا نقصان ہو اور عوام کے دین کو بچانے کے لئے اُن کے سامنے ابوجعفر، ابن عامر علی بن حمزہ اور کسائی کی (روایات پر) قراءت نہ کی جائے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اُس کی توہین کریں اور اُس پر ہنسیں، اگرچہ تمام قراءتیں اور روایات صحیح اور فصیح ہیں۔ ہمارے مشائخ نے ابوعَمر و حفص کی قراءت کو اختیار کیا ہے جو امام عاصم سے مروی ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2،ص:232)

علامہ علاؤالدین حصکفی مزید لکھتے ہیں: قِرَاءَةُ الْقُرْاٰنِ بِقِرَاءَةٍ مَعْرُوْفَةٍ وَّشَاذَّةٍ دَفْعَةً وَّاحِدَةً مَكْرُوْهٌ كَمَا فِي ''الْحَاوِي الْقُدْسِيِّ''۔

ترجمہ: ''قرآن مجید کو معروف اور شاذ دونوں قراءتوں کے ساتھ ایک ساتھ پڑھنا مکروہ ہے، جیسا کہ ''الحاوی القدسی'' میں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9،ص:518)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اپنے رسالہ ''جَمْعُ الْقُرْاٰنِ وَبِمَ عَزْوُهٗ لِعُثْمَانَ'' میں

لکھتے ہیں: ''زمانۂ اقدس حضور پُرنور صلوات اللہ وسلامہ علیہ میں کہ قرآن عظیم نیا نیا اُترا تھا اور ہر قوم وقبیلہ کو اپنے مادری لہجہ قدیمی عادات کا دفعۃً بدل دینا دشوار تھا، آسانی فرمائی گئی تھی کہ ہر قوم عرب اپنے طرز ولہجہ میں قراءتِ قرآن عظیم کرے، زمانۂ نبوّت کے بعد شدہ شدہ اقوامِ مختلفہ سے بعض بعض لوگوں کے ذہن میں جم گیا کہ جس لہجہ ولغت میں ہم پڑھتے ہیں، اسی میں قرآن کریم نازل ہوا ہے، یہاں تک کہ زمانۂ امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ میں بعض لوگوں کو اس بات پر باہم جنگ وجدل وزَدوکوب کی نوبت پہنچی، یہ کہتا تھا قرآن اس لہجہ میں ہے، وہ کہتا تھا نہیں بلکہ دوسرے میں ہے، ہر ایک اپنے لغت پر دعویٰ کرتا تھا۔ جب یہ خبر امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو پہنچی، فرمایا: ابھی سے تم میں یہ اختلاف پیدا ہوا تو آئندہ کیا امید ہے۔ لہٰذا حسبِ مشورہ امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم ودیگر اَعیانِ صحابہ رضی اللہ عنہم یہ قرار پایا کہ اب ہر قوم کو اُس کے لب ولہجہ کی اجازت میں مصلحت نہ رہی بلکہ فتنہ اُٹھتا ہے، لہٰذا تمام اُمت کو خاص لغتِ قریش پر جس میں قرآن عظیم نازل ہوا ہے، جمع کر دینا اور باقی لغات سے باز رکھنا چاہئے۔ صحیفہائے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ حضرت اُمّ المومنین حفصہ بنت الفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس محفوظ ہیں، منگا کر اُن کی نقلیں لے کر تمام سورتیں ایک مُصحف میں جمع کریں اور وہ مصاحف بلادِ اسلام میں بھیج دیں کہ سب اُسی لہجہ کا اتباع کریں، اِس کے خلاف اپنے اپنے طرزِ ادا کے مطابق جو صحائف یا مصاحف بعض لوگوں نے لکھے ہیں، دفعِ فتنہ کے لئے تلف کر دیئے جائیں، اسی رائے صائب کی بنا پر امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا سے کہلا بھیجا کہ صحیفہائے صدیقی بھیج دیجئے، ہم نقلیں لے کر شہروں کو بھیجیں اور اصل آپ کو واپس کر دیں گے۔ اُمّ المومنین نے بھیج دیئے، امیر المومنین نے زید بن ثابت وعبداللہ بن زبیر وسعید بن عاص وعبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو نقلیں کرنے کا حکم دیا، وہ نقلیں مکہ معظمہ وشام ویمن وبحرین وبصرہ وکوفہ کو بھیجی گئیں اور ایک مدینہ طیبہ میں رہی اور اصل صحیفے جمع فرمودۂ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس سے یہ نقلیں ہوئی تھیں،

حضرت اُمّ المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس دیئے۔ اُن کی نسبت معاذ اللہ! دفن کرنے یا کسی طرح تلف کرا دینے کا بیان محض جھوٹ ہے، وہ مبارک صحیفے خلافتِ عثمانی، پھر خلافتِ مرتضوی، پھر خلافت امامِ حسن، پھر خلافتِ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تک بعینہا محفوظ تھے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص: 441)"۔

امام بخاری نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے جمع قرآن کی بابت ایک طویل حدیث نقل فرمائی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن عاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا: اِذَا اَخْتَلَفْتُمْ اَنْتُمْ وَزَیْدُبْنُ ثَابِتٍ فِیْ شَیْءٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ فَاکْتُبُوْہُ بِلِسَانِ قُرَیْشٍ، فَاِنَّمَا نَزَلَ بِلِسَانِہِمْ فَفَعَلُوْا۔

ترجمہ: "جب تمہارا اور زید بن ثابت کا قرآن مجید کے کسی کلمے میں اختلاف ہو جائے، تو اس کو لغتِ قریش کے مطابق لکھو کیونکہ قرآن مجید صرف لغتِ قریش پر نازل ہوا"۔
(صحیح بخاری: 4987)

مقاصد شریعت میں ایک "سَدِّ ذرائع" بھی ہے، یعنی ممکنہ شر کا سَدِّ باب کرنا، مَفاسد اور خرابیوں کا راستہ روکنا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی اسی دینی حکمت کے تحت اپنے بعض پسندیدہ امور کو ترک فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خواہش تھی کہ بنائے قریش پر بنی ہوئی "کعبۃ اللہ" کی عمارت کو شہید کر دیں اور پھر اس میں "حطیم" کو شامل کر کے بنائے ابراہیم پر تعمیر کریں، اسلام کو حجاز میں غلبہ حاصل ہو چکا تھا اور آپ کے پاس مالی وسائل بھی تھے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: لَوْلَا حَدَاثَۃُ عَھْدِ قَوْمِکِ بِالْکُفْرِ لَنَقَضْتُ الْبَیْتَ وَلَجَعَلْتُھَا عَلٰی اَسَاسِ اِبْرَاھِیْمَ فَاِنَّ قُرَیْشًا حِیْنَ بَنَتِ الْبَیْتَ اِسْتَقْصَرَتْ وَلَجَعَلْتُ لَھَا خَلْفًا۔

ترجمہ: "اگر تمہاری قوم نے نئے کفر کو چھوڑ کر تازہ تازہ اسلام قبول نہ کیا ہوتا، تو میں بیت اللہ کی عمارت کو منہدم کر دیتا اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر قائم

کرتا، کیونکہ جب قریش نے اس کو بنایا تھا تو (وسائل کی کمی کے سبب ایک جانب سے) اس کو چھوٹا کردیا تھا اور میں اس کی پچھلی جانب بھی ایک دروازہ بناتا''۔

(صحیح مسلم:3227)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب قرونِ اولیٰ میں قرآن مجید کی مختلف لغات میں اشاعت کو ترک کردیا گیا اور فقہائے کرام نے عوام الناس کے سامنے اُن کی ناواقفی اور کم علمی کے سبب مختلف قراءت پر قرآن مجید تلاوت کرنے سے منع فرمایا، تو ٹھیک اُسی طرح اُس کی اشاعت بھی لوگوں میں اختلاف کا سبب بنے گی، لہٰذا قرآن مجید کے ایسے نسخے عام مسلمانوں کیلئے طبع نہ کئے جائیں۔ البتہ وہ علماء، طلبہ اور قراءِ کرام جو قراءاتِ سبعہ وعشرہ کی تعلیم وتعلّم میں شغف رکھتے ہیں، اُن کے لئے طبع کرائے جاسکتے ہیں۔ اور وہ الگ الگ قراءات پر مشتمل نسخوں کی طباعت کے بغیر بھی یہ کارِ خیر انجام دے سکتے ہیں۔ آج کل تو عالم یہ ہے کہ سعودی حکومت بھی حرمین طیبین کی مساجد میں عرب ممالک کے مسلمانوں کے لئے الگ اور دیگر بلاد کے مسلمانوں کے لئے اُن کی مانوس رسم الخط پر مشتمل قرآن کی طباعت کا اہتمام کرتی ہے۔

دورانِ نماز موبائل فون بجنے کا شرعی حکم

سوال:

اکثر نماز کی حالت میں دورانِ جماعت لوگوں کے موبائل فون بجنا شروع ہو جاتے ہیں، تو اُس وقت کیا کرنا چاہئے، کیا سیدھے ہاتھ سے موبائل بند کردینا چاہئے؟

(رب نواز فیضی، نیو کراچی)

جواب:

نماز کی صحت کے لئے نماز میں خشوع وخضوع کا التزام کرنا مستحسن امر ہے، قرآن مجید میں ہے: الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ ترجمہ: ''جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں، (المومنون:2)''۔ خشوع سے مراد عجز وانکسار اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری کا تصور اور اسی سے بندے کے دل میں عبادت کے وقت یکسوئی پیدا ہوتی ہے۔

ظاہر ہے اسی سے بدن پر لرزہ اور گریہ کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ اصطلاحی معنیٰ حق کی اطاعت کرنا ہے۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی علامہ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری کے حوالے سے حضرت حسن بصری کا قول لکھتے ہیں: ''روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک شخص کو نماز میں اپنی ڈاڑھی سے کھیلتے ہوئے دیکھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء میں بھی خشوع ہوتا، (تبیان القرآن، جلد:7،ص:843)''۔ الحاصل یہ کہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے وقت آدابِ نماز کا خصوصی التزام کرنا فرائضِ بندگی میں سے ہے، اِس لئے ضروری ہے کہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے وقت طہارت، لباس اور دیگر احکامِ شرع کی پاسداری کے ساتھ ساتھ آدابِ نماز کی رعایت بھی کی جائے، موجودہ دور میں موبائل لوگوں کی ضرورت بن گیا ہے اور بسا اوقات نماز میں شامل ہوتے ہوئے لوگ اپنے موبائل کو بند کرنا یعنی Switch Off کرنا بھول جاتے ہیں، ایسے میں دورانِ نماز اگر کال آجائے اور موبائل فون بجنا شروع ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ ایک ہاتھ سے موبائل کا کوئی بھی بٹن دبا کر اُسے بجنے سے روک دے تا کہ اُس کی اور دوسرے نمازیوں کی نمازوں میں خلل واقع نہ ہو۔

چلتی ہوئی ٹرین اور ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے کا شرعی حکم

سوال:

چلتی ٹرین یا ہوائی جہاز پر نماز پڑھنے کے متعلق کیا حکم ہے؟۔

(محمد آصف اقبال قادری، گلبہار 2 کراچی)

جواب:

دورانِ سفر جب ٹرین میں نماز کا وقت آجائے اور نماز کے پورے وقت میں ٹرین نہیں رکتی، تو چلتی ٹرین میں نماز پڑھنا فرض ہے اور اس کا ترک، فرض کا ترک اور گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ہے۔ مسافروں کو ٹرین میں سفر کے وقت قبلہ نما (جو آسانی سے مل جاتا ہے) رکھنا چاہئے اور اس سے قبلہ کی سمت متعین کریں، دن میں سورج کو دیکھ کر بھی قبلہ کی

سمت معلوم ہوجاتی ہے اور قبلہ کی جانب کھڑے ہوکر نماز پڑھیں۔ ٹرین چونکہ دورِ جدید کی ایجاد ہے اس لئے ٹرین میں نماز کے مسئلہ کو سابقہ نظائر میں تلاش کرنا ہوگا، علامہ غلام رسول سعیدی صاحب مدظلہم العالی نے ''شرح صحیح مسلم'' (جلد ثانی، صفحات: 396 تا 407) میں اس پر تفصیلی کلام فرمایا ہے اور بحری جہاز پر نماز کے دلائل پر قیاس کرتے ہوئے چلتی ٹرین میں نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا اور ساتھ ہی چوپایہ پر قیاس کرتے ہوئے بھی جواز کا قول اختیار فرمایا اور مفصل دلائل تحریر فرمائے ہیں۔ اپنی بحث کے آخر میں علامہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: جن دلائل سے ٹرین میں فرض نماز پڑھنا ثابت ہے، اُنہیں دلائل سے ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا ثابت ہے، بلکہ ہوائی جہاز میں وجہ جواز زیادہ قوی ہے، کیونکہ ہوائی جہاز کی پرواز کے دوران نماز کے وقت اس سے اترنا قطعاً غیر متصور ہے، بعض پروازوں میں بارہ بارہ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی زیادہ جہاز پرواز کرتا رہتا ہے بہر حال جب نماز کے پورے وقت کے دوران جہاز پرواز کرتا رہے تو نماز کا پڑھنا فرض ہے اور اس کا ترک گناہِ کبیرہ ہے۔ ہوائی جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اشاروں سے رکوع و سجود کرے اور سجود میں رکوع کی بہ نسبت زیادہ جھکے اور فرض نماز کو ترک نہ کرے۔

ٹرین اور طیارہ میں فرض نماز کے جواز پر ہمارا پہلا استدلال قرآن کریم سے ہے: فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا

ترجمہ: ''اگر تم (دشمنوں سے) خوف زدہ ہو تو پیادہ یا سوار جس طرح بن پڑے (نماز پڑھو)، (البقرہ: 239)''۔ چلتی ہوئی ٹرین اور طیارہ سے نماز کے وقت اترنے میں جان کا خوف ہے اور خوف کے وقت سواری پر اس آیت کی رُو سے نماز جائز ہے۔ دوسرا استدلال ترمذی شریف کی حدیث سے ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے کیچڑ میں اُترنے کی دشواری کی وجہ سے سواری پر نماز پڑھائی (سُنن ترمذی: 411)۔ تیسرا استدلال اجماع امت سے ہے کیونکہ خوف کی وجہ سے سواری پر نماز پڑھنے کے جواز اور بعد میں نہ لوٹانے پر امت کا اجماع ہے، (عالمگیری، جلد 1، ص: 156، منحۃ الخالق علی ہامش البحر، جلد 1، ص: 142)۔ چوتھا

استدلال قیاس سے ہے کیونکہ ہم نے ٹرین اور طیارہ کو اوّلاً کشتی پر قیاس کیا ہے اور ثانیاً چوپایہ پر، ہر اعتبار سے ٹرین اور طیارہ پر نماز کا جواز اور فرضیت ثابت کی ہے۔

مسجد میں ستونوں کے درمیان جماعت کے دوران نمازی کھڑے نہ ہوں

سوال:

ہماری مسجد فاروقیہ میں چوتھی صف کے درمیان میں دو ستون (پلر) ہیں۔ ان ستونوں کے درمیان صف بنائی جاسکتی ہے یا نہیں؟۔

(قاری رب نواز، امام وخطیب جامع مسجد فاروقیہ، 5-G نیو کراچی)

جواب:

پنج وقتہ نمازوں کی جماعت میں کہ جب مسجد میں توسّع بھی ہے، نمازیوں کی تعداد اتنی زیادہ بھی نہیں کہ تنگی ہو تو ستونوں کے درمیان کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ہاں! عیدین وجمعۃ المبارک کے اجتماعات میں لوگوں کی کثیر تعداد کے سبب ستونوں کے درمیان بھی صفیں بنائی جاسکتی ہیں۔ستونوں کے درمیان صفیں بنانے کی ممانعت میں جو احادیث وارد ہوئیں، ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ، عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: كُنَّا نُنْهٰى أَنْ نَصُفَّ بَيْنَ السَّوَارِيْ، عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَنُطْرَدُ عَنْهَا طَرْدًا۔

ترجمہ: ”معاویہ اپنے والد قرہ بن ایاس مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہمیں دوستونوں کے بیچ (یعنی دَروں) میں صف باندھنے سے منع فرمایا جاتا اور وہاں سے دھکّے دے کر ہٹائے جاتے تھے، (سنن ابن ماجہ:1002)“۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: لَا تَصُفُّوْا بَيْنَ الْأَسَاطِيْنِ وَأَتِمُّوا الصُّفُوْفَ،

ترجمہ: ”ستونوں کے بیچ میں صفیں نہ بناؤ اور صفیں پوری کرو“۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، بابُ الصَّلوٰۃ بینَ السَّواری فِی غَیْرِ جَماعۃٍ)

صفوں کو برابر رکھنے اور اُن کے درمیان خلل یا جگہ چھوڑنے کی ممانعت ذیل کی احادیث میں

بیان کی گئی ہیں:

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ وَحَاذُوْا بَيْنَ مَنَاكِبِكُمْ وَلِيْنُوْا فِيْ أَيْدِيْ إِخْوَانِكُمْ وَسُدُّوْا الْخَلَلَ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَدْخُلُ بِمَنْزِلَةِ الْحَذَفِ۔

ترجمہ: ''صفوں کو برابر کرو اور مونڈھوں کو مقابل کرو اور اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم ہوجاؤ اور کشادگیوں کو بند کرو کہ شیطان بھیڑ کے بچے کی طرح تمہارے درمیان داخل ہوجاتا ہے، (مسند امام احمد بن حنبل:22326)''۔

عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ، فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوْفِ مِنْ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صفیں برابر کرو کہ صفوں کا برابر کرنا اقامتِ صلوٰۃ (یعنی جماعت کے لئے سنت و مستحب میں سے) ہے، (صحیح بخاری:723)''۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللهُ، وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو صف کو ملائے گا، اللہ تعالیٰ اُسے ملائے گا اور جو صف کو قطع کرے گا، اللہ تعالیٰ اُس کو قطع کردے گا، (سُنن نسائی:818)''۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''بلاضرورت مقتدیوں کو دَروں میں کھڑا ہونا مکروہ ہے کہ قطعِ صف ہے، اور قطعِ صف ممنوع، حدیث میں ارشاد فرمایا: مَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللهُ، وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللهُ (فتاویٰ امجدیہ، جلد1، ص:163)''۔

مزید لکھتے ہیں: ''دَروں میں کھڑے نہ ہوں کہ مکروہ ہے، ہاں! اگر مُصلّیوں کی کثرت ہے کہ مسجد بھر گئی اور آدمی باقی رہیں تو دَروں میں کھڑے ہوں کہ یہ کھڑا ہونا بضرورت ہے اور

مواضع ضرورت مستثنیٰ ہیں، دَر خارجِ مسجد نہیں ہے اس میں کھڑا ہونا اِس وجہ سے مکروہ وممنوع ہے کہ صف قطع ہوتی ہے اور یہ ممنوع ہے۔ امام کو دَر میں کھڑا ہونا خلافِ سنّت ہے اور نماز ہو جائے گی، (فتاویٰ امجدیہ، جلد 1، ص: 174)''۔

فرض کی پانچویں رکعت پڑھنے کے بعد نماز کا حکم

سوال:

ہماری مسجد کے امام صاحب نمازِ عصر کی جماعت میں چوتھی رکعت پر بیٹھنے کے بجائے پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہوگئے، لوگوں نے بارہا اللہ اکبر کہا، لیکن واپس نہیں لوٹے اور پانچویں رکعت مکمل کرنے کے بعد قعدہ میں بیٹھے اور سجدۂ سہو کر کے سلام پھیر دیا اور کہنے لگے کہ نماز درست ہوگئی ہے۔ بعد میں لوگوں کے اعتراض کرنے پر نمازِ جمعہ کی تقریر کے دوران مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث سنائی کہ ''رسول اللہ ﷺ نے نمازِ ظہر میں پانچ رکعت پڑھائیں، سلام پھیرنے کے بعد صحابہ نے یاد دلایا تو آپ نے دو سجدے کئے''۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ اِس حدیث کے مطابق نماز درست ہوگئی ہے۔ اب ہم معلوم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اُن کا یہ عمل درست ہے؟۔ اگر امام فرض نماز کی چوتھی رکعت میں قعدہ کئے بغیر بھول کر کھڑا ہو جائے اور پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کر لے تو کیا سجدۂ سہو کر لینا نماز کی درستی کے لئے کافی ہوگا؟، (محمد یحیٰ، لاہور)۔

جواب:

مذکورہ امام صاحب کا موقف درست نہیں ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

دو رکعت والی نماز میں اگر تیسری رکعت کے لئے یا چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا، تو جب تک اُس زائد رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو، واپس قعدے کی طرف لوٹ آئے اور سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کرے، لیکن اگر تیسری یا پانچویں رکعت کا سجدہ کر لیا تو اب یہ دیکھا جائے گا کہ دوسری یا چوتھی رکعت میں قعدہ کیا تھا یا نہیں، اگر قعدہ کر لیا تھا تو فرض ادا ہو گیا۔ اگر قعدۂ اخیرہ نہیں کیا تو ایک رکعت اور پڑھ کر سلام پھیر

دے اور یہ پوری چھ رکعات امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک نفل ہوجائیں گی، اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک باطل ہوجائیں گی۔

علامہ برہان الدین ابوبکر فرغانی حنفی لکھتے ہیں: وَاِنْ سَهَا عَنِ الْقُعُوْدِ الْاَخِيْرَةِ، حَتّٰى قَامَ اِلَى الْخَامِسَةِ رَجَعَ اِلَى الْقَعْدَةِ مَالَمْ يَسْجُدْ، لِاَنَّ فِيْهِ اِصْلَاحَ صَلَاتِهِ وَاَمْكَنَهُ ذٰلِكَ، لِاَنَّ مَادُوْنَ الرَّكْعَةِ بِمَحَلِّ الرَّفْضِ، قَالَ: وَاَلْغَى الْخَامِسَةَ ،لِاَنَّهُ رَجَعَ اِلٰى شَيْءٍ مَحَلُّهُ قَبْلَهَا فَتَرْتَفِضُ ،وَسَجَدَ لِلسَّهْوِ لِاَنَّهُ اَخَّرَ وَاجِباً وَاِنْ قَيَّدَ الْخَامِسَةَ بِسَجْدَةٍ: بَطَلَ فَرْضُهُ عِنْدَنَا..... وَتَحَوَّلَتْ صَلَاتُهُ نَفْلاً عِنْدَ اَبِيْ حَنِيْفَةَ وَاَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُمَا اللهُ، خِلَافاً لِمُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللهُ عَلٰى مَامَرَّ، فَيَضُمُّ اِلَيْهَا سَادِسَةً وَلَوْلَمْ يَضُمَّ لَاشَيْءَ عَلَيْهِ

ترجمہ: ''اور اگر قعدۂ اخیرہ بھول گیا یہاں تک کہ پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہوگیا، اگر پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کیا تو قعدہ کی طرف لوٹ آئے، کیونکہ اس میں اُس کی نماز کی اصلاح ہے اور یہ اس لئے ممکن ہے کیونکہ ایک رکعت سے کم کو چھوڑا جاسکتا ہے۔ (ماتن کا قول:) پانچویں رکعت کو لغو کردے کیونکہ وہ (نمازی) ایسی چیز کی طرف پھرا ہے جس کا محل پانچویں رکعت سے مقدم ہے، پس اُس کو چھوڑ دیا جائے اور سجدۂ سہو کرے کیونکہ اس نے فرض کو مؤخر کیا ہے۔ اور اگر اُس نے پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کرلیا تو ہمارے نزدیک فرض باطل ہوگیا''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: ترجمہ: ''اور شیخین (امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف) کے نزدیک اُس کی نماز بدل کر نفل ہوگئی، امام محمد رحمہ اللہ کا اِس میں اختلاف ہے جو کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، پس اس کے ساتھ چھٹی رکعت ملالے اور اگر نہ ملائے تو اس پر کچھ عائد نہیں ہوتا''۔

(ہدایہ، جلد 1، ص:336)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَلَوْسَهَا عَنِ الْقُعُوْدِ الْاَخِيْرِ) كُلِّهِ اَوْ بَعْضِهِ (عَادَ) وَيَكْفِيْ كَوْنُ كِلَا الْجِلْسَتَيْنِ قَدْرَ التَّشَهُّدِ (مَا لَمْ يُقَيِّدْهَا بِسَجْدَةٍ) لِاَنَّ مَادُوْنَ الرَّكْعَةِ مَحَلُّ الرَّفْضِ وَسَجَدَ لِلسَّهْوِ لِتَاْخِيْرِ الْقُعُوْدِ (وَاِنْ قَيَّدَهَا) بِسَجْدَةٍ عَامِدًا

أَوْنَاسِيًا أَوْسَاهِيًا أَوْمُخْطِئًا (تَحَوَّلَ فَرْضُهُ نَفْلاً بِرَفْعِهِ) الْجَبْهَةَ عِنْدَ مُحَمَّدٍ، بِهِ يُفْتٰى، لِأَنَّ تَمَامَ الشَّيْءِ بِاٰخِرِهٖ۔

ترجمہ: ''اور اگر مقتدی قعدۂ اخیرہ کا اکثر یا بعض حصہ بھول کر کھڑا ہو گیا، تو لوٹ آئے اور لوٹنے سے پہلے اور بعد کا بیٹھنا مجموعی طور پر تشہد کے برابر ہو گیا (تو فرض ادا ہو گیا)، جب تک پانچویں رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو، کیونکہ ایک رکعت سے کم کو چھوڑا جا سکتا ہے اور قعدۂ اخیرہ میں تاخیر کی تلافی کے لئے سجدۂ سہو کرلے اور اگر اُس زائد (تیسری یا پانچویں) رکعت کا سجدہ کرلیا خواہ جان بوجھ کر کیا ہو یا بھول کر یا خطا سے کیا ہو، یہ فرض نفل ہو جائیں گے (یعنی یہ امام اعظم اور امام یوسف (شیخین) رحمہما اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے) اور اِسی پر فتویٰ ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سجدے میں جانے پر نہیں بلکہ سجدے سے سر اٹھانے پر نماز باطل ہوگی، اس لیے کسی شی کا مکمل ہونا اس کا اختتام پر ہی ہوتا ہے''۔

اس کی شرح میں (عِنْدَ مُحَمَّدٍ کے تحت) علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''بظاہر یہ پورے متن کی طرف راجع ہے، جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ گویا امام محمد بھی اس صورت میں پوری چھ رکعات کے نفل میں بدل جانے کے قائل ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جب فرض باطل ہو گئے، تو اصل نماز ہی باطل ہو گئی، پس نہ فرض ادا ہوئے اور نہ ہی نفل۔۔۔۔علامہ شامی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ: تنویر الابصار کے متن ''تَحَوَّلَ فَرْضُهُ نَفْلاً'' میں شیخین (امام اعظم اور امام یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ) کا مسلک بیان ہوا ہے اور ''بِرَفْعِهِ (یعنی سجدے سے سر اٹھاتے ہی)'' میں امام محمد کا۔ یعنی شیخین کے نزدیک نمازی جب سجدے میں چلا گیا تو اب فرض باطل ہو گئے اور چھ رکعات مکمل کرلے اور یہ چھ رکعات نفل ہو جائیں گے۔ اور امام محمد کے نزدیک فرض اور نفل دونوں اس وقت باطل ہوں گے، جب نمازی سجدہ سے سر اٹھائے گا''۔ اور اس مرحلے پر امام محمد نزدیک پوری نماز ہی باطل ہو جائے گی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: (وَاِنْ قَعَدَ فِي الرَّابِعَةِ) مَثَلًا قَدْرَ التَّشَهُّدِ (ثُمَّ قَامَ عَادَ وَسَلَّمَ)

وَلَوْسَلَّمَ قَائِماً صَحَّ ،ثُمَّ الْاَصَحُّ أَنَّ الْقَوْمَ يَنْتَظِرُوْنَهٗ،فَإِنْ عَادَتَبِعُوْهُ (وَإِنْ سَجَدَ لِلْخَامِسَةِ سَلَّمُوْا) لِأَنَّهٗ تَمَّ فَرْضُهٗ،إِذْلَمْ يَبْقَ عَلَيْهِ إِلَّاالسَّلَامُ (وَضَمَّ إِلَيْهَا سَادِسَةً) وَلَوْفِي الْعَصْرِ، وَخَامِسَةً فِي الْمَغْرِبِ،وَرَابِعَةً فِي الْفَجْرِ،بِهٖ يُفْتٰى (لِتَصِيْرَالرَّكْعَتَانِ لَهٗ نَفْلًا) وَالضَّمُّ هُنَا آكَدُ۔

ترجمہ:''اگر نمازی چوتھی رکعت میں بقدرِ تشہد بیٹھا، پھر کھڑا ہوگیا تو واپس لوٹے اور بیٹھ کر سلام پھیرے اور اگر کھڑے رہ کر سلام پھیر دیا تو بھی صحیح ہے،لیکن مسنون یہ ہے کہ بیٹھ کر سلام پھیرے۔ پھر صحیح تر یہ ہے کہ مقتدی امام کا انتظار کریں، پس اگر وہ لوٹ آئے تو اُس کی متابعت کریں اور اگر امام پانچویں رکعت کا سجدہ کرے تو مقتدی سلام پھیر دیں،اس لئے کہ مقتدی کا فرض پورا ہوگیا کہ سلام پھیرنے کے سوااس کے ذمے کچھ باقی نہیں ہے،اور (امام پانچویں رکعت پڑھنے کے بعد) اُس میں چھٹی رکعت ملالے اگرچہ نمازِ عصر میں ہو،اور مغرب کی نماز میں پانچویں رکعت اور نمازِ فجر میں چوتھی رکعت ملالے،اِسی پر فتویٰ ہے زائد رکعت کا ملانا اِس لئے ہے کہ دو رکعت نفل ہوجائیں اور یہاں ایک رکعت ملانا زیادہ مؤکد ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار،جلد 2،ص:480 تا 483)

علامہ امجد علی اعظمی ''غنیۃ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:''چار رکعت والے فرض میں چوتھی رکعت کے بعد قعدہ نہ کیا،تو جب تک پانچویں کا سجدہ نہ کیا ہو بیٹھ جائے اور پانچویں کا سجدہ کرلیا یا فجر میں دوسری رکعت پر نہیں بیٹھا اور تیسری کا سجدہ کرلیا یا مغرب میں تیسری پر نہ بیٹھا اور چوتھی کا سجدہ کرلیا،تو ان سب صورتوں میں فرض باطل ہوگئے،مغرب کے سوا اور نمازوں میں ایک رکعت اور ملالے،(بہارِ شریعت،جلد اول،ص:192)''۔

فقہاء لکھتے ہیں:چار چیزیں وہ ہیں کہ اگر امام کرے تو مقتدی اس کا ساتھ نہ دیں۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَاَرْبَعَةُ اَشْيَاءَ إِذَا تَعَمَّدَ الْإِمَامُ لَايُتَابِعُهُ الْمُقْتَدِيْ ۔۔۔ وَقَامَ إِلَى الْخَامِسَةِ سَاهِيًا كَذَا فِي الْوَجِيْزِ الْكُرْدَرِيِّ، فَإِنْ لَمْ يُقَيِّدِ الْخَامِسَةَ بِالسَّجْدَةِ وَعَادَ وَسَلَّمَ،سَلَّمَ الْمُقْتَدِيْ مَعَهٗ، وَإِنْ قَيَّدَ الْخَامِسَةَ بِالسَّجْدَةِ سَلَّمَ الْمُقْتَدِيْ، وَلَوْلَمْ

يَقْعُدِ الْاِمَامُ عَلَى الرَّابِعَةِ وَقَامَ اِلَى الْخَامِسَةِ سَاهِيًا وَتَشَهَّدَ الْمُقْتَدِىْ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَيَّدَ الْاِمَامُ الْخَامِسَةَ بِالسَّجْدَةِ فَسَدَتْ صَلَاتُهُمْ كَذَا فِى الْخُلَاصَةِ۔

ترجمہ: ''چار چیزیں وہ ہیں کہ مقتدی اُن میں امام کی متابعت نہ کرے۔۔۔۔(اُن میں سے ایک) امام بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے (تو مقتدی کھڑا نہ ہو)، جیسا کہ ''وجیز کردری'' میں ہے (یعنی مقتدی اُس کے لوٹنے کا انتظار کریں)، پس اگر اُس نے پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کیا اور لوٹ آیا اور سلام پھیر دیا تو مقتدی بھی اُس کے ساتھ سلام پھیر دیں اور اگر امام نے پانچویں رکعت کا سجدہ کر لیا، تو مقتدی تنہا سلام پھیر دیں۔ اور اگر امام نے چوتھی رکعت پر قعدہ نہیں کیا تھا اور بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا اور پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کر لیا تو اب سب کی نماز فاسد ہو گئی، اگرچہ مقتدیوں نے تشہد پڑھ کر سلام پھیرا ہو، ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:90)''۔ البتہ اگر یہ مغرب کی نماز ہے، تو چوتھی رکعت مکمل کر کے سلام پھیر لے، یہ چار رکعات نفل ہو جائیں گی۔

پس ایسی صورت میں امام کو چاہئے کہ دو رکعت والی نماز میں تیسری رکعت، تین رکعات والی نماز میں چوتھی رکعت اور چار رکعت والی نماز میں پانچویں کا سجدہ کرنے سے پیشتر لوٹ آئے اور اگر نہ لوٹا اور اُس رکعت کا سجدہ بھی کر لیا تو مغرب کے علاوہ باقی نمازوں میں ایک رکعت اور زائد پڑھے، اگر ایک رکعت اور نہ ملائی تو وہ نماز فاسد ہو جائے گی۔

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ امام صاحب کا بیان کردہ حدیث سے استدلال درست نہیں ہے، ہم اُس موضوع پر جملہ احادیث کا مکمل متن مع ترجمہ ذیل میں پیش کر رہے ہیں، اس کے بعد اُن پر ضروری بحث کی جائے گی:

(1) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ خَمْسًا، فَقِيْلَ لَهُ: أَزِيْدَ فِى الصَّلَاةِ؟، فَقَالَ: وَمَا ذَاكَ؟ قَالَ: صَلَّيْتَ خَمْسًا، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا سَلَّمَ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پانچ

رکعات پڑھا دیں، آپ سے پوچھا گیا: کیا اب نماز میں اضافہ ہوگیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی کیا وجہ ہے؟، حضرت ابن مسعود نے کہا: آپ نے پانچ رکعات نماز پڑھائی ہے، آپ نے سلام پھیرنے کے بعد سہو کے دو سجدے کئے، (صحیح بخاری: 1226)''۔

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:
''علامہ نووی کی تحقیق کے مطابق یہ واقعہ اُس وقت کا ہے، جب نماز میں گفتگو کی اباحت منسوخ ہوچکی تھی۔ اس کے باوجود صحابہ کرام نے آپ سے گفتگو کی، علامہ نووی لکھتے ہیں: ہمارے اور دیگر علماء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے ہم کلام ہونے سے نماز نہیں ٹوٹتی اور یہ مسئلہ مشہور ہے۔ یہ صرف آپ کی خصوصیت ہے کسی اور شخص سے نمازی بات کرے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ ان احادیث میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ قبلہ سے منہ پھیر کر صحابہ کی طرف رُخ کر چکے تھے، جب آپ نے اس بات کی تحقیق کر لی کہ پانچ رکعات ہوئی ہیں تو پھر آپ قبلہ کی طرف پھر گئے اور یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے کوئی اور نمازی نماز میں قبلہ سے پھر جائے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی، (شرح صحیح مسلم، جلد 2، ص: 144)''۔

(2) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ رَكْعَتَيْنِ مِنْ بَعْضِ الصَّلَوَاتِ، ثُمَّ قَامَ فَلَمْ يَجْلِسْ، فَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ، فَلَمَّا قَضٰى صَلٰوتَهُ وَنَظَرْنَا تَسْلِيْمَهُ، كَبَّرَ قَبْلَ التَّسْلِيْمِ فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ، ثُمَّ سَلَّمَ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کسی نماز کی دو رکعت پڑھائی، پھر آپ کھڑے ہوگئے اور بیٹھے نہیں، پس نمازی بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہوگئے، جب آپ نے اپنی نماز پوری کرلی تو ہم آپ کے سلام کے منتظر تھے، آپ نے سلام پھیرنے سے پہلے اللہ اکبر کہا، پھر بیٹھے ہوئے دو سجدے سہو کے لئے، پھر سلام پھیر دیا، (صحیح بخاری: 1224، صحیح مسلم: 1268)''۔

(3) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَامَ مِنَ اثْنَتَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ، لَمْ يَجْلِسْ بَيْنَهُمَا، فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهُ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ

سَلَّمَ بَعْدَ ذَالِكَ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن بحسینہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی دو رکعت پڑھ کر کھڑے ہوگئے اور دو رکعت کے بعد نہیں بیٹھے، جب آپ ﷺ نے نماز پڑھ لی تو دو سجدے کئے، پھر اس کے بعد سلام پھیر دیا، (صحیح بخاری: 1225)''۔

(4) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: صَلَّى بِنَا النَّبِيُّ ﷺ الظُّهْرَ أَوِ الْعَصْرَ، فَسَلَّمَ، فَقَالَ لَهُ ذُو الْيَدَيْنِ: الصَّلَاةُ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَنَقَصَتْ؟، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِأَصْحَابِهِ: أَحَقٌّ مَا يَقُوْلُ؟، قَالُوْا: نَعَمْ، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ أُخْرَيَيْنِ، ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ۔

قَالَ سَعْدٌ: وَرَأَيْتُ عُرْوَةَ بْنَ الزُّبَيْرِ صَلَّى مِنَ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ فَسَلَّمَ، وَتَكَلَّمَ، ثُمَّ صَلَّى مَا بَقِيَ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، وَقَالَ: هٰكَذَا فَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں نبی ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی، پس سلام پھیر دیا، پھر آپ ﷺ سے ذوالیدین رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! کیا نماز کم ہوگئی ہے؟، پس نبی ﷺ نے اپنے اصحاب سے پوچھا: آیا جو یہ کہہ رہے ہیں، وہ حق ہے؟، انہوں نے کہا: جی ہاں!، پس آپ نے دو رکعت اور پڑھائیں، پھر (سہو کے) دو سجدے کئے۔ سعد نے کہا: میں نے عروہ بن زبیر کو دیکھا، انہوں نے مغرب کی دو رکعت پڑھائیں، پھر سلام پھیر دیا اور کلام کیا، پھر باقی نماز پڑھائی اور (سہو کے) دو سجدے کئے اور کہا: نبی ﷺ نے اسی طرح کیا تھا''۔

(صحیح بخاری: 1227)

(5) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ خَمْسًا، فَقِيْلَ لَهُ: أَزِيْدَ فِي الصَّلَاةِ؟، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا سَلَّمَ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی پانچ رکعات پڑھائیں، آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ: کیا نماز میں زیادتی ہوگئی ہے؟، پس آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد (سہو کے) دو سجدے اور کئے''۔ (سنن ترمذی: 392)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی 297ھ لکھتے ہیں:

قَالُوْا: اِذَا صَلَّی الرَّجُلُ الظُّهْرَ خَمْسًا، فَصَلَاتُهٗ جَائِزَةٌ وَسَجَدَ سَجْدَتَیِ السَّهْوِ، وَاِنْ لَّمْ یَجْلِسْ فِی الرَّابِعَةِ وَهُوَ قَوْلُ الشَّافِعِیِّ وَاَحْمَدَ وَاِسْحَاقَ۔ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: اِذَا صَلَّی الظُّهْرَ خَمْسًا وَلَمْ یَقْعُدْ فِی الرَّابِعَةِ مِقْدَارَ التَّشَهُّدِ، فَسَدَتْ صَلَاتُهٗ، وَهُوَ قَوْلُ سُفْیَانَ الثَّوْرِیِّ وَبَعْضِ اَهْلِ الْكُوْفَةِ۔

ترجمہ: ''بعض نے کہا: جب کوئی شخص ظہر کی پانچ رکعات پڑھ لے، تو اس کی نماز جائز ہے اور وہ سہو کے دو سجدے کرے، خواہ وہ چوتھی رکعت پر (تشہد کے لئے) نہ بیٹھا ہو، یہ امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق کا قول ہے اور بعض ائمہ نے کہا: جب کسی نے ظہر کی پانچ رکعات پڑھ لی ہوں اور چوتھی رکعت پر تشہد کی مقدار نہ بیٹھا ہو، تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے اور سفیان ثوری اور بعض اہلِ کوفہ کا قول یہی ہے''۔ (سُنن ترمذی، جلد 1، ص:293)

ان احادیثِ مبارکہ کے ظاہری الفاظ میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چوتھی رکعت پر قعدہ نہیں کیا اور بھول کر پانچویں رکعت پڑھ لی، پھر صحابۂ کرام کے متوجہ کرنے پر آپ نے سلام پھیر کر دو سجدے کر لیے اور نماز مکمل فرمادی۔ بظاہر یہ حدیث فقہ حنفی کی مؤید نہیں ہے، کیونکہ فقہ حنفی کی رو سے چوتھی رکعت کا قعدہ نہ کرنے کی صورت میں پانچویں رکعت کے سجدہ میں جاتے ہی فرض باطل ہو جاتے ہیں۔ تو شاید مذکورہ امام نے ظاہر حدیث سے استدلال کیا ہو اور اسے مسئلہ معلوم نہ ہو۔

اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے علامہ بدر الدین عینی حنفی لکھتے ہیں: ''اور امام ابوحنیفہ نے کہا: جب بھول کر ایک رکعت کا اضافہ کیا، تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی اور اُس پر اعادہ لازم ہوگا۔ اور یہ بھی فرمایا: جب چوتھی رکعت کا سجدہ کر لیا ہو، پھر بھول کر پانچویں رکعت کا اضافہ کیا، تو ایک رکعت اور ملالے تاکہ یہ دو نفل ہو جائیں اور اگر چوتھی رکعت کے تشہد پر نہیں بیٹھا، تو فرض نماز باطل ہو جائے گی۔ یہ حدیث امامِ اعظم کے موقف کے خلاف ہے اور جمہور کے لئے حجت ہے: میں کہتا ہوں: میں تسلیم نہیں کرتا کہ امام اعظم سے نماز کے

باطل ہونے کا قول صحیح طور پر منقول ہے، جبکہ بھول کر چھٹی رکعت کا اضافہ کرلیا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حال سے بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے کہ آپ نے چوتھی رکعت پر قعدہ کرلیا ہوگا (اور ایسی متعدد مثالیں ملیں گی کہ صحابی حدیث روایت کرتے ہیں، لیکن اس کا کوئی حصہ چھوڑ دیتے ہیں) اس لیے کہ آپ کے فعل مبارک کو درستی پر محمول کرنا، نادرستی پر محمول کرنے سے احسن ہے اور یہی آپ کے حال کے مناسب ہے، کیونکہ اس میں مذکور ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ظہر کی نماز پانچ رکعات پڑھیں اور ظہر کا پڑھا جانا تب ہی ہوگا کہ اپنے وقت میں تمام ارکان کے ساتھ مقررہ طریقے پر پڑھی ہو۔ اگر آپ یہ سوال کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پانچویں رکعت کے لیے کھڑے ہونے کے بعد واپس نہیں لوٹے اور ایک رکعت ملا کر اسے "دوگانہ نفل" بھی نہیں بنایا۔ میں کہتا ہوں: یہ ہمارے لیے نقصان دہ نہیں ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک چھٹی رکعت کا ملانا واجب نہیں ہے، یہاں تک کہ صاحب ہدایہ نے کہا: "اگر کچھ نہ ملائے تو اس پر کچھ عائد نہیں ہوتا، کیونکہ یہ ظنی مسئلہ ہے اور صاحب "البدائع الصنائع" نے کہا: اولیٰ یہ ہے کہ عصر کے سوا ایک رکعت اور ملائے تاکہ یہ دو رکعت نفل ہوجائیں"۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد: 7، ص: 448)

حدیث مبارک ہے: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد میں داخل ہوئے، پھر ایک شخص آیا اور اس نے نماز پڑھی، پھر وہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سلام کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: "واپس جاؤ اور نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز (صحیح طریقے سے) نہیں پڑھی"۔ اُس نے پھر نماز پڑھی اور آکر نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سلام کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پھر فرمایا: واپس جاؤ، نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز (صحیح طور پر) نہیں پڑھی، یہ مکالمہ تین بار ہوا۔ پھر اُس شخص نے کہا: اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا۔ پس آپ مجھے نماز کا (صحیح) طریقہ بتائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو "اللہ اکبر" (یعنی تکبیر تحریمہ) کہو، پھر تم آسانی سے جتنا قرآن پڑھ سکتے ہو، پڑھو، پھر اطمینان سے رکوع کرو، پھر رکوع سے سر اٹھا کر اعتدال کے

ساتھ کھڑے ہو جاؤ، پھر اطمینان سے سجدہ کرو، پھر سجدے سے سر اٹھا کر اطمینان سے بیٹھ جاؤ، پھر اطمینان سے (دوسرا) سجدہ کرو، پھر اپنی پوری نماز اسی (سکون وقرار کے ساتھ) پڑھو، (بخاری:793)''۔

اسی کی شرح میں علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے اُس شخص کو صحیح نماز کا طریقہ بتاتے ہوئے متفق علیہ واجبات کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں فرمایا: جیسے نیت، قعدۂ اخیرہ اور بعض مختلف فیہ واجبات کو بھی بیان نہیں فرمایا، جیسے تشہد اخیر، نبی ﷺ پر درود اور آخر میں سلام، امام نووی (اس کی شرح میں) بیان کرتے ہیں: یہ حدیث اس پر محمول ہے کہ یہ امور اُس شخص کو معلوم تھے، (فتح الباری، جلد:2،ص:362)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات مخاطب کے علم پر اعتماد کر کے بعض تفصیلات و جزءیات کا بیان نہیں کیا جاتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اہم نہیں ہیں۔علیٰ ہذا القیاس حدیث سہو میں رسول اللہ ﷺ کے قعدۂ اخیرہ کے لیے بیٹھنے کا ذکر چھوڑ دیا گیا کہ یہ سب کو معلوم ہے۔

سنن ترمذی حدیث نمبر:304 میں اسی واقعے کا بیان ہے، اس کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم یہ کرلو، تو تم نے اپنی نماز پوری کر لی اور اگر اس میں سے کچھ کم کیا، تو تمہاری نماز میں کمی واقع ہوگئی''۔رسول اللہ ﷺ کا اس دیہاتی کو یہ فرمانا کہ: ''واپس جاؤ، نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی''، یہ اس امر کا بیان ہے کہ نماز میں ''تعدیل ارکان'' (یعنی تمام ارکان کو ٹھیک ادا کرنا) واجب ہے اور ترکِ واجب سے نماز ناقص ہوتی ہے اور واجب الاعادہ ہوتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کی کامل نماز کا بیان سنن ترمذی کی حدیث نمبر:304 میں ہے۔

ننگے سر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:

برہنہ سر نماز پڑھنا کیسا ہے، کیا نماز ادا ہو جائے گی؟، دورانِ نماز ٹوپی سر سے گر

جائے تو کیا اُٹھا کر پہن لینا چاہئے ، (محمد رمیز ، نارتھ کراچی)۔

جواب:

برہنہ سر نماز پڑھنا آداب اور سنت کے منافی ہے ، عُذر یا مجبوری کے سبب ہو تو اِس کی رخصت ہے ، لیکن عادت بنالینا قطعاً درست نہیں ہے۔ اگر نماز کے دوران ٹوپی گر جائے تو ایک ہاتھ سے نماز میں ہی اٹھا کر سر پر رکھنا افضل و بہتر ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَتُكْرَهُ الصَّلَاةُ حَاسِرًا رَأْسَهُ إِذَا كَانَ يَجِدُ الْعِمَامَةَ وَقَدْ فَعَلَ ذَالِكَ تَكَاسُلاً أَوْتَهَاوُنًا بِالصَّلَاةِ وَلَا بَأْسَ بِهِ إِذَا فَعَلَهُ تَذَلُّلاً وَخُشُوْعًا بَلْ هُوَحَسَنٌ كَذَا فِي "الذَّخِيرَةِ"۔

ترجمہ: "عمامہ (یا ٹوپی وغیرہ) موجود ہو، تو ننگے سر نماز پڑھنا (اُس صورت میں) مکروہ ہے جب کہ (نماز میں) سستی کی بنا پر (ٹوپی نہ پہنی ہو) یا نماز کو ہلکا جانتے ہوئے ایسا کیا۔ اور اگر خشوع و خضوع کے سبب ہو تو کوئی قباحت نہیں بلکہ حَسَن ہے ، جیسا کہ "ذخیرہ" میں ہے ، (فتاویٰ عالمگیری ، جلد 1 ، ص:106)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَصَلَاتُهُ حَاسِرًا) أَيْ كَاشِفًا (رَأْسَهُ لِلتَّكَاسُلِ) وَ(لَا) بَأْسَ بِهِ لِلتَّذَلُّلِ ، وَأَمَّا لِلْإِهَانَةِ بِهَا فَكُفْرٌ ، وَلَوْسَقَطَتْ قَلَنْسُوَتُهُ فَإِعَادَتُهَا أَفْضَلُ ، إِلَّا إِذَا احْتَاجَتْ لِتَكْوِيرٍ أَوْعَمَلٍ كَثِيرٍ۔

ترجمہ: "ننگے سر نماز پڑھنا اگر سُستی کے سبب ہو تو مکروہ ہے اور اگر عجز و انکسار کی وجہ سے ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اور اگر اہانت کے لئے (یعنی نماز کو حقیر جانتے ہوئے) ہو تو کفر ہے اور اگر (دورانِ نماز) ٹوپی گر جائے تو اُس کا سر پر دوبارہ رکھ لینا افضل ہے ، لیکن اگر ایسی صورت ہے کہ جس میں لپیٹنے کی یا عملِ کثیر کی حاجت ہے تو اُٹھانا افضل نہیں"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار ، جلد 2 ، ص:351)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: "آج کل دیارِ بنگال کے بعض شہروں میں بعض لوگوں نے فرض جماعت میں سر ننگا کر کے نماز پڑھنا اختیار کیا ہے اگر کسی

نے کہا کہ جماعت کی اہانت ہوتی ہے تو اس کے جواب میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ عاجزی وانکساری کی وجہ سے پڑھتا ہوں۔ اسی طرح عاجزی وانکساری کے بہانے سے بعض لوگوں نے علاوہ نماز کے بھی سر پر ٹوپی رکھنا چھوڑ دیا ہے، تو کیا ننگے سر فرض نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے سے نماز جائز ہوگی یا مکروہ ہوگی؟۔ اگر جائز ہوگی تو کیا حضور سرورِ کائنات یا حضرت مولائے کائنات یا حضرات امامین متطہرین یا حضرات صحابۂ کرام یا اولیائے عظام نے کبھی فرض جماعت میں ننگے سر نماز پڑھی ہے یا نہیں، اور علاوہ نماز کے بھی ان حضرات نے کبھی کبھی سر کو ننگا رکھا ہے یا نہیں؟۔ اور صوفیائے عظام کی کتابوں میں ننگے سر رہنا تہذیب اور آداب کے خلاف آیا ہے یا نہیں اور احادیث شریفہ وفقہ سے اس کی کراہت ثابت ہے یا نہیں؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''حضور اقدس ﷺ کی سنّت کریمہ نماز مع کلاہ وعمامہ ہے اور فقہائے کرام نے ننگے سر نماز پڑھنے کو تین قسم کیا ہے، اگر تواضع وعاجزی کی نیت سے ہو تو جائز اور سُستی کی وجہ سے ہو تو مکروہ اور معاذ اللہ نماز کو بے قدر اور ہلکا سمجھ کر ہو تو کفر۔ جب مسلمان اپنی نیت تواضع بتاتے ہیں تو اُسے نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں، مسلمان پر بدگمانی حرام ہے، ننگے سر رکھنے کا احرام میں حکم ہے اور اس حالت میں شبانہ روز برابر سر برہنہ رہنا حضور اکرم ﷺ وصحابۂ کرام سب سے ثابت، اس کے بغیر ننگے سر کی عادت ڈالنا کوچہ وبازار میں اسی طرح پھرنا، نہ ہرگز ثابت ہے، نہ شرعاً پسندیدہ، بلکہ وہ منجملہ نمود ذات کے اسباب سے ہے، اور ایسی وضع جس پر انگلیاں اُٹھیں، شرعاً مکروہ، ''مجمع البحار'' وغیرہ میں ہے: اَلْخُرُوْجُ عَنْ عَادَةِ الْبَلَدِ شُهْرَةٌ وَمَكْرُوْهٌ ترجمہ: ''اہلِ شہر کے معمول سے نکلنا شہرت اور مکروہ ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص: 389، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''نماز کی حالت میں سترِ عورت فرض ہے، مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے اور عورت کا ستر تمام جسم ہے، صرف چہرہ، ہاتھوں اور پیروں کا استثنا ہے۔ مجبوری کی حالت میں ایک کپڑے کے ساتھ بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے وسعت دی ہے تو قمیص، شلوار اور عمامہ یا ٹوپی کے ساتھ نماز پڑھنی چاہئے،

غیر مقلدین حضرات اس باب کی احادیث سے ننگے سر نماز پڑھنے پر استدلال کرتے ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ وہ صرف سر کھلا رکھتے ہیں، قمیص، شلوار، شیروانی وغیرہ سب پہنتے ہیں، صرف سر نہ ڈھانپنے کے لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ اُنہوں نے باوجود اور کپڑوں کے صرف ایک کپڑے کے ساتھ نماز پڑھی، نیز یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ جس وضع اور ہیئت میں ہم دنیا دار معزز لوگوں کے سامنے جانا خلافِ ادب گردانتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی اس ہیئت میں کھڑے ہونے سے اجتناب کرنا چاہئے اور جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں عمامہ یا ٹوپی سے سر ڈھانپنے کی وسعت دی ہے تو ہمیں اس وسعت کو اختیار کرنا چاہئے۔ علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

اَلْمُسْتَحَبُّ اَنْ یُّصَلِّیَ الرَّجُلُ فِیْ ثَلَاثَةِ اَثْوَابٍ قَمِیْصٍ وَّاِزَارٍ وَّعِمَامَةٍ۔

ترجمہ: ''مستحب یہ ہے کہ مرد تین کپڑوں میں نماز پڑھے قمیص، تہبند اور عمامہ''۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں: فَقَالَ: اِذَا وَسَّعَ اللّٰہُ فَاَوْسِعُوْا ترجمہ: ''جب اللہ تعالیٰ نے وسعت دی ہے تو وسعت کو اختیار کرو''۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں: عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ فَلْیَلْبَسْ ثَوْبَیْہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ اَحَقُّ اَنْ یُّزَیَّنَ لَہٗ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو دو کپڑوں میں نماز پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کے لئے زینت اختیار کی جائے''۔

عَنْ نَّافِعٍ قَالَ: رَاٰنِی ابْنُ عُمَرَ وَاَنَا اُصَلِّیْ فِیْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ فَقَالَ: لَمْ اَکْسُکَ، قُلْتُ: بَلٰی، قَالَ: فَلَوْ بَعَثْتُکَ کُنْتَ تَذْھَبُ ھٰکَذَا، قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَزَیَّنَ لَہٗ۔

ترجمہ: ''نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر نے مجھے ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، تو اُنہوں نے کہا: کیا میں نے تم کو اور کپڑے نہیں پہنائے؟، میں نے کہا: کیوں نہیں، اُنہوں نے کہا: اگر میں تم کو کسی جگہ بھیجوں تو کیا تم اسی حالت میں چلے جاؤ گے؟،

میں نے کہا: نہیں، اُنہوں نے کہا: پھر اللہ تعالیٰ کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کے لئے زینت اختیار کی جائے''۔

حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں: عَنْ عَاصِمِ بْنِ كُلَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ خَالِهِ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي الشِّتَاءِ فَوَجَدْتُهُمْ يُصَلُّونَ فِي الْبَرَانِسِ وَالْأَكْسِيَةِ وَأَيْدِيهِمْ فِيهَا، رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْكَبِيرِ وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُونَ۔

ترجمہ: ''کلیب کے والد اپنے ماموں سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں سردیوں میں حاضر ہوا، وہ سب ٹوپیاں پہنے ہوئے اور چادریں اوڑھے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور ان کے ہاتھ ان کی چادروں میں تھے''۔ اسے طبرانی نے ''المعجم الکبیر'' میں روایت کیا اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں: قَالَ الْحَسَنُ: كَانَ الْقَوْمُ يَسْجُدُونَ عَلَى الْعِمَامَةِ وَالْقَلَنْسُوَةِ وَيَدَاهُ فِي كُمِّهِ۔

ترجمہ: ''حسن بصری کہتے ہیں کہ (گرمی کی وجہ سے) لوگ (یعنی صحابہ اور تابعین) عمامہ اور ٹوپی پر سجدہ کرتے تھے (یعنی پیشانی عمامہ کے پیچ اور ٹوپی سے ڈھکی ہوئی ہوتی تھی) اور ان کے ہاتھ آستینوں میں ہوتے تھے''۔

وَضَعَ أَبُو إِسْحَاقَ قَلَنْسُوَتَهُ فِي الصَّلٰوةِ وَرَفَعَهَا۔ ترجمہ: ''ابو اسحاق نے نماز میں اپنی ٹوپی کو رکھا اور اونچا کیا''۔

امام شعرانی لکھتے ہیں: وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْمُرُ بِسَتْرِ الرَّأْسِ فِي الصَّلٰوةِ بِالْعِمَامَةِ وَالْقَلَنْسُوَةِ وَيَنْهٰى عَنْ كَشْفِ الرَّأْسِ فِي الصَّلٰوةِ۔

ترجمہ: ''نبی ﷺ نماز میں عمامہ یا ٹوپی کے ساتھ سر ڈھانپنے کا حکم دیتے تھے اور ننگے سر نماز پڑھنے سے منع فرماتے تھے''۔

علامہ سیوطی حافظ ابن عساکر اور حافظ رویانی کے حوالے سے لکھتے ہیں: كَانَ يَلْبَسُ الْقَلَانِسَ تَحْتَ الْعَمَائِمِ وَبِغَيْرِ الْعَمَائِمِ وَيَلْبَسُ الْعَمَائِمَ بِغَيْرِ قَلَانِسَ (الحدیث)۔

ترجمہ: ''نبی ﷺ ٹوپی عمامہ کے نیچے پہنتے تھے اور ٹوپی بغیر عمامہ کے بھی پہنتے تھے اور عمامہ بغیر ٹوپی کے بھی پہنتے تھے''۔

ان احادیث سے یہ واضح ہوگیا کہ نبی ﷺ، صحابہ، تابعین اور سلف صالحین کا طریقہ عمامہ یا ٹوپی سے سر ڈھانپ کر نماز پڑھنا تھا، اس لئے جب انسان کے پاس عمامہ یا ٹوپی کی وسعت ہو تو وہ ننگے سر نماز نہ پڑھے، عمامہ باندھ کر یا ٹوپی پہن کر نماز پڑھے''۔
(شرح صحیح مسلم، جلد 1، ص:1336-1333)

ماضیٔ قریب میں ہماری معاشرتی اقدار میں ننگے سر رہنا اور خاص طور پر بڑوں کے سامنے ننگے سر آنا ایک ناپسندیدہ اور معیوب بات سمجھی جاتی تھی، لیکن اب قدریں بدل چکی ہیں۔ اس لئے اب ننگے سر رہنا ہمارے معاشرے میں بدنامی یا عیب کی علامت نہیں ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ننگے سر نماز پڑھنا اگرچہ جائز ہے مگر ادب اور ہماری دینی اَقدار کا تقاضا یہ ہے کہ سر پر کم از کم ٹوپی پہن کر نماز پڑھی جائے۔ لیکن کسی ننگے سر نماز پڑھنے والے کو ملامت نہ کی جائے، سوائے اِس کے کہ وہ نماز کو معمولی جانتے ہوئے ایسا کرے، اس کا حکم بیان کیا جاچکا ہے۔

عیدین وجمعہ میں غیر عربی میں خطبہ پڑھنا

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ بکر جو لوگوں کو عربی زبان میں جمعۃ المبارک کا خطبہ دیتا ہے گویا کہ یہ ایسا ہے جیسے ''صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ'' کیونکہ وہ عربی زبان سمجھتے ہی نہیں لہٰذا انہیں عربی زبان میں خطبہ دینا درست نہیں ہے، خطبہ اُس زبان میں ہونا چاہئے، جس زبان کے حاضرین ہیں اور زید یہ بھی کہتا ہے کہ میں جس طرح انگلش زبان میں عبور رکھتا ہوں تو میں انگلش زبان میں خطبہ دوں۔

(۱) اصل خطبہ کس زبان میں ہونا چاہئے اور افضل وسنت کیا ہے؟۔

(۲) عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں خطبۂ جمعہ دینا کیسا ہے اور اس کا حکم کیا ہے؟۔

(۳) کفار کی آیت ''صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ'' کو مسلمانوں پر چسپاں کرنا کیسا ہے؟، (علی رضا عطاری، عمر کوٹ)۔

جواب:

اِس مسئلے میں جمہور علماء اُمّت کا موقف اور تعامل (General Practice) وتوارث (Inherited Religious Practice) یہی ہے کہ عربی زبان کے علاوہ کسی بھی دوسری زبان میں خطبہ پڑھنا یا دوسری زبان کے کلمات ملا کر خطبہ پڑھنا مکروہ اور سنّتِ متوارثہ کے خلاف ہے، نماز اور خطبہ تو ادا ہو جائے گا لیکن افضل وسنت یہی ہے کہ نمازِ جمعہ ہو یا عیدین خطبہ عربی زبان میں ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: وَاَنْ تَکُوْنَ بِالْعَرَبِیَّةِ، فَلَا تَصِحُّ الْخُطْبَةُ بِغَیْرِ الْعَرَبِیَّةِ مَعَ الْقُدْرَةِ عَلَیْهَا، کَقِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ، فَاِنَّهَا لَاتُجْزِئُ بِغَیْرِ الْعَرَبِیَّةِ، وَتَصِحُّ الْخُطْبَةُ لَا الْقِرَاءَةُ بِغَیْرِ الْعَرَبِیَّةِ مَعَ الْعَجْزِ عَنْهَا۔

ترجمہ: ''اور (خطبہ) عربی میں ہونا چاہئے، عربی زبان پر قدرت رکھتے ہوئے غیر عربی میں خطبہ دینا درست نہیں ہے، جیسے قرآن کی قراءت، پس (نماز میں) غیر عربی میں قراءت جائز نہیں۔ اور جو عربی میں خطبہ نہ پڑھ سکتا ہو تو اُس کے عجز کے سبب غیر عربی میں خطبہ صحیح ہوگا، (الفقہ الاسلامی واَدلتہ، جلد 2، ص:1310)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ خطبۂ جمعہ میں جو وعظ ونصیحت پر مشتمل اُردو قصیدے پڑھے جاتے ہیں، یہ شرعاً کیسا ہے؟، اور عوام کا یہ عذر کہ عربی ہماری سمجھ میں نہیں آتی لہٰذا اردو کی ضرورت ہے، قابلِ قبول ہے یا نہیں؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''یہ امر خلافِ سنّتِ مُتوارثۂ مسلمین ہے اور سنّتِ متوارثہ کا خلاف مکروہ، صدیوں سے اہلِ اسلام میں ہمیشہ خالص عربی زبان میں خطبہ معمول ومتوارث رہا ہے اور متوارث کا اتباع ضرور ہے۔ درمختار میں ہے: لِاَنَّ الْمُسْلِمِیْنَ تَوَارَثُوْهُ فَوَجَبَ اِتِّبَاعُهُمْ یعنی یہ مسلمانوں کا توارث ہے جس کی اتباع لازم ہے، زمانۂ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں بحمد اللہ ہزار ہا بلادِ عجم فتح ہوئے، ہزاروں عجمی حاضر ہوئے مگر کبھی منقول نہیں کہ انہوں نے

ان کی غرض سے خطبہ غیر عربی میں پڑھا یا اس میں دوسری زبان کے الفاظ ملائے ہوں، وَكُلُّ مَا وُجِدَ مُقْتَضِهُ عَيْنًا مَعَ عَدَمِ الْمَانِعِ ثُمَّ تَرَكُوْهُ دَلَّ اَنَّهُمْ كَفُوْا عَنْهُ فَكَانَ اَدْنَاهُ الْكَرَاهَةُ۔

ترجمہ: ''ہر وہ شے جس کا مقتضٰی پایا جائے اور کوئی مانع بھی نہیں پھر اس کو ترک کر دیا ہو، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اسے چھوڑا گیا ہے تو کم از کم یہ عمل مکروہ ضرور ہوگا''۔

عوام کا یہ عذر جب صحابۂ کرام کے نزدیک لائقِ لحاظ نہ تھا، اب کیوں قابلِ قبول ہوگا، بات یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے علم سیکھنا سب پر واجب کیا ہے، عوام کہ نہیں سمجھتے، سبب یہ ہے کہ نہیں سیکھتے تو قصور اُن کا ہے نہ کہ خطیب کا، آخر عوام قرآن مجید بھی تو نہیں سمجھتے، کیا اُن کے لئے قرآن اُردو میں پڑھا جائے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص:303، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مزید لکھتے ہیں: ''خطبہ ضرور وعظ وتذکیر کے لئے ہے، جیسے نماز ذکر کے لئے ہے، قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میری یاد کے لئے نماز قائم کرو) اور خود قرآن عظیم کہ اس کا تو نام ہی ''ذکر حکیم'' ہے اور اس کے نہ سمجھنے پر سخت انکار فرماتا ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (کیا وہ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں) پھر جس کی سمجھ میں عربی نہ آئے، نہ اُس کے لئے نماز وقرآن اُردو یا بنگلہ یا انگریزی کر دیئے جائیں گے، نہ خطبہ واذان، یہ اس کا اپنا قصور ہے، اس کا دین عربی، نبی عربی، کتاب عربی، پھر عربی اتنی بھی نہ سیکھی کہ اپنا دین سمجھ سکتا۔ انگریزی کی حالت دیکھئے اس پر کیسے اندھے باولے ہو کر گرتے ہیں کہ دو پیسے کمانے کی امید ہے اور عربی جس میں دین ہے، ایمان ہے، اُس سے کچھ غرض نہیں، اللہ تعالیٰ ہدایت بخشے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص:455، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مزید لکھتے ہیں: ''خطبہ خود وعظ و پند ہے، مگر اُس میں غیر عربی زبان کا خلط مکروہ وخلافِ سنّتِ متوارثہ ہے، اگرچہ نفسِ فرضِ خطبہ خالص دوسری زبان سے ادا ہو جائے گا، صحابۂ کرام نے عجم کے ہزاروں شہر فتح فرمائے اور ان میں منبر نصب کئے اور خطبے پڑھے اور اُن کی

زبانیں جانتے تھے، اُن سے گفتگو کرتے تھے مگر کبھی منقول نہیں کہ عربی کے سوا کسی اور زبان میں خطبہ فرمایا یا غیر زبان کو ملایا: فَهُوَ كَفٌّ وَالْكَفُّ مُتَّبَعٌ قَالَ ﷺ مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ۔

ترجمہ: "یہ فعل سے رُکنا ہے اور رُکنے میں اتباع کی جائے گی، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے ہمارے کسی معاملے میں اختراع کی حالانکہ وہ اس میں سے نہ تھی تو وہ مردود ہوگی"۔

درمختار میں ہے: صَحَّ لَوْ شَرَعَ بِغَيْرِ عَرَبِيَّةٍ وَشَرَطَا عَجْزَهُ وَعَلٰى هٰذَا الْخِلَافِ الْخُطْبَةُ۔

ترجمہ: "صحیح یہ ہے اگر اس نے نماز کی تکبیر غیر عربی میں شروع کی اور صاحبین کے نزدیک بشرطیکہ وہ عاجز ہو، یہی اختلاف خطبہ کے بارے میں ہے"۔

ہاں! اگر اثنائے خطبہ میں مثلاً کسی ہندی کو کوئی فعلِ ناجائز کرتے دیکھا، جیسے خطبہ ہونے کی حالت میں چلنا یا پنکھا جھلنا اور وہ عربی نہیں سمجھتا، تو اُردو میں اُسے منع کرے کہ یہ حاجت یونہی رفع ہوگی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 467، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

ہمارے اس خطے کے علماء کرام نے صدیوں سے جمعۃ المبارک وعیدین کے موقع پر اسی لئے مسنون عربی خطبے کے ساتھ ساتھ اُردو یا کسی بھی مقامی زبان میں تقریر کا سلسلہ جاری کیا تاکہ عوام کو دینی مسائل سے آگہی بھی حاصل ہو، خاص مواقع پر اُن موضوعات پر خطاب ہو اور عربی میں خطبۂ جمعہ وعیدین کی سنت کا توارث اور تسلسل بھی قائم رہے۔ آپ کے سوال میں مذکور زید کی سوچ اور اندازِ بیان انتہائی نامناسب ہے، اُسے اس سے رجوع کرنا چاہئے۔ ہمیں کسی دلیل یا قرینے کے بغیر مسلمانوں کے بارے میں بدگمانی سے بچنا چاہئے، ہوسکتا ہے کہ اُس کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ یہ آیت منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تاہم اسے محاورے کے طور پر استعمال کرنا بہرحال بے ادبی ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

ایک امام کا دو جگہ نمازِ عید پڑھانا

سوال:

ایک مولوی صاحب نے نمازِ عید الفطر دو جگہ پڑھائی، کیا دونوں جگہ عید کی نماز

پڑھنے والوں کی نماز ہوئی یا نہیں؟ اُس مولوی صاحب کا یہ عمل شریعت کی نگاہ میں کیسا ہے؟، (محمد عمران قادری، سیکٹر e-15 اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

عیدین کی نماز واجب ہے، اِس کے لئے شرائط وہی ہیں جو نمازِ جمعہ میں ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ نمازِ جمعہ میں خطبہ پڑھنا شرط ہے اور عیدین میں سنت ہے۔ مذکورہ مولوی صاحب ایک مرتبہ اپنا واجب ادا کر چکے تھے، تو اب اُنہیں امام بننا جائز نہیں تھا کہ اب اُن کی یہ نماز نفل شمار ہوگی اور مُتنفِّل (نفل پڑھنے والے) کے پیچھے فرض یا واجب ادا کرنے والوں کی نماز صحیح نہیں ہے۔ مذکورہ مولوی صاحب نے دوسری جماعت میں شامل ہونے والوں کی نمازیں بھی خراب کیں، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَ) لَا (مُفْتَرِضٍ بِمُتَنَفِّلٍ وَبِمُفْتَرِضٍ فَرْضًا اٰخَرَ) لِأَنَّ اِتِّحَادَ الصَّلَاتَیْنِ شَرْطٌ عِنْدَنَا

ترجمہ: ''اور فرض نماز پڑھنے والے کا نفل نماز پڑھنے والے امام کی اقتدا درست نہیں ہے اور اِسی طرح ایک فرض پڑھنے والے کے لئے دوسرے فرض پڑھنے والے کی اقتدا میں بھی نماز پڑھنا درست نہیں ہے، کیونکہ (صحتِ اقتدا کے لئے) امام اور مقتدی کی نماز کا ایک ہونا ہمارے نزدیک شرط ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 279)''۔

نمازِ جمعہ وعیدین کی امامت کا استحقاق

سوال:

ہمارے گاؤں نکدر ضلع نیلم آزاد کشمیر میں جمعہ اور عیدین کی نماز گذشتہ چھ برس سے جس مسجد میں ادا کی جارہی ہے، وہاں تقریباً پانچ سو افراد کی گنجائش ہے، اب کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جامع مسجد کے بجائے گاؤں کے گراؤنڈ کو عیدگاہ بنا کر وہاں عیدین کی نماز ادا کی جائے، جبکہ اس گراؤنڈ میں بھی پانچ سو افراد کی گنجائش ہے۔ نیز عیدگاہ میں جامع مسجد کے مقرر خطیب کے علاوہ ایک اور صاحب عید کی نماز پڑھائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر عیدین کی نماز کو عیدگاہ میں منتقل کر دیا جائے تو وہاں خطبہ دینے اور نماز پڑھانے کا حق کسے

حاصل ہے جامع مسجد کے خطیب یا کسی اور صاحب کو؟۔ (سعید احمد شیخ، نکدر، آزاد کشمیر)

جواب:

عیدین کی نماز اگرچہ مسجد میں بھی پڑھنا جائز ہے، لیکن کھلے میدان یا عیدگاہ میں ادا کرنا سنت اور افضل ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَالْأَضْحٰى إِلَى الْمُصَلّٰى، فَأَوَّلُ شَيْءٍ يَبْدَأُ بِهِ الصَّلَاةُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ کی طرف جاتے تھے، سب سے پہلے آپ نماز پڑھاتے''۔ (صحیح بخاری:956)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: اَلْخُرُوْجُ إِلَى الْجَبَّانَةِ فِيْ صَلَاةِ الْعِيْدِ سُنَّةٌ وَإِنْ كَانَ يَسَعُهُمُ الْمَسْجِدُ الْجَامِعُ، عَلٰى هٰذَا عَامَّةُ الْمَشَايِخِ وَهُوَ الصَّحِيْحُ، هٰكَذَا فِي ''الْمُضْمَرَاتِ''۔

ترجمہ: ''(نمازِ عید کے لئے) کھلے میدان (عیدگاہ) کی طرف جانا سنت ہے اگرچہ جامع مسجد میں (کثیر تعداد میں نمازیوں کی) گنجائش ہو، عام مشائخ کا یہی معمول ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ ''المضمرات'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:150)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَالْخُرُوْجُ إِلَيْهَا) أَيِ الْجَبَّانَةِ لِصَلَاةِ الْعِيْدِ (سُنَّةٌ وَإِنْ وَسِعَهُمُ الْمَسْجِدُ الْجَامِعُ) هُوَ الصَّحِيْحُ۔

ترجمہ: ''نمازِ عید کے لئے کھلے میدان (یعنی عیدگاہ) کی طرف جانا سنت ہے اگرچہ جامع مسجد میں لوگوں کی گنجائش زیادہ ہو، یہی صحیح ہے''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:46)

امامِ مُعیّن ہی نمازِ عید کی امامت کا زیادہ حق دار ہے، جسے نمازِ جمعہ کے لئے امام مقرر کیا گیا، وہی عید کی نمازیں پڑھانے کا زیادہ حقدار ہے، ہاں! اگر امامِ معیّن اجازت دیدے تو دوسرے صاحب کو امامت کرنا جائز ہوگا۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

رَجُلٌ خَطَبَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ بِغَیْرِ اِذْنِ الْاِمَامِ وَالْاِمَامُ حَاضِرٌ لَایَجُوْزُ ذٰلِكَ اِلَّااَنْ یَّکُوْنَ الْاِمَامُ اَمَرَہٗ بِذَالِكَ۔

ترجمہ: ''جمعہ کے دِن امام کی موجودگی میں کوئی شخص امام کی اجازت کے بغیر خطبہ دینا چاہے تو اُس کے لئے جائز نہیں ہے، سوائے اِس کے کہ امام کی اجازت سے اُس نے ایسا کیا ہو، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:145)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَفِی ''السِّرَاجِیَّةِ'': لَوْ صَلّٰی اَحَدٌ بِغَیْرِ اِذْنِ الْخَطِیْبِ لَایَجُوْزُ، اِلَّا اِذَا اقْتَدٰی بِہٖ مَنْ لَہٗ وِلَایَةُ الْجُمُعَةِ۔

ترجمہ: ''''سراجیہ'' میں ہے: اگر خطیب کی اجازت کے بغیر کسی نے جمعہ پڑھایا تو جائز نہیں، سوائے اس صورت کے کہ جسے نمازِ جمعہ خود پڑھانے یا اُس کا امام مقرر کرنے کی ولایت حاصل ہے، وہ خود بھی اس شخص کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا ہو (یعنی اس صورت میں اس کا امام بننا جائز ہوگا)۔ اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں کہ جسے امام وخطیب جمعہ مقرر کرنے کا اختیار ہے، اس کا خود کسی امام کی اقتداء میں جمعہ پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اُسے اس کی اجازت حاصل ہے''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3،ص:12)

علامہ شیخ احمد طحطاوی لکھتے ہیں: فَصَاحِبُ الْبَیْتِ وَالْمَجْلِسِ وَاِمَامُ الْمَسْجِدِ أَحَقُّ بِالْاِمَامَةِ مِنْ غَیْرِہٖ وَاِنْ کَانَ الْغَیْرُ أَفْقَہَ، وَأَقْرَأَ، وَأَوْرَعَ وَأَفْضَلَ مِنْہُ، اِنْ شَاءَ تَقَدَّمَ وَاِنْ شَاءَ قَدَّمَ مَنْ یُّرِیْدُہٗ، وَاِنْ کَانَ الَّذِیْ یُقَدِّمُہٗ مَفْضُوْلًا بِالنِّسْبَةِ اِلٰی بَاقِی الْحَاضِرِیْنَ، لِأَنَّہٗ سُلْطَانُہٗ فَیَتَصَرَّفُ فِیْہِ کَیْفَ شَاءَ۔

ترجمہ: ''صاحبِ خانہ وصاحبِ مجلس اور امامِ مسجد دوسرے لوگوں کی نسبت (امامت کے) زیادہ حق دار ہیں، اگرچہ اُن کا غیر زیادہ فقیہ، اچھا قرآن پڑھنے والا (عمدہ قاری) اور زیادہ پرہیزگار ہو اور اُن سے افضل بھی ہو، اُسے اختیار ہے کہ اگر چاہے تو خود آگے بڑھے (امامت کرے) اور چاہے تو (مذکورہ افراد میں سے) کسی کو آگے بڑھائے، خواہ وہ باقی حاضرین کی نسبت کم فضیلت والا ہو، اِس لئے کہ اس معاملہ کا اختیار اُسے حاصل ہے، جیسے

چاہے کرے، (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 1، ص:405)"۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر وہ عیدگاہ مسجد انتظامیہ ہی کے زیرِ انتظام ہے اور اسی جامع مسجد کی عیدگاہ کے نام سے معروف وموسوم ہے تو نمازِ عید کی امامت اور خطبۂ مسنونہ کا زیادہ حق دار اس جامع مسجد کے امام وخطیب ہی ہیں۔

فرض نماز کی آخری دو رکعات میں فاتحہ کے بعد تلاوت پر سجدۂ سہو واجب نہیں

سوال:

اگر فرض نماز کی آخری دو رکعات میں بھولے سے سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملائی تو کیا سجدۂ سہو کرنا ہوگا؟، (امتیاز احمد، اورنگی ٹاؤن)۔

جواب:

اگر فرض کی تیسری یا چوتھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد قصداً یا سہواً کوئی سورت پڑھ لی تو سجدۂ سہو واجب نہیں۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَلَوْ قَرَأَ فِي الْأُخْرَيَيْنِ الْفَاتِحَةَ وَالسُّوْرَةَ لَا يَلْزَمُهُ السَّهْوُ وَهُوَ الْأَصَحُّ، وَلَوْ قَرَأَ فِي رُكُوْعِهٖ أَوْ سُجُوْدِهٖ أَوْ تَشَهُّدِهٖ يَلْزَمُهُ، وَهٰذَا إِذَا بَدَأَ بِالْقِرَاءَةِ ثُمَّ بِالتَّشَهُّدِ، وَإِنْ بَدَأَ بِالتَّشَهُّدِ ثُمَّ بِالْقِرَاءَةِ فَلَا سَهْوَ عَلَيْهِ، كَذَا فِيْ "مُحِيْطِ السَّرَخْسِيِّ"۔

ترجمہ: "اگر (فرض کی) آخری دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور (دوسری کوئی) سورت پڑھی تو سجدۂ سہو لازم نہیں ہوگا اور یہی صحیح ترین قول ہے۔ اور اگر رکوع یا سجود یا تشہد میں قرآن پڑھا، تو سجدۂ سہو لازم ہے اور یہ اُس وقت ہے کہ جب (التحیات میں) ابتدا قراءت سے کی اور پھر تشہد پڑھی ہو اور اگر پہلے التحیات پڑھی اور پھر قراءت کی تو اُس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، جیسا کہ "محیط السرخسی" میں ہے"۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:126)

نمازِ جمعہ کی دوسری جماعت جائز نہیں

سوال:

کیا مسجد میں ایک نمازِ جمعہ کے بعد دوسری نمازِ جمعہ باجماعت ادا کی جاسکتی

ہے؟،(شاہد علی، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

جمعہ وعیدین کی نمازوں کی امامت کا حق ہر ایک کو حاصل نہیں، فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق سلطانِ اسلام یا اُس کی جانب سے مامور کسی شخص کو جمعہ قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ موجودہ دور میں امامِ مُعیّن جو امامِ جمعہ بھی ہے، جمعے کے قیام کا اُسی کو حق حاصل ہے۔ ایک مسجد میں ایک جمعے کی اقامت کے لئے دو امام مقرر نہیں ہو سکتے، لہٰذا ایک مسجد میں جمعہ دو بار قائم نہیں ہوسکتا، جب کچھ لوگ اِس مسجد میں جمعہ کی جماعت نہ پا سکیں تو دوسری مسجد میں جا کر جمعہ ادا کریں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو صرف نمازِ ظہر الگ الگ ادا کریں، جماعت جائز نہیں ہوگی۔

امامِ مُعیّن کی موجودگی میں کسی کو اُس کی اجازت کے بغیر نماز پڑھانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: رَجُلٌ خَطَبَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ بِغَیْرِ اِذْنِ الْاِمَامِ وَالْاِمَامُ حَاضِرٌ، لَایَجُوْزُ ذٰلِکَ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ الْاِمَامُ اَمَرَہٗ بِذَالِکَ۔

ترجمہ:"جمعہ کے دِن امام کی موجودگی میں کوئی شخص امام کی اجازت کے بغیر خطبہ دینا چاہے تو اُس کے لئے جائز نہیں ہے، سوائے اِس کے کہ امام کی اجازت سے اُس نے ایسا کیا ہو۔(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:145)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَفِی "السِّرَاجِیَّةِ" لَوْ صَلّٰی اَحَدٌ بِغَیْرِ اِذْنِ الْخَطِیْبِ لَایَجُوْزُ، اِلَّا اِذَا اقْتَدٰی بِہٖ مَنْ لَّہٗ وِلَایَةُ الْجُمُعَةِ۔

ترجمہ:"""سراجیہ" میں ہے: اگر خطیب کی اجازت کے بغیر کسی نے جمعہ پڑھایا تو جائز نہیں، سوائے اس صورت کے کہ جسے نمازِ جمعہ خود پڑھانے یا اُس کا امام مقرر کرنے کی ولایت حاصل ہے، وہ خود بھی اس شخص کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا ہو (یعنی اس صورت میں اس کا امام بننا جائز ہوگا)۔ اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں کہ جسے امام وخطیب جمعہ مقرر

کرنے کا اختیار ہے، اس کا خود کسی امام کی اقتداء میں جمعہ پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اُسے اس کی اجازت حاصل ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص:12)''۔

ایک ہی مسجد میں دو بار نمازِ جمعہ ادا کرنا ہرگز جائز نہیں۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:'' ایک قصبہ میں ایک مسجد ہے جہاں لوگ بہت دنوں سے جمعہ پڑھا کرتے ہیں اگر امام مع چند لوگوں کے نمازِ جمعہ پڑھ لے تو بعدہٗ دوسرے لوگوں کو تکرارِ نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر پڑھ لیا تو نماز اُن کی ہوگئی یا نہیں؟''۔ آپ جواب میں لکھتے ہیں:'' ایک مسجد میں تکرارِ نمازِ جمعہ ہرگز جائز نہیں، وَقَدْ اَخْطَاَ بَعْضُ الْعَصْرِیِّیْنَ مِنْ لَکْھنَوْ فِیْ تَجْوِیْزِ ذٰلِکَ مُغْتَرًّا بِجَوَازِ التَّعَدُّدِ کَمَا بَیَّنَّاہُ فِیْ فَتَاوٰنَا ترجمہ:'' بعض معاصرین لکھنؤ نے اسے جائز کہہ کر غلطی کی ہے، اُنہیں تعدد جمعہ کے جواز میں دھوکا ہوا ہے جیسا کہ ہم نے اپنے فتاویٰ میں بیان کردیا ہے''۔

جمعہ وعیدین کی امامت مثل نمازِ پنجگانہ نہیں کہ جسے چاہے امام کردیجئے، بلکہ اُس کے لئے شرط لازم ہے کہ امام ماذون من جہۃ سلطانِ الاسلام ہو، بلا واسطہ یا بالواسطہ کہ ماذون کا ماذون ہو یا ماذون الماذون کا ماذون ہو، وَھَلُمَّ جَرًّا بِضَرُوْرَۃٍ اَوْبِدُوْنِھَا اَیْضًا عَلَی اخْتِلَافِ الْقِیْلَیْنِ مَعَ شَرْطِ الْمَعْلُوْمِ الْمُبِیْنِ فِیْ کَلِمَاتِ الْعُلَمَاءِ الْکِرَامِ ترجمہ:'' اور اسی طرح آگے ضرورت کی وجہ سے یا اس کے بغیر بھی۔ اختلافِ قولین کی بنا پر، باوجودیکہ علماء کرام کی عبارات میں شرط معلوم اور واضح ہے۔ یہاں تک کہ اگر بغیر اُس کی اجازت کے دوسرا شخص امامتِ جمعہ کرے، نماز نہ ہوگی۔ سراجیہ میں ہے: لَوْ صَلّٰی اَحَدٌ بِغَیْرِ اِذْنِ الْخَطِیْبِ لَایَجُوْزُ، اِلَّا اِذَا اقْتَدٰی بِہٖ مَنْ لَہٗ وِلَایَۃُ الْجُمُعَۃِ۔

ترجمہ:'' اگر خطیب کی اجازت کے بغیر نماز پڑھائی تو جائز نہیں، البتہ اس صورت میں جب اس کی اقتدا کسی ایسے شخص نے کی جو جمعہ قائم کرسکتا تھا''۔ اَقُوْلُ: یہاں استثناء کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اجازت اس اجازت کو بھی شامل ہے جو دلالۃً ہو۔ درمختار میں ہے: وَاَقَرَّہٗ شَیْخُ الْاِسْلَامِ (اسے شیخ الاسلام نے ثابت رکھا) ہاں! جہاں ماذونِ سلطان نہ باقی

ہو وہاں بضرورتِ اقامت شعار اجتماعِ مسلمین کو قائم مقام اذنِ سلطان قرار دیا ہے، یعنی مسلمان متفق ہو کر جسے امامِ جمعہ مقرر کرلیں، وہ مثل امام "ماذون من السلطان" ہو جائے گا۔ درمختار میں ہے: نَصْبُ الْعَامَّةِ الْخَطِيْبَ غَيْرُ مُعْتَبَرٍ مَعَ وُجُوْدِ مَنْ ذُكِرَ، اَمَّا مَعَ عَدَمِهِمْ فَيَجُوْزُ لِلضَّرُوْرَةِ ترجمہ: "مذکورہ اشخاص کے ہوتے ہوئے عوام کا خطیب مقرر کرنا معتبر نہیں، البتہ اگر مذکورہ افراد نہ ہوں تو ضرورت کی وجہ سے جائز ہوگا"۔

اور شک نہیں جو امر ضرورۃً جائز رکھا گیا وہ حدِ ضرورت سے تجاوز نہیں کرسکتا لِمَا عُرِفَ مِنَ الْقَاعِدَةِ الْمُطَّرِدَةِ الْفِقْهِيَّةِ بَلْ وَالْعَقْلِيَّةِ اِنَّ مَا كَانَ بِضَرُوْرَةٍ فَتَقَدَّرَ بِقَدْرِهَا۔ کیونکہ فقہ بلکہ عقلاً قاعدۂ مسلمہ ہے کہ جو کچھ ضرورت کی وجہ سے ہوتا ہے، وہ ضرورت کی مقدار کے برابر ہی ہوتا ہے اور مسجد واحد کے لئے وقتِ واحد میں دو امام کی ہرگز ضرورت نہیں، تو جب پہلا امام مُعیّن جمعہ ہے، دوسرا ضرور اُس کی لیاقت سے دُور مہجور، تو اُس کے پیچھے نمازِ جمعہ باطل ومحذور، البتہ اگر امام مُعیّن نے براہِ شرارت خواہ اپنی کسی خاص حاجت کے سبب جلدی کی اور وقتِ معہود سے پہلے معدودے چند کے ساتھ نماز پڑھ لی، عامہ جماعت مسلمین وقت معیّن پر حاضر ہوئی، تو اب ظاہراً مقتضائے نظر فقہی یہ ہے کہ اُنہیں جائز ہو کہ دوسرے شخص کو باتفاق عام مسلمین امام مقرر کریں اور نمازِ جمعہ پڑھیں"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 362-361، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نمازِ تراویح کے اجتماعات میں تلفظ کی ادائیگی وقراءت کا حکم

سوال:

ماہِ رمضان المبارک میں جگہ جگہ 5 روزہ، 10 روزہ اور 15 روزہ تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں اکثر حفاظ قرآن پاک کو غلط انداز میں پڑھتے ہیں، جبکہ مقتدیوں کا بھی تصور یہ ہوتا ہے کہ چند روزہ تراویح کے بعد مزید نہیں پڑھنی، دوسری طرف ان محافلِ تراویح میں شامل اکثر لوگ پیچھے بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے ہیں اور رکوع میں جانے سے پہلے جماعت میں شامل ہوجاتے ہیں۔ کیا اس طرح کی تراویح کا اہتمام کرنا

مناسب ہے؟۔(حاجی رضوان الٰہی، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید مطلقاً صحیح پڑھنا فرض ہے، خواہ نماز میں ہو یا بیرونِ نماز، قرآن مجید کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۝

ترجمہ: ''اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، (المزمل:4)''۔

حروف کی ادائیگی اُن کے مخارج سے درست طور پر ہو، وہ صفات جن سے ایک مخرج کے چند حروف ایک دوسرے سے ممتاز ہوں، اُن کی رعایت کی جائے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: لَا یَنْبَغِیْ لِلْقَوْمِ اَنْ یُّقَدِّمُوْا فِی التَّرَاوِیْحِ الْخُوْشْخَوَانَ لٰکِنْ یُّقَدِّمُوا الدُّرُسْتْخَوَانَ فَاِنَّ الْاِمَامَ اِذَاقَرَأَ بِصَوْتٍ حَسَنٍ یَشْغَلُہٗ عَنِ الْخُشُوْعِ وَالتَّدَبُّرِوَالتَّفَکُّرِ کَذَافِیْ ''فَتَاوٰی قَاضِیْ خَانَ''۔

ترجمہ: ''قوم کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ نمازِ تراویح میں محض خوش الحان کو اپنا امام بنائیں بلکہ درست خواں (صحیح پڑھنے والے) کو امام بنانا چاہیے۔ کیونکہ بعض اوقات لوگ خوش الحان قاری کی آواز کے سحر میں کھو کر نماز میں خشوع وخضوع اور آیاتِ الٰہی میں تدبرو تفکر سے غافل ہو جاتے ہیں، جیسا کہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے''۔

نوٹ: فتاویٰ عالمگیری کے حاشیہ میں ''بحراوی'' کے حوالے سے ''خوشخواں'' کے معنیٰ ''اچھی آواز کے ساتھ پڑھنا'' اور ''درست خواں'' کے معنیٰ ''صحیح قراءت کے ساتھ پڑھنا'' کئے ہیں۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:116، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ اس مسئلے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''افسوس صد افسوس کہ اس زمانے میں حفاظ کی حالت ناگفتہ بہ ہے، اکثر تو ایسا پڑھتے ہیں کہ ''یَعْلَمُوْنَ، تَعْلَمُوْنَ'' کے سوا کچھ پتہ نہیں چلتا، الفاظ وحروف کھا جایا کرتے ہیں، جو اچھا پڑھنے والے کہے جاتے ہیں، اُنہیں دیکھئے تو حروف صحیح ادا نہیں ہوتے۔ ہمزہ، الف، عین اور ذ، ز، ظ اور ث، س، ص، ت، ط وغیرہا حروف میں تفرقہ نہیں کرتے، جس سے قطعاً

نماز ہی نہیں ہوتی۔ فقیر کو انہی مصیبتوں کی وجہ سے تین سال ختم قرآن مجید سننا نہ ملا''۔

(بہارِ شریعت، جلد اول، حصہ پنجم، ص:271)

پانچ روزہ، دس روزہ یا پندرہ روزہ تراویح کی ادائیگی میں شرعی طور پر تو کوئی قباحت نہیں ہے بشرطیکہ قرآن مجید صحیح پڑھا جائے، الفاظ کی ادائیگی صحیح ہو اور سننے والے کی سمجھ میں آئے۔ اگر پانچ یا دس روزہ تراویح وختمِ قرآن سے یہ سمجھا جائے کہ بس ایک قرآن ختم ہو گیا، اب تراویح سے بھی فارغ، تو یہ طرزِ عمل اور سوچ بالکل غلط ہے، تراویح پورے ماہِ رمضان کی سنّت ہے، ختمِ قرآن خواہ ستائیسویں شب کو ہو یا اس سے کم دنوں میں، چاہئے کہ بقیہ دنوں کی تراویح بھی باقاعدگی سے پڑھیں۔ دورانِ نماز مقتدیوں پر خاموشی کے ساتھ تلاوت سننا فرض ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝
ترجمہ: ''اور جب قرآن پڑھا جائے، تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، (الاعراف:204)''۔

سہ روزہ، پنج روزہ، شش روزہ یا دس روزہ تراویح میں شرکت کرنے والے بعض افراد کا عمل جو آپ نے نقل کیا ہے، یہ انتہائی افسوس ناک ہے، یہ ایک طرح سے نماز، قرآن اور قیام کی اہمیت کو کم کرنا ہے اور اہانت کے مترادف ہے، ایسے لوگ اپنا طرزِ عمل درست کریں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں۔

مسجد اور وقف کے مسائل

وقف کا شرعی حکم

سوال:

بکر نے ایک بنگلہ مسجد بنانے کے لئے خریدا، چہار دیواری توڑ کر نماز شروع کر دی گئی، جیسے جیسے فنڈ جمع ہوتا گیا دیواروں پر ٹائل، فرش پر ماربل اور دروازے وغیرہ لگا دیئے گئے۔ اِس کام کے لئے بکر نے زید کو ذمہ دار بنایا اور ساتھ ہی اُسے یہ بھی کہا کہ تین صفوں کی عارضی نیت کرلیں تا کہ جب مسجد کی مزید توسیع ہو تو ازسرِ نو تعمیر کروا کر خواتین کا مدرسہ اور امام و مؤذن کی رہائش بھی بنائی جائے۔ چنانچہ زید نے اِس طرح نیت کی کہ آج سے یہ تین صفیں مسجد ہیں۔ اب مسجد کی تعمیر گراؤنڈ + تین فلور مکمل ہو چکی ہے۔ امام کا مصلّٰی پہلی منزل پر رکھا گیا ہے اور گراؤنڈ فلور بھی مسجد میں شامل ہے۔

(۱) گراؤنڈ فلور پر جو تین صفوں کی نیت کی تھی، یہ آسمان تک مسجد کہلائے گی یا صرف وہی تین صفیں؟۔ کیا پہلی منزل پر مسجد کی نیت کر کے جماعت کر سکتے ہیں؟۔

(۲) دوسری منزل پر خواتین کا مدرسہ اور تیسری منزل پر امام و مؤذن کی رہائش بنا سکتے ہیں؟، (محمد زاہد انصاری، کراچی یونیورسٹی)۔

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثریٰ) تک مسجد ہی ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: قَوْلُهٗ اِلٰی عَنَانِ السَّمَاءِ بِفَتْحِ الْعَیْنِ وَکَذَا اِلٰی تَحْتَ الثَّرٰی کَمَا فِی ''الْبِیْرِیِّ'' عَنِ الْاِسْبِیْجَابِیِّ۔

ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے ''بیری'' میں اسبیجابی سے اسی طرح منقول ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 2، ص: 370-371)''۔ تکمیلِ مسجد کے بعد محض تین صفیں مسجد قرار نہیں دی جائیں گی، بلکہ مسجد کی عمارت پوری کی پوری مسجد کہلاتی ہے اور مسجد کے جمیع اجزاء کا حکم یکساں ہے، جس طرح نیچے مسجد کے اندر نماز صحیح اور مشروع ہے، اسی طرح فرسٹ فلور پر بھی نماز باجماعت جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مسجد ہی ہے، لہٰذا

صورتِ مسئولہ میں فرسٹ فلور پر نماز باجماعت پڑھنے میں ازروئے شرع کوئی حرج نہیں ہے، البتہ فقہاءِ کرام کی تصریحات کی رو سے فقط امام کا اونچی جگہ کھڑا ہونا مکروہِ تنزیہی ہے، لیکن اگر امام کے ساتھ کچھ مقتدی بھی اوپر کھڑے ہوں اور باقی امام سے نیچے ہوں تو ایسی صورت میں بلاکراہت نماز جائز ہے۔

(۲) بالغ طالبات کا مسجد کی چھت پر مدرسہ قائم کرنا بوجوہ درست نہیں ہے، ایک تو یہ کہ ایسی طالبات اوران کی معلمات کے فطری طور پر ایامِ حیض بھی آتے ہیں اوران ایام میں عورت کا مطلقاً مسجد میں داخل ہونا منع ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَلَایَحِلُّ لِلْجُنُبِ وَالْحَائِضِ وَالنُّفَسَاءِ الْوُقُوْفُ عَلَیْہِ۔

ترجمہ: ''اور جنبی، اور حیض ونفاس والی عورت کا مسجد کی چھت پر ٹھہرنا جائز نہیں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2،ص:370)

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَسَطْحُ الْمَسْجِدِ لَہٗ حُکْمُ الْمَسْجِدِ کَذَا فِی ''الْجَوْھَرَۃِ النَّیِّرَۃِ''۔

ترجمہ: ''اور مسجد کی چھت مسجد ہی کے حکم میں ہے، ''جوہرہ نیرہ'' میں اسی طرح سے ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد: اول،ص:38، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

مسجد کی چھت پر مدرسے کا قیام، وقف میں تبدیلی کرنا ہے اور مسجد مکمل ہونے کے بعد اس کے مصرف میں تغییر کرنا جائز نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَایَجُوْزُ تَغْیِیْرُ الْوَقْفِ عَنْ ھَیْئَتِہٖ۔

ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد:2ص:490)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: اَمَّا لَوْتَمَّتِ الْمَسْجِدِیَّۃُ ثُمَّ اَرَادَ الْبِنَاءَ مُنِعَ۔

ترجمہ: ''اگر کسی مسجد کی مسجدیت تمام ہوجائے پھر اگر اس میں مزید تعمیر کا ارادہ ہو (جس سے اس وقف کے مصرف میں تبدیلی ہوتی ہو) تو اسے روک دیا جائے گا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 6ص:428)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز مسجد کے نیچے دکان بنانے کے مجوزین کی اس دلیل (کہ مسجد کے اوپر امام کے لئے بالا خانہ بنانا جائز ہے) کے جواب میں لکھتے ہیں: صورتِ مستفسرہ میں وہ دکانیں قطعی حرام، اور وہ بالا خانہ بھی قطعی حرام، ہاں وقت بنائے مسجد قبلِ تمامِ مسجدیّت نیچے مسجد کے لئے دکانیں یا اوپر امام کے لئے بالا خانہ بانی بنائے اور اس کے بعد اسے مسجد کرے تو جائز ہے، اور اگر مسجد بنا کر بنانا چاہے اگرچہ مسجد کی دیوار کا صرف اُسارا اس میں لے اور کہے میری پہلے سے یہ نیت تھی ہرگز قبول نہ کریں گے اور عمارت کو ڈھادیں گے، درمختار میں ہے: لَوْبَنٰی فَوْقَهٗ بَيْتًا لِلْاِمَامِ لَا يَضُرُّ، لِاَنَّهٗ مِنَ الْمَصَالِحِ اَمَّا لَوْ تَمَّتِ الْمَسْجِدِيَّةُ ثُمَّ اَرَادَ الْبِنَاءَ مُنِعَ، وَلَوْقَالَ عَنَيْتُ ذٰلِكَ لَمْ يُصَدَّقْ، ''تَاتَارْخَانِيَه'' فَاِذَا كَانَ هٰذَا فِي الْوَاقِفِ فَكَيْفَ بِغَيْرِهٖ، فَيَجِبُ هَدْمُهٗ وَلَوْعَلٰی جِدَارِ الْمَسْجِدِ وَلَا يَجُوْزُ اَخْذُ الْاُجْرَةِ مِنْهُ وَلَا اَنْ يَّجْعَلَ شَيْئًا مِّنْهُ مُسْتَغِلًّا وَلَا سُكْنٰی ''بَزَّازِيَة''۔

ترجمہ: ''اگر واقف نے مسجد کے اوپر امام کے لئے حجرہ بنادیا، تو حرج نہیں، کیونکہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے، لیکن تمامِ مسجدیّت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے، تو اس کو منع کیا جائے گا، اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی'' تاتارخانیہ''، جب خود واقف کا یہ حکم ہے تو کسی اور کو یہ اختیار کیسے ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ایسی عمارت کو گرانا واجب ہے، اگرچہ صرف دیوار مسجد پر وہ استوار کی گئی ہو، اس کی اجرت لینا یا مسجد کا کوئی حصہ کرائے کے لئے یا رہائش کے لئے مقرر کرنا جائز نہیں (بزازیہ)''۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 432,433 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

اگر مسجد تمام ہونے سے قبل بانیٔ مسجد نے نیت کرلی تھی کہ اوپر امام وموذن کی رہائش گاہ بھی بنائی جائے گی، تو بنائی جاسکتی ہے، لیکن اگر مسجدیت تمام ہونے کے بعد وہ چاہے کہ اب رہائش بنائی جائے، تو ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔

قبرستان میں اپنے لئے جگہ مخصوص کرنے کا شرعی حکم

سوال:

کسی قبرستان میں جو چاہے سرکاری ہو یا کسی انجمن کا ہو یا کسی ایسوسی ایشن کا ہو کیا وہاں پر اپنے خاندان کے لئے کوئی جگہ قیمتاً خریدی جاسکتی ہے جس میں باؤنڈری بنا کر اپنے لئے مخصوص کرلی جائے، (محمد انور، بلاک 22، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

مسلمانوں کے عام قبرستان درحقیقت وقف ہوتے ہیں اور وقف میں کسی شخص کا ایسا تصرُّف کرنا جس سے ذاتی ملکیت کا اظہار ہو، جائز نہیں ہے۔ جو قبرستان خاص کسی انجمن وغیرہ کی ملک ہو، ایسے قبرستان میں اُس انجمن کے ذمہ داران سے اجازت کے بغیر دفن نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وقف میں مالکانہ تصرُّف حرام ہے۔ لِأَنَّ الْوَقْفَ لَايُمَلَّكُ (وقف کسی کا مملوک نہیں ہوسکتا)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: فَاِذَا تَمَّ وَلَزِمَ لَايُمَلَّكُ وَلَايُعَارُ وَلَا يُرْهَنُ

ترجمہ: ''پس جب وقف تام (مکمل) ہوجائے تو نہ تو کسی کو اس کا مالک بنایا جاسکتا ہے، نہ اسے عاریتاً دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے رہن رکھا جاسکتا ہے۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (لَايُمَلَّكُ) أَیْ لَايَكُوْنُ مَمْلُوْكًا لِصَاحِبِهٖ وَلَايُمَلَّكُ أَیْ لَايَقْبَلُ التَّمْلِيْكُ لِغَيْرِهٖ بِالْبَيْعِ وَنَحْوِهٖ لِاسْتِحَالَةِ تَمْلِيْكِ الْخَارِجِ عَنْ مِلْكِهٖ وَلَايُعَارُ، وَلَايُرْهَنُ لِاقْتِضَائِهِمَا الْمِلْكَ۔

ترجمہ: ''(وہ کسی کی مِلک نہیں بنے گا) یعنی وقف کرنے والے کی ملکیت میں نہیں رہے گا اور نہ ہی بیع وغیرہ کے ذریعے کسی دوسرے کی مِلک میں دیا جاسکے گا، کیونکہ جو چیز کسی کی اپنی مِلک سے نکل جائے، اس کے لئے کسی دوسرے کو اُس کا مالک بنانا ممکن نہیں ہے۔ نہ اُسے کسی کو عاریۃً دیا جاسکتا ہے اور نہ رہن ہی رکھا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں مِلک کا تقاضا کرتی ہیں (اور وقف شدہ چیز واقف کی مِلک میں نہیں رہتی)، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص: 421)''۔

کسی جگہ کو چہار دیواری بنا کر کسی ذاتی مَصرَف کے لئے مخصوص کر لینا، اُس شے میں مالکانہ تصرُّف کی حیثیت رکھتا ہے، جو وقف میں نہیں کی جا سکتی۔ قبرستانِ اَمواتِ مسلمین کے لئے عام ہیں، وہاں تدفین مسلمانوں کا حق ہے۔ پھر ارشادِ ربّ العالمین ہے: وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ

ترجمہ: ''اور کوئی شخص (از خود) نہیں جانتا کہ وہ کس جگہ مرے گا، (لقمان: 34)''۔

ایک فقہی اصول ہے کہ ''شَرْطُ الْوَاقِفِ کَنَصِّ الشَّارِعِ'' یعنی وقف کے مصرف کے بارے میں واقف کی شرط نصِ شارع کی طرح نافذ ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے کوئی قطعۂ زمین اپنے خاندان کے افراد کے لئے بطور قبرستان وقف کیا، تو اس میں صرف ''موقوف علیہم'' کے اَموات ہی کو دفن کیا جا سکے گا، نہ کہ عام مسلمانوں کو۔ اسی طرح جو قطعۂ زمین کسی کمیونٹی یا برادری کے لوگوں نے اپنے اراکین اور اُن کے لواحقین کی اَموات کیلئے قبرستان کی نیت سے وقف کیا ہے، اس میں انہی لوگوں کی اَموات کو دفن کیا جا سکتا ہے۔

وقف میں تبدیلی جائز نہیں

سوال:

ایک صاحب نے مدرسے کی نیت سے جگہ خرید کر وقف کر دی اور وہ خود اس کے متولی بھی ہیں۔ اُن کا ارادہ ہے کہ اس جگہ کو تین منزلہ بنا کر ایک منزل کرائے پر دے دی جائے تا کہ اس کا کرایہ مدرسے پر خرچ ہو، ایک حصے میں دوا خانہ قائم کرنا چاہتے ہیں تا کہ اُس کی آمدنی وقف پر خرچ ہو۔ وقف کی عمارت میں دینی و دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول بھی قائم کرنا چاہتے ہیں تا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کریں اور اس کی آمدنی بھی وقف کی جگہ پر استعمال ہو گی، وقف کی عمارت میں ایک کمرہ امام مسجد کو تاحیات ان کی خدمات کے بدلے دینا چاہتے ہیں۔ کیا مندرجہ بالا اُمور کی اجازت ہے یا نہیں؟۔ اگر ابتداءً کثیر الاستعمال کاموں کی نیت نہ کی ہو تو کیا اب وہ نیت کر سکتا ہے؟۔

(سعید الدین اشرفی، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

آپ کے بیان کے مطابق واقف نے قطعۂ زمین کو مدرسے کی نیت سے وقف کیا ہے۔شریعت کی رُو سے جب کوئی چیز وقف کردی جائے اور وقف مکمل ہو جائے تو اُس سے رجوع یا اُس میں تغیر وتبدُّل کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ وقف کے ساتھ ہی مذکورہ پلاٹ واقف (وقف کرنے والے) کی ملکیت سے خارج ہو گیا اور واقف کو بھی اُس میں تبدیلی کی اجازت نہیں ہے۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَایَجُوْزُ تَغْیِیْرُ الْوَقْفِ عَنْ هَیْئَتِهٖ، ترجمہ:''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 490)''۔جب وقف شدہ چیز کا مقصد واقف نے مُتعیّن کردیا ہو تو فقہی اصول یہ ہے کہ''شَرْطُ الْوَاقِفِ کَنَصِّ الشَّارِعِ''،''یعنی واقف کی مقررہ شرائط نصِ شرعی کی طرح مؤثر ہوتی ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6،ص:508،داراحیاء التراث العربی)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: فَإِذَاتَمَّ وَلَزِمَ لَایُمَلَّکُ وَلَایُعَارُ وَلَایُرْهَنُ

ترجمہ:''پس جب وقف تامّ (مکمل) ہوجائے تو نہ تو کسی کو اس کا مالک بنایا جا سکتا ہے، نہ اسے عاریتاً دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے رہن رکھا جاسکتا ہے۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (لَایُمَلَّکُ) أَیْ لَایَکُوْنُ مَمْلُوْکًا لِصَاحِبِهٖ وَلَایُمَلَّکُ أَیْ لَایَقْبَلُ التَّمْلِیْکُ لِغَیْرِهٖ بِالْبَیْعِ وَنَحْوِهٖ لِاسْتِحَالَةِ تَمْلِیْکِ الْخَارِجِ عَنْ مِلْکِهٖ وَلَا یُعَارُ، وَلَایُرْهَنُ لِاقْتِضَائِهِمَا الْمِلْکَ۔

ترجمہ:''(وہ کسی کی مِلک نہیں بنے گا) یعنی وقف کرنے والے کی ملکیت میں نہیں رہے گا اور نہ بیع وغیرہ ہی کے ذریعے کسی دوسرے کی مِلک میں دیا جاسکے گا، کیونکہ جو چیز کسی کی اپنی مِلک سے نکل جائے، کسی دوسرے کو اُس کا مالک بنانا ممکن نہیں ہے۔نہ اُسے کسی کو عاریۃً دیا جاسکتا ہے اور نہ رہن ہی رکھا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں مِلک کا تقاضا کرتی ہیں (اور وقف شدہ چیز واقف کی مِلک میں نہیں رہتی)''۔(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6،ص:421)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اَلْبُقْعَةُ الْمَوْقُوْفَةُ عَلٰی جِهَةٍ إِذَا بَنٰی رَجُلٌ فِیْهَا بِنَاءً

وَوَقَفَهَا عَلٰى تِلْكَ الْجِهَةِ يَجُوْزُ بِلَا خِلَافٍ تَبْعًا لَهَا فَإِنْ وَقَفَهَا عَلٰى جِهَةٍ أُخْرٰى اِخْتَلَفُوْا فِىْ جَوَازِهٖ وَالْأَصَحُّ أَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ كَذَا فِى الْغِيَاثِيَّةِ۔

ترجمہ: ''کسی مقصد کے لئے وقف شدہ قطعۂ زمین پر کسی نے عمارت بنائی اور اُس عمارت کو اُسی مقصد کے لئے وقف کردیا، (جس کے لئے قطعۂ زمین وقف تھا) تو اُس کی تبعیت میں اس عمارت کا وقف بغیر کسی اختلاف کے درست ہے، لیکن اگر عمارت کو کسی دوسرے مقصد کے لئے وقف کیا تو اس کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے، زیادہ صحیح یہ ہے کہ جائز نہیں، ''غیاثیہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 362)''۔

اُس وقف شدہ زمین پر جس قدر بھی تعمیر کی جائے گی، صرف مدرسے ہی کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے، نہ کرائے پر دے سکتے ہیں اور نہ ہی کسی اور مقصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔ وقف مکمل ہونے کے بعد اُسے تبدیل کرنا یا ختم کرنا جائز نہیں ہے اور شرعاً وقف میں تبدیلی کرنا حرام ہے اور تبدیلی کرنے والا سخت گناہ گار ہے۔ تکمیلِ وقف کے بعد واقف کو بھی اُس میں تبدیلی کا اختیار حاصل نہیں ہے اور نہ ہی اب دیگر مشاغل کی نیت کرسکتا ہے۔

مسجد کا نام واقف کی نسبت سے ہوسکتا ہے

سوال:

ایک شخص مسجد تعمیر کروا رہا ہے، اور مسجد کا نام اپنے والد کے نام پر رکھنا چاہتا ہے، یعنی ''جامع مسجد غلام نبی''، کیا اس طرح نام رکھا جاسکتا ہے؟۔

(حافظ رضاء المصطفیٰ، نارتھ کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ مسجد کا نام ''غلام نبی'' رکھا جاسکتا ہے، اگر مذکورہ شخص مسجد کا بانی بھی ہے، تو اُسے یہ حق حاصل ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَمِنْ تَضْدِهٖ نِسْبَةُ الْوَقْفِ اِلَيْهِمْ۔

ترجمہ: ''واقف کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وقف اُسی کی طرف منسوب رہے''۔
(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6،ص:499)

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لئے اُن کے نام سے کنواں وقف کیا۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ، أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ: إِنَّ أُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ، فَأَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: اَلْمَاءُ، قَالَ: فَحَفَرَ بِئْرًا وَقَالَ: هٰذِهٖ لِأُمِّ سَعْدٍ۔

ترجمہ: ''حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کی: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! امّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پا گئی ہیں تو (ان کے ایصالِ ثواب کیلئے) کون سا صدقہ افضل ہے؟، آپ نے ارشاد فرمایا: ''پانی''، چنانچہ انہوں نے کنواں کھود کر (وقف کر دیا) اور اُنہوں نے اُس کا نام ''بِئْرُ اُمِّ سَعْدٍ'' (امِ سعد کا کنواں) رکھا، (سنن ابی داؤد: 1678)''۔ یہ محض نسبت کے اظہار کے لئے ہوتا ہے یا ایصالِ ثواب کی نیت سے، ورنہ سب مساجد اللہ تعالیٰ کے لئے وقف ہوتی ہیں اور وقف کا مقصد اللہ کا تقرب، اُس کی رضا اور اجرِ آخرت کا حصول ہوتا ہے۔

مسجد میں توسیع کا شرعی حکم

سوال:

مسجد نور واقع سیکٹر D-11 نیو کراچی کی توسیع کی بابت شرعی رہنمائی درکار ہے۔ مسجد کے دائیں جانب کچھ جگہ تھی، جسے جنازہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا، اور بائیں جانب مسجد کے تحت مدرسہ کا آغاز کر دیا گیا۔ مسجد کا پورا فاؤنڈیشن شروع سے ایک ہی بنا ہوا ہے اور مدرسہ اور جنازہ گاہ بھی بعد میں بنائی تھی۔ دائیں جانب جو جگہ ہے اُس کے اوپر امام صاحب کے کمرے کا آدھا حصہ آتا ہے۔ کیا مسجد میں مذکورہ توسیع کی جا سکتی ہے؟۔ نیز مسجد کا فرش انتہائی خستہ حال ہے، اُس کو دوبارہ بنانا اسراف میں داخل تو نہیں؟۔
(محمد آصف رضا، جنرل سیکریٹری جامع مسجد نور، سیکٹر D-11 نیو کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ جنازہ گاہ اور مدرسے کی جگہ اُن مقاصد کے لئے وقف نہیں ہے بلکہ انتظامیہ سہولت کے پیشِ نظر اس جگہ کو جنازہ گاہ اور مدرسے کے لئے استعمال کر رہی تھی، تو اُس جگہ کو مسجد کی توسیع میں شامل کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر یہ جگہ ان مقاصد کے لئے وقف تھی تو پھر اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ وقف میں تبدیلی حرام ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَایَجُوْزُ تَغْیِیْرُ الْوَقْفِ عَنْ هَیْئَتِهٖ۔

ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''جو زمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے کام میں لائی جاسکتی ہے اور اُس کے بھی اسی کام میں جس کیلئے واقف نے وقف کی، وقف کو اس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں، شَرْطُ الْوَاقِفِ كَنَصِّ الشَّارِعِ فِیْ وُجُوْبِ الْعَمَلِ بِهٖ۔ (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص کی مثل ہے)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 16 ص:546، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

مساجد کے لئے عوام سے جو عمومی چندہ یا عطیات لئے جاتے ہیں، ان میں یہ امر معروف ہے کہ مسجد کے مَصارفِ جاریہ (Current Expenses) جن میں مساجد کے یوٹیلیٹی بلز، ضرورت کے وقت رنگ وروغن، دریاں، قالین، ٹیوب لائٹس، پنکھے، پانی وسیوریج کا انتظام اور مسجد کے عملے کی تنخواہیں اور مَصارف بھی شامل ہوتے ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ثُمَّ اِلٰی مَاهُوَ اَقْرَبُ اِلَی الْعِمَارَةِ وَاَعَمُّ لِلْمَصْلَحَةِ كَالْاِمَامِ لِلْمَسْجِدِ وَالْمُدَرِّسِ لِلْمَدْرَسَةِ یُصْرَفُ اِلَیْهِمْ بِقَدْرِ كِفَایَتِهِمْ ثُمَّ السِّرَاجِ وَالْبُسُطِ كَذٰلِكَ اِلٰی اٰخِرِ الْمَصَالِحِ، هٰذَا اِذَا لَمْ یَكُنْ مُعَیَّنًا فَاِنْ كَانَ الْوَقْفُ مُعَیَّنًا عَلٰی شَیْءٍ یُصْرَفُ اِلَیْهِ بَعْدَ عِمَارَةِ الْبِنَاءِ كَذَا فِی ''الْحَاوِی الْقُدْسِیِّ''۔

ترجمہ: ''پھر جو امر (مسجد کی) آبادکاری کے لئے ضروری ہے اور عام مفاد میں ہے، جیسے مسجد کے لئے امام اور مدرسے کے لئے مدرس، ان پر ضرورت اور کفایت کے مطابق

وقف کا مال خرچ کیا جائے ، پھر روشنی کا انتظام، دریاں وغیرہ ،اسی طرح مسجد کی دیگر ضروریات کیلئے (وقف کا) مال خرچ کیا جائے ، یہ اُس وقت ہے کہ جب وقف کے لئے دیئے ہوئے مال کا مقصد طے شدہ اور معین نہ ہو، اگر وقف کسی خاص مقصد کے لئے طے شدہ ہو تو عمارت کی تعمیر کے بعد اُسی پر صرف کیا جائے گا ،جیسا کہ ''الحاوی القدسی'' میں ہے،(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2،ص:368)''۔لہٰذا مسجد کا فرش اگر ایسا خستہ حال ہے کہ جس پر نماز پڑھنا دشوار ہو یعنی نماز پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہو، تو اُسے دوبارہ نئے سرے سے بنانے میں حرج نہیں ہے۔

میت اور جنازہ کے مسائل

میت کے غسل کے لئے دوسرے مسلک کی تنظیم کی خدمات لینا

سوال:

ایک غیر اسلامی ملک کی آبادی میں عرصہ دراز سے ایک تنظیم میت و جنازہ کے معاملات معاوضہ واخراجات کے ساتھ ادا کر رہی ہے ،اُس کے ذمہ داروں کی بعض کوتاہیوں، لاپرواہیوں اور کچھ ذاتی نوعیت کی رنجشوں اور اختلافات کے باعث دوسری تنظیم ان ہی خدمات کے لئے معرضِ وجود میں آگئی ہے۔ احوالِ واقعی یہ ہے کہ پہلی تنظیم کے ذمہ داران توسنی ہیں لیکن وہ آبادی میں شامل دیوبندی، تبلیغی، اہلِ قرآن کہلانے والے اور دیگر کے مُردوں کے لئے بھی بامعاوضہ خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ دوسری تنظیم کے ذمہ داران بھی عوام الناس پر مشتمل ہیں مگران میں دیوبندی تبلیغی بھی شامل ہیں اور وہ سنی عقائد کے مطابق میت کے معاملات کی ادائیگی میں مداخلت یا ممانعت نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں درج ذیل سوالات کے جواب مطلوب ہیں:

(۱) کیا اس دوسری تنظیم سے خدمات لینے والے سنی افراد پر کوئی شرعی اعتراض کیا جائے گا۔

(۲) اس دوسری تنظیم کے زیرِ انتظام اٹھائے ہوئے سنی میت کے جنازے کی امامت کرنے والے سنی عالم پر کوئی اعتراض ہوگا؟۔

(۳) اگر سنی عالم نمازِ جنازہ کی امامت نہ کرے، تو دیوبندی، تبلیغی عالم نمازِ جنازہ پڑھاتا ہے اور اہل سنت عوام اس کی اقتداء نہیں کرتے ،یوں اس سنی مردے کی نمازِ جنازہ غیر سنی کو پڑھانے کی اجازت دینا شرعاً کیسا ہوگا۔

(۴) اگر سنی صحیح العقیدہ اس دیوبندی تبلیغی کی اقتدا میں نمازِ جنازہ ادا کریں تو ان کیلئے کیا شرعی حکم ہوگا؟۔ (محمد عثمان، لوڈیم، جنوبی افریقہ)

جواب:

اہلسنت وجماعت کا داخلی انتشار ہر جگہ اپنی ناکامی کا سبب ہے، ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ہے، ایک دوسرے کا احترام نہیں کر پاتے ، سماجی تنظیمیں چلانے کی

اہمیت ہم میں مفقود ہوتی جارہی ہے۔ قیامت کے دن شیطان اپنے پیروکاروں سے کہے گا:
فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
ترجمہ: ''پس تم مجھے ملامت نہ کرو (بلکہ) اپنے آپ کو ملامت کرو، (ابراہیم:22)''۔ پس اہلسنّت بھی موجودہ دور میں اپنی ناکامیوں، بے تدبیریوں اور حکمت ودانش سے عاری طرزِ عمل کی وجہ سے اپنی ناکامیوں کے خود ذمہ دار ہیں۔ اہلِ سنّت پر بحیثیتِ مجموعی یہ ابتلاو آزمائش کا دور ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مافوق الاسباب اس قعرِ مذلّت سے نکلنے کیلئے کوئی صورت ہمارے لئے مُقدّر فرمائے۔ آپ کے دریافت طلب سوالات کے جوابات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اگر اہلسنّت وجماعت کے پاس اُس شہر/قصبے یا محلے میں اپنا مرکز ہے، تو اپنی میت کے غسل اور تجہیز وتکفین، جنازہ اور تدفین کے انتظامات اپنے مرکز میں اپنے اطمینان کے مطابق کریں۔ میت کو غسل دینا فرضِ کفایہ ہے۔ مستحسن بات یہ ہے کہ عامۃ المسلمین (مرد اورعورتیں) غسلِ میت کا مسنون طریقہ سیکھیں اور افضل یہ ہے کہ میت کا قریب ترین دین دار مرد اپنی مردانہ میت کو اور عورتیں اپنی زنانہ میت کو خود غسل دیں، ورنہ کم از کم اپنی نگرانی میں غسل دلائیں۔ تاہم اگر کسی ضرورت یا مجبوری کے تحت ملے جلے افراد پر مشتمل کسی دوسری تنظیم کے زیرِ اہتمام میت کو غسل دیا گیا ہے، اور شرعی تقاضے پورے کئے گئے ہیں، تو اس سے بھی غسلِ میت کا فریضہ ادا ہوجاتا ہے، یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اُس پر کوئی فتویٰ صادر کردیا جائے۔ بہتر یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل میں اہلسنّت کے مقامی ثقہ اور معتمد علیہ عالم سے رجوع کیا جائے، کیونکہ ان کو مقامی حالات سے آگاہی ہوتی ہے اور وہ مزید وضاحت کے لئے کسی کو طلب بھی کرسکتے ہیں۔ جنازہ بہرحال سُنّی عالم سے پڑھوانا چاہیے۔

(۲) اہلسنّت وجماعت کی اَموات کا جنازہ اہلسنّت وجماعت کے صحیح العقیدہ عالم ہی کو پڑھانا چاہیے، اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟۔ کیوں کہ آپ کے بیان کے مطابق اگر آپ اپنے ہم مسلک امام سے اپنی میت کی نمازِ جنازہ پڑھانا چاہیں، تو مخالف تنظیم آپ کو یہ

سہولت فراہم کرتی ہے اور اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی۔

(۳،۴) یہ سوالات خارج از بحث ہیں، جب اہلسنّت وجماعت کا صحیح العقیدہ عالم نمازِ جنازہ پڑھائے گا، تو تیسرے اور چوتھے سوال کی نوبت ہی نہیں آئے گی، یہ محض فرضی سوالات ہیں۔

کسی کی زمین میں اُس کی اجازت کے بغیر میت دفن کرنا

سوال:

میرے والد کا چھ سال قبل انتقال ہو چکا ہے، تدفین ہزارہ میں ہوئی۔ رشتہ داروں نے قبر تیار کروالی، جہاں قبر تیار کروائی، اُس زمین کے مالکان بھی موجود تھے اور اُس وقت اُنہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، لیکن کچھ عرصہ بعد اُنہوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا ہے کہ یہ ہماری جگہ ہے یہاں قبر کیوں بنائی۔ میں اُنہیں زمین کے بدلے زمین دینے کو تیار ہوں اور اگر زمین کے بدلے رقم لینا چاہیں تو اُس کے لئے بھی تیار ہوں لیکن وہ اِس پر راضی نہیں اور اِس بات پر بضد ہیں کہ میں وہاں سے اپنے والد کی لاش نکال لوں۔ اِس مسئلے کا حل کیا ہے؟، (محمد حمید خان، ہزارہ)۔

جواب:

کسی دوسرے کی زمین میں اُس کی اجازت کے بغیر میت کی تدفین کرنا جائز نہیں، اگر اُس کی اجازت کے بغیر تدفین کی گئی تو زمین کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ وہاں سے مردہ نکلوادے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اِذَا دُفِنَ الْمَیِّتُ فِیْ أَرْضِ غَیْرِہٖ بِغَیْرِ اِذْنِ مَالِکِھَا، فَالْمَالِکُ بِالْخِیَارِ اِنْ شَاءَ أَمَرَ بِاِخْرَاجِ الْمَیِّتِ وَاِنْ شَاءَ سَوَّی الْاَرْضَ وَزَرَعَ فِیْھَا، کَذَا فِی ''التَّجْنِیْسِ''۔

ترجمہ: ''کسی دوسرے شخص کی زمین میں اگر اُس کی اجازت کے بغیر میت کی تدفین کردی گئی تو مالک کو اختیار ہے کہ اگر وہ چاہے تو (اولیائے میت سے کہہ کر) مردے کو نکلوادے یا زمین برابر کر کے اُس میں کھیتی باڑی کرے، ''تجنیس'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری،

جلد 1،ص:167)

شریعتِ مطہرہ میں میّت کی تدفین کے بعد اُس کی قبر کھولنا ناجائز وحرام ہے، مگر جب کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو مثلاً کسی کو غصب شدہ زمین میں دفن کیا گیا یا دفن کے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں قبر کھودنے کی اجازت ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (لَا یُخْرَجُ مِنْہُ) بَعْدَ اِھَالَۃِ التُّرَابِ (اِلَّا) لِحَقِّ آدَمِیٍّ، (کَاَنْ تَکُوْنَ الْاَرْضُ مَغْصُوْبَۃً اَوْ اُخِذَتْ بِشُفْعَۃٍ) وَیُخَیَّرُ الْمَالِکُ بَیْنَ اِخْرَاجِہٖ وَمُسَاوَاتِہٖ بِالْاَرْضِ۔

ترجمہ: ''میت پر مٹی ڈال دینے کے بعد میّت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا، سوائے اس کے کہ کسی انسان کا حق اس سے متعلق ہو، مثلاً غصب شدہ زمین میں دفن کیا گیا ہو یا حقِ شفعہ کی بنا پر کسی نے لے لی ہو، تو زمین کے مالک کو اختیار ہوگا کہ میّت کو قبر سے نکلوادے یا زمین برابر کردے''۔(ردالمحتار جلد 3 صفحہ 135,136)

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ آپ کے والد کی قبر کی تیاری اور تدفین کے وقت زمین کے مالک موجود تھے اور اُنہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، تو یہ ایک طرح سے رضاءِ سکوتی (SILENT PERMISSION) ہے۔اب چھ سال بعد اُن کا قبر کی جگہ کو خالی کرنے کا مطالبہ درست نہیں ہے۔آپ نے اُنہیں جو دو تجویزیں دی ہیں کہ زمین کی موجودہ قیمت لے لیں یا بدلے میں زمین لے لیں، اُنہیں قبول کرلینا چاہئے۔متبادل کے طور پر ان کے پاس اب صرف زمین کو ہموار کرکے استعمال میں لانے کا اختیار ہے لیکن یہ ہماری معاشرتی اقدار کے خلاف ہے اور گاؤں کے بااثر اور دین دار لوگوں کو اُنہیں حسنِ سلوک پر آمادہ کرنا چاہئے۔

قبر کا پختہ کرنا

سوال:

قبر کو کناروں یا سنگِ مرمر سے پکا و مزین کرنا کیسا ہے؟،(عبدالقیوم، لانڈھی)۔

جواب:

عام مسلمانوں کی قبروں کو پختہ کرنا مناسب نہیں ہے، ہاں! تعظیم کے لئے اولیاء وعلماء کرام کی قبور کو پختہ کرنا جائز ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں عظمت واحترام قائم ہو، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَفِی ''الْاَحْکَامِ'' عَنْ ''جَامِعِ الْفَتَاوٰی'' وَقِیْلَ لَایُکْرَہُ الْبِنَاءُ اِذَا کَانَ الْمَیِّتُ مِنَ الْمَشَایِخِ وَالْعُلَمَاءِ وَالسَّادَاتِ۔

ترجمہ: '''' الاحکام'' میں'' جامع الفتاویٰ'' سے منقول ہے: کہا گیا ہے کہ مشائخ، علماء اور سادات کرام کی قبور کو اوپر سے پختہ کرنا مکروہ نہیں ہے (یعنی اُن پر عمارات وقبہ وغیرہ بنا سکتے ہیں)''۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: نَعَمْ فِی ''الْاِمْدَادِ'' عَنِ ''الْکُبْرٰی'' وَالْیَوْمَ اِعْتَادُوا التَّسْنِیْمَ بِاللَّبِنِ صِیَانَةً لِلْقَبْرِ عَنِ النَّبْشِ وَرَأَوْا ذٰلِکَ حَسَنًا، وَقَالَ ﷺ: مَا رَاٰہُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَھُوَ عِنْدَ اللہِ حَسَنٌ۔

ترجمہ: ''ہاں!'' الامداد'' میں'' کبریٰ'' سے منقول ہے کہ آج کل لوگ اینٹوں سے قبروں کو کوہان نما بنانے لگے ہیں، تاکہ قبر کھلنے سے محفوظ رہے، اور وہ اس عمل کو اچھا سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ہر وہ کام جسے مسلمان اچھا سمجھتے ہوں، وہ (کام) اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہے''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 135-134)

لحد میں سیمنٹ اور بلاکوں کی چنائی کرنا

سوال:

لحد میں سیمنٹ اور بلاکوں کے ذریعے چنائی کی ہوئی دیواریں تعمیر کرواکے میت اُتارنا کیسا ہے؟، (عبدالقیوم، لانڈھی، کراچی)۔

جواب:

اگر قبر کی مٹی نرم یا ریت والی ہو، جس میں قبر کے بیٹھ جانے کا اندیشہ ہو تو قبر کے اندر اینٹوں کے ذریعے چنائی کر کے اُس میں تدفین کی جا سکتی ہے۔ علماء نے قبر میں پکی اینٹیں (جو بھٹی میں بنائی جاتی ہے) اور لکڑی لگانے کو مکروہ لکھا ہے لیکن اگر زمین نرم ہو تو قبر

کے اندر اینٹ اور لکڑی کا استعمال بھی جائز ہے۔ علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر المرغینانی لکھتے ہیں:

وَیُکْرَہُ الْآجُرُّ وَالْخَشَبُ، لِأَنَّہُمَا لِإِحْکَامِ الْبِنَاءِ وَالْقَبْرُ مَوْضِعُ الْبِلٰی، ثُمَّ بِالْآجُرِّ أَثَرُ النَّارِ فَیُکْرَہُ تَفَاؤُلًا، وَلَا بَأْسَ بِالْقَصَبِ، وَفِی الْجَامِعِ الصَّغِیْرِ: وَیُسْتَحَبُّ اللَّبِنُ وَالْقَصَبُ لِأَنَّہُ ﷺ جُعِلَ عَلٰی قَبْرِہٖ طُنٌّ مِنْ قَصَبٍ، ثُمَّ یُھَالُ التُّرَابُ وَیُسَنَّمُ الْقَبْرُ وَلَا یُسَطَّحُ أَیْ: لَا یُرَبَّعُ لِأَنَّہُ ﷺ نَھٰی عَنْ تَرْبِیْعِ الْقُبُوْرِ، وَمَنْ شَاھَدَ قَبْرَہٗ أَخْبَرَ أَنَّہٗ مُسَنَّمٌ۔

ترجمہ: ''اور (قبر میں) پکی اینٹیں اور لکڑی لگانا مکروہ ہے، اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں عمارت کی مضبوطی کے لئے ہیں اور قبر بوسیدہ ہونے کی جگہ ہے پھر یہ کہ پکی اینٹ میں آگ کا اثر ہے، اس لئے بدفالی سے بچنے کے لئے مکروہ ہے اور بانس کے استعمال میں کچھ مضائقہ نہیں، اور ''الجامع الصغیر'' میں ہے: کچی اینٹ اور بانس کا استعمال مستحب ہے، کیونکہ حضور ﷺ کی قبر پر بانس کا ایک گٹھا رکھا گیا تھا، پھر قبر پر مٹی ڈال دی جائے اور قبر کو کوہان نما بنایا جائے اور ہموار نہ بنایا جائے یعنی چوکور نہ ہو کیونکہ حضور ﷺ نے قبروں کو چوکور بنانے سے منع فرمایا ہے اور جس نے آنحضرت ﷺ کی قبر کو دیکھا ہے، اُس نے بتایا ہے کہ وہ مُسَنَّم (کوہان نما) ہے، (الہدایہ، جلد 1۔ص: 427)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: قَالَ فِی ''الْحِلْیَۃِ'': وَکَرِھُوا الْآجُرَّ وَأَلْوَاحَ الْخَشَبِ، وَقَالَ الْإِمَامُ التُّمُرْتَاشِیُّ: ھٰذَا إِذَا کَانَ حَوْلَ الْمَیِّتِ، فَلَوْ فَوْقَہٗ لَا یُکْرَہُ لِأَنَّہٗ یَکُوْنُ عِصْمَۃً مِّنَ السَّبُعِ، وَقَالَ مَشَایِخُ بُخَارٰی: لَا یُکْرَہُ الْآجُرُّ فِیْ بَلْدَتِنَا لِلْحَاجَۃِ إِلَیْہِ لِضُعْفِ الْأَرَاضِیْ۔

ترجمہ: '''''حلیہ'' میں فرمایا: علماء نے پکی اینٹوں اور لکڑی کے تختوں کو مکروہ قرار دیا ہے، اور امام تمرتاشی نے فرمایا: کراہت اُس صورت میں ہے کہ جب (پکی اینٹیں اور لکڑی کے تختے) میت کے گرد ہوں اور اگر اُس کے اوپر ہوں تو مکروہ نہیں ہے، اس لئے کہ یہ درندوں سے حفاظت کا ذریعہ ہوگا۔ مشائخ بخارا نے فرمایا: ہمارے شہروں میں (قبر کے اندر) پکی

اینٹوں کا استعمال مکروہ نہیں کیونکہ زمین کمزور ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص:132، بیروت)

قبر پر نام کی تختی یا کتبہ لگانا

سوال:

شناخت کی غرض سے کتبے پر متوفی کا نام، تاریخِ وفات کندہ کرواکر سرہانے لگانا جائز ہے؟۔

جواب:

اگر ضرورت ہو تو قبر پر نام وغیرہ کا کتبہ لگانے میں کوئی حرج نہیں تاکہ قبر کے آثار محفوظ رہیں۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

لَابَأْسَ بِالْکِتَابَةِ اِنِ احْتِیْجَ اِلَیْهَا حَتّٰی لَایَذْهَبَ الْاَثَرُ وَلَا یُمْتَهَنُ

ترجمہ: ''اگر ضرورت ہو تو قبر پر لکھنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ قبر کا نشان محفوظ رہے اور اُس کی اہانت بھی نہ ہو۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: قَوْلُهٗ: (لَا بَأْسَ بِالْکِتَابَةِ الخ) لِاَنَّ النَّهْیَ عَنْهَا وَاِنْ صَحَّ فَقَدْ وُجِدَ الْاِجْمَاعُ الْعَمَلِیُّ بِهَا، فَقَدْ أَخْرَجَ الْحَاکِمُ النَّهْیَ عَنْهَا مِنْ طُرُقٍ، ثُمَّ قَالَ: هٰذِهِ الْأَسَانِیْدُ صَحِیْحَةٌ وَلَیْسَ الْعَمَلُ عَلَیْهَا، فَاِنَّ أَئِمَّةَ الْمُسْلِمِیْنَ مِنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ مَکْتُوْبٌ عَلٰی قُبُوْرِهِمْ وَهُوَ عَمَلٌ أَخَذَ بِهِ الْخَلَفُ عَنِ السَّلَفِ، وَیَتَقَوّٰی بِمَا أَخْرَجَهٗ أَبُوْدَاوٗدَ بِاِسْنَادٍ جَیِّدٍ ''أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حَمَلَ حَجَرًا فَوَضَعَهَا عِنْدَ رَأْسِ عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ وَقَالَ: أَتَعَلَّمُ بِهَا قَبْرَ أَخِیْ وَأَدْفِنُ اِلَیْهِ مَنْ مَاتَ مِنْ أَهْلِیْ'' فَاِنَّ الْکِتَابَةَ طَرِیْقٌ اِلٰی تَعَرُّفِ الْقَبْرِ بِهَا، نَعَمْ یَظْهَرُ أَنَّ مَحَلَّ هٰذَا الْاِجْمَاعِ الْعَمَلِیِّ عَلَی الرُّخْصَةِ فِیْهَا مَا اِذَا کَانَتِ الْحَاجَةُ دَاعِیَةً اِلَیْهِ فِی الْجُمْلَةِ کَمَا أَشَارَ اِلَیْهِ فِی ''الْمُحِیْطِ'' بِقَوْلِهٖ: وَاِنِ احْتِیْجَ اِلَی الْکِتَابَةِ، حَتّٰی لَایَذْهَبَ الْاَثَرُ وَلَا یُمْتَهَنُ فَلَا بَأْسَ بِهٖ، فَأَمَّا الْکِتَابَةُ بِغَیْرِ عُذْرٍ فَلَا، حَتّٰی أَنَّهٗ یُکْرَهُ کِتَابَةُ شَیْءٍ عَلَیْهِ مِنَ الْقُرْاٰنِ أَوِ الشِّعْرِ أَوْ اِطْرَاءِ مَدْحٍ لَهٗ وَنَحْوِ ذٰالِکَ۔

ترجمہ:''(قبر پر لکھنے کی ممانعت) اگرچہ صحیح حدیث سے ثابت ہے لیکن اِس کے ثبوت پر اجماعِ عملی موجود ہے، حاکم نے لکھنے کی ممانعت میں احادیث وارد کی ہیں اور کہا ہے کہ یہ احادیث اگرچہ صحیح ہیں لیکن ان پر عمل نہیں ہے، کیونکہ مشرق سے لے کر مغرب تک ائمۂ مسلمین کی قبروں پر لکھا جاتا ہے اور متاخرین نے متقدمین کے عمل کو اختیار کیا ہے۔اِس نظریے کو سُنن ابوداؤد کی ایک روایت سے تقویت ملتی ہے کہ:''رسول اللہ ﷺ نے ایک پتھر اُٹھا کر حضرت عثمان بن مظعون کی قبر کے سرہانے رکھا اور فرمایا: میں اس کے ذریعے اپنے بھائی عثمان کی قبر کی شناخت کروں گا تاکہ میرے اہل سے جو وفات پاجائے، اُسے یہاں دفن کروں''۔ کیونکہ لکھنا بھی قبر کی شناخت اور علامت ہے، ہاں! یہ بات ظاہر ہے کہ (لکھنے کے ثبوت پر) اس اجماعِ عملی کی رخصت اس صورت پر محمول ہے جب اس کی ضرورت ہو جیسا کہ ''محیط'' میں ہے کہ اگر قبر پر لکھنے کی ضرورت ہو تاکہ اس کے آثار محو نہ ہوں اور اُس کی اِہانت بھی نہ ہو، تو لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور بلا عذر لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ قبر پر قرآن مجید (کی آیات) لکھنا یا اشعار یا (صاحبِ قبر کی) تعریف میں مبالغہ آرائی پر مبنی کلمات اور اس طرح کی عبارات لکھنا مکروہ ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:135)

کتبے پر آیاتِ قرآنی لکھنا

سوال:

قبر کے کتبے پر قرآنی آیات وغیرہ لکھوانا کیسا ہے؟، (معاذ احمد، بلیر)۔

جواب:

صرف ضرورت کے لئے یا شناخت وعلامت کے طور پر متوفّی کا نام کندہ کرانے میں حرج نہیں ہے تاکہ قبر کے آثار باقی رہیں اور اس کی اہانت نہ ہو، اِس کے علاوہ قرآن مجید کی آیات یا اشعار لکھانا یا مبالغہ آرائی پر مبنی تحریر مکروہ ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

حَتّٰی أَنَّهٗ يُكْرَهُ كِتَابَةُ شَيْءٍ عَلَيْهِ مِنَ الْقُرْاٰنِ أَوِ الشِّعْرِ أَوْ اِطْرَاءِ مَدْحٍ لَّهٗ وَنَحْوِ ذَالِكَ۔

ترجمہ: ”یہاں تک کہ قبر پر قرآن مجید (کی آیات) لکھنا یا اشعار یا (صاحبِ قبر کی) تعریف میں مبالغہ آرائی کے کلمات اور اس طرح کی چیزیں لکھنا مکروہ ہے“۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص:135)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: وَأَمَّا الْكِتَابَةُ عَلَى الْقَبْرِ فَمَكْرُوْهَةٌ عِنْدَ الْجُمْهُوْرِ، سَوَاءٌ اِسْمُ صَاحِبِهٖ أَوْغَيْرِهٖ، عِنْدَ رَأْسِهٖ أَمْ فِيْ غَيْرِهٖ، أَوْ كِتَابَةُ الرِّقَاعِ اِلَيْهِ وَ دَسُّهَا فِي الْاَنْقَابِ، وَتَحْرُمُ عِنْدَ الْمَالِكِيَّةِ كِتَابَةُ الْقُرْاٰنِ عَلَى الْقَبْرِ، وَدَلِيْلُهُمْ: مَا رَوٰى جَابِرٌ: نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنْ تَجْصِيْصِ الْقُبُوْرِ، وَأَنْ يُكْتَبَ عَلَيْهَا، وَأَنْ يُبْنٰى عَلَيْهَا، وَقَالَ الْحَنَفِيَّةُ: لَابَأْسَ بِالْكِتَابَةِ عَلَى الْقَبْرِ اِنِ احْتِيْجَ اِلَيْهَا حَتّٰى لَايَذْهَبُ الْاَثَرُ وَلَايُمْتَهَنُ۔

ترجمہ: ”قبر پر لکھنا جمہور علماء کے نزدیک مکروہ ہے، خواہ صاحبِ قبر کا نام ہو یا کسی اور کا، خواہ سرہانے کی طرف لکھے یا کسی اور جگہ، یا اُس کے نام کوئی پرچہ یا تحریر لکھ کر سوراخ میں رکھ دی جائے، اصحابِ مالکیہ کے نزدیک قبر پر قرآن مجید (کی آیات) لکھنا حرام ہے اور اُس کی دلیل یہ (حدیث) ہے: جسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو پختہ کرنے، اُن پر لکھنے اور اُن پر عمارت بنانے سے منع فرمایا (رواہ مسلم)۔

احناف کہتے ہیں: اگر ضرورت ہو تو قبر پر لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے تاکہ قبر کا نشان محفوظ رہے اور اُس کی اہانت بھی نہ ہو“۔

مزید لکھتے ہیں: وَالْخُلَاصَةُ أَنَّ النَّهْيَ عَنِ الْكِتَابَةِ مَحْمُوْلٌ عَلٰى عَدَمِ الْحَاجَةِ، وَاَنَّ الْكِتَابَةَ بِغَيْرِ عُذْرٍ، أَوْ كِتَابَةَ شَيْءٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ أَوِ الشِّعْرِ أَوْ اِطْرَاءِ مَدْحٍ لَّهٗ وَنَحْوِ ذَالِكَ فَهُوَ مَكْرُوْهٌ۔

ترجمہ: ”خلاصہ یہ ہے کہ (قبر پر) لکھنے کی ممانعت کو بلاضرورت لکھنے پر محمول کیا جائے یعنی جبکہ لکھنا ضرورت کے بغیر ہے، قرآن مجید (کی آیات) یا اشعار لکھنا یا صاحب قبر کی تعریف میں مبالغہ آرائی کے کلمات لکھنا مکروہ ہے“۔ (الفقہ الاسلامی واَدلتہٗ، جلد 2، ص:1553)

نامحرم عورت کی میت کو کاندھا دینا

سوال:

کیا نامحرم عورت کی میت کو کاندھا دے سکتے ہیں اور قبر میں اتار سکتے ہیں، چہرہ دیکھ سکتے ہیں؟۔

جواب:

جنازہ خواہ مرد کا ہو یا عورت کا، محرم ہو یا نامحرم، جنازہ کو کندھا دینا باعث ثواب ہے۔ سُنّت یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے چاروں پایوں کو کندھا دے اور ہر بار دس قدم چلے۔ حدیث پاک میں ہے: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتّٰى يُصَلِّيَ فَلَهٗ قِيْرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَ حَتّٰى تُدْفَنَ كَانَ لَهٗ قِيْرَاطَانِ، قِيْلَ: وَمَا الْقِيْرَاطَانِ؟، قَالَ: مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيْمَيْنِ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو جنازہ کے ساتھ حاضر رہا یہاں تک کہ اُس پر نماز پڑھی، پس اُس کے لئے ایک قیراط (کے برابر اجر) ہے اور جو (میت کے) دفن کیے جانے تک حاضر رہا، اُس کے لئے دو قیراط (کے برابر اجر) ہے۔ آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا: قیراط سے کیا مراد ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: دو بڑے بڑے پہاڑوں کے برابر''۔ (صحیح بخاری: 1325)

میت کو قبر میں اتارنے والے دو یا تین جو مناسب ہوں، کوئی تعداد متعین نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ قوی، نیک اور امین ہوں۔ عورت کا جنازہ قبر میں اتارنے والے محارم ہوں۔ محرم کے ہوتے ہوئے غیر محرم اُسے قبر میں نہیں اتار سکتا۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَذُو الرَّحِمِ الْمَحْرَمِ أَوْلٰى بِإِدْخَالِ الْمَرْأَةِ مِنْ غَيْرِهِمْ كَذَا فِي الْجَوْهَرَةِ النَّيِّرَةِ، وَكَذَا ذُو الرَّحِمِ غَيْرِ الْمَحْرَمِ أَوْلٰى مِنَ الْأَجْنَبِيِّ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَلَا بَأْسَ لِلْأَجَانِبِ وَضْعُهَا كَذَا فِي ''الْبَحْرِ الرَّائِقِ''۔

ترجمہ: ''عورت کو قبر میں اتارنے والے محرم رشتے دار غیر سے بہتر ہیں، جیسا کہ

''جوہرۂ نیرہ'' میں ہے۔اور اسی طرح غیر محرم رشتے دار اجنبی سے بہتر ہیں، اور اگر عورت کے دونوں قسموں کے رشتے دار نہ ہوں، تو اجنبی مرد بھی اسے قبر میں اتار سکتے ہیں، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:166، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

عورت کی تدفین کے وقت قبر پر چادر یا کپڑے کا پردہ کرلینا چاہئے۔علامہ ابوالحسن علی بن ابوبکر المرغینانی متوفٰی 593ھ لکھتے ہیں:

وَیُسَجّٰی قَبْرُالْمَرْاَۃِ بِثَوْبٍ، حَتّٰی یُجْعَلَ اللَّبِنُ عَلَی اللَّحْدِ وَلَا یُسَجّٰی قَبْرُ الرَّجُلِ لِاَنَّ مَبْنٰی حَالِھِنَّ عَلَی السَّتْرِ وَمَبْنٰی حَالِ الرِّجَالِ عَلَی الْاِنْکِشَافِ۔

ترجمہ:''اور (تدفین کے وقت) عورت کی قبر پر کپڑے (یا چادر) سے پردہ کرلیا جائے، یہاں تک کہ کچی اینٹیں (یا تختے، آج کل سلیب لگائے جاتے ہیں) قبر پر لگائی جائیں اور مرد کی قبر پر پردہ نہ کیا جائے کیونکہ عورتوں کے مناسب حال پردہ ہے اور مرد کے مناسبِ حال میت کی کھلے ماحول میں تدفین ہے، (ہدایہ، جلد 1،ص:427)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (وَیُسَجّٰی قَبْرُھَا) اَیْ بِثَوْبٍ وَّنَحْوِہٖ اِسْتِحْبَابًا حَالَ اِدْخَالِھَا الْقَبْرَحَتّٰی یُسَوّٰی اللَّبِنُ عَلَی اللَّحْدِ کَذَا فِیْ ''شَرْحِ الْمُنْیَۃِ'' وَ''الْاِمْدَادِ''۔

ترجمہ:''اور عورت کو قبر میں اتارتے وقت استحباباً کسی کپڑے یا کسی چیز سے پردہ کیا جائے، یہاں تک کہ قبر پر اینٹیں لگادی جائیں، جیسا کہ ''شرح المنیہ'' اور ''الامداد'' میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3،ص:133)

عورت کے محارم اُسے قبر میں اتاریں، غیر محرم چہرہ نہیں دیکھ سکتے۔شوہر چہرہ دیکھ سکتا ہے، جنازے کو کندھا دے سکتا ہے۔عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ شوہر عورت کے جنازے کو نہ کندھا دے سکتا ہے، نہ قبر میں اتار سکتا ہے، نہ منہ دیکھ سکتا ہے، یہ غلط ہے۔شوہر کے لئے اپنی وفات یافتہ بیوی کو براہِ راست چھونے کی ممانعت ہے، ضرورت کے تحت عورت کے بدن پر کپڑا ڈال کر یا ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر اُسے چھو سکتا ہے۔عورت ضرورت کے تحت اپنے وفات یافتہ شوہر کو چھو بھی سکتی ہے اور اسے غسل بھی دے سکتی ہے۔غیر محرم مرد کے لئے

عورت کا چہرہ دیکھنا منع ہے۔

شرابی کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال:

اگر کوئی عادی شرابی، زانی شخص مرجاتا ہے تو کیا اُس کی نمازِ جنازہ پڑھائی جائے گی اور مسجد کا امام نمازِ جنازہ پڑھائے یا نہیں؟، (کاظم، کراچی)۔

جواب:

ہر مسلمان خواہ وہ کیسا ہی گنہگار اور مرتکبِ کبائر ہو، اُس کی نمازِ جنازہ پڑھائی جائے گی۔ حدیثِ پاک میں ہے: وَالصَّلَاةُ وَاجِبَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ، بَرًّا کَانَ أَوْ فَاجِرًا، وَإِنْ عَمِلَ کَبَائِرَ۔

ترجمہ: ''ہر مسلمان کی نمازِ جنازہ فرض (کفایہ) ہے نیک ہو یا بدکار، اگرچہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہوا ہو، (سُنن ابوداؤد:2525)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَھِیَ فَرْضٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ مَاتَ، خَلَا) أَرْبَعَۃٍ: (بُغَاۃٌ وَقُطَّاعُ طَرِیْقٍ) فَلَا یُغَسَّلُوْا، وَلَا یُصَلّٰی عَلَیْھِمْ (إِذَا قُتِلُوْا فِی الْحَرْبِ)، وَلَوْ بَعْدَہٗ صُلِّیَ عَلَیْھِمْ لِأَنَّہٗ حَدٌّ أَوْ قِصَاصٌ (وَکَذَا) أَھْلُ عُصْبَۃٍ، وَ (مُکَابِرٌ فِی مِصْرٍ لَیْلًا وَخُنَّاقٌ) ـــ لَا (یُصَلّٰی عَلٰی قَاتِلِ أَحَدِ أَبَوَیْہِ) إِھَانَۃً لَہٗ، وَأَلْحَقَہٗ فِی ''النَّھْرِ'' بِالْبُغَاۃِ۔

ترجمہ: ''ہر مسلمان کی نمازِ جنازہ فرض (کفایہ) ہے، سوائے چار کے: امیر المومنین کا باغی اور رہزن، اِن کو غسل نہیں دیا جائے گا اور ان کی نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی، جبکہ یہ لڑائی میں مارے گئے ہوں۔ اور اگر لڑائی کے بعد مر گئے (یا قصاص اور حد میں انہیں سزائے موت دی گئی) تو اُن پر نماز پڑھی جائے گی، اس لئے کہ یہ حد یا قصاص ہے۔ اور اِسی طرح جو عصبیت کے نام پر (لڑتے ہوئے) مارے گئے ہوں، یا وہ رات کو شہر میں لوٹ مار کرتا ہو یا گلا دبا کر لوگوں کو مارتا ہو۔۔۔ اور اپنے والدین میں سے کسی ایک کو قتل کرنے والے کی نمازِ جنازہ اس کے اہانت کے طور پر نہ پڑھی جائے، ''النہر الفائق'' میں اُسے بھی

باغیوں میں شمار کیا ہے''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص:101-99)

اگر زجر کے لئے اکابر علماء وخطباء خود نمازِ جنازہ نہ پڑھائیں، دوسروں سے پڑھوادیں تو کوئی حرج نہیں۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے بے نمازی کی نمازِ جنازہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''مسلمان اگرچہ بے نمازی ہو، اس کے جنازے کی نماز مسلمانوں پر فرض ہے، اگر کوئی نہ پڑھے گا، جتنوں کو خبر ہو سب گنہگار و تارکِ فرض رہیں گے۔ ہاں اگر زجر کے لئے علماء خود نہ پڑھیں، دوسروں سے پڑھوادیں تو بے جا نہیں، اور اگر اُن کے نہ پڑھنے سے اور بھی کوئی نہ پڑھے یا اُن کو بھی منع کریں تو یہ علماء بھی مستحقِ عذابِ نار ہوں گے، بلکہ جُہّال سے زیادہ۔ در مختار میں ہے: هِيَ فَرْضٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ مَاتَ، خَلَا أَرْبَعَةٍ بُغَاةٍ وَقُطَّاعِ طَرِيْقٍ إِذَا قُتِلُوْا فِي الْحَرْبِ وَكَذَا مُكَابِرٌ فِيْ مِصْرٍ لَيْلًا بِسِلَاحٍ وَخُنَّاقٍ وَقَاتِلُ أَحَدِ أَبَوَيْهِ وَأَلْحَقَهُ فِي ''النَّهْرِ'' بِالْبُغَاةِ مُلَخَّصًا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص:162)

چند سوالات

سکھر شہر میں لینڈ مافیا کے کچھ لوگوں نے مسلمانوں کے ایک قدیم قبرستان کو مسمار کردیا ہے۔ جس میں عالمِ اسلام کے جید سادات مشائخ عظام، علماء کرام اور تینوں مسلح افواج کے 1965ء اور 1970ء کے شہداء کے مزارات مسمار کرنے کے علاوہ 12 فٹ مشترکہ روڈ پر مسیحی قبرستان میں ان کے بشپ پادری اور اپنے وقت کے ان کے فوجی جرنیلوں کی قبریں بھی مسمار کرکے اپنے جرائم کو چھپانے اور سکھر شہر کو مذہبی فسادات کا گہوارہ بنانے کے لئے مسیحی قبرستان میں مسجد بناکر عقوبت خانوں کی تعمیر جاری رکھی ہوئی ہے۔ مسجد کی آڑ میں دوسرا ظلم ان ظالموں نے یہ مچایا کہ افواج پاکستان کے شہداء کی میتوں کو نکال کر غائب کردیا، ان کی قبروں کو ہیروئن، چرس، افیوں، شراب جیسی نجس اشیاء صندوق بناکر ملک دشمن کاوشوں میں مجرمان مشغول ہیں اور انتظامیہ خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ اِس حوالے سے چند سوالات کا حل مطلوب ہے: صاحبزادہ حبیب ناصر قادری، چیرمین دفاع قبرستان کمیٹی، سکھر

قبر کی حرمت کا شرعی حکم

سوال:1۔

ایک عام قبر کی حرمت کے بارے میں زندہ انسانوں پر کیا واجب ہے؟۔قبروں کی بے حرمتی کرنے والوں کے خلاف حکومتِ وقت یا اُس شہر کے اربابِ اختیار کا مذہبی، اخلاقی اور سماجی فریضہ کیا ہے؟۔

جواب:

نہ صرف میت کی تعظیم وتکریم لازم ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ قبور مسلمین کی تعظیم وادب کا بھی حکم ارشاد فرماتے ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ''لَاَنْ یَّجْلِسَ اَحَدُکُمْ عَلٰی جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِیَابَهٗ حَتّٰی تَخْلُصَ اِلٰی جِلْدِهٖ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّجْلِسَ عَلٰی قَبْرٍ''۔

ترجمہ:''ابوہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:''تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس سے کہ قبر پر بیٹھے، (ابوداؤد:3220)''۔

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لَاَنْ اَمْشِیَ عَلٰی جَمْرَةٍ اَوْ سَیْفٍ اَوْ اَخْصِفَ نَعْلِیْ بِرِجْلِیْ، اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَمْشِیَ عَلٰی قَبْرِ مُسْلِمٍ، وَمَا اُبَالِیْ اَوَسَطَ الْقُبُوْرِ قَضَیْتُ حَاجَتِیْ، اَوْ وَسَطَ السُّوْقِ''۔

ترجمہ:''عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے زیادہ پسند ہے آگ یا تلوار پر چلنا یا پاؤں سے جوتے پر پیوند لگانا، بہ نسبت اس کے کہ قبرِ مسلم پر چلوں، اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قبر کے وسط میں میری حاجت پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان، (ابن ماجہ:1568)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:''علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی عزت زندہ ومردہ برابر ہے۔محقق علی الاطلاق علامہ کمال الدین بن ہمام رحمہ اللہ

تعالیٰ علیہ فتح القدیر (جلد:2،ص:102 مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر) میں فرماتے ہیں: وَتَوْضِیْحُہٗ الْاِتِّفَاقُ عَلٰی اَنَّ حُرْمَۃَ الْمُسْلِمِ مَیِّتًا کَحُرْمَتِہٖ حَیًّا۔ ترجمہ: اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت وحرمت زندہ مسلمان کی طرح ہے۔(ت)۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں: کَسْرُ عَظْمِ الْمَیِّتِ وَاَذَاہُ کَکَسْرِہٖ حَیًّا، رَوَاہُ اِمَامُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاؤدَ وَابْنُ مَاجَۃَ بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ عَنْ اُمِّ الْمُؤمِنِیْنَ عَائِشَۃَ الصِّدِّیْقَۃِ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا۔ ترجمہ: ''مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا، اسے امام احمد وابوداؤد وابن ماجہ نے سند حسن کے ساتھ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا''۔ یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، اَلْمَیِّتُ یُؤْذِیْہِ فِیْ قَبْرِہٖ مَا یُؤْذِیْہِ فِیْ بَیْتِہٖ۔ ترجمہ: ''سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے گھر میں اسے اذیت ہوتی۔ علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں: اَفَادَ اَنَّ حُرْمَۃَ الْمُؤْمِنِ بَعْدَ مَوْتِہٖ بَاقِیَۃٌ۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت بعد موت کے بھی ویسے ہی باقی ہے۔ سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اَذَی الْمُؤْمِنِ فِیْ مَوْتِہٖ کَاَذَاہُ فِیْ حَیَاتِہٖ رَوَاہُ اَبُوْبَکْرِ بْنُ اَبِیْ شَیْبَۃَ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو، اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔ علماء فرماتے ہیں: اَلْمَیِّتُ یَتَاَذّٰی بِمَا یَتَاَذّٰی بِہِ الْحَیُّ۔ کَذَا فِیْ ''رَدِّالْمُحْتَارِ'' وَغَیْرِہٖ مِنْ مُعْتَمَدَاتِ الْاَسْفَارِ۔ جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے، مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں، جیسا کہ ردالمحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے۔(ت) علامہ شیخ عبدالحق مُحدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اَشِعَّۃُ اللّمعات میں امام علامہ ابوعمر یوسف بن عبدالبر سے نقل فرماتے ہیں: ازیں جا مستفاد میگردد کہ میت مُتالم میگردد بجمیع آنچہ مُتالم میگردد بدان حی، ولازم اینست کہ مُتلذذ گردد بتمام آنچہ مُتلذذ می شود بدان زندہ، انتہی۔ اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی اَلم پہنچتا ہے، اور یہ لازم ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہو، ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے،

انتہی (ت)۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 9،ص:442-441،رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

قبروں کی بے حرمتی کرنا اور بلا ضرورت قبروں کو کھودنا نہایت سخت اور شدید جرم ہے۔ حکومتِ وقت یا عدلیہ ایسے اشخاص کو سخت ترین تعزیر دے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''مسلمان کی قبر کو کھودنا تو نہایت سخت شدید جرم ہے، اسلامی سلطنت ہو تو ایسا شخص سخت تعزیر کا مستحق ہے یہاں تک کہ سلطانِ اسلام کی اگر رائے ہو تو جو ایسی حرکت کا مرتکب ہوا کرتا ہو، اُسے سزائے قتل دے سکتا ہے، جو شخص ناحق پر اس کی تائید کرتے ہیں سب اسی کی طرح مرتکب جرم و مستحق سزا ہیں۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ترجمہ: ''گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُعِيْنَهٗ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَلَعَ مِنْ عُنُقِهٖ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ۔ ترجمہ: ''جو دانستہ کسی ظالم کی مدد کو چلے اس نے اپنی گردن سے اسلام کی رسی نکال دی، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:540 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

حکومت اور عدلیہ کی ذمہ داری ہے کہ اِس رُجحان کے مستقل سَدِّ باب کے لئے اِن مجرموں کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔ اِس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقامی حکومتوں کے ادارے جن کے ذمے مزارات اور قبرستانوں کی نگرانی ہے، وہ اپنے فرائض سے غافل ہیں اور ذمہ داران کے خلاف عبرت ناک تادیبی اور انضباطی کارروائی کی جانی چاہئے۔ دنیا کے مُتمدِّن ممالک میں قبرستانوں کا انتظام نہایت مربوط اور مُنظّم ہوتا ہے، قبریں مقررہ معیار کے مطابق ترتیب سے بنائی جاتی ہیں۔ قبرستان کی صفائی کا انتظام ہوتا ہے اور قبرستان میں مدفون لوگوں کا باقاعدہ ریکارڈ ہوتا ہے، قبرستان کا تفصیلی نقشہ ہوتا ہے اور اُس کے ذریعے ہر میت کے رشتہ دار اپنے عزیز کی قبر پر بآسانی جا کر فاتحہ پڑھ سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں گورکن مردہ فروش ہو گئے ہیں اور چوہے اور حشرات الارض قبروں کو کھودتے رہتے ہیں۔ اِسی طرح قبرستان جرائم پیشہ لوگوں اور نشے کے عادی افراد کی پناہ گاہ بنے ہوئے ہیں اور لینڈ مافیا کے لوگ بھی قبروں کے آثار کو مٹا کر قبضے کرتے رہتے ہیں۔ ضرورت اِس امر کی

ہے کہ بڑے شہروں میں تمام نئی کالونیوں اور ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے ڈیولپرز کے لئے قبرستان کی جگہ مختص کرنے کی قانونی پابندی لگائی جائے اور اِس کے بغیر کسی بھی نئی ہاؤسنگ اسکیم کی منظوری نہ دی جائے، کیونکہ پرانے قبرستانوں میں گنجائش نہیں رہی، یہ بھی لازمی قرار دیا جائے کہ میت کے ورثاء کا مکمل پتا قبرستان کے رجسٹر میں درج ہوتا کہ ایسا نہ ہو کہ گمنام لوگ کسی کو قتل کر کے اور میت کو لاوارث قرار دے کر قبرستان میں دفن کر دیں اور قرائن کی شہادت کو ختم کر دیں۔

قبرستان کی تبدیلی

سوال:3۔

مسلمان یا غیر مسلم کی قبروں پر مسجد بنانا اور اُس کی آڑ میں عقوبت خانے نما رہائشوں کی تعمیر کا عمل اسلام کی رُو سے کیسا ہے؟۔

جواب:

مسلمانوں کے قبرستان کو (خواہ کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو) مسمار کرنا یا کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَسُئِلَ هُوَ (أَيِ الْقَاضِي الْإِمَامُ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ مَحْمُوْدُ الْأُوْزْجَنْدِيُّ) عَنِ الْمَقْبَرَةِ فِي الْقُرىٰ إِذَا انْدَرَسَتْ وَلَمْ يَبْقَ فِيْهَا أَثَرُ الْمَوْتىٰ لَا الْعَظْمُ وَلَا غَيْرُهُ هَلْ يَجُوْزُ زَرْعُهَا وَاسْتِغْلَالُهَا؟، قَالَ: لَا، وَلَهَا حُكْمُ الْمَقْبَرَةِ، كَذَا فِي ''الْمُحِيْط''۔

ترجمہ: ''شمس الائمہ امام قاضی محمود اوزجندی سے دیہات میں موجود ایسے قبرستان کی بابت پوچھا گیا کہ جس (قبرستان) کے نشانات مٹ چکے ہوں اور اُس میں میت کی ہڈیاں یا کوئی دوسرے آثار (اعضاء وغیرہ) باقی نہ رہے ہوں، تو کیا اس پر کھیتی کرنا اور اس سے غلہ حاصل کرنا جائز ہے؟، آپ نے جواب میں فرمایا: نہیں بلکہ وہ قبرستان ہی کے حکم میں ہے، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے''۔ محشی نے اس پر حاشیہ لکھا: قَوْلُهُ، قَالَ: لَا، هٰذَا لَا يُنَافِيْ مَاقَالَهُ الزَّيْلَعِيُّ فِيْ بَابِ الْجَنَائِزِ مِنْ أَنَّ الْمَيِّتَ إِذَا بَلِيَ وَصَارَ تُرَابًا جَازَ زَرْعُهُ وَالْبِنَاءُ عَلَيْهِ،

لِاَنَّ الْمَانِعَ هُنَا كَوْنُ الْمَحَلِّ مَوْقُوْفًا عَلَى الدَّفْنِ فَلَا يَجُوْزُ اِسْتِعْمَالُهُ فِيْ غَيْرِهٖ فَلْيَتَأَمَّلْ وَلْيُحَرَّرْ۔

ترجمہ: ''مصنف کا قول ''لا''، ''امام زیلعی'' کے اُس قول کے منافی نہیں ہے جو باب الجنائز میں ہے کہ'' جب (قبر میں) میت بوسیدہ اور مٹی ہو جائے، تو اُس پر زراعت اور تعمیر کرنا جائز ہے''، یہاں (زراعت سے) ممانعت اس لئے ہے کہ یہ مقام تدفین کے لئے وقف ہے، اس کا دوسرے مصرف میں استعمال جائز نہیں، پس غور کرنا اور درست لکھنا چاہئے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:470، 471، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

یہ حکم اُس صورت میں ہے کہ جب وقف مکمل ہو چکا ہو، تو اُس میں تبدیلی جائز نہیں۔

غیر مسلم قبرستان کا حکم

سوال:2۔

غیر مسلموں کی قبروں کے بارے میں اسلام مسلمانوں کو کیا حکم دیتا ہے؟۔ کیا وہاں مسلمانوں کی مساجد وغیرہ بنائی جاسکتی ہیں؟۔

جواب:

مملکتِ اسلامیہ پاکستان میں رہنے والے تمام پابندِ آئین وقانون غیر مسلم ذمّی ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک غیر مسلم کی جان ومال محفوظ ہے۔ اگر غیر مسلم (عیسائی یا کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے) وہاں موجود ہیں وہی اُس قبرستان پر قابض ہوں گے اور اپنے دین کے اعتبار سے استعمال کریں گے، اگر عیسائی آبادی وہاں نہ ہو تو وہ قبرستان حکومت کی ملکیت ہوگا۔

شریعت کی رُو سے کفار کا چھوڑا ہوا مال تین قسم کا ہوتا ہے: (۱) مالِ غنیمت جو جہاد کے ذریعے حاصل ہوا ہو۔ (۲) مالِ صلح جو جہاد یا کسی سختی کے بغیر کفار سے حاصل ہو، کفار خود دے جائیں یا چھوڑ جائیں۔ (۳) مالِ فَی جو جبراً کفار سے وصول کیا جائے، جیسے خراج اور جزیہ۔ پاکستان میں غیر مسلموں کی متروکہ جائیداد، عبادت گاہیں وغیرہ سب مالِ صلح کہلاتے

ہیں۔ مالِ صلح کا حکم بھی مالِ فَیْ کی طرح یہی ہے کہ بیت المال اور حکومت کی ملکیت ہوگا۔
کفار کی متروکہ جائیداد کو شرعی اصطلاح میں مالِ فَیْ کہا جاتا ہے۔
علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: فَالْاَرْضُ فَیْءٌ اِنْ شَاءَ الْاِمَامُ خَمَّسَهَا وَقَسَّمَ أَرْبَعَةَ الْاَخْمَاسِ بَيْنَ الْغَانِمِيْنَ وَاِنْ شَاءَ تَرَكَهَا عَلٰى حَالِهَا۔
ترجمہ: ''کافر کی متروکہ زمین سب کی سب فَیْ ہے، امام (حاکم) کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو پانچویں حصے میں سے چوتھائی مالِ غنیمت جمع کرنے والوں کے درمیان تقسیم کردے اور اگر چاہے تو جیسی ہے اُسی طرح چھوڑ دے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:202)''۔
علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَمُقْتَضَاهُ أَنَّ مَا أُخِذَ بِالْقِتَالِ وَالْحَرْبِ غَنِيْمَةٌ، وَمَا أُخِذَ بَعْدَهُ مِمَّا وُضِعَ عَلَيْهِمْ قَهْرًا كَالْجِزْيَةِ وَالْخَرَاجِ: فَيْءٌ، وَمَا أُخِذَ مِنْهُمْ بِلَا حَرْبٍ وَلَا قَهْرٍ كَالْهَدِيَّةِ وَالصُّلْحِ فَهُوَ: لَا غَنِيْمَةٌ وَلَا فَيْءٌ، وَحُكْمُهُ حُكْمُ الْفَيْءِ لَا يُخَمَّسُ وَيُوْضَعُ فِيْ بَيْتِ الْمَالِ۔
ترجمہ: ''جو مال کفار سے جنگ اور قتال کے بعد حاصل ہوا، وہ مالِ غنیمت ہے اور جو جنگ کے بعد اُن سے جبراً وصول کیا جائے، جیسے جزیہ اور خراج: تو وہ مالِ فَیْ ہے، اور جو بغیر جنگ اور بغیر سختی کے اُن سے لیا گیا ہو جیسے تحائف، تو وہ مالِ صلح ہے، نہ غنیمت ہے اور نہ فَیْ اور اُس کا حکم مالِ فَیْ کے حکم کی طرح ہے، اُس سے پانچواں حصہ نہیں نکالا جائے گا اور بیت المال (سرکاری مال) میں رکھ دیا جائے گا، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص:170، بیروت)''۔
پس اگر وہاں عیسائی کمیونٹی نہ ہو اور وہ قبرستان زیرِ استعمال نہ آتا ہو تو حکومتِ وقت جیسا چاہے اُس میں تصرُّف کرسکتی ہے، کسی دوسرے شخص کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہاں مسجد یا کوئی اور چیز تعمیر کرے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: مَقْبَرَةٌ كَانَتْ لِلْمُشْرِكِيْنَ أَرَادُوْا أَنْ يَّجْعَلُوْهَا مَقْبَرَةً لِلْمُسْلِمِيْنَ فَإِنْ كَانَتْ آثَارُهُمْ قَدْ اِنْدَرَسَتْ فَلَا بَأْسَ بِذٰلِكَ، وَاِنْ بَقِيَتْ آثَارُهُمْ بِأَنْ بَقِيَ مِنْ عِظَامِهِمْ شَيْءٌ يُنْبَشُ وَيُقْبَرُ ثُمَّ يُجْعَلُ مَقْبَرَةً لِلْمُسْلِمِيْنَ لِأَنَّ مَوْضِعَ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كَانَ مَقْبَرَةً لِلْمُشْرِكِيْنَ

فَنُبِشَتْ وَاتُّخِذَهَا مَسْجِدًا كَذَا فِي "الْمُضْمَرَاتِ"۔

ترجمہ: "مشرکین کا قبرستان ہے اور مسلمان اُسے اپنا قبرستان بنانا چاہتے ہیں، اگر اُن قبروں کے نشانات مٹ چکے ہیں تو حرج نہیں اور اگر آثار باقی ہیں تو اُن بقیہ ہڈیوں کو کھود کر (الگ) دفن کر دیا جائے گا، پھر اس جگہ کو مسلمانوں کا قبرستان بنایا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ جس جگہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، وہاں (پہلے) مشرکین کا قبرستان تھا، پس اُن کو اکھیڑ دیا اور اُس کو مسجد بنا دیا، جیسا کہ "مضمرات" میں ہے"۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد، ص:469)

نمازِ جنازہ کے بعد دعا کی شرعی حیثیت

سوال:

ہم نمازِ جنازہ کے فوراً بعد میت کو دفنانے سے پہلے جو دعا کرتے ہیں آیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عملِ مبارک سے ثابت ہے؟ اگر ثابت نہیں ہے تو کس درجے میں ہے، مستحب یا مباح؟ (محمد سلیم، راولپنڈی)۔

جواب:

دعا فی نفسہٖ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی محبوب اور پسندیدہ فعل ہے، مقاماتِ نجاست وکراہت کے سوا، خواہ نماز کے اول وآخر میں یا علاوہ نماز، نمازِ جنازہ سے قبل ہو یا بعد، ہر موقع پر مستحب و مستحسن ہے۔ نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانِ مبارک سے ثابت ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقُولُ: إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم میت کی نماز (جنازہ) پڑھ چکو تو پھر اس کے لیے اخلاص سے دعا کرو"، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 3119، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1497)۔

اس حدیث میں فَأَخْلِصُوا پر "فا" ہے، یہ حرفِ عطف ہے اور یہ "فا" "تعقیب علی الفور"

(یعنی اس کے ماقبل جس عمل یا بات کا تذکرہ ہو، اس کے فوراً بعد وہ کام کرنا جو ''فا'' کے بعد مذکور ہے) کے لیے آتی ہے، اس کا مطلب ہے کہ میت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کے فوراً بعد اس کے لئے اخلاص سے دعا کرو۔

اعلیٰحضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''میت کے لئے دعا قبل نمازِ جنازہ وبعد نمازِ جنازہ ہمیشہ مطلقاً مستحب ومندوب ہے۔ اور اس کی اصلاً ممانعت نہیں ہے، خود حضور پُرنور سیّدِ عالم ﷺ وصحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جنازہ سے قبل وبعد نماز دونوں وقت میّت کے لئے دعا فرمانا اور اس کا حکم دینا ثابت ہے، فقہاءِ کرام ہرگز اُسے منع نہیں فرماتے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 258-257 رضا فاؤنڈیشن)

اہلسنت کے نزدیک نمازِ جنازہ پڑھنے کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے، فرض یا واجب نہیں ہے۔

امام علاؤ الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں: وَلَنَا: مَارُوِیَ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ صَلّٰی عَلٰی جَنَازَۃٍ فَلَمَّا فَرَغَ جَاءَ عُمَرُ وَمَعَهٗ قَوْمٌ فَأَرَادَ أَنْ یُّصَلِّیَ ثَانِیًا فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ ﷺ: ''اَلصَّلَاۃُ عَلَی الْجَنَازَۃِ لَا تُعَادُ وَلٰکِنِ ادْعُ لِلْمَیِّتِ وَاسْتَغْفِرْ لَهٗ''، وَهٰذَا نَصٌّ فِی الْبَابِ وَرُوِیَ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ وَابْنَ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمْ فَاتَتْهُمَا صَلَاۃٌ عَلٰی جَنَازَۃٍ، فَلَمَّا حَضَرَا مَازَادَا عَلَی الْاِسْتِغْفَارِ لَهٗ، وَرُوِیَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ أَنَّهٗ فَاتَتْهُ الصَّلَاۃُ عَلٰی جَنَازَۃِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، فَلَمَّا حَضَرَ قَالَ: اِنْ سَبَقْتُمُوْنِیْ بِالصَّلَاۃِ عَلَیْهِ فَلَا تَسْبِقُوْنِیْ بِالدُّعَاءِ لَهٗ۔

ترجمہ: ''ہماری دلیل یہ روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی، جب آپ نمازِ جنازہ پڑھ چکے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور یہ ارادہ کیا کہ ان پر نمازِ جنازہ پڑھیں تو نبی ﷺ نے فرمایا نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جاتی، لیکن تم میت کے لیے دعا کرو اور استغفار کرو، اور یہ حدیث اس باب میں نص (صریح) ہے، اور روایت ہے کہ

حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایک جنازہ کی نماز رہ گئی، جب وہ آئے تو انہوں نے میت کے لیے صرف استغفار کیا، اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ رہ گئی، جب وہ آئے تو انہوں نے کہا: اگر تم نے ان کی نمازِ جنازہ میں مجھ پر سبقت کر لی ہے، تو ان کے لیے دعا کرنے میں مجھ پر سبقت نہ کرو۔

(بدائع الصنائع، جلد 2، ص: 461)

صرف اتنی احتیاط کرنی چاہیے کہ نمازِ جنازہ کا سلام پھیرنے کے بعد صف بندی توڑ کر دعا کی جائے تاکہ اس دعا کے نمازِ جنازہ کا لازمی حصہ بننے کا لوگوں کو گمان پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں نفسِ مسئلہ کی مکمل تحقیق اور مخالفین کے دلائل اور ان کے جوابات پر مشتمل ہمارا مُفصل ومُدلّل فتویٰ تفہیم المسائل جلد سوم میں موجود ہے، اسے الگ کتابچے کی صورت میں بھی شائع کیا جا چکا ہے، آپ بھی مطالعہ کریں۔

نمازِ جنازہ کی تکرار

سوال:

ہمارے گاؤں بنی تحصیل وضلع میر پور آزاد کشمیر کے اکثر لوگ بسلسلۂ روزگار بیرون ممالک مقیم ہیں۔ جب بھی کسی شخص کا انتقال ہو جاتا ہے تو نماز جنازہ وہاں ادا کرنے کے بعد جب یہاں میت کو لاتے ہیں تو یہاں مقیم رشتہ دار واحباب دوبارہ نمازِ جنازہ ادا کرتے ہیں۔ یہاں کے امام وخطیب صاحب نے عوام کو مطلع کیا کہ ازروئے فقہ حنفی نمازِ جنازہ کی تکرار جائز نہیں اور پھر مزید علماء کے فتاویٰ جات بھی حاصل کیے۔ وہ امام صاحبان جو بے علم ہیں، ہر موقع پر جب جنازہ باہر سے لایا جاتا ہے، آموجود ہوتے ہیں اور ثبوت مانگنے پر بھاگ جاتے ہیں، آج تک یہی صورتِ حال ہے۔ اب اس وقت صورت یہ ہے کہ آدھے لوگ فقہ حنفی کی روشنی میں نمازِ جنازہ کی تکرار نہیں کرتے اور آدھے دوبارہ پڑھنے پر زور دیتے ہیں اور نہ پڑھنے والوں سے الجھتے ہیں، نوبت بایں جارسید کہ بات دست وگریبان تک پہنچ چکی ہے۔ گاؤں کی ساری آبادی سنی حنفی عقائد کی پیروکار ہے۔ مہربانی فرما

کر رہنمائی کیجئے۔

راجہ حاجی جہانداد خان، حاجی عبدالرزاق، حاجی کرامت حسین، حاجی محمد اکبر
اہلِ گاؤں بنی تحصیل وضلع میرپور

جواب:

تحصیل وضلع میرپور کی ایک مسجد کے امام صاحب اور صدر کمیٹی کی معرفت اہالیانِ بنی گاؤں تحصیل وضلع میرپور کی طرف سے ایک استفتاء ''نمازِ جنازہ کی تکرار'' کے حوالے سے موصول ہوا۔ مستفتی خود عالمِ دین معلوم ہوتے ہیں، لیکن دیہی علاقوں میں یا جہاں برادری سسٹم ہے، وہاں ائمہ وخطباء پر دباؤ ڈالا جاتا ہے، شرعی امور میں برادری ازم کی بنیاد پر دباؤ ڈالنا عصبیتِ جاہلیہ ہے اور اس کی حوصلہ شکنی سب مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ اُس کے ساتھ 13 مفتیانِ کرام کا لکھا ہوا ایک فتویٰ بھی موصول ہوا۔

فقہ حنفی میں یہ مسئلہ اجماعی اور مُتفق علیہا ہے کہ ولی اَقرب کے بعد نمازِ جنازہ کا اعادہ جائز نہیں ہے۔ بیرونِ ملک یا پاکستان کے بعض بڑے شہروں میں لوگ ملازمت یا کاروبار کرتے ہیں، فیملی کے ساتھ رہتے ہیں، مگر کسی کا انتقال ہوجائے تو میت کو اپنے آبائی گاؤں، قصبے یا شہر میں تدفین کے لئے لے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں میت کے ولی اَقرب اور اس کے درجے کے اولیاء میں سے کوئی نہ جنازہ پڑھے، نہ اس کی اجازت دے۔ مقامی لوگ اپنے طور پر پڑھ لیں تو حرج نہیں۔ بعد میں ولی اَقرب یا اُس درجے کے تمام اولیاء اپنے آبائی مقام پر اپنے عزیز کی میت کی نماز جنازہ خود پڑھا لیں یا اپنی اجازت سے پڑھوا لیں۔ تاہم اگر ولی اَقرب نے میت کی نماز جنازہ پڑھ لی ہے، تو پھر فقہ حنفی کی رُو سے نماز جنازہ کا اعادہ درست نہیں ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ علماء اور خطباء وقتاً فوقتاً یہ مسئلہ لوگوں کو بتاتے رہیں اور جو خطباء کرام بیرون ملک کہیں امام وخطیب کے منصب پر فائز ہیں تو وہ بھی یہ فریضہ ادا کریں تاکہ لوگوں کو دین کے بارے میں واقفیت ہو۔

نوٹ:۔ اس مسئلے کی مزید تفصیل ہماری جلد ششم سوال نمبر 53 اور 55 کے جوابات میں

ملاحظہ فرمائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کفن کیسا تھا؟

سوال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کفن کس طرح کا تھا، اُس میں کتنے کپڑے تھے اور تدفین کس طرح کی گئی؟، (نذیر، کراچی)

جواب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تین سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا قمیص، اِزار اور لفافہ۔ حدیث مبارک میں ہے:

(۱) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم كُفِّنَ فِی ثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ يَمَانِيَةٍ، بِيْضٍ سَحُوْلِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيْهِنَّ قَمِيْصٌ وَلَا عِمَامَةٌ۔

ترجمہ: ''اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تین سفید یمنی کپڑوں کا کفن دیا گیا تھا، جو سُوت کے بنے ہوئے تھے اور اُن میں قمیص اور عمامہ نہیں تھا، (صحیح بخاری :1264، صحیح مسلم:941، سُنن ترمذی:998)''۔

(۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كُفِّنَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم فِی ثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ نَجْرَانِيَّةٍ، اَلْحُلَّةُ ثَوْبَانِ، وَقَمِيْصِهِ الَّذِیْ مَاتَ فِيْهِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا، دو چادریں (حُلّہ) اور وہ قمیص جس میں آپ کا وصال ہوا''۔

(سُنن ابوداؤد:3153)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تدفین کے لئے لحد بنائی گئی تھی، جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِیْ وَقَّاصٍ أَنَّ سَعْدَ بْنَ أَبِیْ وَقَّاصٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ فِی مَرَضِهِ الَّذِیْ هَلَكَ فِيْهِ: اِلْحَدُوْا لِیْ لَحْدًا وَانْصِبُوْا عَلَیَّ اللَّبِنَ نَصْبًا كَمَا صُنِعَ بِرَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ترجمہ: ''حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنی مرض الموت میں کہا: میرے لئے لحد بنانا اور اس پر کچی اینٹیں لگانا، جس طرح رسول اللہ ﷺ کی قبرِ مبارک بنائی گئی تھی''۔
(صحیح مسلم:2238)

امام یحییٰ بن شرف الدین نووی لکھتے ہیں: فِيهِ اِسْتِحْبَابُ اللَّحْدِ وَنَصْبِ اللَّبِنِ، وَأَنَّهُ فُعِلَ ذَالِكَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِاتِّفَاقِ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَقَدْ نَقَلُوْا أَنَّ عَدَدَ لَبِنَاتِهِ تِسْعٌ۔

ترجمہ: ''اِس (حدیث) سے لحد اور اُس میں اینٹیں لگانے کا استحباب ثابت ہوتا ہے، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اتفاق سے رسول اللہ ﷺ کی قبر انور پر اس طرح کیا گیا، جو اینٹیں لگائی گئیں، اُن کی تعداد نو تھی، (شرح النووی، جلد 3، ص:316)''۔

قبر دو قسموں کی بنائی جاتی ہیں، (۱) لحد: قبر بنا کر اس میں میت کو رکھنے کی جگہ اس طرح بنائی جاتی ہے کہ میت کا رُخ قبلے کی طرف ہو، اِسے بغلی قبر کہا جاتا ہے اور پھر اُس قبر کو اوپر سے بند کر دیا جاتا ہے۔ (۲) صندوق جو کہ ہمارے یہاں رائج ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَصِفَةُ اللَّحْدِ أَنْ يُحْفَرَ الْقَبْرُ بِتَمَامِهِ ثُمَّ يُحْفَرُ فِيْ جَانِبِ الْقِبْلَةِ مِنْهُ حَفِيْرَةٌ فَيُوْضَعُ فِيْهِ الْمَيِّتُ كَذَا فِي ''الْمُحِيْط'' ـ وَيُجْعَلُ ذٰلِكَ كَالْبَيْتِ الْمُسَقَّفِ كَذَا فِي الْبَحْرِ الرَّائِقِ، فَاِنْ كَانَتِ الْاَرْضُ رِخْوَةً فَلَا بَأْسَ بِالشَّقِّ كَذَا فِيْ فَتَاوٰى قَاضِيْ خَانَ، وَصِفَةُ الشَّقِّ أَنْ تُحْفَرَ حَفِيْرَةٌ كَالنَّهْرِ وَسَطَ الْقَبْرِ وَيُبْنٰى جَانِبَاهُ بِاللَّبِنِ أَوْ غَيْرِهِ وَيُوْضَعُ الْمَيِّتُ فِيْهِ وَيُسَقَّفُ كَذَا فِيْ ''مِعْرَاجِ الدِّرَايَةِ''۔

ترجمہ: ''لحد کی صورت یہ ہے کہ قبر پوری کھودنے کے بعد قبلے کی جانب کھودی جاتی ہے پھر اُس میں میت رکھ دے، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے، جیسا کہ (چھت والے) مکان بنائے جاتے ہیں، ''البحر الرائق'' میں اِسی طرح ہے۔ پس اگر زمین نرم ہو تو صندوق بنانے میں حرج نہیں، فتاویٰ قاضی خان میں بھی اِسی طرح ہے اور شق (صندوق) کی صورت یہ ہے کہ

قبر کے درمیان میں نہر کی طرح مستطیل ایک گڑھا کھودا جائے جس کے دونوں جانب پکی اینٹیں یا کسی اور چیز سے بنادیں اور میت اُس میں رکھ کر اوپر سے چھت ڈال دی جاتی ہے، جیسا کہ ''معراج الدرایہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:166165-)''۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ

سوال:

اُمّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تھی یا نہیں؟، اگر پڑھائی گئی تو کس نے پڑھائی؟، (منور احمد، ملیر)۔

جواب:

اُم المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ ادانہیں کی گئی تھی کہ نمازِ جنازہ کے احکام بعد میں نازل ہوئے اور اُمّ المومنین کی وفات بعثتِ مبارکہ کے دس سال بعد رمضان میں ہوئی۔نمازِ جنازہ کا آغاز ہجرت کے پہلے سال شوال کے مہینے میں ہوا۔ علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:''اسلام میں نمازِ جنازہ کا آغاز ہجرت کے پہلے سال ماہِ شوال میں ہوا۔ حافظ ابن اثیر متوفّٰی 630ھ اور حافظ ابن کثیر متوفّٰی 774ھ نے لکھا ہے: کہ نبی ﷺ کے مدینہ منورہ میں ہجرت کے سات مہینے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا، (اُسد الغابہ، جلد 1،ص:205، البدایہ وَالنہایہ، جلد 2،ص:626)۔امام محمد بن سَعد مُتوفّٰی 230ھ نے لکھا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے اَسعد بن زُرارہ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور اُن کو سب سے پہلے بقیع (کے قبرستان) میں دفن کیا گیا، (طبقاتِ کبریٰ، جلد 3،ص:459)۔حافظ ابن حجر عسقلانی مُتوفّٰی 852ھ لکھتے ہیں: امام بغوی نے کہا ہے: مجھے خبر پہنچی ہے کہ ہجرت کے بعد صحابہ میں جو سب سے پہلے فوت ہوئے، وہ حضرت اسعد بن زُرارہ تھے اور نبی ﷺ نے سب سے پہلے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی، (الاصابہ، جلد 1،ص:209)''۔

(نعمۃ الباری شرح صحیح بخاری، جلد 3،ص:379)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: فی الواقع کتب سیر میں علماء نے یہی لکھا ہے کہ اُمّ المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جنازہ مبارکہ کی نماز نہ ہوئی کہ اُس وقت یہ نماز ہوئی ہی نہ تھی، اس کے بعد اس کا حکم ہوا ہے۔ زُرقانی علی المواہب میں ہے: فِیْ رَمَضَانَ بَعْدَ الْبَعْثِ بِعَشْرِ سِنِیْنَ مَاتَتِ الصِّدِّیْقَةُ الطَّاهِرَةُ خَدِیْجَةُ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا وَدُفِنَتْ بِالْحَجُوْنِ وَنَزَلَ ﷺ حُفْرَتَهَا وَلَمْ تَكُنْ یَوْمَئِذٍ الصَّلٰوةُ عَلَی الْجَنَازَةِ

ترجمہ: ''صدیقہ طاہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بعثت کے دس سال بعد ماہِ رمضان میں وفات پائی اور مقامِ حجون میں دفن کی گئیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کی قبر میں اُترے، اُس وقت نمازِ جنازہ نہ تھی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص:369)''۔

زکوٰۃ کے مسائل

خیراتی فنڈ پر زکوٰۃ نہیں

سوال:

ہماری جماعت کا ذیلی ادارہ عید قرباں کے دنوں میں ہماری جماعت کے ممبرز اور دیگر مخیر حضرات سے چرمِ قربانی وصول کر کے غریب اور مڈل کلاس خاندانوں کی طبی امداد، ہسپتال کے اخراجات، وغیرہ کی مد میں صرف کرتا ہے۔ گذشتہ چند سالوں کی غیر استعمال شدہ رقوم رکھی ہوئی ہیں۔ جس کے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لئے گئے بعد میں اُن سرٹیفکیٹ کو بھنوالیا گیا۔ ہم آپ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا غیر استعمال شدہ رقم کو DSC یا اسلامی بینک میں رکھ کر اس کا منافع حاصل کر سکتے ہیں، حاصل شدہ منافع اور وقت ضرورت کے مطابق اسلامی بینک میں رکھی گئی رقم غریب اور مڈل کلاس ممبران پر خرچ کی جاسکتی ہے۔ چرمِ قربانی کی وصولی میں جو اخراجات مثلاً یومیہ سوزوکی کرایہ، عملہ کی اجرت، کارکنان کا کھانا وغیرہ ہوتے ہیں، کیا یہ مذکورہ اخراجات اِس رقم سے کئے جاسکتے ہیں؟۔ چرمِ قربان کی غیر استعمال شدہ رقم کتنے عرصے تک رکھ سکتے ہیں اور اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی ادارے کو کرنا ہوگی یا نہیں؟ (محمد صدیق صولی، آنریری سیکریٹری جنرل، پوربندر میمن جماعت)

جواب:

قربانی کی کھال صدقۂ نافلہ ہے اور ہر نیک کام میں خرچ کی جاسکتی ہے اس میں مالک بنانا بھی شرط نہیں ہے، فقہاء نے لکھا کہ غنی (مالدار) کو بھی دے سکتے ہیں، لیکن دینا صحیح نہیں کیونکہ مقصدِ تصدُّق کے خلاف ہے۔ قربانی کی کھال سے حاصل ہونے والی رقم رفاہِ عامہ کے کاموں میں خرچ کی جاسکتی ہے۔ آپ اِس رقم یا اس کے کچھ حصے کو انوسٹ (Invest) کرنا چاہتے ہوں تو اسلامی بینک میں مضاربت پر نفع ونقصان کا اکاؤنٹ کھولیں تا کہ خالص ربا (سود) سے بچ سکیں، اسلامی بینک سے حاصل ہونے والے منافع سے مستحقین کی مدد بھی کر سکتے ہیں اور دیگر مصارف (عملہ وکارکنان کی اجرت وغیرہ) جو آپ نے ذکر کئے ہیں، اُن میں صرف کر سکتے ہیں۔ دینی کام رضا کارانہ طور پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور

اجرِ آخرت کے لئے کرنا افضل ہے۔ تاہم قرآن مجید میں صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، کفارات ونذر وغیرہ) کے جہاں مصارف بیان کئے گئے ہیں، وہاں چوتھا مصرف ایسے کارکنان کو بھی بیان کیا ہے جو زکوٰۃ وصدقات کی وصولی پر مامور ہوں، انہیں ''عاملینِ زکوٰۃ'' سے تعبیر کیا ہے، لہٰذا شرعاً اس کا جواز موجود ہے۔ کسی کارِ خیر کی اجرت مطلقاً معیوب بات نہیں ہے۔ اِس رقم کے روکے رکھنے یا صرف کئے جانے کی کوئی مدت متعین نہیں۔ خیراتی فنڈ (Chairity Fund) پر زکوٰۃ نہیں۔ زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ آپ اپنی برادری کے ممبران سے کہہ دیں کہ جو عطیات یا چرمِ قربانی آپ سب کی طرف سے جمع ہوگی، اسے سب سے پہلے برادری کے مستحقین کی مالی اعانت کی جائے گی اور جو رقم سال کے بعد بچ جائے، وہ عام مستحقین پر خرچ کی جائے گی، اس صورت میں آپ اس تذبذب سے بچ جائیں گے۔

کسی چیز کو محض مستحق کے تصرُّف میں دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی

سوال:

زید نے اسلم کو اپنی زکوٰۃ کی رقم دی کہ اس رقم سے مستحقین کو ضرورت کی کوئی چیز لے دو، اسلم نے اس رقم سے مکانات تعمیر کروا کر مستحقین کو دیئے۔ اس نے ان میں سے چند مکانات اکرم کے توسط سے دیئے، اسلم نے تو مکانات دیتے وقت کوئی شرط عائد نہیں کی البتہ اکرم نے مستحق افراد کو مکان دیتے وقت یہ شرط عائد کی کہ آپ اس مکان کے مالک نہیں ہے، صرف آپ کو رہائش کی سہولت دی جارہی ہے اور یہ مکانات ہمیشہ میری، میرے ادارے یا جماعت کی ملکیت رہیں گے۔ اگر تمہیں کہیں اور شفٹ ہونا ہو تو نہ مکان بیچ سکتے ہو اور نہ ہی کرائے پر دے سکتے ہو۔ اسکے علاوہ وقتاً فوقتاً اپنا حق جتاتا رہتا ہے اور اپنی تسکینِ نفس کے لئے کبھی کوئی اسٹکر یا بورڈ آویزاں کر کے اپنی تشہیر اور مستحقین کی عزتِ نفس مجروح کرتا رہتا ہے۔ اس تفصیل کے بعد چند سوالات کا حل مطلوب ہے:

(۱) کیا اس طرح زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے کہ جس مستحق کو دیئے، اُسے مالک نہ بنایا جائے؟۔

(۲) کیا اکرم کا زکوٰۃ کی مد میں دی گئی چیز کو اپنی ملکیت، اپنی جماعت یا ادارے کی ملکیت بنانا جائز ہے؟۔ (۳) کیا عمرو مستحقین سے وہ مکان واپس لے سکتا ہے؟۔ (۴) عمرو کے اس عمل کو شرعاً کیا کہا جائے گا؟۔ (۵) جس مستحق کو زکوٰۃ دی گئی، اُس کی عزتِ نفس مجروح کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟۔ (محمد خالد، اللہ والا ٹاؤن، کورنگی کراسنگ، کراچی)

جواب:

آپ کی بیان کی ہوئی صورت میں اسلم اور اکرم کی حیثیت زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے محض وکیل کی ہے، زید نے اپنی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اُنہیں وکیل مقرر کیا ہے، لہٰذا اُن دونوں پر لازم تھا کہ وکیل کی حیثیت سے مستحقین تک اُس زکوٰۃ کو پہنچادیتے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے، یعنی جس مستحق کو زکوٰۃ دی جارہی ہے، اُسے اُس مال پر تصرُّف کا مکمل اختیار حاصل ہونا چاہئے۔ جو شخص اپنے مال پر زکوٰۃ ادا کررہا ہے، شرعاً اُسے بھی اس طرح کی شرائط رکھنے کا اختیار حاصل نہیں، اکرم تو محض ادائیگیٔ زکوٰۃ کیلئے وکیل ہے۔ مذکورہ شرط سے مالکانہ تصرُّف کا اختیار باطل ہوجاتا ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی زکوٰۃ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (هِيَ) لُغَةً: اَلطَّهَارَةُ وَالنَّمَاءُ، وَشَرْعًا: (تَمْلِيْكٌ) خَرَجَ الْإِبَاحَةُ، فَلَوْ أَطْعَمَ يَتِيْمًا نَاوِيًا الزَّكَاةَ لَايُجْزِيْهِ إِلَّا إِذَا دَفَعَ إِلَيْهِ الْمَطْعُوْمَ، كَمَالَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ أَنْ يَعْقِلَ الْقَبْضَ۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ ہیں: ''(مال کا) پاک ہونا اور (مال کا) بڑھنا''۔ زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں: ''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنادینا''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کردینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہوگیا، پس اگر کسی شخص نے نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلا دیا، تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مگر جب وہی کھانا یتیم کے حوالے کردیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، جیسے اگر ادائے زکوٰۃ کے لئے یتیم کو کپڑا پہنایا بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہو (تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی)''۔۔۔۔۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَيُشْتَرَطُ أَنْ يَكُوْنَ الصَّرْفُ (تَمْلِيْكًا) لَا إِبَاحَةً كَمَا مَرَّ

ترجمہ:''اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنا دیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گذشتہ سطور میں) گزرا''۔

مالک بنائے جانے کے بعد اُس سے رجوع ممکن نہیں ہے اور ھبہ وصدقہ کا مالک بناتے وقت کسی شرطِ فاسد کا اضافہ کیا گیا ہوتو وہ شرط باطل ہوجائے گی اور ھبہ وصدقہ صحیح نافذ ہوجائے گا۔علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: اَلْبَحْثُ لِصَاحِبِ ''النَّھْرِ'' وَقَالَ: لِاَنَّہٗ مُقْتَضٰی صِحَّۃِ التَّمْلِیْکِ، قَالَ ''الرَّحْمَتِیُّ'': وَالظَّاھِرُاَنَّہٗ لَا شُبْھَۃَ فِیْہِ لِاَنَّہٗ مَلَّکَہٗ اِیَّاہُ عَنْ زَکَاۃِ مَالِہٖ وَشَرَطَ عَلَیْہِ شَرْطًا فَاسِدًا، وَالْھِبَۃُ وَالصَّدَقَۃُ لَایَفْسُدَانِ بِالشَّرْطِ الْفَاسِدِ۔

ترجمہ:''صاحبِ ''نہر'' نے اس پر بحث کرتے ہوئے فرمایا: تملیک کے درست ہونے کا تقاضا یہی ہے، ''رحمتی'' نے فرمایا: ظاہر یہی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں، کیونکہ اس نے فقیر کو اپنے مال کی زکوٰۃ دے کر اُسے مالک بنادیا اور ساتھ شرطِ فاسد کا اضافہ کردیا ہے، حالانکہ ھبہ اور صدقہ شرطِ فاسد سے باطل نہیں ہوتے (بلکہ فاسد شرط غیر مؤثر ہوجاتی ہے)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3،ص:161، 263-264)''۔یعنی اگر کسی شخص نے کسی کو کوئی چیز ھبہ کردی ہے یا صدقے کے طور پر دے دی ہے اور وہ اس کے تصرف پر کوئی شرط بھی عائد کردے کہ مثلاً: تم اسے بیچ نہیں سکو گے، تو یہ شرط باطل ہوجائے گی اور ھبہ یا صدقہ کی ہوئی چیز پر قبضہ اور مِلک قائم ہونے کے بعد اسے ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہوگا۔زکوٰۃ بھی صدقہ ہے اور صدقہ شروطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتا بلکہ وہ شرط فاسد ہوجاتی ہے۔پس اُن مکانات پر اُن مستحقین کو پورے مالکانہ حقوق حاصل ہیں، خواہ اپنے ذاتی استعمال میں رکھیں یا کسی کو کرائے پر دے دیں یا کسی کو ھبہ کردیں یا وقف کردیں یا کسی پر فروخت کردیں۔صدقہ دے کر احسان جتانے سے اجر ضائع ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی

ترجمہ:''احسان جتا کر اور اذیت دے کر اپنے صدقات (کے اجر) کو باطل نہ کرو، (البقرہ:264)''۔اسی طرح زکوٰۃ میں دیئے ہوئے مال پر اپنا بورڈ لگانا ریا کاری

ہے اور رِیا اخلاص کی ضد ہے، جس سے اجر باطل ہوجاتا ہے اور حدیث میں نام ونمود اور ریا کے لئے انفاق فی سبیل اللہ پر آخرت میں عذاب کی وعید آئی ہے۔لہٰذا اکرم کی عائد کردہ شرائط فاسد ہیں اور یہ حرکات اگر وہ صاحب مال کے حکم سے کررہا ہے، تو اُس کا اجر باطل ہوگا اور اگر اپنی مرضی سے اپنے نفس اور انا کی تسکین کے لئے کررہا ہے، تو یہ گنہگار ہوا۔

زکوٰۃ کی رقم تعمیراتی مد میں استعمال نہیں کی جاسکتی

سوال:

ہمارے ادارے میں سماعت سے محروم بچوں کو میٹرک تک مفت تعلیم دی جاتی ہے، ادارے میں زیادہ تر غریب بچے ہیں۔مُخیّر حضرات کے تعاون سے ادارہ چل رہا ہے، جس میں عطیات وزکوٰۃ شامل ہے۔ادارے کی توسیع کے لئے ایک مکان خریدا تھا، جس پر تعمیراتی کام جاری ہے، کیا عمارت کی تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم لگائی جاسکتی ہے؟۔

(سید ابرار اللہ، سرجانی ٹاؤن، کراچی)

جواب:

زکوٰۃ کی رقم تعمیرات کی مد میں استعمال نہیں کی جاسکتی، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَلَا یَجُوْزُ اَنْ یُّبْنٰی بِالزَّکَاۃِ الْمَسْجِدُ وَکَذَا الْقَنَاطِرُ وَالسِّقَایَاتُ وَاِصْلَاحُ الطُّرُقَاتِ وَکَرْیُ الْاَنْھَارِ وَالْحَجُّ وَالْجِھَادُ وَکُلُّ مَالَاتَمْلِیْکَ فِیْهِ۔

ترجمہ:''اور زکوٰۃ کی رقم سے مسجد (وغیرہ) کی تعمیر جائز نہیں اور اسی طرح پلوں کی تعمیر، کنوؤں کی کھدائی، راستوں کی درستی، نہروں کی کھدائی اور حج اور جہاد کے لئے (زکوٰۃ کی رقم کا براہِ راست استعمال) جائز نہیں ہے، (اسی طرح) ہر اُس کام کے لئے جس میں تملیک نہ پائی جاتی ہو (زکوٰۃ کی رقم کا استعمال) جائز نہیں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:188)''۔

سوال میں مذکور ادارے کے تعمیری مصارف میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی کہ وہاں بھی تملیک موجود نہیں ہے۔

زکوٰۃ وفطرہ اور صدقاتِ واجبہ کی ادائیگی کے بارے میں روزنامہ اُمت کے سوالوں کے جوابات

سوال:

ا۔لسانی ،علاقائی اور فرقہ ورانہ بنیادوں پر کام کرنے والی تنظیموں کا زکوٰۃ وفطرہ لینا جائز ہے؟،کیا انہیں زکوٰۃ دینے سے شرعی فرض کی ادائیگی ہو جاتی ہے؟۔واضح رہے کہ ایسی بعض تنظیموں نے فلاحی شعبے کے نام سے کچھ سرگرمیاں شروع کر رکھی ہیں تاہم ان سرگرمیوں کے بارے میں جاننے اور درست طریقے سے معلومات لینے کا کوئی طریقہ کار نہیں ہے۔

۲۔لسانی ،علاقائی اور فرقہ ورانہ بنیادوں پر کام کرنے والی تنظیمیں لوگوں سے زبردستی بھی زکوٰۃ ،فطرہ وصول کرتی ہیں ،نہ دینے کی صورت میں جان ومال کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔کیا مذکورہ صورت میں زکوٰۃ وفطرہ دینے والا اپنے فرض کی ادائیگی سے بری الذمہ ہو گیا یا اُسے دوبارہ زکوٰۃ وفطرہ ادا کرنا ہوگا؟۔

۳۔ملک بھر میں فلاحی اداروں کے نام پر بعض ایسے ادارے کام کر رہے ہیں، جنہیں گویئے، میراثی ،فلم ایکٹر اور اسی قماش کے دوسرے لوگ چلاتے ہیں۔یہ غیر سرکاری ادارے (N.G.Os) ہر سال زور وشور سے زکوٰۃ ،فطرہ وصول کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اسے فلاحی کاموں میں صرف کریں گے۔واضح رہے کہ ان تنظیموں کی ساکھ اور طریقہ کار کا بھی دین سے کوئی تعلق نہیں اور ان میں کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت بھی دینی رجحان نہیں رکھتی۔ان تنظیموں کے اخراجات کے بارے میں جاننے کا کوئی طریقہ عام آدمی کے پاس نہیں ہے،کیا مذکورہ N.G.Os کو زکوٰۃ ،فطرہ دینا جائز ہے؟۔(ادارۂ امت، کراچی)

جواب:

ا۔بہتر تو یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ کی رقم براہِ راست مستحق کو دے ،لیکن وہ

قابلِ اعتماد ادارے یا فرد کو بھی اپنا وکیل بنا سکتا ہے۔اس کے لئے ضروری ہے کہ جو فرد یا ادارہ مال دار لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر رہا ہے، وہ زکوٰۃ کے مصارف شرعی کو جانتا بھی ہو اور خدا ترس اور ذمے دار ہو تاکہ وہ زکوٰۃ کو اس کے صحیح شرعی مصارف پر صرف کرے کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کی فرضیت کو بار بار تکرار کے ساتھ بیان فرمایا ہے، لیکن نہ زکوٰۃ کا نصاب بتایا ہے، نہ شرحِ زکوٰۃ اور نہ ہی وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط بتائی ہیں، یہ سب تفصیلات حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں۔البتہ زکوٰۃ کے جس شعبے کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وضاحت وصراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، وہ ''مصارفِ زکوٰۃ'' ہیں اور سورۂ توبہ آیت نمبر:60 میں اس کے آٹھ مصارف متعین فرما دیئے ہیں، جن میں رَدوبدل کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ارشادِ رسول ﷺ ہے:

حَدَّثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ (بِسَنَدِهٖ) اَنَّهٗ سَمِعَ زِیَادَبْنَ حَارِثِ الصُّدَائِیَّ قَالَ: اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَبَایَعْتُهٗ فَذَکَرَ حَدِیْثًا طَوِیْلًا فَاَتَاهُ رَجُلٌ، فَقَالَ: اَعْطِنِیْ مِنَ الصَّدَقَةِ، فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنَّ اللهَ لَمْ یَرْضَ بِحُکْمِ نَبِیٍّ وَلَاغَیْرِهٖ حَتّٰی حَکَمَ فِیْهَا هُوَفَجَزَّاَهَا ثَمَانِیَةَ اَجْزَاءٍ فَاِنْ کُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْاَجْزَاءِ اَعْطَیْتُكَ حَقَّكَ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن مسلمہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ان کے شیخ الشیخ نے زیاد بن حارث صدائی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے آپ ﷺ کے دستِ اقدس پر بیعتِ اسلام کی، پھر انہوں نے ایک طویل حدیث بیان کی اور اس دوران انہوں نے بیان کیا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمایئے! تو رسول اللہ ﷺ نے اُس سے فرمایا: (مصارفِ زکوٰۃ کے معاملے کو) اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے حکم پر نہیں چھوڑا (یعنی یہ صوابدیدی مسئلہ نہیں ہے)، بلکہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورۂ توبہ:60 میں) خود ہی فیصلہ فرما دیا ہے اور اس کے آٹھ مصارف بیان کئے ہیں، تو اگر تم ان میں سے کسی مصرف کے تحت حقدار بنتے ہو تو (مالِ زکوٰۃ میں سے) میں تمہارا حق

تمہیں دے دوں گا (ورنہ تمہیں نہیں دوں گا)، (سنن ابی داؤد: 1627)''۔

پس جن تنظیموں یا اداروں کے بارے میں زکوٰۃ دینے والے کو یقین یا ظنِ غالب ہو کہ وہ زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کو اس کے مصارف شرعیہ پر صرف نہیں کرتے تو انہیں زکوٰۃ ہرگز نہ دی جائے اور دینے سے ادا بھی نہیں ہوگی اور قیامت کے دن زکوٰۃ دینے والے سے اس کی باز پرس ہوگی۔

۲۔ زکوٰۃ ایک دینی و مالی عبادت ہے اور غیر مسلم ممالک میں بھی مسلمانوں پر اس حوالے سے کوئی جبر نہیں ہے، نہ غیر مسلم حکومتوں کی طرف سے اور نہ ہی پرائیویٹ گروہوں کی طرف سے۔ اور آزاد وطن پاکستان تو حاصل ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ مسلمان اپنے آزاد وطن میں آزادانہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے، لہٰذا ایک اسلامی ریاست میں اس طرح کا جبر افسوسناک ہے جو مسلمانوں کی آزادانہ عبادت کے حق کو اپنی مرضی کے تابع کرے۔ اگر کسی کو اپنی جان، مال اور عزت بچانے کے لئے اس طرح کے عناصر کو جبراً وکرہاً کچھ دینا پڑے، تو یہ ایک ابتلا ہے اور اس کا وبال حکومت پر بھی ہوگا، لیکن اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، البتہ اگر ان سے جان، مال یا عزت وآبرو کو خطرہ لاحق ہو اور حکومت بھی تحفظ نہ دے تو زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کے علاوہ کچھ دے کر دفع شر کریں۔

۳۔ جن تنظیموں کا آپ نے حوالہ دیا ہے، حقیقت حال تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، مگر جس طرح آپ نے بیان کیا ہے کہ ظنِ غالب یا غالب قرائن وآثار ایسے ہیں کہ یہ لوگ زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ شرعی حدود وقیود کے ساتھ اُن مصارف پر صرف نہیں کرتے بلکہ ان میں سے بعض کے تو نظریات بھی سیکولر ہیں، بعض نام نہاد لبرل اور آزاد منش ہیں، بعض اپنے اللّے تللّوں پر خرچ کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کو دینے سے زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ ادا نہیں ہوں گے، البتہ نفلی خیرات ان کو دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں، لیکن جن کے مشاغل و پروگرام غیر شرعی ہوں، ان کو دینا حرام ہے کیونکہ یہ ''اِعانت علی المعصیۃ'' ہے، یعنی برائی کے کاموں میں معاون ومددگار بننا اور اس سے قرآن مجید میں صراحۃً منع فرمایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد

ہے: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

ترجمہ: ''نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور حدودِ شرعی سے تجاوز والے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو، (المائدہ:2)''۔

زکوٰۃ کی رقم سے افطار کا اہتمام کرنا

سوال:

ایک صاحبِ ثروت شخص رمضان المبارک میں اچھی خاصی رقم مدرسہ کے طلبا اور غریب افراد کے افطار کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ کیا زکوٰۃ کی رقم سے افطار کروا سکتے ہیں؟، (قاری حافظ محمد اسرائیل، مدرسہ دار القرآن، اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

زکوٰۃ یا فطرہ کی رقم ایسے مصارف پر جہاں ''تملیک'' (مالک بنانا) نہ پایا جائے، صرف نہیں کی جاسکتی۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک (یعنی مالک بنانا) شرط ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَشَرْعًا: (تَمْلِيْكٌ) خَرَجَ الْاِبَاحَةُ، فَلَوْ اَطْعَمَ يَتِيْمًا نَاوِيًا الزَّكَاةَ لَايُجْزِيْهِ اِلَّا اِذَا دَفَعَ اِلَيْهِ الْمَطْعُوْمَ، كَمَا لَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ اَنْ يَعْقِلَ الْقَبْضَ اِلَّا اِذَا حَكَمَ عَلَيْهِ بِنَفَقَتِهِمْ۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں: ''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنا دینا''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کر دینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہو گیا، پس اگر کسی شخص نے نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلا دیا، تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مگر جب وہی کھانا یتیم کے حوالے کر دیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، جیسے اگر ادائے زکوٰۃ کے لئے یتیم کو کپڑا پہنایا بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہو (تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی)، لیکن اگر حاکم نے اس شخص کو یتیم کو نان نفقہ دینے کا حکم دے دیا ہے، تو اب یتیم پر خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی (بلکہ وہ یتیم کی کفالت کر کے اپنا فرض ادا کرے گا)''۔۔۔۔۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَيُشْتَرَطُ اَنْ يَكُوْنَ الصَّرْفُ (تَمْلِيْكًا) لَا اِبَاحَةً كَمَا مَرَّ۔

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنا دیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گذشتہ سطور میں) گزرا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3،ص:161)

آج کل چوکوں اور چوراہوں پر، بالخصوص رمضان المبارک کے مہینے میں بعض لوگ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ وغیرہ کی رقوم سے لنگرِ عام کھلاتے ہیں، جس میں اس بات کی کوئی تمیز نہیں ہوتی کہ یہ لوگ مستحقِ زکوٰۃ ہیں یا نہیں؟، اسی طرح غیر مسلم بھی آکر شامل ہوسکتے ہیں جبکہ وہ مصرفِ زکوٰۃ نہیں بن سکتے۔ اگر بالفرض سبھی لنگر کھانے والے مستحق ہوں تو بھی اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیونکہ ادائیگیِ زکوٰۃ کے لئے محض اباحت (یعنی کسی چیز کو کسی مستحق کے استعمال کے لئے مباح کردینا) کافی نہیں بلکہ اس کو مالک بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں ادائیگیِ زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کا یہ طریقہ درست نہیں ہے اور اس طرح سے زکوٰۃ دینے والے بری الذمہ نہیں ہوں گے اور جو تنظیمیں اس طرح کا نظام چلاتی ہیں، وہ بھی عنداللہ جوابدہ ہوں گی، البتہ اگر نفلی خیرات (Charity) کے طور پر کوئی یہ لنگر چلا رہا ہے تو جائز ہے، ویسے ہمارے نزدیک یہ طریقہ احترامِ انسانیت کے منافی ہے۔ غیر مسلموں کو نفلی خیرات دی جاسکتی ہے۔

قرضِ حسن پر زکوٰۃ

سوال:

کیا قرضِ حسن پر زکوٰۃ ہے؟، (فیصل گھڑیالی، کراچی)۔

جواب:

قرض دینے والا مال کا حقیقی مالک ہے، مگر قرض دینے کے بعد اُس کی ملکیت تو قائم ہے لیکن تصرُّف موجود نہیں۔ مقروض کی ملکیت اس لئے مکمل نہیں کہ اس کے پاس تصرُّف تو ہے مگر وہ اس مال کا قانونی مالک نہیں ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق اگر مقروض صاحب حیثیت اور دیانت دار ہے کہ قرض واپس کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور قرض ادا کرنے سے انکاری بھی نہیں ہے یا اگر مقروض انکاری ہے مگر قرض دہندہ کے پاس ٹھوس

شہادتیں یا تحریری دستاویزات اور ثبوت موجود ہیں، تو چونکہ ایسی صورت میں قرض وصول کرنے کی قوی امید موجود ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے یہ مال قرض دہندہ کے قبضے اور تصرُّف میں ہو، لہٰذا اس قرض کی زکوٰۃ قرض خواہ پر واجب ہے۔ اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہر سال اپنے واجب الوصول (Receiveable) قرض کی رقم کو اپنی کل مالیت میں جمع کر کے زکوٰۃ ادا کرتا رہے، ہوسکتا ہے اس کی برکت سے قرض جلد وصول ہو جائے، ورنہ قرض کی رقم جب بھی وصول ہوگی تو پچھلے تمام سالوں کی اکٹھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

پلاٹ پر زکوٰۃ کس صورت میں ہوگی

سوال:

بچوں کے لئے اِس نیت کے ساتھ پلاٹ خریدا کہ اُن کی شادی پر کام آئے گا، کیا اِس پر زکوٰۃ ہے؟۔ یا تو وہ اُس پر گھر بنائے گا، یا اُسے خود بیچ دے گا، یا والد پلاٹ بیچ کر شادی میں خرچ کرے گا یا جہیز میں دے دے گا۔ بچے بالغ ہو گئے ہیں مگر پلاٹ اُن کے سپرد نہیں کیا، زکوٰۃ کون دے گا؟، (فیصل گھڑیالی، کراچی)۔

جواب:

ذاتی استعمال کا مکان زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے، اسی طرح ذاتی مکان کے لئے خریدا ہوا پلاٹ بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔ ایسے مکانات، پلاٹس، دکانیں یا فلیٹس جو کاروباری اور تجارتی مقاصد کے لئے ہیں، یعنی نفع کمانے کی غرض سے خریدے گئے ہیں، ان سب کی مالیت پر زکوٰۃ ہے، اور اس میں قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے بلکہ موجودہ بازاری قیمت (Market Value) کا اعتبار ہوگا۔ سوال میں جو صورت آپ نے بیان کی ہے، اُس کے مطابق وہ پلاٹ والد ہی کی ملکیت ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اس پر تصرُّف کرے گا، خواہ فروخت کر کے شادی پر خرچ کرے یا بیٹیوں کو جہیز میں دے یا اپنا گھر بنائے۔ لہٰذا یہ مالِ تجارت کے حکم میں ہے اور ان پر بازاری قیمت کے مطابق زکوٰۃ فرض ہے۔

شرعی فقیر پر زکوٰۃ، فطرہ اور حج فرض نہیں

سوال:

میرے چھ بچے ہیں، پانچ زیرِ تعلیم ہیں۔ میں پاکستان اسٹیل کا ملازم ہوں، ماہانہ 30 ہزار کماتا ہوں، ذاتی مکان اہلیہ کے نام اور اِسی مکان کے آدھے حصے سے کرائے کی مد میں سات ہزار روپے کی آمدنی ہے۔ گھر کے کل آٹھ افراد ہیں، اس کے باوجود مہینہ بڑی مشکل سے گزرتا ہے، بچت بالکل نہیں ہوتی۔ تقریباً تین لاکھ روپے کے مقروض بھی ہیں، ہم کم برابر قرض اتارنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ بچیوں کی شادی کی بالکل تیاری نہیں کر پا رہے۔ اکاؤنٹ میں کوئی نقد رقم یا گھر میں سونا چاندی بالکل نہیں ہے۔ میرے ذمہ گھر کا سربراہ اور اہلیہ کے ذمہ مالک مکان ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ، حج اور قربانی کے کیا احکام ہیں؟۔ آج تک ہم ان مدوں میں کوئی فریضہ انجام نہیں دے سکے ہیں۔

(نسیم احمد، سیکٹر G-5 نیو کراچی)

جواب:

آپ کے بیان کے مطابق آپ کا دستیاب آمدنی میں گزر اوقات مشکل سے ہوتا ہے اور پس انداز رقم کچھ بھی نہیں ہے اور علاوہ ازیں آپ پر تین لاکھ روپے قرض بھی ہے۔ لٰہذا آپ پر شرعاً قربانی، حج، صدقۂ فطر اور زکوٰۃ کچھ بھی واجب نہیں ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں آپ سے باز پرس ہوگی۔ آپ رزق میں کشادگی کے لئے ہر نماز کے بعد ''یَا رَزَّاقُ یَا وَاسِعُ یَا صَمَدُ'' اور ''حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ'' پڑھتے رہیں اور قرض کی ادائیگی کے لئے دعا کریں، فجر اور مغرب کے بعد پڑھیں: ''اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِکَ عَنْ حَرَامِکَ وَأَغْنِنِیْ بِفَضْلِکَ عَمَّنْ سِوَاکَ'' اور رات کو سونے سے پہلے پانچ سو مرتبہ ''یَا مُسَبِّبَ الْاَسْبَابِ'' پڑھیں۔ اور اپنی طرف سے تگ و دو کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ اسباب کو سازگار فرمائے گا۔ ایسا شخص جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو نصاب کے برابر ہو، اُسے شرعی فقیر کہا جاتا ہے۔

روزے کے مسائل

نفلی صدقات کا حکم

سوال:

رمضان المبارک میں کچھ مخیر حضرات ہماری مسجد میں افطاری کے لئے نقد رقم دیتے ہیں اور بعد المغرب کھانے کے لئے دیگوں کا اہتمام کرتے ہیں، آخری عشرہ میں معتکفین کے لئے بھی یہ اہتمام ہوتا ہے۔ مسجد کمیٹی اُس رقم سے افطار کا اہتمام کرتی ہے۔ مسجد کمیٹی نے یہ اہتمام کررکھا ہے کہ ہر فرد کے لئے علیحدہ علیحدہ پلاسٹک کے برتنوں میں دیا جاتا ہے۔ دکاندار، ریڑھی والے، ہوٹل اور ہر طبقہ کے لوگ شربت اور افطار وغیرہ شاپنگ بیگ میں ڈال کر لے جاتے ہیں، اسی طرح کچھ لوگ مغرب کے بعد اور سحری کا کھانا بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ کیا افطار کا یہ سامان لوگ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں؟۔ مسجد کمیٹی ممبران اور مسجد کا عملہ جو مسجد میں ہر وقت حاضر رہتا ہے، کیا یہ تمام لوگ افطار و سحر میں مسجد میں کھاسکتے ہیں اور اپنے گھروں پر پارسل لے جاسکتے ہیں؟۔

(محمد حسین، جامع مسجد نوری، علی آباد کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں محلے کے عطیہ دینے والے اہلِ خیر حضرات کی طرف سے یہ انتظام اگر نفلی خیرات (Charity) کی رقم سے کیا جارہا ہے تو یہ جائز ہے، اس سے کسی بھی روزے دار کو افطار کرایا جاسکتا ہے اور وہ چاہے تو گھر بھی لے کر جاسکتا ہے، کیونکہ چندہ دینے والوں کے لئے یہ معہود و معروف (Understood) ہے اور ان کا سکوت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس پر راضی ہیں۔ افطار کے لئے دی جانے والی رقم کا مصرف (یعنی روزے داروں کو افطار کرانا) مُتعین ہے، لیکن افراد مُتعین نہیں ہوتے۔ لہٰذا کسی بھی روزے دار کو اس سے افطار کرایا جاسکتا ہے۔ چونکہ نفلی صدقہ کے لئے لینے والے کا مستحقِ زکوٰۃ یعنی فقیر و مسکین ہونا ضروری نہیں ہے، اس لئے کسی بھی روزے دار کو افطار کرایا جاسکتا ہے اور وہ افطار کرسکتا ہے، خواہ انتظامیہ کا رکن ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر عطیہ دینے

والوں کی طرف سے کوئی شرط عائد نہیں ہے، تو لوگ ساتھ بھی لے جاسکتے ہیں اور معتکفین کو بھی کھلایا جاسکتا ہے۔ تاہم عطیہ دینے والوں کو یہ بتادیا جائے کہ وہ اس مد میں زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم نہ دیں، کیوں کہ صدقاتِ واجبہ کے مصارف مُتعین ہیں اور ان رقوم کے خرچ کرنے کے لئے شرعی شرائط کی پابندی لازم ہے۔ ان رقوم سے صرف مالکانہ بنیاد پر فقراء و مساکین کو نقد رقم یا کھانا وغیرہ دیا جاسکتا ہے، صرف اباحت کافی نہیں ہے۔ اس کو معتکفین یا غیر مستحقِ زکوٰۃ دکانداروں پر صرف نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی انتظامیہ کے لوگ اسے خود کھاسکتے ہیں یا گھر لے جاسکتے ہیں۔

روزے کی نیت کا شرعی حکم

سوال:

رمضان المبارک کے روزوں کے لئے سحری کے وقت جو نیت کی جاتی ہے: ''وَبِصَوْمِ غَدٍ نَوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ''، اس میں کل کے روزے کی نیت سے کیا مراد ہے؟، کیا اس طرح نیت کرنا درست ہے؟، (قاری بہادر خان، چترال)۔

جواب:

نیت دل کے ارادے کا نام ہے، یہ قلب و ذہن کا عمل ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظاً روزے کی نیت کے کلمات منقول نہیں ہیں اور ان نفوسِ قدسیہ کو اِس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ ہر وقت اور ہر عبادت میں حضوریِ قلب، توجہ الی اللہ اور اخلاص وللّٰہیت کی کیفیت سے سرشار رہتے تھے۔ وہ جسم وروح، قلب اور قالب کی یکسوئی، جمعیت خاطر اور عزیمت کے ساتھ دورانِ عبادت بلکہ ہر حال میں ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب متوجہ رہتے تھے، اس لئے ان کو لفظاً نیت کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ متاخرین فقہاء کرام اور جمہور علماء امت نے جب یہ دیکھا کہ اب لوگوں میں حضوریِ قلب اور استحضارِ نیت کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی تو اُنہوں نے لفظاً نیت کو مستحسن و مستحب قرار دیا، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَالنِّيَّةُ مَعْرِفَتُهُ بِقَلْبِهِ أَنْ يَصُومَ كَذَا فِي الْخُلَاصَةِ وَ "مُحِيطِ السَّرَخْسِيِّ"، وَالسُّنَّةُ أَنْ يَتَلَفَّظَ بِهَا كَذَا فِي "النَّهْرِ الْفَائِقِ"۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَلَوْ قَالَ نَوَيْتُ أَنْ أَصُومَ غَدًا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالَى صَحَّتْ نِيَّتُهُ هُوَ الصَّحِيحُ كَذَا فِي "الظَّهِيرِيَّةِ"۔

ترجمہ: "اور نیت دل سے اِس بات کے جاننے کا نام ہے کہ وہ فلاں دن کا روزہ رکھ رہا ہے، "خلاصۃ الفتاویٰ" اور "محیط السرخسی" میں اسی طرح ہے۔ اور سنت یہ ہے کہ (زبان سے) الفاظ ادا کئے جائیں، جیسا کہ "النہر الفائق" میں ہے۔۔۔۔ اگر (روزے دار نے) کہا: میں نے کل کے روزے کی نیت کی ان شاء اللہ، تو اُس کی نیت صحیح ہے اور یہی بات صحیح ہے، جیسا کہ "ظہیریہ" میں بھی ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:195)"۔

روزے کی نیت کا وقت صبح صادق سے ضحوۂ کبریٰ (جسے لوگ عموماً زوال کا وقت کہتے ہیں) سے پہلے تک ہے۔ اصطلاح میں لفظ "غد" بمعنی کل اِس لئے مستعمل ہے کہ عام طور پر صبح صادق سے پہلے روزے کی نیت کرلی جاتی ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(وَالسُّنَّةُ) أَيْ سُنَّةُ الْمَشَايِخِ، لَا النَّبِيِّ ﷺ لِعَدَمِ وُرُودِ النُّطْقِ بِهَا عَنْهُ، قَوْلُهُ: (أَنْ يَتَلَفَّظَ بِهَا) فَيَقُولُ: نَوَيْتُ أَصُومُ غَدًا أَوْ هٰذَا الْيَوْمَ إِنْ نَوَى نَهَارًا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ فَرْضِ رَمَضَانَ۔

ترجمہ: "(اور روزے کی نیت کرنا سنت ہے) یعنی یہ علماء ومشائخ کی سنت ہے، نبی کریم ﷺ کی سنت نہیں ہے کیونکہ (رسول اللہ ﷺ سے) لفظاً (نیت کے کلمات) وارد نہیں ہوئے۔ مصنف کا قول: (زبان سے الفاظ ادا کرے) پس (اگر رات میں نیت کرے تو) یہ کہے: میں نے نیت کی کہ "اللہ عزّوجل کے لئے کل کا روزہ رکھوں گا" یا "آج کے رمضان کے فرض روزے کی نیت کرتا ہوں"، اگر نیت دن میں کی ہے"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص:308)

علامہ ابوبکر بن علی بن محمد الحدادیمنی متوفّٰی 800ھ لکھتے ہیں: فَيَقُولُ إِذَا نَوَى مِنَ اللَّيْلِ: نَوَيْتُ أَصُومُ غَدًا لِلّٰهِ تَعَالَى مِنْ فَرْضِ رَمَضَانَ، وَإِنْ نَوَى مِنَ النَّهَارِ يَقُولُ: نَوَيْتُ

أَصُوْمُ هٰذَا الْيَوْمَ لِلّٰهِ تَعَالٰى مِنْ فَرْضِ رَمَضَانَ۔

ترجمہ:''پس جب رات میں (روزے کی) نیت کرے تو کہے: میں نے نیت کی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کل رمضان کا فرض روزہ رکھوں گا، اور اگر دِن میں نیت کرے تو کہے: میں نے نیت کی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے آج رمضان کا فرض روزہ رکھتا ہوں، (الجوہرۃ النیّرہ،ص:167)''۔

الغرض اگر رات کو نیت کرنا چاہے تو یہ کہے کہ:''میں کل کے روزے کی نیت کرتا ہوں''۔ اور اگر صبح صادق کے وقت یا اس کے بعد کر رہا ہے تو یہ کہے: نَوَيْتُ اَنْ أَصُوْمَ هٰذَا الْيَوْمَ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ فَرْضِ رَمَضَانَ، ترجمہ:''میں آج کے رمضان کے فرض روزے کی نیت کرتا ہوں''۔

روزے کی حالت میں ازدواجی تعلق قائم کرنے والے پر قضا و کفارہ لازم ہے

سوال:

ایک شخص نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے مباشرت کی جبکہ اُسے اپنا روزہ دار ہونا یاد تھا، اِس کا کفارہ کیا ہوگا؟ (معرفت: شیر محمد، کراچی)۔

جواب:

اگر اُسے اپنا روزہ دار ہونا یاد ہے اور اُس نے بیوی سے مباشرت کی تو روزہ جاتا رہا اور اُس شخص پر روزے کی قضا کے ساتھ کفارہ بھی لازم ہے۔ روزہ توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ متواتر ساٹھ دنوں کے روزے رکھے اور اگر روزے نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ مساکین کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائے۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلاً وَقَعَ بِامْرَأَتِهٖ فِيْ رَمَضَانَ، فَاسْتَفْتٰى رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: هَلْ تَجِدُ رَقَبَةً؟، قَالَ: لَا، قَالَ: وَهَلْ تَسْتَطِيْعُ صِيَامَ شَهْرَيْنِ؟، قَالَ: لَا، قَالَ: فَأَطْعِمْ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رمضان میں (دن کے وقت) اپنی بیوی سے جماع کرلیا، پھر رسول اللہ ﷺ سے اس سلسلے میں مسئلہ

دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم غلام آزاد کرسکتے ہو؟، اُس نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: دوماہ کے روزے رکھ سکتے ہو؟، اُس نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلادو، (صحیح مسلم:2595)"۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: مَنْ جَامَعَ عَمْدًا فِیْ أَحَدِ السَّبِیْلَیْنِ فَعَلَیْهِ الْقَضَاءُ وَالْکَفَّارَۃُ وَلَا یُشْتَرَطُ الْاِنْزَالُ فِی الْمَحَلَّیْنِ کَذَا فِی "الْھِدَایَۃِ"، وَعَلَی الْمَرْأَۃِ مِثْلُ مَا عَلَی الرَّجُلِ اِنْ کَانَتْ مُطَاوِعَۃً وَاِنْ کَانَتْ مُکْرَھَۃً فَعَلَیْھَا الْقَضَاءُ دُوْنَ الْکَفَّارَۃِ، وَکَذَا اِذَا کَانَتْ مُکْرَھَۃً فِی الْاِبْتِدَاءِ ثُمَّ طَاوَعَتْہُ بَعْدَ ذَالِکَ کَذَا فِیْ "فَتَاوٰی قَاضِیْ خَانْ"۔

ترجمہ: "جس نے جان بوجھ کر سبیلین (فرج و دبر) میں سے کسی مقام پر (عورت سے) جماع کیا، تو اُس پر قضاء اور کفارہ (دونوں) لازم ہیں اور اُس پر قُبُل ودُبُر میں انزال شرط نہیں ہے، "ہدایہ" میں اِسی طرح ہے۔ اور عورت اپنی رضا سے (جماع میں) مشغول رہی، تو اُس پر بھی مرد کی طرح قضاء وکفارہ (دونوں) لازم ہیں اور اگر مرد نے مجبور کر کے (جماع) کیا تو عورت پر صرف (روزے کی) قضاء ہے، کفارہ نہیں اور اِسی طرح اگر ابتداء میں اُس پر جبر کیا گیا، پھر خوشی سے مشغول ہوگئی (تو اُس پر کفارہ لازم نہیں)، "فتاویٰ قاضی خان" میں اِسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:205)"۔

نوٹ: روزہ رکھ کر توڑنے سے کفارہ صرف اس صورت میں لازم آتا ہے کہ رات ہی سے روزۂ رمضان کی نیت کی ہو اور اگر دن میں روزے کی نیت کی اور پھر توڑ دیا، تو کفارہ لازم نہیں، (جوہرہ، بہارِ شریعت، جلد:5، ص:991)۔

رمضان المبارک میں ملازمین کو دوپہر کا کھانا دینا

سوال:

ہمارے یہاں اکثر ملازمین اندرونِ سندھ یا پنجاب سے آئے ہوئے لوگ ہیں جن کو ادارے کی طرف سے قیام وطعام کی سہولت حاصل ہے، اکثر ملازمین نماز وروزہ کے

پابند نہیں ہوتے۔ رمضان المبارک میں کچھ مزید ملازمین رکھے جاتے ہیں۔ سارا سال کی طرح ماہِ رمضان میں بھی ملازمین کو صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا مہیا کیا جاتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ رمضان المبارک میں ہم اُنہیں صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا دے کر کسی گناہ کے مرتکب تو نہیں ہورہے؟، (شیخ محمد حسین، کورنگی کراچی)۔

جواب:

رمضان المبارک کے روزے ہر مسلمان عاقل وبالغ پر فرض ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر روزے رکھنا فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ گنتی کے چند دنوں میں، پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا مسافر ہو (اور روزے نہ رکھے) تو دوسرے دنوں میں عدد (پورا کرنا) لازم ہے، (البقرہ:184-183)''۔

مسافر، حاملہ عورت اور ایسا مریض جو روزے نہ رکھ سکتا ہو یا روزے رکھنے سے مرض بڑھنے کا اندیشہ ہو، کے سوا کسی دوسرے شخص کو بلا عذر روزہ چھوڑنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔
اگر آپ کے ادارے میں کام کرنے والے ملازمین پر اس حوالے سے کوئی پابندی نہیں یا کام کی نوعیت ایسی نہیں کہ جو روزہ یا نماز کی ادائیگی میں رکاوٹ ہو تو ملازمین کے روزہ ونماز ترک کرنے کا وبال خود اُنہی پر ہے، مگر آپ کی شرعی ذمہ داری ہے کہ انہیں صوم وصلوٰۃ کی پابندی کی تلقین کریں اور دین دار ملازمین کی خصوصی حوصلہ افزائی کریں اور دین دار ملازمین کو ترجیح دیں۔ آپ کے ادارے کی طرف سے اُن ملازمین کے لئے سحری وافطار بشمول رات کے کھانے کا انتظام ہونا چاہئے، ناشتہ یا دوپہر کے کھانے کا نہیں، کیونکہ اُن کے روزہ نہ رکھنے کے سبب دوپہر کا کھانا مہیا کرنا اُن کے گناہ پر معاونت شمار ہوگا اور اللہ

عزّوجل کا فرمان ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
ترجمہ: ''اور تم نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔

اگر اُن کا روزے نہ رکھنا اِس سبب سے ہے کہ اُن کا کام سخت محنت ومشقت والا ہے، تو یہ ہوسکتا ہے کہ ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ'' (نیکی پر معاونت) پر عمل کرتے ہوئے ملازمین کو دِن کے اوقات میں سہولت اور رعایت دے سکتے ہیں، جس پر آپ عند اللہ ماجور ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوْكِهٖ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَأَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ۔
ترجمہ: ''جو آدمی (ماہِ رمضان المبارک میں) اپنے خادم کے کام میں تخفیف کرے گا، اللہ تعالیٰ اُس کی مغفرت فرمادے گا اور اس کو دوزخ سے رہائی دے دے گا''۔
(مشکوٰۃ، ص:174)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: لَا يَجُوْزُ أَنْ يَّعْمَلَ عَمَلًا يَصِلُ بِهٖ إِلَى الضُّعْفِ، فَيَخْبِزُ نِصْفَ النَّهَارِ وَيَسْتَرِيْحُ الْبَاقِيْ۔
ترجمہ: ''روزہ دار کے لئے ایسا کام کرنا جائز نہیں ہے، جس سے اُسے (روزہ رکھنے میں) کمزوری محسوس ہو، پس نانبائی آدھا دن روٹی لگائے اور باقی دن آرام کرے''۔
(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص:357)

اعتکاف کن صورتوں میں فاسد ہوجاتا ہے

سوال:

اعتکاف کن کن صورتوں میں فاسد ہوجاتا ہے؟، (محمد ابدال، نارتھ کراچی)۔

جواب:

رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف ''سنّتِ مؤکّدہ علی الکفایہ'' ہے، جس کے لئے روزہ شرط ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اَلسُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ أَنْ لَّا يَعُوْدَ مَرِيْضًا، وَلَا يَشْهَدَ جَنَازَةً وَلَا يَمَسَّ امْرَأَةً وَلَا

يُبَاشِرَهَا وَلَا يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ إِلَّا لِمَا لَا بُدَّ مِنْهُ، وَلَا اعْتِكَافَ إِلَّا بِصَوْمٍ وَلَا اعْتِكَافَ إِلَّا فِي مَسْجِدٍ جَامِعٍ۔

ترجمہ: ''معتکف کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ نہ کسی مریض کی عیادت کو جائے، نہ کسی جنازے میں شریک ہو، نہ کسی عورت کو چھوئے، نہ اُس کے ساتھ مباشرت کرے، نہ ہی کسی ناگزیر ضرورت کے بغیر کسی کام کے لئے (مسجد سے) باہر نکلے اور روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہے اور جامع مسجد میں ہی اعتکاف کرے، (سُنن ابوداؤد: 2473)''۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ فِي الْمُعْتَكِفِ: هُوَ يَعْكُفُ الذُّنُوبَ، وَيَجْرِي لَهُ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا۔

ترجمہ: '' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مُعتکف کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ گناہوں سے (تو ویسے بھی) رکا رہتا ہے، اور (مسجد میں ٹھہرے رہنے کی وجہ سے) ایسی تمام نیکیوں کا ثواب اسے مل جاتا ہے (جو اعتکاف کی پابندیوں کی وجہ سے وہ کر نہیں پاتا)، (سُنن ابن ماجہ: 1781)''۔

اعتکاف کی صحت کے لئے مفسدات سے بچنا ضروری ہے۔

ا۔ معتکف کو طبعی وشرعی ضرورت کے بغیر مسجد سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے، رات میں نہ دن میں، اگر بلا ضرورت ایک لحہ کو بھی نکلا تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

(الف) شرعی عذر سے مراد غسلِ واجب یا وضو کے لئے مسجد سے نکلنا۔

(ب) طبعی عذر سے مراد قضائے حاجت کے لئے مسجد سے نکلنا۔

۲۔ اگر مسجد میں جمعہ نہیں ہوتا تو جمعہ پڑھنے کے لئے دوسری مسجد میں جانا عذرِ شرعی ہے، اس کے لئے اذانِ جمعہ کے بعد نکلے۔

۳۔ کسی وقت کوئی حادثہ ہو جائے تو جان و مال بچانے کے لئے مسجد سے نکلنا جائز ہے۔

۴۔ مریض کی عیادت اور نمازِ جنازہ میں شرکت کے لئے اگر مسجد سے باہر گیا، تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

۵۔ بیوی سے جماع کرنا، بوسہ دینا، لمس اور معانقہ کرنا، یہ تمام امور ناجائز ہیں، ان سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

۶۔ معتکف کو بے ہوشی یا جنون طاری ہوا اور اتنا طول پکڑ گیا کہ روزہ نہ رکھ سکا، تو اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے اور قضا واجب ہے۔

۷۔ مرض کے علاج کے لئے مسجد سے نکلے تو اعتکاف فاسد ہو گیا۔

۸۔ اعتکاف کے لئے روزہ شرط ہے، اس لئے روزہ توڑنے سے اعتکاف بھی ٹوٹ جاتا ہے، خواہ یہ روزہ کسی عذر کی وجہ سے توڑا ہو یا بلا عذر، جان بوجھ کر توڑا ہو یا غلطی سے ٹوٹا ہو، ہر صورت میں اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔ غلطی سے روزہ ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ تو یاد تھا، لیکن بے اختیار کوئی عمل ایسا ہو گیا جو روزے کے منافی تھا مثلاً لاعلمی کی بنا پر صبح صادق طلوع ہونے کے بعد تک کھاتا رہا یا غروبِ آفتاب سے پہلے افطار کر لیا پھر پتا چلا کہ وقت سے پہلے افطار کر لیا ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا یا روزہ یاد ہونے کے باوجود کلّی کرتے وقت بے اختیار پانی حلق میں چلا گیا، تو ان تمام صورتوں میں روزہ جاتا رہا اور اعتکاف بھی فاسد ہو گیا، مگر اس روزے کی صرف قضا کرنی ہوگی، کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

جن امور کی ممانعت (مثلاً جماع وغیرہ) اعتکاف کی وجہ سے ہے، اُن کے لئے مسجد سے نکلنا منع ہے، عمداً اور نسیاناً مسجد سے باہر نکلنے پر حکم یکساں ہے اور جن امور کی اعتکاف میں ممانعت روزے کی وجہ سے ہے: مثلاً کھانا، پینا، ان کے عمداً ارتکاب کی وجہ سے اعتکاف فاسد ہوگا اور بھول کر کرنے سے فاسد نہیں ہوگا۔

۹۔ مُعتکف کو غسلِ فرض اور غسلِ مسنون (جمعۃ المبارک کا غسل) کے علاوہ ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے غسل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

علامہ یوسف بن عمر الصوفی الکماروی لکھتے ہیں: وَيَجُوْزُ لِلْمُعْتَكِفِ اَنْ يَّخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فِيْ سَبْعَةِ اَشْيَاءَ اَلْبَوْلُ وَالْغَائِطُ وَالْوُضُوْءُ وَالْاِغْتِسَالُ فَرْضًا كَانَ اَوْ نَفْلًا وَالْجُمُعَةُ۔ الخ

ترجمہ: ''معتکف کے لئے سات چیزوں کی وجہ سے مسجد سے نکلنا جائز ہے: (۱) پیشاب

(۲) پاخانہ (۳) وضو (۴) غسل خواہ فرض ہو یا نفل (یعنی جمعے کا غسل مسنون) (۵) جمعہ پڑھنے کے لئے''۔ (جامع المضمرات والمشکلات شرح مختصر القدوری (مخطوطہ) ص:170)

الشیخ علی بن احمد الفوری لکھتے ہیں: فِی فَتَاوَی الْحُجَّةِ وَیَجُوْزُ لِلْمُعْتَکِفِ اَنْ یَّخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فِیْ سَبْعَةِ اَشْیَاءَ اَلْبَوْلُ وَالْغَائِطُ وَالْوُضُوْءُ وَالْاِغْتِسَالُ فَرْضًا کَانَ اَوْنَفْلاً وَالْجُمُعَةُ وَیَخْرُجُ اَیْضًا لِحَاجَةِ السُّلْطَانِ وَیَخْرُجُ اَیْضًا لِاَمْرٍ لَابُدَّ مِنْهُ ثُمَّ یَرْجِعُ بَعْدَ مَافَرَغَ مِنْ ذَالِکَ الْاَمْرِ سَرِیْعًا فِی ''الْخُوَارَزْمِی'' وَ ''السُّغْنَاقِی'' مِنَ الذَّخِیْرَةِ وَھٰذَا کُلُّهٗ فِی الْاِعْتِکَافِ الْوَاجِبِ۔

ترجمہ: ''فتاویٰ الحجہ میں مذکور ہے کہ سات امور انجام دینے کے لئے معتکف کا مسجد سے نکلنا جائز ہے: (۱) پیشاب (۲) پاخانہ کے لئے (۳) وضو (۴) غسل خواہ فرض ہو یا نفل (۵) جمعہ کی ادائیگی (۶) حاکم کے کام سے (۷) وہ کام جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، پھر فارغ ہونے کے بعد جلد واپس آجائے، خوارزمی اور سغناقی میں ''ذخیرہ'' سے نقل ہے اور یہ تمام باتیں اعتکافِ واجب میں ہیں، (خزانۃ الروایات (مخطوطہ) جلد 1، ص:431)۔

پہلے ہم نے اعتکاف کی حالت میں غسلِ مسنون (جمعہ کے غسل) کی ممانعت کا لکھا تھا، مگر اب ان فقہی حوالہ جات کی وجہ سے ہم نے اس کے جواز کا قول کیا ہے۔ اگر رمضان مبارک کے آخری عشرے کے اعتکاف کی نیت کی ہے اور بلا عذر یا کسی عذر کے سبب اعتکاف توڑ دیا، تو صرف ایک دن کی قضا لازم آئے گی۔ اگر رمضان مبارک میں قضا کرے تو رمضان کا روزہ اُس کے لئے کافی ہے، ورنہ غیر رمضان میں قضا کرنے کے لئے روزہ بھی لازم ہوگا۔

اعتکاف کے لئے مسجد کی شرط

سوال:

کیا رمضان کے اخیر عشرے کا اعتکاف مسجد میں ہونا ضروری ہے؟، یا مسجد سے ملحق کسی ہال یا علیحدہ سے کسی جگہ کیا جا سکتا ہے؟۔ جیسا کہ آج کل کچھ لوگ شہرِ اعتکاف کے نام سے کسی وسیع و عریض ہال یا گراؤنڈ کا انتظام کرتے ہیں اور وہاں کسی تنظیم یا ادارے کی

جانب سے ہزاروں افراد کو اجتماعی اعتکاف کروایا جاتا ہے۔

(یامین، روزنامہ نوائے وقت، لاہور)

جواب:

اعتدال اور میانہ رَوِی اختیار کرتے ہوئے اعتکاف یقیناً خلوت کی عبادت ہے، یہ نہ تو قدیم حکماء وفلاسفہ کی تجویز کردہ رَہبانیت یا جوگیوں کی طرح تنہائی اور مردم بیزاری کا نام ہے اور نہ ہی کسی فیسٹیول کی صورت جمع ہوجانے کا عمل۔ اسی لئے اعتکاف کا مقام اور جگہ دور دراز وادیوں اور پہاڑوں کے غاروں میں تجویز نہیں کئے گئے اور نہ ہی میلے ٹھیلوں کے مقامات کو پسند کیا گیا ہے، بلکہ محلہ کی وہ مسجد یا جامع مسجد تجویز کی گئی، جس میں پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ہوتی ہو۔ جہاں ایک ماحول رَبِّ کائنات کی عبادت وشکر گزاری کا پایا جاتا ہے، فرض نمازوں کے بعد نوافل، صلوٰۃ الاوّابین، تہجد، اِشراق وچاشت ہورہے ہوں، کسی گوشے میں تلاوتِ قرآن اور اَذکارِ الٰہیہ میں مشغولیت پائی جائے۔ اعتکاف کا مقصد توجہ الی اللہ ہے۔

رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف **"سُنّتِ مؤکّدہ علی الکفایہ"** ہے، اس اعتکاف میں ضروری ہے کہ رمضان المبارک کی بیسویں تاریخ کو غروبِ آفتاب سے پہلے نیتِ اعتکاف کے ساتھ مسجد میں داخل ہوجائے اور 29 ویں رمضان کی شام کو چاند نظر آنے یا تیس روزے پورے ہونے کی صورت میں غروبِ آفتاب کے بعد مسجد سے نکلے۔ اگر غروبِ آفتاب کے بعد مسجد میں داخل ہوئے یا غروبِ آفتاب کے بعد اعتکاف کی نیت کی تو یہ اعتکاف "سُنّتِ مؤکّدہ" نہیں بلکہ نفلی ہوگا۔ عورت اپنے گھر پر ہی کوئی کمرہ یا جگہ مخصوص کرکے وہاں اعتکاف کی نیت سے بیٹھ جائے۔ مردوں کے اعتکاف کے لئے مسجد کا ہونا شرط ہے، مسجد کے علاوہ مردوں کا اعتکاف جائز نہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اِس عبادت کے لئے یوں حکم فرماتا ہے:

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ

يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمہ:''اور جب تم مساجد میں معتکف ہوتو (کسی وقت بھی) اپنی بیویوں سے عملِ زوجیت نہ کرو، یہ اللہ کی حدیں ہیں، سوتم ان کے قریب نہ جاؤ، اللہ اسی طرح اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ متقی بن جائیں، (البقرہ:187)''۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

ترجمہ:''اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) سے تاکیداً فرمایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں (یعنی نماز پڑھنے والوں) کے لئے پاک رکھو، (البقرہ:125)''۔

اُمُّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا بِصَوْمٍ وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا فِيْ مَسْجِدٍ جَامِعٍ۔

ترجمہ:''اعتکاف (مسنون یا جس کی نذر مانی ہو) روزے کے ساتھ اور جامع مسجد میں ہی ہونا چاہیے، (سُنن ابوداود:2473)''۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ: اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ، قَالَ نَافِعٌ: وَقَدْ اَرَانِيْ عَبْدُ اللّٰهِ الْمَكَانَ الَّذِيْ كَانَ يَعْتَكِفُ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے تھے۔ نافع کہتے ہیں کہ عبداللہ نے مجھے وہ مقام دکھایا جہاں رسول اللہ ﷺ مسجد میں اعتکاف فرماتے تھے''۔ (سُنن ابوداود:2465)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ اعتکاف کی شرائط بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: وَمِنْهَا مَسْجِدُ الْجَمَاعَةِ فَيَصِحُّ فِيْ كُلِّ مَسْجِدٍ لَهٗ اَذَانٌ وَاِقَامَةٌ، هُوَالصَّحِيْحُ كَذَا فِي ''الْخُلَاصَةِ''۔ وَاَفْضَلُ الْاِعْتِكَافِ مَاكَانَ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ثُمَّ فِيْ مَسْجِدِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ ثُمَّ فِيْ بَيْتِ الْمَقْدِسِ ثُمَّ فِي الْجَامِعِ ثُمَّ فِيْمَا كَانَ اَهْلُهٗ اَكْثَرَ وَاَوْفَرَ كَذَا فِي ''التَّبْيِيْنِ''۔

ترجمہ:''(اعتکاف کی شرائط میں سے) مسجد جماعت ہونا ہے اور ہر وہ مسجد صحیح ہے جہاں اذان واقامت ہوتی ہو اور یہی صحیح ہے، جیسا کہ ''خلاصہ'' میں ہے۔ سب سے افضل مسجد حرام شریف میں اعتکاف ہے، پھر مسجدِ نبوی علیہ الصلاۃ والسلام، پھر بیت المقدس، پھر جامع مسجد میں اور پھر وہ مسجد جہاں بڑی جماعت ہوتی ہو، ''تبیین'' میں اِسی طرح ہے''۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:211)

اعتکاف کی حقیقت اور روح یہ ہے کہ انسان اپنے معمولاتِ زندگی کو تج کر، کاروبارِ حیات سے الگ تھلگ اور یکسو ہو کر اللہ سے لو لگائے، اُسی کے در پر پڑا رہے، اُسی کے ذکر و فکر میں مشغول رہے اور اسی کا ہو کر رہے، یہ دراصل ایک عُزلت نشینی اور خَلوت گزینی (Privacy) کی عبادت ہے۔ ایک حدیث پاک میں مساجد کو ''بیت اللہ'' اور مسجد میں عبادت کی غرض سے آنے والوں کو زائر کہا گیا ہے، تو معتکف گویا اللہ کے در پر سوالی بن کر بیٹھتا ہے اور وہ مجسم التجا و دعا بن جاتا ہے۔

آج کل نوجوانوں میں ''اعتکاف'' کا ذوق وشوق بہت ہے، یہ ایک اچھی علامت ہے اور مستحسن بات ہے، لیکن عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان ٹولیوں کی شکل میں مساجد میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں، بعض معتکفین کے گروپ بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی غیبتیں اور عیب جوئی کرتے ہیں، دو نوجوان پردہ تان کر اکٹھے سو جاتے ہیں، حالانکہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ دو سگے بھائی بھی بلوغت کے قریب عمر کو پہنچ جائیں، تو انہیں علیحدہ سلایا جائے۔ غروبِ آفتاب سے اختتام سحر تک چائے نوشی اور خورد و نوش کے دور چلتے رہتے ہیں، پیٹ بھر کر کھاتے ہیں، پھر دن بھر خوابِ غفلت میں پڑے رہتے ہیں۔ یہ سارا طرزِ عمل روحِ عبادت کے بالکل خلاف ہے، ایسا کرنے والوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اعتکاف میں نہ بیٹھیں بلکہ حسبِ توفیق نوافل، تلاوت اور اذکار کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر گھروں کو چلے جائیں۔ اعتکاف گروپ بندی کی عبادت نہیں ہے، خَلوت گزینی کی عبادت ہے۔ بندہ اعتکاف کی نیت کر کے، اللہ تعالیٰ سے پیمان کرتا ہے کہ وہ اسی کا ہو کر

رہے گا، پھر مسجد اور اعتکاف کی حرمت کو پامال کرنے کا وبال اپنے سر لینے سے بہتر ہے کہ اعتکاف میں نہ بیٹھیں، کیونکہ یہ عبادت شریعت نے فرض یا واجب قرار نہیں دی، یہ عبادت سنت ہے یا نفل۔ اور یہ عبادت وہی لوگ صحیح طور پر کر سکتے ہیں جو صاحبانِ عزیمت ہوں، اُن کے دل خَشیَۃِ الٰہی سے معمور ہوں، ان پر اللہ تعالیٰ کی ہیبت طاری ہو، نماز، قرآن، مسجد اور اعتکاف کی حرمت کی پاس داری کر سکتے ہوں، تو پھر یہ اعلیٰ درجے کی سعادت ہے، کیونکہ ؎

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری است

آج کل جو بعض مقامات پر اسے میلے ٹھیلے اور پکنک کا رنگ دے دیا گیا ہے، ہمارے نزدیک یہ درست نہیں ہے اور اعتکاف صرف مسجد ہی میں کرنا چاہئے۔

عاشورۂ محرم کا روزہ

سوال:

عاشورۂ محرم کے روزے کا کیا حکم ہے اور شریعتِ مطہرہ میں اِس کی کیا حیثیت ہے؟۔

جواب:

عاشور (دس مُحرّم) کا روزہ نفلی ہے اور شریعتِ مطہرہ میں اِس کی بڑی فضیلت اور اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ علماء کا اِس پر اتفاق ہے کہ عاشور (دس محرم) کا روزہ رکھنا سنّت ہے، ہاں ابتدائے اسلام میں اِس کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے: (۱) امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک ابتدائے اسلام میں عاشور کا روزہ واجب تھا۔ (۲) امام شافعی کے دوقول ہیں: (اول) عاشور کا روزہ رکھنا کبھی بھی واجب نہیں تھا بلکہ اِس کا استحباب مؤکد تھا، رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد اِس کے استحباب کا درجہ کم ہوگیا۔ (دوم) دوسرا قول امام اعظم کے مثل ہے۔

ابتدائی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عاشور کا روزہ رکھتے تھے۔ عاشور کے دِن روزہ رکھنے کی

فضیلت میں کئی احادیث وارد ہوئی ہیں:

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا قَالَ: صَامَ النَّبِیُّ ﷺ عَاشُوْرَاءَ وَأَمَرَ بِصِيَامِهٖ، فَلَمَّا فُرِضَ رَمَضَانُ تُرِكَ وَكَانَ عَبْدُ اللّٰہِ لَا يَصُوْمُهٗ إِلَّا أَنْ يُوَافِقَ صَوْمَهٗ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے عاشورا کا روزہ رکھا اور (صحابۂ کرام کو) بھی اس کے رکھنے کا حکم دیا، پھر رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو عاشورا کا روزہ ترک کر دیا گیا اور حضرت عبداللہ بن عمر صرف اس صورت میں عاشورا کا روزہ رکھتے تھے جب ان کے معمول کے نفلی روزے کے دِن عاشور ہو''۔

(صحیح بخاری:1892)

(۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ عَاشُوْرَاءُ يَوْمًا تَصُوْمُهٗ قُرَيْشٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ يَصُوْمُهٗ، فَلَمَّا قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ صَامَهٗ وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهٖ، فَلَمَّا افْتُرِضَ رَمَضَانُ كَانَ رَمَضَانُ هُوَ الْفَرِيْضَةَ، وَتَرَكَ عَاشُوْرَاءَ فَمَنْ شَاءَ صَامَهٗ وَمَنْ شَاءَ تَرَكَهٗ۔

ترجمہ: ''اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں قریش زمانۂ جاہلیت میں عاشورا کے دِن روزہ رکھتے تھے، رسول اللہ ﷺ بھی عاشورا کا روزہ رکھتے تھے، پھر جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے، (مدینہ میں بھی) عاشورا کا روزہ رکھتے اور لوگوں کو بھی اِس کا روزہ رکھنے کا حکم ارشاد فرماتے۔ پس جب (2ھ میں) رمضان کے روزے فرض ہو گئے، تو عاشورا کا روزہ ترک کر دیا، پس جو چاہتا اُس دن روزہ رکھتا اور جو چاہتا (اس دِن) روزہ ترک کر دیتا، (صحیح بخاری:2002، سُنن ترمذی:753)''۔

(۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَدِيْنَةَ فَوَجَدَ الْيَهُوْدَ صِيَامًا، فَقَالَ: مَا هٰذَا؟، قَالُوْا: هٰذَا يَوْمٌ أَنْجَى اللّٰہُ فِيْهِ مُوْسٰى، وَأَغْرَقَ فِيْهِ فِرْعَوْنَ فَصَامَهٗ مُوْسٰى شُكْرًا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: نَحْنُ أَحَقُّ بِمُوْسٰى مِنْكُمْ، فَصَامَهٗ وَأَمَرَ بِصِيَامِهٖ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ مدینہ میں آئے تو یہود اُس دِن کا روزہ رکھتے تھے، آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کیسا روزہ ہے؟، اُنہوں

نے کہا: اِس دِن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی تھی اور اس دن فرعون کو غرق کر دیا تھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دن شکر ادا کرنے کے لئے روزہ رکھا، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے شکر بجالانے کے مستحق ہیں، پس آپ ﷺ نے اُس دِن روزہ رکھا اور اُس دِن روزہ رکھنے کا حکم دیا''۔
(صحیح بخاری:2004-4680، سُنن ابن ماجہ:1734)

(۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا: حِيْنَ صَامَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ، وَأَمَرَ بِصِيَامِهٖ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ، اِنَّهٗ يَوْمٌ تُعَظِّمُهُ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: فَاِذَا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ، اِنْ شَاءَ اللهُ، صُمْنَا الْيَوْمَ التَّاسِعَ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورا کے دِن کا روزہ رکھا اور اس دن کا روزہ رکھنے کا حکم فرمایا تو صحابۂ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! یہ وہ دِن ہے جس کی یہود اور نصاریٰ تعظیم کرتے ہیں، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب آئندہ سال ہوگا تو ہم ان شاء اللہ نو محرم کا (بھی) روزہ رکھیں گے، (صحیح مسلم:2664)''۔

(۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لَئِنْ بَقِيْتُ اِلٰى قَابِلٍ لَأَصُوْمَنَّ التَّاسِعَ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھوں گا''۔ (صحیح مسلم:2665)

(۶) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: صُوْمُوْا يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ، وَخَالِفُوا الْيَهُوْدَ، صُوْمُوْا قَبْلَهٗ يَوْمًا، أَوْ بَعْدَهٗ يَوْمًا۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عاشورا کا روزہ رکھو اور اِس میں یہود کی مخالفت کرو، اِس سے ایک دِن پہلے یا اُس کے ایک

دِن بعد کا بھی روزہ رکھ لیا کرو، (مُسند امام احمد بن حنبل:2154)''۔

(۷) رُوِیَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ قَالَ: صُوْمُوا التَّاسِعَ وَالْعَاشِرَ وَخَالِفُوا الْيَهُوْدَ۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (محرم کی) نو اور دس تاریخ کو روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو، (سُنن ترمذی، جلد 1، ص:536)''۔

(۸) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: صِيَامُ يَوْمِ عَاشُوْرَاءَ إِنِّي أَحْتَسِبُ عَلَى اللهِ أَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهُ۔

ترجمہ:''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ عاشورا کے دِن روزہ رکھنے سے اللہ تعالیٰ اس سے ایک سال پہلے کے گناہ معاف فرمادے گا، (سُنن ترمذی:752، سُنن ابن ماجہ:1738)''۔

(۹) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: صَوْمُ يَوْمِ عَرَفَةَ يُكَفِّرُ سَنَتَيْنِ مَاضِيَةً وَمُسْتَقْبِلَةً وَصَوْمُ عَاشُوْرَاءَ يُكَفِّرُ سَنَةً مَاضِيَةً۔

ترجمہ:''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یومِ عرفہ کا روزہ ماضی اور مستقبل کے دو سالوں کے گناہوں کا کفارہ ہے (یعنی اُن کو مٹادیتا ہے) اور عاشورا کے دِن کا روزہ گذشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے''۔

(مسند امام احمد بن حنبل، جلد 5، ص:296)

علامہ ابن عابدین شامی ''سنت ھدیٰ'' اور ''سنت زائدہ'' کی تعریف کے بعد لکھتے ہیں:

وَالظَّاهِرُ أَنَّ صَوْمَ عَاشُوْرَاءَ مِنَ الْقِسْمِ الثَّانِي، بَلْ سَمَّاهُ فِي ''الْخَانِيَةِ'' مُسْتَحَبًّا فَقَالَ: وَيُسْتَحَبُّ أَنْ يَصُوْمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ بِصَوْمِ يَوْمٍ قَبْلَهُ أَوْ يَوْمٍ بَعْدَهُ لِيَكُوْنَ مُخَالِفًا لِأَهْلِ الْكِتَابِ، وَنَحْوُهُ فِي ''الْبَدَائِعِ''۔

ترجمہ:''ظاہر یہ ہے کہ عاشورا کا روزہ دوسری قسم سے ہے، بلکہ ''فتاویٰ خانیہ'' میں اسے مستحب قرار دیا ہے اور یہ بھی مستحب ہے کہ اس سے ایک دِن پہلے یا ایک دِن بعد بھی روزہ رکھا جائے تاکہ اہلِ کتاب کی مخالفت ہو، ''بدائع الصنائع'' میں اِسی طرح ہے''۔ (ردالمحتار

علی الدر المختار، جلد 3، ص:300)

الغرض عاشور (دس محرم) کا روزہ مستحب ہے، رسول اللہ ﷺ نے یہود کی مشابہت سے بچنے کے لئے فرمایا کہ ایک کے بجائے دو دِن (۹ اور ۱۰ یا ۱۰ اور ۱۱ المُحرّم) کا روزہ رکھا کرو۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فعل اصل کے اعتبار سے خیر ہو تو محض یہود سے مشابہت کی بنا پر اسے ترک نہیں کیا جائے گا بلکہ اصلِ خیر کو قائم رکھتے ہوئے مشابہت یہود سے احتراز کیا جائے گا۔

حج وعمرہ کے مسائل

عمرے کے متعلق چند سوالات

عمرے کے حوالے سے چند ضروری مسائل کا حل چاہتی ہوں۔

(بیگم عدنان یوسف، منگھوپیر روڈ، کراچی)

سوال:

عمرہ کے لئے ضروری شرائط کیا ہیں؟۔

جواب:

عمرہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک نفل اور سنت عبادت ہے، یعنی کوئی مسلمان استطاعت کے باوجود عمرہ ادا نہ کرے تو شرعاً اُس سے کوئی مؤاخذہ یا باز پرس نہیں ہوگی۔ لیکن جب کوئی اس کی نیت کر لے اور احرام باندھ لے تو اس پر واجب ہو جاتا ہے اور اس کی صحتِ ادا کے لئے شرعی شرائط کی پابندی ضروری ہے۔ جیسے نفل نماز کا شرعاً کسی سے مطالبہ نہیں ہے، لیکن جو مسلمان نفل نماز کی نیت کر کے شروع کر دے گا، تو اس پر صحتِ ادا کے لئے نماز کے تمام فرائض، واجبات، سنتوں اور مستحبات کی رعایت اور مفسدات ومکروہات سے بچنا ضروری ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَالْعُمْرَةُ) فِی الْعُمُرِ (مَرَّةً سُنَّةٌ مُؤَكَّدَةٌ) عَلَى الْمَذْهَبِ، وَصُحِّحَ فِی "الْجَوْهَرَةِ" وُجُوبُهَا، قُلْنَا: اَلْمَأْمُوْرُ بِهِ فِی الْآيَةِ الْإِتْمَامُ، وَذَالِكَ بَعْدَ الشُّرُوْعِ وَبِهِ نَقُوْلُ (وَهِیَ إِحْرَامٌ وَطَوَافٌ وَسَعْیٌ) وَحَلْقٌ أَوْ تَقْصِيْرٌ، فَالْإِحْرَامُ شَرْطٌ، وَمُعْظَمُ الطَّوَافِ رُكْنٌ، وَغَيْرُهُمَا وَاجِبٌ هُوَالْمُخْتَارُ، وَيَفْعَلُ فِيْهَا كَفِعْلِ الْحَاجِّ۔

ترجمہ: "صحیح مذہب کے مطابق اور تمام عمر میں ایک مرتبہ عمرہ کرنا سنتِ مؤکدہ ہے، اور "جوہرہ" میں عمرہ کے واجب ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔ ہم جواب میں کہتے ہیں: آیت میں حج کے ساتھ عمرے کے اتمام کا بھی ذکر ہے اور اِتمام فعل شروع ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے اور یہی ہمارا مذہب ہے۔ اور شریعت میں عمرہ احرام، طواف، (صفاومروہ کی) سعی اور حلق یا قصر پر مشتمل امور کا نام ہے۔ احرام باندھنا عمرہ میں شرط ہے، طواف کا اکثر حصہ (یعنی بیت

اللہ کے کم از کم چار چکر) رکن ہے اور اِس کے علاوہ باقی امور واجب ہیں اور یہی مختار قول ہے۔عمرہ (کے احرام اور طواف وسعی) میں ویسا ہی کرے، جیسا حج کرنے والا کرتا ہے''۔

حج کی شرائط میں وجوب کے لئے ایک شرط وقت کا پایا جانا بھی ہے، لیکن عمرہ کیلئے وقت کی قید نہیں، سوائے یوم عرفہ اور اُس کے بعد کے چار دنوں کے کہ ان میں عمرہ کرنا مکروہ ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَجَازَتْ فِیْ کُلِّ السَّنَةِ) وَنُدِبَتْ فِیْ رَمَضَانَ (وَکُرِهَتْ) تَحْرِیْمًا (یَوْمَ عَرَفَةَ وَأَرْبَعَةً بَعْدَهَا)۔

ترجمہ: ''پورے سال میں کسی بھی وقت عمرہ کرنا جائز ہے اور رمضان میں عمرہ کرنا مستحب ہے اور عرفہ کے دِن اور اس کے بعد کے چار دن (یعنی ایام تشریق میں) عمرہ کرنا مکروہِ تحریمی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3،ص:422)''۔

لیکن اگر عمرے کا احرام ان ایام سے قبل باندھا ہے، تو ان ایام میں عمرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، تاہم ان ایام سے مؤخر کرنا بہتر ہے۔

مقروض کا عمرہ کرنا

سوال:

میں نے پچھلے تین سالوں سے تنگدستی کے باعث زکوٰۃ ادا نہیں کی، میں مقروض بھی ہوں، کیا میں عمرے کی ادائیگی کے لئے جا سکتی ہوں؟۔

جواب:

عمرہ نفلی عبادت ہے، واجب نہیں ہے کہ نہ کرنے سے کوئی گنہگار قرار پائے یا آخرت میں مواخذہ ہو، تاہم اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے تو عمرہ کرنا سعادت ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اگر آپ صاحبِ نصاب ہیں تو آپ پر زکوٰۃ واجب ہے، اور شرعاً واجب عبادت نفلی عبادت پر مُقدم ہے۔ اگر آپ عمرہ ادا کریں گی تو ادا ہو جائے گا اور آپ کو اس کا اجر ملے گا۔ لیکن اگر آپ مقروض ہیں، تو قرض ادا کرنے کو ترجیح دینی چاہیئے، کیونکہ قرض کی باز پرس آخرت میں بھی ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تنبیہ اور

زجر (To Restrain) کے طور پر مقروض کا جنازہ پڑھانے سے منع فرمایا تھا تاوقتیکہ ایک صحابی نے اس کے قرض کو ادا کرنا اپنے ذمے لے لیا۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: اَلْقَتْلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ يُكَفِّرُ كُلَّ شَيْءٍ اِلَّا الدَّيْنَ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل (یعنی شہادت) سے بندے کے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، لیکن قرض کی مسئولیت باقی رہتی ہے، (صحیح مسلم:4880)''۔

عورت کا شوہر کے بغیر عمرے پر جانا

سوال:

میرے شوہر نے مجھے اپنے والد کے ساتھ عمرے پر جانے کی اجازت دی ہے کیونکہ میرا بھائی نہیں ہے اور میں اپنے والد کو عمرہ کرانا چاہتی ہوں، ایسی صورت میں کیا میں شوہر کے بغیر عمرے پر جانے سے گنہگار تو نہیں ہوں گی؟۔

جواب:

چونکہ آپ کے شوہر نے آپ کو بخوشی عمرے پر جانے کی اجازت دے دی ہے اور آپ کے ساتھ آپ کے والد شریکِ سفر ہوں گے، تو آپ کا عمرہ جائز ہے اور شوہر کے بغیر جانے سے آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور والد کو عمرہ کرانے کا اللہ تعالیٰ آپ کو یقیناً اجر عطا فرمائے گا۔

اپنے ناراض رشتے داروں سے صلح کرنا افضل ہے

سوال:

میری اپنے سسرال والوں سے اَن بَن ہے، جس کی بنا پر گذشتہ آٹھ ماہ سے اپنے والدین کے گھر رہ رہی ہوں، میرا اپنے شوہر کے سوا کسی سے رابطہ نہیں ہے، ہم آپس میں ملتے بھی رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ساس وغیرہ جو ناراض ہیں، تو کیا میں ان سے ملے

بغیر عمرے پر جاسکتی ہوں؟۔

جواب:

آپ کا اپنی ساس سے علیحدہ رہنا معیوب بات نہیں ہے، مگر قطع تعلق کرنا ''قطع رحمی'' ہے اور یہ شریعت میں منع ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''لَا یَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ یَّھْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَیَالٍ''۔

ترجمہ: ''مؤمن کیلئے یہ جائز نہیں کہ اپنے (دینی) بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق (Boycott) کرے، (صحیح بخاری: 6077)''۔

(2) عَنْ جُبَیْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ۔

ترجمہ: ''حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قطعِ رحمی کرنے والا (یعنی قرابت کے رشتے کو توڑنے والا) جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔
(صحیح بخاری:5984)

(3) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَایَکُوْنُ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّھْجُرَ مُسْلِمًا فَوْقَ ثَلَاثَةٍ فَاِذَا لَقِیَهُ سَلَّمَهُ عَلَیْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ کُلَّ ذَالِكَ لَایَرُدُّ عَلَیْهِ فَقَدْ بَاءَ بِاِثْمِهٖ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے قطعِ تعلق کرے، لہٰذا جب وہ اس سے ملے تو اسے (یکے بعد دیگرے) تین بار سلام کرے، (اور اگر) ہر بار (دوسرا بھائی سلام کا) جواب نہ دے، تو (سلام کرنے والا بری الذمہ ہوجائے گا اور) اب آئندہ جاری رہنے والے قطع تعلق کا سارے کا سارا گناہ اسی پر ہوگا (جس نے تین بار سلام کا جواب نہیں دیا)، (سنن ابوداود:4913)''۔آپ کے عمرے پر جانے کیلئے شرعاً ساس کی اجازت یا رضامندی ضروری نہیں ہے، شوہر کی اجازت کافی ہے۔لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی ساس اور سسر سے مل کر اور صلح کرکے جائیں، آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو اس کی معافی مانگ لیں اور ان کو بھی خوش دلی سے معاف کردینا چاہیے۔خدانخواستہ اگر وہ معاف

نہ کریں تو آپ حرمین طیبین جا کر ان کے لئے دعا کریں اور ان کی تالیف قلب اور دلوں میں نرمی پیدا ہونے کی بھی دعا کریں۔

عمرے کی شرعی حیثیت

سوال:

عمرے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ فرض ہے، واجب ہے، یا سنّت ونفل؟۔

جواب:

عمرے کے بارے میں فقہاء کرام کے تین اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ عمرہ فرض ہے۔ یہ حضرت امام شافعی کا قول ہے۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: وَقَالَ الشَّافِعِيَّةُ فِي الْأَظْهَرِ، وَالْحَنَابِلَةُ: اَلْعُمْرَةُ فَرْضٌ كَالْحَجِّ، لِقَوْلِهِ تَعَالَىٰ: وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (البقرہ:196) أَيِ ائْتُوا بِهِمَا تَامَّيْنِ وَمُقْتَضَى الْأَمْرِ الْوُجُوْبُ

ترجمہ: ''شافعیہ کے معروف قول کے مطابق اور حنابلہ کے نزدیک عمرہ حج کی طرح فرض ہے۔ وہ قرآن کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ: وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ''اور اللہ کے لئے حج اور عمرے کو پورا کرو'' (البقرہ:196)۔ ان کے نزدیک یہاں ''اِتمام (پورا کرنے)'' کا امر ہے اور امر وجوب (بمعنی فرض) کے لئے آتا ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد:3، ص:2075)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں: وَقَالَ الشَّافِعِيُّ: اَلْعُمْرَةُ سُنَّةٌ لَا نَعْلَمُ أَحَدًا رَخَّصَ فِي تَرْكِهَا، وَلَيْسَ فِيهَا شَيْءٌ ثَابِتٌ بِأَنَّهَا تَطَوُّعٌ، وَقَدْ رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ بِإِسْنَادٍ وَهُوَ ضَعِيفٌ لَا تَقُوْمُ بِمِثْلِهِ الْحُجَّةُ وَقَدْ بَلَغَنَا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ كَانَ يُوْجِبُهَا۔

ترجمہ: ''اور امام شافعی نے کہا: عمرہ سنت ہے، ہم کسی ایسے صاحبِ علم کو نہیں جانتے جس نے اس کے چھوڑنے کی رخصت دی ہو اور کہیں سے یہ ثابت نہیں کہ عمرہ نفلی عبادت ہے اور نبی ﷺ سے بعض ایسی ضعیف روایات بیان کی گئی ہیں کہ اس درجے کی کسی روایت سے حکم

شرعی ثابت کرنے کے لئے حجت قائم نہیں کی جاسکتی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ وہ عمرے کے وجوب کا قول کرتے تھے، (اس عبارت کا مستفاد بھی یہ ہے کہ عمرہ واجب ہے)، (سنن ترمذی، مع تحقیق وتخریج، جلد: 2، ص: 77)"۔

امام نووی لکھتے ہیں: وَاخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِیْ وُجُوْبِ الْعُمْرَةِ فَمَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ وَالْجُمْهُوْرِ أَنَّهَا وَاجِبَةٌ، وَمِمَّنْ قَالَ بِهٖ عُمَرُ، وَابْنُ عُمَرَ، وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَطَاوُوْسٌ، وَعَطَاءٌ، وَابْنُ مُسَيَّبٍ، وَسَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ، وَالْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ، وَمَسْرُوْقٌ، وَابْنُ سِيْرِيْنَ، وَالشَّعْبِيُّ، وَأَبُوْبُرْدَةَ ابْنُ أَبِيْ مُوْسٰى، وَعَبْدُاللهِ بْنُ شَدَّادٍ، وَالثَّوْرِيُّ، وَأَحْمَدُ، وَإِسْحَاقُ، وَأَبُوْ عُبَيْدٍ، وَدَاوُدُ، وَقَالَ مَالِكٌ، وَأَبُوْحَنِيْفَةَ، وَأَبُوْثَوْرٍ هِيَ سُنَّةٌ وَلَيْسَتْ وَاجِبَةٌ، وَحُكِيَ أَيْضًا عَنِ النَّخَعِيِّ۔

ترجمہ: "عمرے کے واجب ہونے میں علماء کا اختلاف ہے، امام شافعی اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ یہ واجب ہے، حضرت عمر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور بعض تابعین کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ وجوب کے قائل تھے۔ اور امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ابوثور رحمہم اللہ نے کہا: عمرہ سنت ہے، واجب نہیں ہے اور امام نخعی کا بھی یہی قول ہے، (صحیح مسلم مع شرح النووی، جلد: 4، ص: 276)"۔

فقہ حنفی کی رو سے عمرے کے بارے میں تین اقوال ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ عمرہ واجب ہے، جیسے صدقۂ فطر، قربانی اور وتر کی نماز۔ اور بعض فقہاءِ کرام نے جو عمرے کو "سنّت" کہا ہے، تو یہ وجوب کے منافی نہیں ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کا وجوب "سنّت" سے ثابت ہے۔ اور بعض فقہاء کرام نے عمرے کو سنت ونفل قرار دیا ہے۔

عمرے کے نفلی عبادت ہونے کے دلائل:

(۱) سورۂ آل عمران آیت 97 میں جہاں حج کی فرضیت کا ذکر ہے، اس میں عمرے کا ذکر نہیں ہے۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کیا عمرہ واجب ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں" تم عمرہ کرلو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، ایک روایت کے مطابق آپ نے جواب میں "خَیْرٌ لَّکَ" اور دوسری روایت کے مطابق آپ نے "اَوْلیٰ لَکَ" کے کلمات ارشاد فرمائے (دونوں کلمات کا معنی ایک ہی ہے، یعنی عمرہ کرنا تمہارے لئے بہتر ہے)"۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ بحوالہ: نیل الاوطار، جلد:3،ص:2075)

عَنْ جَابِرٍ: اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْعُمْرَةِ أَوَاجِبَةٌ هِیَ؟، قَالَ: "لَا" وَأَنْ تَعْتَمِرُوْا هُوَأَفْضَلُ۔

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے عمرہ کی بابت سوال کیا گیا کہ کیا عمرہ واجب ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں"، اگر تم عمرہ کرلو تو یہ افضل ہے، (سُنن ترمذی:931)"۔

(۳) رسول اللہ ﷺ سے ایک روایت ہے کہ: "اَلْحَجُّ مَکْتُوْبٌ وَّالْعُمْرَةُ تَطَوُّعٌ" (یعنی حج فرض ہے اور عمرہ نفل)، (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ بحوالہ: نیل الاوطار، جلد:3،ص:2075)"۔

ان تمام روایات کا مستفاد یہ ہے کہ عمرہ سنت ونفل ہے، واجب نہیں ہے۔

(۴) ایک اَعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ ﷺ سے ایمان اور شرائع (یعنی ارکانِ اسلام) کے بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے عبادات میں ارکانِ دین یعنی فرائض کا بیان فرمایا اور اس میں عمرے کا ذکر نہیں فرمایا، اس نے دریافت کیا کہ مجھ پر ان کے علاوہ بھی کوئی چیز لازم ہے؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "لَا" "اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ"، (ترجمہ: "نہیں" سوائے اس کے تم نفل کے طور پر اسے ادا کرو")۔

(۵) آیت میں جہاں حج کے ساتھ عمرے کے بھی اِتمام (پورا کرنے) کا ذکر ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی بھی نفلی عبادت جو اصلاً بندے پر فرض وواجب نہیں ہے، جب بندہ نیت کرکے شروع کردیتا ہے، تو پھر اس کا پورا کرنا اس پر واجب ہوجاتا ہے، خواہ نفلی نماز

ہو یا نفلی روزہ ہو یا عمرہ۔ اسی طرح بندہ جب کسی چیز کی نذر مان لیتا ہے، تو اس کا ایفا (پورا کرنا) اس پر واجب ہو جاتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ'' اور انہیں چاہئے کہ اپنی نذروں کو پورا کیا کریں (الحج: 29)''۔ حالانکہ نذر ماننے سے پہلے وہ چیز بندے پر واجب نہیں ہوتی۔

(۶) علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ترجمہ: ''مذہبِ حنفی کی ''ظاہر الروایہ'' کی رو سے عمرہ ''سنت'' ہے، کیونکہ امام محمد نے اس کو واضح طور پر ''تطوُّع'' (نفلی عبادت) لکھا ہے اور صاحبِ ''فتح القدیر'' علامہ کمال الدین بن ہمام کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وقت کے تعین کے بغیر زندگی میں ایک بار عمرہ ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے، البتہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنا افضل ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ عمرہ واجب ہے ''جوہرۂ نیرہ'' میں وجوب کے قول کو صحیح قرار دیا ہے، صاحب ''البحر الرائق'' نے کہا کہ علامہ علاؤ الدین ابو بکر کاسانی نے ''بدائع الصنائع'' میں اسے قولِ مختار قرار دیا ہے۔ امام ابن ہمام نے دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھا: عمرے کے واجب اور نفل ہونے کے بارے میں دلائل متعارض ہیں، لہٰذا جب وجوب ثابت نہ ہو تو محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فعلِ مبارک، صحابۂ کرام اور تابعین کرام کے فعل سے اس کا سنت ہونا ہی ثابت ہوگا، لہٰذا ہم نے سنت ہونے کا قول اختیار کیا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ مذہبِ حنفیہ کے قواعد کے مطابق عمرہ سنت ہے اور نفلی عبادت ہے، یہ ساری بحث ''ردالمحتار، جلد: 3، ص: 421، فقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد: 3، ص: 2075 اور بدائع الصنائع، جلد: 2، ص: 338'' کی بحث کا خلاصہ ہے۔

امام برہان الدین، امام ابن ہمام رحمہما اللہ تعالیٰ نے عمرے کو نفل اور سنت ہی قرار دیا ہے، (فتح القدیر علی الہدایہ، جلد: 3، ص: 124)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عمروں کی تعداد

سوال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کتنے عمرے ادا فرمائے تھے؟۔

جواب:

ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے عمروں کی تعداد چار ہے، جیسا کہ احادیث مبارکہ میں تصریح موجود ہے:

قَالَ اَنَسٌ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اِعْتَمَرَ أَرْبَعَ عُمَرٍ کُلُّھُنَّ فِیْ ذِی الْقَعْدَۃِ اِلَّا الَّتِیْ مَعَ حَجَّتِہٖ: عُمْرَۃٌ مِّنَ الْحُدَیْبِیَۃِ أَوْزَمَنَ الْحُدَیْبِیَۃِ فِیْ ذِی الْقَعْدَۃِ، وَعُمْرَۃٌ مِّنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ، فِیْ ذِی الْقَعْدَۃِ، وَعُمْرَۃٌ مِّنْ جِعْرَانَۃَ حَیْثُ قَسَمَ غَنَائِمَ حُنَیْنٍ فِیْ ذِی الْقَعْدَۃِ وَعُمْرَۃٌ مَّعَ حَجَّتِہٖ

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عمرے ادا کئے ہیں اور اس ایک عمرے کے سوا جو آپ نے حج کے ساتھ ادا فرمایا (باقی) سب ذیقعدہ میں کئے ہیں، ایک عمرہ صلحِ حدیبیہ کے زمانے میں ذیقعدہ میں کیا اور ایک عمرہ آپ نے (صلحِ حدیبیہ کے) اگلے سال ذوالقعدہ میں کیا، اور جب آپ نے غزوۂ حنین کا مالِ غنیمت تقسیم کیا، تو اس وقت ایک عمرہ ذیقعدہ میں جِعْرَانَۃ سے کیا اور ایک عمرہ آپ نے حج کے ساتھ کیا، (صحیح مسلم: 3031)''۔

صحیح مسلم کی حدیث نمبر: 3032 میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ایک حج اور چار عمروں کا ذکر ہے۔

امام نووی لکھتے ہیں: ''حضرت انس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایات میں رسول اللہ ﷺ کے چار عمروں پر اتفاق ہے۔ ایک عمرہ 6ھ میں صلح حدیبیہ کے سال کیا، اس موقع پر کفارِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا گیا تھا، لہٰذا اُنہوں نے اِحرام کھول دیا (یعنی اسے بھی محدثین کرام نے عمرہ شمار کیا ہے)۔ دوسرا عمرہ 7ھ میں ذیقعدہ میں کیا، اسے محدثین کرام نے ''عمرۃُ القضاء'' سے تعبیر کیا ہے۔ تیسرا عمرہ 8ھ کو فتح مکہ کے سال ذیقعدہ میں کیا (اور چوتھا عمرہ آپ ﷺ نے 10ھ کو حجۃ الوداع کے موقع پر کیا، اس کا احرام ذیقعدہ میں باندھا تھا اور ادائیگی ذوالحجہ میں کی تھی۔۔۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: صحیح یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عمرے کیے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہما نے تصریح کی ہے اور قطعیت کے ساتھ بیان کیا ہے، تو ان کی روایات کا قطعی دلیل کے بغیر رد کرنا جائز نہیں ہے۔۔۔۔ امام نووی مزید لکھتے ہیں: قاضی عیاض کا یہ قول کہ رسول اللہ ﷺ نے 10ھ کو ''حجِ اِفراد'' کیا تھا، ''حجِ قران'' نہیں کیا تھا، تو ان کا یہ قول صحیح نہیں ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ نبی ﷺ نے شروع میں صرف حج کا احرام باندھا تھا، (یعنی آپ مُفرِد تھے) لیکن پھر آپ نے عمرے کی بھی نیت کر لی اور آپ ''قارِن'' ہو گئے اور یہ تاویل ضروری ہے''۔

(صحیح مسلم مع شرح النووی، جلد 4، ص: 157)

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''پہلا عمرہ چھ ہجری میں حدیبیہ کے سال ذوالقعدہ میں کیا، جس میں آپ کو اور صحابہ کو روک دیا گیا اور آپ ﷺ اور صحابۂ کرام حلال ہو گئے، اس کو بھی عمرہ شمار کیا گیا''، (شرح صحیح مسلم، جلد 3، ص: 481)۔

صحیح بخاری: 1860 میں ہے کہ جب کفارِ قریش نے بیت اللہ تک جانے سے مسلمانوں کو روک لیا تو آپ نے اپنی ہَدی (قربانی کے اونٹ کو ذبح کر لیا) اور سر منڈا لیا اور فرمایا: میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے عمرے کو واجب کر لیا ہے۔

امام ابن ھُمام لکھتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا پہلا عمرہ صلح حدیبیہ کے سال 6 ہجری میں تھا، کفارِ مکہ نے آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو روک دیا تو آپ نے اپنی ہَدی کو ذبح فرمایا، آپ اور آپ کے اصحاب نے حلق فرمایا اور مدینہ منورہ کی طرف لوٹ گئے۔

حج اور عید الاضحیٰ کا باہم تعلق

سوال:

کیا حج اور عید الاضحیٰ کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟۔ میرے علم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے عید الاضحیٰ کو حج کے ساتھ نہیں جوڑا، (سورۂ کوثر: 2) رسول اللہ ﷺ نے حج کی فرضیت سے کئی سال پہلے ہی مسلمانوں کو عید الاضحیٰ منانے کا حکم

دے دیا تھا، جب وہ مدینہ منورہ تشریف لائے، (سنن ابوداود)۔ جتنے سال مدینہ میں مقیم رہے، حج کے ساتھ جوڑے بغیر اُنہوں نے ہر سال عید منائی یہاں تک کہ حج فرض ہوگیا۔ اس اُلجھن میں میری مدد فرمائیں کہ کیا حج کو عیدالاضحیٰ کے ساتھ جوڑنا درست ہے؟۔ حجاج نہ تو عید مناتے ہیں اور نہ ہی عید کی نماز پڑھتے ہیں، براہِ کرم فقہ کی روشنی میں اس مسئلے کی تفصیل بیان فرمائیں۔ (ڈاکٹر شہرام ملک، Johnson City، امریکہ)

جواب:

نمازِ عیدالاضحیٰ اور حج کا باہم کوئی التزام یا تلازم نہیں ہے۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے مواقع پر رسول اللہ ﷺ کا معمول احادیث مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ: کَانَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَخْرُجُ یَوْمَ الْفِطْرِ وَالْاَضْحٰی اِلَی الْمُصَلّٰی فَاَوَّلُ شَیْئٍ یَبْدَاُ بِہِ الصَّلٰوۃُ ثُمَّ یَنْصَرِفُ فَیَقُوْمُ مُقَابِلَ النَّاسِ وَالنَّاسُ جُلُوْسٌ عَلٰی صُفُوْفِھِمْ فَیَعِظُھُمْ وَیُوْصِیْھِمْ وَیَاْمُرُھُمْ فَاِنْ کَانَ یُرِیْدُ اَنْ یَّقْطَعَ بَعْثًا قَطَعَہٗ اَوْ یَاْمُرَ بِشَیْئٍ اَمَرَبِہٖ ثُمَّ یَنْصَرِفُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کو تشریف لے جاتے اور نماز سے ابتدا کرتے، نماز پڑھنے کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور لوگ صف بستہ بیٹھے ہوتے، پس آپ اُن کو وعظ و نصیحت فرماتے، اور حکم جاری فرماتے اگر کوئی لشکر بھیجنا ہوتا یا حکم جاری کرنا ہوتا تو اُس کا حکم فرماتے پھر واپس تشریف لاتے، (صحیح بخاری:956)''۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ: قَدِمَ النَّبِیُّ ﷺ الْمَدِیْنَۃَ وَلَھُمْ یَوْمَانِ یَلْعَبُوْنَ فِیْھِمَا، قَالَ: مَا ھٰذَانِ الْیَوْمَانِ؟ قَالُوْا: کُنَّا نَلْعَبُ فِیْھِمَا فِی الْجَاھِلِیَّۃِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: قَدْاَبْدَلَکُمُ اللّٰہُ خَیْرًا مِنْھُمَا یَوْمَ الْاَضْحٰی وَیَوْمَ الْفِطْرِ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ (مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے) مدینہ تشریف لائے، تو (اس زمانے میں) اہلِ مدینہ کے دو (تہوار)

کے دن تھے، جن میں وہ کھیل تماشے کرتے تھے (اہل سیرت کا بیان ہے کہ یہ نیروز اور مہرجان کے دن تھے)، تو آپ ﷺ نے پوچھا: یہ دو دن کیا ہیں؟، انہوں نے جواب دیا: ہم ان دنوں میں زمانۂ جاہلیت میں کھیل تماشا کرتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان دو دنوں کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں دو بہتر دن عطا کر دیئے ہیں، یعنی عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کا دن، (سنن ابوداؤد: 1134)''۔

یہ ہجرت کے ابتدائی سال کا ذکر ہے جبکہ حج اسلام میں 9ھ کو فرض ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عیدالاضحیٰ حج سے الگ ایک مستقل عبادت ہے۔

صحیح مسلم میں ''کتاب العیدین'' کا باب (Chapter) ہے۔ اس کے تحت امام یحیٰ بن شرف النووی متوفّٰی 676ھ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''امام شافعی اور جمہور علماء کے نزدیک نمازِ عید سنت مؤکدہ ہے۔ اور ایک شافعی عالم ابوسعید اِصطخری نے کہا: یہ فرض کفایہ ہے، اور امام ابوحنیفہ نے کہا: نمازِ عید واجب ہے، جب ہم کہتے ہیں کہ نمازِ عید فرض کفایہ ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شہر یا علاقے کے سب لوگ نمازِ عید ادا نہ کریں تو مطلقاً فرض کفایہ ترک کرنے پر ان سے قتال کیا جائے گا، اور جب ہم کہتے ہیں کہ نمازِ عید سنت مؤکدہ ہے، جیسے سنت ظہر وغیرہ، تو لوگوں کے ترک کرنے پر ان سے قتال نہیں کیا جائے گا اور ایک قول کی رو سے سنت قرار دیئے جانے کے باوجود اس کے ترک پر اُن سے قتال کیا جائے گا، کیونکہ یہ محض ایک سنت ہی نہیں ہے، مسلمانوں کا ایک ظاہری شِعار ہے (شِعار ایسے عمل کو کہتے ہیں جو کسی مذہب کی شناخت اور امتیاز بن جائے اور نمازِ عیدین میں مسلمانوں کی جمعیت کا ایک مظاہرہ ہوتا ہے)''۔

(صحیح مسلم بشرح الامام النووی، ج:5، ص:171)

صحیح مسلم میں اسی باب کے تحت امام مسلم حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول بیان کرتے ہیں کہ ''میں نبی ﷺ اور (آپ کے خلفاء اربعہ) ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے ساتھ نمازِ عید میں شریک رہا، سب نے پہلے نماز پڑھائی اور پھر خطبہ دیا''۔ اس کے تحت

امام نووی لکھتے ہیں: اس میں تمام علماء کے متفق علیہ مذہب کی دلیل ہے کہ خطبۂ عید، نمازِ عید کے بعد ہے، (صحیح مسلم بشرح الامام النووی، ج:5،ص:171)"۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: فقہ حنبلی میں ظاہر مذہب کے مطابق نماز عید (عید الفطر و عید الاضحیٰ) فرض کفایہ ہے، (المغنی لابن قدامہ ج:2،ص 367، کشاف القناع: ج:2،ص:55)

فقہ حنفی: نمازِ عیدین واجب ہے، جس پر جمعہ واجب ہے، اس پر نماز عید واجب ہے۔

فقہ مالکی وشافعی: نماز عیدین سنت مؤکدہ ہے، اور اس کی شرائط وہی ہیں، جو جمعہ کی ہیں۔

دلائل: ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ، (مفسرین نے اس سے نماز عید الاضحیٰ اور قربانی مراد لی ہے)۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین نے مُواظبت (Persistance) فرمائی۔

نمازِ عید ہجرت کے بعد مشروع (Legislated) ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے پہلی بار عیدین کی نماز 2ھ میں پڑھائی، (فقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد:2،ص:87-1386)۔

آپ کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے کہ نماز عید الاضحیٰ اور حج کا باہم کوئی التزام یا تلازم (They are not attached or connected with each other, they are not corelated, they are not coincident with each other) نہیں ہے اور یہ کہ حج زندگی میں ایک بار فرض ہے اور نماز عید الفطر و عید الاضحیٰ ہر سال پڑھی جاتی ہے، ائمۂ اربعہ کے نزدیک اس کی شرعی حیثیت (Legal Status) میں اگر کوئی اختلاف ہے، تو صرف اتنا ہے کہ آیا فرض کفایہ ہے، واجب ہے یا سنّت مؤکدہ ہے، لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ شعائرِ اسلام میں سے ہے اور شعائر اسلام (Religious Signs) کا قیام ودَوام مقاصدِ شرعیہ میں سے ہے۔

مخصوص ایام میں اِحرام باندھنے کا شرعی حکم

سوال:

میں 03 اپریل کو عمرے پر جارہی ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ماہانہ ایام شروع ہوگئے ہیں، ایسے میں کیا میں اِحرام باندھ کر جاؤں یا جدہ میں کچھ دن رک کر طہارت کے بعد اِحرام باندھوں۔ میں نے ڈاکٹر سے بھی رجوع کیا تھا، اُنہوں نے کچھ دوائیں دی ہیں جس سے ممکنہ طور پر اتوار تک ماہواری بند ہوجائے گی، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو کیا میں اِحرام باندھ کر روانہ ہوجاؤں؟، (سیما، کراچی)۔

جواب:

فقہاءِ کرام کی تصریحات کے مطابق حیض ونفاس احرام سے مانع نہیں ہیں۔ حیض یا نفاس والی عورت اِحرام باندھ سکتی ہے، اُسے چاہئے کہ حیض یا نفاس ہی کی حالت میں غسل کرکے احرام باندھ لے اور حج یا عمرے کے لئے روانہ ہوجائے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَإِذَا أَرَادَ الْإِحْرَامَ اغْتَسَلَ أَوْ تَوَضَّأَ وَالْغُسْلُ أَفْضَلُ إِلَّا أَنَّ هٰذَا الْغُسْلَ لِلتَّنْظِيفِ حَتّٰى تُؤْمَرَ بِهِ الْحَائِضُ كَذَا فِي ''الْهِدَايَةِ'' وَيُسْتَحَبُّ فِي حَقِّ النُّفَسَاءِ وَالصَّبِيِّ الخ۔

ترجمہ: ''(عازم حج وعمرہ) جب اِحرام کا ارادہ کرے تو غسل کرے یا وضو کرے اور غسل کرنا افضل ہے، مگر یہ غسل (نجاست صغریٰ یا کبریٰ سے طہارت کے لئے نہیں بلکہ) صفائی کیلئے ہے، یہاں تک حائض عورت کو بھی اس کا حکم دیا جائے گا، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے اور نفاس والی عورت اور بچے کے لئے بھی غسل مستحب ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص:222)

ائمۂ اربعہ کے نزدیک عورت کا اِحرام کے لئے غسل کرنا مستحب ہے۔ آپ غسل کرکے اِحرام باندھ لیں اور عمرہ کی نیت کرکے تلبیہ پڑھ لیں، اس طرح آپ ''مُحْرِمہ'' ہوجائیں گی۔ آپ اِحرام کے لئے نفل نہیں پڑھیں گی۔ آپ حرم شریف پہنچ کر ہوٹل پر قیام کریں یا جدہ میں کوئی آپ کا محرم ہے، تو اس کے ہاں بھی قیام کرسکتی ہیں، ایامِ حیض ختم ہونے پر غسل

طہارت کریں اور پھر جا کر اپنا عمرہ ادا کریں۔ آپ جدہ جا کر بھی ایامِ حیض ختم ہونے پر پاک ہو کر اِحرام باندھ سکتی ہیں، لیکن اگر آپ یہاں سے اِحرام باندھ کر جائیں گی تو آپ کا یہ سارا سفر عمرے کی عبادت میں شمار ہوگا اور اس پر آپ کو اجر ملے گا۔

جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ پر حج وعمرہ کرنا

سوال:

حج وعمرہ کی ادائیگی کے لئے جانے والے زائرین کو سعودی حکومت کی طرف سے پابند کیا جاتا ہے کہ مختلف مہلک بیماریوں سے بچاؤ اور پھیلاؤ کے سدِ باب کے لئے حفاظتی ٹیکے لگوانا لازمی شرط ہے۔ اِس ضمن میں چند معالج حضرات خانہ پری کے لئے ان حفاظتی ٹیکوں کی جعلی اسناد مہیا کرتے ہیں اور زائرین بغیر ٹیکے لگوائے اِن جعلی دستاویز کو ضروری سفری خانہ پری میں استعمال کرتے ہیں۔ کیا حج وعمرہ سے متعلق قوانین کی خلاف ورزی بذریعہ دھوکہ دہی جائز ہے؟۔ کیا اِن دستاویز کا تیار کرنا اور ان کا استعمال جائز ہے؟۔ کیا اس سے حج وعمرہ پر کوئی اثر پڑتا ہے؟، (نعمان علیم، سیکٹر 7-D/4، نارتھ کراچی)۔

جواب:

شرعاً ریاستوں/حکومتوں کو اپنی انتظامی مصلحتوں کے تحت مباح امور میں قانون بنانے کا اختیار حاصل ہے، جیسے مختلف ممالک کے لئے حج کا کوٹہ مقرر کرنا۔ اور کسی کے ملک میں جب ہم ویزا لے کر داخل ہوتے ہیں تو اس کے قوانین کی پابندی ہم پر لازم ہوتی ہے، اور قانون توڑنے کی صورت میں اگر گرفت میں آگیا تو عزت پامال ہوتی ہے اور مسلمان کو اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرنی چاہئے۔ حدیث پاک میں ہے:

لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَهٗ، قَالُوْا: وَکَیْفَ یُذِلُّ نَفْسَهٗ؟، قَالَ: یَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا یُطِیْقُ۔

ترجمہ: ’’کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ خود کو ذلت میں ڈالے، صحابۂ کرام نے عرض کی: (یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم!) وہ خود کو کیسے ذلت میں ڈالے گا؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے

فرمایا: کسی ایسی مصیبت میں خود کو گرفتار کرنا جس کی یہ طاقت نہیں رکھتا''۔

(سُنن ترمذی:2254)

اسی طرح ویزا لیتے وقت یا ضروری سفارتی کارروائی کے دوران دھوکا دہی، فریب اور جھوٹ، شرعاً اور اخلاقاً ناجائز وگناہ اور قانوناً جرم ہے اور یہ کوئی ایسی اضطراری صورت حال نہیں ہے کہ جھوٹ اور غلط بیانی کی رخصت دی جائے۔ حدیث پاک میں ہے: وَاِنَّ الْکِذْبَ یَھْدِیْ اِلَی الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ یَھْدِیْ اِلَی النَّارِ

ترجمہ: ''جھوٹ (اللہ کی) نافرمانی کا راستہ دکھاتا ہے اور فجور (اللہ کی نافرمانی انسان کو) جہنم کا راستہ دکھاتی ہے، (صحیح بخاری:6094)''۔

حدیث پاک میں اِس جرم کی شناعت اور قباحت کو یوں بیان فرمایا: لَیْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّ۔

ترجمہ: ''جو دھوکا دہی کرے، وہ ہم میں سے نہیں، (سُنن ترمذی:3452)''۔

شریعت کے احکام کا اِطلاق ظاہر پر ہوتا ہے اور ہم شریعت کے مطابق کسی عبادت کے صحیح یا باطل ہونے کا حکم ظاہری فقہی احکام کے مطابق لگاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہونے یا رَد ہونے کا سرٹیفکیٹ ہم جاری نہیں کرتے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عمل کی قبولیت کا مدار اخلاصِ عمل اور نیت پر ہوگا اور نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم حج یا عمرے کی عبادت کے لئے جھوٹ یا غلط بیانی کو اختیار کرنا بہر صورت ناجائز ہے اور اس گناہ میں جعلی طبّی سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا اور اس کا حامل یعنی استعمال کرنے والا دونوں شامل ہیں۔ پھر ''سَدِّ ذرائع'' یعنی خرابیوں کا سَدِّ باب کرنا مقاصدِ شرعیہ میں سے ہے اور اگر احتیاطی تدبیر کے طور پر بعض مہلک امراض کے ٹیکے لگوانے سے اُن امراض سے محفوظ رہنے کا ظنِّ غالب ہو تو اسے کسی قانونی پابندی کے بغیر بھی اختیار کرنا بہتر ہے۔

رمیٔ جمرات کا مسئلہ

سوال:

رمی کا وقت کب سے کب تک رہتا ہے؟ کیا رات میں رمی کی جا سکتی ہے؟۔
(ضیاء الرحمٰن، گلستانِ جوہر، کراچی)

جواب:

منیٰ میں تین جگہ ستون بنے ہوئے ہیں، ان کو جمرات (جمرہ کی جمع) کہتے ہیں۔ جمرہ سے مراد خاص وقت میں خاص مقام پر پتھر کی کنکریاں مارنا۔ پہلا جمرہ جو منیٰ سے قریب ہے، ''جمرۂ اولیٰ'' کہلاتا ہے اور درمیان والا ''جمرۂ وسطیٰ'' اور آخری جو مکہ سے قریب ہے ''جمرۂ عقبہ'' کہلاتا ہے۔ اِن کو عرفِ عام میں بالترتیب چھوٹا شیطان، درمیانہ شیطان اور بڑا شیطان بھی کہا جاتا ہے۔ دس، گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کو ان جمرات پر سات، سات کنکریاں ماری جاتی ہے، جسے رَمی جَمرات کہا جاتا ہے۔ یومِ نحر (دس ذی الحجہ) کو رمی کا وقت صبحِ صادق کے طلوع ہونے سے ہوتا ہے، طلوعِ فجر سے پہلے رمی جائز نہیں، مستحب وقت طلوعِ آفتاب سے وقتِ زوال تک ہے۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: رَمَی رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الْجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى، وَأَمَّا بَعْدُ، فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم النحر (دسویں ذی الحجہ) کو چاشت کے وقت رمی کرے اور اس کے بعد کے دنوں میں سورج ڈھلنے کے بعد، (صحیح مسلم: 3139)''۔

جمرۂ عقبہ کے بارے میں علامہ شامی نے لکھا ہے کہ یہ منیٰ کی آخری حد پر مکہ کی جانب ہے اور حدودِ منیٰ میں نہیں ہے۔ دسویں ذی الحجہ کو منیٰ میں پہلے جمرۂ عقبہ کی رَمی کی جاتی ہے۔ اِس رمی کا وقت دس ذی الحجہ کی نمازِ فجر سے گیارہ ذی الحجہ کی فجر تک ہے۔ مسنون یہ ہے کہ طلوعِ آفتاب سے زوال کے وقت تک کی جائے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَوَقْتُهُ مِنَ الْفَجْرِ إِلَى الْفَجْرِ، وَيُسَنُّ مِنْ طُلُوْعِ ذُكَاءٍ لِزَوَالِهَا، وَيُبَاحُ لِغُرُوْبِهَا، وَيُكْرَهُ لِلْفَجْرِ

ترجمہ: ''اِس رمی کا وقت (دس ذی الحجہ کی) فجر سے اگلے دن کی فجر تک ہے۔ مسنون وقت طلوعِ آفتاب سے زوال تک ہے اور زوال سے غروب تک مُباح ہے اور (غروب سے) فجر تک مکروہ ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3، ص: 474-473)''۔

گیارہ ذی الحجہ کو بعد نمازِ ظہر پہلے جمرۂ اولیٰ، پھر جمرۂ وسطیٰ اور پھر جمرۂ عقبہ کی رمی کی جائے گی۔ گیارہویں و بارہویں ذی الحجہ کی رمی کا وقت آفتاب ڈھلنے سے صبح تک ہے، رات میں یعنی آفتاب ڈوبنے کے بعد مکروہ ہے اور تیرہویں کی رمی کا وقت صبح سے آفتاب ڈوبنے تک ہے، مگر صبح سے آفتاب ڈھلنے تک مکروہ وقت ہے، اُس کے بعد غروب آفتاب تک مسنون۔

علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود حنفی کاسانی بیان کرتے ہیں: وَأَمَّا وَقْتُ الرَّمْيِ مِنَ الْيَوْمِ الْأَوَّلِ وَالثَّانِيْ مِنْ أَيَّامِ التَّشْرِيْقِ وَهُوَالْيَوْمُ الثَّانِيْ وَالثَّالِثُ مِنْ أَيَّامِ الرَّمْيِ فَبَعْدَ الزَّوَالِ حَتّٰى لَايَجُوْزَ الرَّمْيُ فِيْهِمَا قَبْلَ الزَّوَالِ فِي الرِّوَايَةِ الْمَشْهُوْرَةِ عَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَ، وَرُوِيَ عَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَ أَنَّ الْأَفْضَلَ أَنْ يُرْمٰى فِي الْيَوْمِ الثَّانِيْ وَالثَّالِثِ بَعْدَ الزَّوَالِ، فَإِنْ رَمٰى قَبْلَهٗ جَازَ، وَجْهُ هٰذِهِ الرِّوَايَةِ أَنَّ قَبْلَ الزَّوَالِ وَقْتُ الرَّمْيِ فِيْ يَوْمِ النَّحْرِ، فَكَذَا فِي الْيَوْمِ الثَّانِيْ وَالثَّالِثِ لِأَنَّ الْكُلَّ أَيَّامُ النَّحْرِ، وَجْهُ الرِّوَايَةِ الْمَشْهُوْرَةِ مَا رُوِيَ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَمَى الْجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى، وَرَمٰى فِيْ بَقِيَّةِ الْأَيَّامِ بَعْدَ الزَّوَالِ، وَهٰذَا بَابٌ لَا يُعْرَفُ بِالْقِيَاسِ بَلْ بِالتَّوْقِيْفِ، فَإِنْ أَخَّرَ الرَّمْيَ فِيْهِمَا إِلَى اللَّيْلِ فَرَمٰى قَبْلَ طُلُوْعِ الْفَجْرِ جَازَ وَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ لِأَنَّ اللَّيْلَ وَقْتُ الرَّمْيِ فِيْ أَيَّامِ الرَّمْيِ لِمَا رَوَيْنَا مِنَ الْحَدِيْثِ۔

ترجمہ: ''ایامِ تشریق میں پہلے اور دوسرے دن جو ایامِ رَمی کا دوسرا اور تیسرا دن بنتا ہے، رَمی کا وقت زوال کے بعد ہے اور ان دنوں میں زوال سے پہلے رمی جائز نہیں ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہی روایت مشہور ہے۔ اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ دوسرے اور تیسرے دن زوال کے بعد رَمی افضل ہے اور زوال سے پہلے بھی رَمی جائز ہے۔ اِس روایت کی وجہ یہ ہے کہ یومِ نحر میں زوال سے پہلے رَمی کا وقت ہے، تو دوسرے اور تیسرے دن میں بھی اس

وقت رَمی جائز ہوگی کیونکہ سب ایامِ نحر ہیں اور مشہور روایت کی وجہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ: ''رسول اللہ ﷺ نے یومِ نحر میں چاشت کے وقت جمرہ کی رَمی کی اور باقی دنوں میں زوال کے بعد رَمی کی۔ ان مسائل کا مدار قیاس پر نہیں ہے بلکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عمل اور اُن سے روایت پر موقوف ہے۔ اگر کسی شخص نے ان دِنوں میں سے کسی دِن میں تاخیر سے رمی کی اور آئندہ دِن طلوعِ فجر سے پہلے رمی کی، تو جائز ہوگئی اور (اس تاخیر کے سبب) کچھ لازم نہیں ہوگا، کیونکہ ایامِ رمی میں رات بھی رمی کا وقت ہے، جیسا کہ ہم حدیث روایت کر چکے ہیں، (بدائع الصنائع، جلد 2، ص:208)''۔ اگر پہلے تین دن یعنی دس، گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کی رَمی کسی عذر کے سبب دِن میں نہیں کی تو رات میں کرلے، اگر بغیر عُذر ہے تو کراہت ہے اور اسے کراہتِ تنزیہی پر محمول کرنا چاہئے۔ رات میں رَمی کرنا اگرچہ مکروہ ہے مگر عذر کی وجہ سے یہ کراہت باقی نہیں رہتی۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ زیادہ عمر کے لوگ اور بعض خواتین رَمی کے لئے کسی کو اپنا نائب بنالیتے ہیں، یہ درست نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ وہ رات کے وقت کرلیں، وہاں رات کو بھی دن کا سماں ہوتا ہے اور اس میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

کنکریوں کی تعداد

سوال:

ساتوں کنکریاں ایک ساتھ ماری جائیں تو کیا واجب ادا ہو جائے گا؟۔

(عبدالمالک، نیو کراچی)

جواب:

اگر ساری کنکریاں ایک ساتھ پھینک دیں تو یہ سب ایک کے قائم مقام ہوں گی۔ سات بار سے کم جائز نہیں ہیں۔ علامہ برہان الدین ابوبکر حنفی لکھتے ہیں: وَلَوْ رَمٰی بِسَبْعِ حَصَیَاتٍ جُمْلَۃً، فَھٰذِہٖ وَاحِدَۃٌ، لِاَنَّ الْمَنْصُوْصَ عَلَیْہِ تَفَرُّقُ الْاَفْعَالِ۔ ترجمہ: ''اگر ساتوں کنکریاں ایک ساتھ پھینک دیں تو وہ ایک کنکری شمار ہوگی، اس لئے کہ حکم تو الگ الگ

کنکری پھینکنے کا ہے، (ہدایہ، جلد 2، ص:209)"۔

مردوعورت کے احرام میں فرق

سوال:

مردوعورت کے احرام میں کیا فرق ہے؟، (وقاص رحمان، نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

احرام کے دیگر مسائل میں مردوعورت کے احکام یکساں ہیں سوائے چند امور کے جو احرام کی حالت میں عورتوں کے لئے جائز ہیں:

(۱) سر چھپانا (یونہی گوند وغیرہ سے بال جمانا) (۲) دستانے، موزے اور سلے کپڑے پہننا (۳) بلند آواز سے تلبیہ نہ کہے (۴) رمل نہ کرے (۵) میلین کے درمیان نہ دوڑے (۶) عورت صرف قصر کرے گی حلق نہیں۔ علامہ برہان الدین ابوبکر حنفی لکھتے ہیں: قَالَ وَالْمَرْأَةُ فِیْ جَمِیْعِ ذَالِكَ كَالرَّجُلِ، لِأَنَّهَا مُخَاطَبَةٌ كَالرَّجُلِ، غَیْرَ أَنَّهَا لَاتَكْشِفُ رَأْسَهَا، لِأَنَّهُ عَوْرَةٌ، وَتَكْشِفُ وَجْهَهَا، لِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ السَّلَامُ: "اِحْرَامُ الْمَرْأَةِ فِیْ وَجْهِهَا"، وَلَوْسَدَلَتْ شَیْئًا عَلٰی وَجْهِهَا، وَجَافَتْهُ عَنْهُ: جَازَ، هٰكَذَا رُوِیَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا، وَلِأَنَّهُ بِمَنْزِلَةِ الْإِسْتِظْلَالِ بِالْمَحْمِلِ، وَلَاتَرْفَعُ صَوْتَهَا بِالتَّلْبِیَةِ، لِمَافِیْهِ مِنَ الْفِتْنَةِ، وَلَاتَرْمُلُ وَلَاتَسْعٰی بَیْنَ الْمِیْلَیْنِ، لِأَنَّهُ مُخِلٌّ بِسَتْرِ الْعَوْرَةِ، وَلَاتَحْلِقُ وَلٰكِنْ تُقَصِّرُ، لِمَا رُوِیَ أَنَّ النَّبِیَّ عَلَیْهِ السَّلَامُ نَهَی النِّسَاءَ عَنِ الْحَلْقِ، وَأَمَرَهُنَّ بِالتَّقْصِیْرِ، وَلِأَنَّ حَلْقَ الشَّعْرِ فِیْ حَقِّهَا مُثْلَةٌ كَحَلْقِ اللِّحْیَةِ فِیْ حَقِّ الرَّجُلِ، وَتَلْبَسُ مِنَ الْمَخِیْطِ مَا بَدَالَهَا، لِأَنَّ فِیْ لُبْسِ غَیْرِ الْمَخِیْطِ كَشْفُ الْعَوْرَةِ، قَالُوْا: لَاتَسْتَلِمُ الْحَجَرَ اِذَاكَانَ هُنَاكَ جَمْعٌ لِأَنَّهَا مَمْنُوْعَةٌ عَنْ مُمَاسَّةِ الرِّجَالِ اِلَّا أَنْ تَجِدَ الْمَوْضِعَ خَالِیًا۔

ترجمہ: "عورت ان تمام امور میں مرد کے مانند ہے کیونکہ عورت بھی مردوں کے مانند شریعت کے احکام کی مخاطبہ ہے، یعنی اُن پر بھی شرعی احکام کا اِطلاق ہوتا ہے۔ (مگر یہ کہ) عورت اپنا سر نہیں کھولے گی کیونکہ اس کے لئے سر کا ڈھانکنا واجب ہے اور وہ اپنا چہرہ

کھولے گی کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''عورت کا احرام اُس کے چہرے میں ہے'' اور اگر عورت نے کوئی چیز اپنے چہرے پر لٹکائی اور اس کو چہرہ سے الگ رکھا تو جائز ہے، ایسا ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور یہ اس لئے کہ یہ محمل (کجاوے) کی مثل ہے۔ اور عورت اپنی آواز کو تلبیہ کے ساتھ بلند نہیں کرے گی کیونکہ اس میں فتنہ ہے اور عورت نہ رَمل کرے گی اور نہ میلین کے درمیان دوڑے گی، کیونکہ اس کا دوڑنا سترِ عورت میں مُخل ہوگا۔ اور عورت سر نہیں مونڈے گی بلکہ قصر کرے گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے عورتوں کو حلق کرنے سے منع فرمایا اور قصر کرنے کا حکم اِس وجہ سے دیا کہ عورتوں کے حق میں سر منڈانا مُثلہ ہے (مُثلہ کے معنی ہیں: صورت بگاڑنا)، جیسے مردوں کے حق میں داڑھی منڈانا (مُثلہ ہے)۔ عورت کو جو بھی سلا ہوا کپڑا میسر ہو پہن لے، کیونکہ بغیر سلا کپڑا پہننے میں کشفِ عورت (ستر کھلنے) کا احتمال ہے۔ فقہاءِ کرام نے کہا ہے کہ عورت وہاں پر بھیڑ ہونے کی صورت میں حجرِ اسود کا استلام نہ کرے کیونکہ عورت کو مردوں کے ساتھ بدن مس کرنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن اگر جگہ خالی پائے، (تو استلام کرلے)، (ہدایہ، جلد 2، ص: 226-227)''۔

طوافِ وَداع کی شرعی حیثیت

سوال:

طوافِ زیارۃ کے بعد اگر وقت کم رہ گیا ہو تو کیا طوافِ وَداع جاتا رہے گا یا اُس پر بھی کوئی دم ہوگا؟۔

جواب:

طوافِ زیارت (جسے طوافِ افاضہ، طوافِ فرض اور طوافِ یوم النحر بھی کہتے ہیں) حج کا دوسرا رکن اور تیسرا فرض ہے اور دسویں ذی الحجہ کو کیا جاتا ہے۔ طوافِ رخصت، جسے طوافِ وداع اور طوافِ صدر بھی کہتے ہیں، یہ طواف باہر والوں پر واجب ہے، مکہ اور میقات کے اندر رہنے والوں پر واجب نہیں۔ طوافِ وَداع کا وقت طوافِ زیارت کے

بعد ہوتا ہے، اِس کے لئے آخری وقت کوئی نہیں بلکہ جب بھی کرے گا، ادا ہو جائے گا۔ طوافِ زیارت کے بعد کسی بھی نیت سے طواف کرلے، وہ طوافِ وداع ہی شمار ہوگا، طوافِ وداع کی نیت کرے یا نہ کرے۔

مستحب یہ ہے کہ حج سے فراغت کے بعد جب حاجی مکہ سے روانگی کا ارادہ کرے، تو طوافِ وداع ادا کرے۔ اگر کسی شخص نے طوافِ وَداع نہیں کیا اور واپس روانہ ہوگیا مگر ابھی میقات سے باہر نہیں گیا تو اُس پر لوٹنا واجب ہے، واپس آکر طوافِ وَداع کرلے، اِس کیلئے اُس پر دوبارہ احرام نہیں ہے۔ اگر میقات سے باہر چلا گیا تو لوٹنا واجب نہیں بلکہ دَم ادا کرے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَمَنْ نَفَرَ وَلَمْ يَطُفْ لِلصَّدْرِ فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مَالَمْ يُجَاوِزِ الْمِيقَاتَ فَإِنْ ذَكَرَ بَعْدَ مُجَاوَزَةِ الْمِيقَاتِ لَمْ يَرْجِعْ فَإِنْ رَجَعَ رَجَعَ بِعُمْرَةٍ وَإِنْ عَادَ بِعُمْرَةٍ اِبْتَدَأَ بِطَوَافِهَا فَإِذَا فَرَغَ مِنْ عُمْرَتِهٖ طَافَ لِلصَّدَرِ كَذَا فِي ''السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ''۔

ترجمہ: ''جو حاجی طوافِ رخصت ادا کئے بغیر چلا گیا، تو جب تک میقات سے باہر نہ گیا ہو، واپس آکر طوافِ صدر کرے۔ اور اگر اسے میقات سے باہر جانے کے بعد یاد آیا تو واپس نہ لوٹے (بلکہ دَم دے)۔ پس اگر واپس لوٹا، تو عمرے کا احرام باندھ کر لوٹے اور عمرے کے لئے لوٹا ہو تو پہلے عمرے کا طواف کرے، پھر جب عمرے سے فارغ ہو جائے تو طوافِ رخصت ادا کرے (اِس صورت میں دَم واجب نہیں ہوگا)''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 235)

طوافِ زیارت اور طوافِ وداع الگ الگ ہیں

سوال:

کیا طوافِ زیارت، طوافِ وداع کے قائم مقام ہے؟۔ اِس کے نہ ہونے سے حج پر فرق پڑے گا؟۔

جواب:

جی نہیں! طوافِ زیارت، طوافِ وَداع کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ طوافِ زیارت حج کا دوسرا رُکن اور تیسرا فرض ہے، اِس کے بغیر حج ادا نہیں ہوتا۔ اگر طوافِ زیارت نہ کیا ہو، تو طوافِ زیارت کا وقت تاحیات رہتا ہے، اِس لئے طوافِ زیارت اُس وقت فوت ہوگا، جب زندگی ختم ہوگی۔ جب تک طوافِ زیارت نہ کیا جائے، حاجی پر اُس کی بیوی حلال نہیں ہوگی۔

حج کی قربانی کے دِن

سوال:

حج کی قربانی کتنے دِن کی جاسکتی ہے؟۔ کیا 11 اور 12 ذی الحجہ کو حج کی قربانی کی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

ادائیگیِ حج کے موقع پر رمی سے فارغ ہوکر جو قربانی کی جاتی ہے یہ صرف منیٰ میں ادا کی جاسکتی ہے، یہ قربانی "حجِ تمتُّع" اور "حجِ قران" کا شکرانہ ہے۔ حجِ تمتُّع یہ ہے کہ کوئی شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کرکے احرام کھول دے اور پھر ایامِ حج میں حج کا احرام باندھ کر حج مکمل کرلے۔ اور حجِ قِران یہ ہے کہ حج وعمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھے اور عمرہ ادا کرکے احرام سے باہر نہ آئے بلکہ اِسی احرام کے ساتھ حج مکمل کرلے۔ اِن دونوں قسم کے حجاج پر دو عبادتوں (حج وعمرہ) کے شکرانے کے طور پر واجب ہے، حجِ اِفراد (تنہا حج کا احرام باندھنے) والے پر قربانی واجب نہیں۔ یہ وہ قربانی نہیں ہے جو عیدالاضحیٰ کے موقع پر کی جاتی ہے۔ اِس قربانی کا وقت دسویں ذی الحجہ کی فجر طلوع ہونے سے بارہویں کے غروبِ آفتاب تک ہے، علامہ علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: (وَأَوَّلُ وَقْتِہٖ) أَیْ زَمَانُ جَوَازِ ھٰذَاالدَّمِ (طُلُوْعُ الْفَجْرِ مِنْ یَّوْمِ النَّحْرِ فَلَایَجُوْزُ قَبْلَہٗ) أَیْ اِتِّفَاقًا (وَآخِرُہٗ مِنْ حَیْثُ الْوُجُوْبِ) أَیْ عِنْدَالْإِمَامِ وَکَذَا مِنْ حَیْثُ السُّنَّۃِ عِنْدَ

صَاحِبَيْهِ وَغَيْرِهِمَا مِنَ الْأَئِمَّةِ (غُرُوْبُ الشَّمْسِ مِنْ اٰخِرِ اَيَّامِ النَّحْرِ) وَلٰكِنْ أَوَّلُهَا أَفْضَلُهَا۔

ترجمہ: ''اور اِس قربانی کا اول وقت یعنی اِس خون بہانے کے جواز کا وقت 10 ذی الحجہ کے طلوع فجر سے ہے، اِس سے پہلے بالاتفاق جائز نہیں ہے، اور (قربانی کا آخری وقت بطور وجوب) یعنی امام صاحب اور اِسی طرح صاحبین اور دیگر ائمہ کے نزدیک سنّت کے طور پر (بارھویں کے غروبِ آفتاب تک ہے لیکن افضل پہلا وقت (یعنی 10 ذی الحجہ) ہے''۔

(المسلک المتقسط ،ص:291-290)

ایک سے زائد عمرے کرنے پر حلق کا مسئلہ

سوال:

اگر کوئی شخص ایک عمرہ ادا کرنے کے بعد دوسرے عمرے کا ارادہ کرتا ہے اور پہلے عمرے کے بعد حلق کرالیا تھا، لہٰذا اب دوسرے عمرے کے بعد کیا کرے جبکہ اُس کے سر پر بال نہیں ہیں؟۔

جواب:

جس شخص کے سر پر بال نہ ہوں (خواہ قدرتی طور پر نہ ہوں یا پہلے حلق کراچکا تھا)، تو وہ سر پر استرا پھرالے، واجب ادا ہوجائے گا اور وہ اِحرام سے باہر آجائے گا۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

وَاِذَا جَاءَ وَقْتُ الْحَلْقِ وَلَمْ يَكُنْ عَلٰى رَأْسِهٖ شَعْرٌ بِأَنْ حَلَقَ قَبْلَ ذٰلِكَ أَوْ بِسَبَبٍ اٰخَرَ ذَكَرَ فِي ''الْأَصْلِ'' أَنَّهٗ يَجْرِي الْمُوْسٰى عَلٰى رَأْسِهٖ۔

ترجمہ: ''پس جب حلق کا وقت آئے اور اُس کے سر پر بال نہ ہوں، اِس بنا پر کہ پہلے حلق کرا چکا ہے یا کسی اور سبب سے، ''اصل'' یعنی ''مبسوط'' میں مذکور ہے کہ سر پر اُسترا پھرائے گا''

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:231)

لباسِ اِحرام کا سائز

سوال:

کیا احرام کی کوئی حد مقرر ہے کہ کتنے گز کا ہونا چاہئے، لمبائی چوڑائی کتنی ہونا چاہئے؟۔

جواب:

احرام کے لئے دو چادریں سنت ہیں، ایک ازار کے لئے اور دوسری چادر اِس طرح اوڑھے کہ دونوں مونڈھے، سینہ اور پیٹھ چھپی رہے اور طواف کے دوران داہنی بغل کے نیچے کر کے دونوں سِرے بائیں مونڈھے پر ڈالیں، اسے اِضطباع کہتے ہیں، مگر یہ ہیئت اسی طواف میں ہوتی جس کے بعد سعی ہوتی ہے، نیز طواف کے بعد دونوں مونڈھے حسبِ سابق چھپائے جائیں، علامہ شیخ احمد طحطاوی لکھتے ہیں:

(وَلُبْسُ اِزَارٍ وَرِدَاءٍ) أَوَّلُهُمَا لِسَتْرِالْعَوْرَةِ، وَثَانِيْهِمَا لِسَتْرِالْكَتِفَيْنِ فَإِنَّ الصَّلَاةَ مَعَ كَشْفِهِمَا أَوْكَشْفِ أَحَدِهِمَا مَكْرُوْهَةٌ، مُنْلَّا عَلِيْ، قَوْلُهُ: (جَدِيْدَيْنِ) تَشْبِيْهًا بِكَفَنِ الْمَيِّتِ، وَهُمَا أَفْضَلُ مِنَ الْغَسِيْلَيْنِ، وَقَوْلُهُ: أَبْيَضَيْنِ هُوَ أَفْضَلُ مِنْ لَوْنٍ اٰخَرَ، وَهٰذَا بَيَانٌ لِلسُّنَّةِ، وَالأَفَسَتْرُالْعَوْرَةِ كَافٍ۔

ترجمہ: ’’(احرام کے لئے اِزار اور چادر کا پہننا) ان میں سے پہلی چادر یعنی اِزار سترِ عورت کے لئے ہے اور دوسری شانوں کو چھپانے کے لئے ہے، کیونکہ دونوں یا ایک (کندھے) کے کھلنے سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے، ملا علی قاری نے یہ لکھا ہے۔ اور مُصنف کا یہ کہنا کہ: دونوں چادریں نئی ہوں تو یہ میت کے کفن کے ساتھ تشبیہ کے لئے ہے، پس نئی چادریں دُھلی ہوئی چادروں سے افضل ہیں۔ اور مُصنف کا یہ کہنا کہ: دونوں چادریں سفید ہوں، تو سفید رنگ کسی بھی دوسرے رنگ سے بہتر ہے اور یہ (چادروں کی تعداد) سنت کے بیان کے لئے ہے، اگر دو چادریں موجود نہ ہوں تو سترِ عورت (یعنی اُن اعضا کا چھپانا جن کا شرعاً پردے میں رہنا واجب ہے) کافی ہے (یعنی ایک چادر بھی استعمال کی جا سکتی ہے)‘‘۔

(حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 2، ص:409)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِحرام میں اصل سترِ عورت ہے، اگر دو چادروں کی استطاعت نہ ہوتو ایک چادر بھی کافی ہوگی۔ اسی طرح بعض لوگ لمبے قد والے ہوتے ہیں اور بعض پستہ قد تو اِحرام کی چادروں کا طول وعرض اُس کی جسامت اور قامت کے اعتبار سے ہوگا شریعتِ مطہرہ میں گز یا میٹر کی کوئی حد مُتعیّن نہیں کی گئی۔

قربانی اور ذبح کے مسائل

حلال جانور کے ذبح کا شرعی طریقہ

سوال:

جانور چھوٹے جیسے مرغی اور بڑے یعنی گائے اور اونٹ ذبح کرنے کا اسلامی طریقہ، تمام نصوص اور اصول کی تفصیل کے ساتھ کیا ہے؟۔

(میاں شہباز، پاکستان ٹائمز، یو۔ایس۔اے)

جواب:

جانور کے گلے میں چار رگوں (۱۔حلقوم ۲۔مَرِیٔ ۳، ۴۔وَدَجین) کے کاٹنے کو ذَبح کہتے ہیں۔فقہاء کے نزدیک تین رگوں کا کٹنا بھی ذَبح کے حلال ہونے کے لئے کافی ہے، اسے ذبح اور ذَکاۃ کہتے ہیں۔ذبح شرعی کے لئے چار رگوں کے کاٹے جانے کے حوالے سے ائمۂ اَحناف کے مندرجہ ذیل اَقوال ہیں:

۱۔اکثر یعنی تین رگیں کٹ جائیں، یہ امامِ اَعظم رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہے اور یہی قول مُفتٰی بہ ہے، یعنی فقہِ حنفی میں اِسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر الفرغانی المرغینانی حنفی لکھتے ہیں: وَالْعُرُوْقُ الَّتِیْ تُقْطَعُ فِی الذَّكَاةِ اَرْبَعَةٌ: اَلْحُلْقُوْمُ، وَالْمَرِیُٔ، وَالْوَدَجَانُ، لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَفْرِ الْأَوْدَاجَ بِمَا شِئْتَ، وَهِیَ اسْمُ الْجَمْعِ، وَأَقَلُّهُ الثَّلَاثُ، فَيَتَنَاوَلُ الْمَرِیءَ وَالْوَدَجَيْنِ، وَهُوَ حُجَّةٌ عَلَى الشَّافِعِیِّ فِی الِاكْتِفَاءِ بِالْحُلْقُوْمِ وَالْمَرِیءِ، اِلاَّ أَنَّهٗ لَايُمْكِنُ قَطْعُ هٰذِهِ الثَّلَاثَةِ اِلَّا بِقَطْعِ الْحُلْقُوْمِ، فَيَثْبُتُ قَطْعُ الْحُلْقُوْمِ بِاقْتِضَائِهٖ،

ترجمہ: ''وہ رگیں جو ذبح کے وقت کاٹی جاتی ہیں، چار ہیں: (۱) حُلقوم (۲) مَرِیٔ (۳ و ۴) وَدَجان، کیونکہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: رگوں کو جس قدر چاہو کاٹ دو اور یہ اسمِ جمع ہے اور اِس کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے، تو یہ مَرِی اور وَدَجان کو شامل ہے۔ یہ امامِ شافعی رحمہ اللہ پر حُجت ہے کہ اُنہوں نے حُلقوم اور مَرِیٔ پر اِکتفا کیا، کیونکہ حُلقوم کو کاٹے بغیر اِن تین رگوں کا کٹنا ممکن ہی نہیں ہے، تو اِن تین رگوں کے کٹنے سے

حُلقوم خود کٹ جاتا ہے، (ہدایہ، جلد 7، ص:135)"۔

۲۔ چاروں رگیں پوری یا اُن میں سے ہر ایک کا اکثر حصہ کٹ جائے، یہ امام محمد رحمہ اللہ کا قول ہے۔

۳۔ حُلقوم کا کٹنا ضروری ہے اور باقی تین میں سے کوئی دو رگیں، یہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول ہے۔

نوٹ: امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کا مآل بھی امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے ملتا جلتا ہے، کیونکہ حُلقوم کو کاٹے بغیر بقیہ دو رگیں کٹ نہیں سکتیں۔

ذکاۃ شرعی کی دو قسمیں ہیں: (۱) اختیاری (۲) اضطراری۔

ذبح اختیاری سے مراد یہ ہے کہ جانور قابو میں ہو اور ذبح کرنے والا اُسے لٹا کر شریعت کے مطابق ذبح کرے اور اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، اِسی طرح اونٹ کو باندھا ہوا ہو اور اُسے نحر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ درج ذیل حدیث سے اسی ذبح اختیاری کی طرف اشارہ ہے:

عَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ قَالَ: ثِنْتَانِ حَفِظْتُهُمَا عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ اللهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، فَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهُ۔

ترجمہ: "شداد بن اوس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو باتیں یاد رکھی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو درجۂ احسان میں کرنے کا حکم دیا ہے، سو جب تم کسی کو (قصاص میں) قتل کرو، تو احسن طریقے سے قتل کرو (یعنی اس طرح کہ اسے اذیت کم سے کم ہو) اور جب تم (جانور) ذبح کرو، تو احسن طریقے سے ذبح کرو، تم میں سے کسی شخص کو چاہیے کہ وہ چھری تیز کرے اور اپنے ذبیحے کو آرام پہنچائے"۔

(صحیح مسلم:5050)

ذبح اضطراری یہ ہے کہ جانور بے قابو ہو جائے اور کسی طور پر اس طرح قابو میں نہ آئے کہ

اسے باقاعدہ لٹا کر شرعی شرائط کے مطابق ذبح کیا جائے یا اونٹ بِدَک کر بھاگ گیا ہو اور اُسے باندھ کر نحر نہ کیا جاسکتا ہو اور اُس کے قریب جانے سے جانی نقصان کا اندیشہ ہو، تو اُس جانور کے بدن میں ایسے مقام پر کسی تیز دھار آلے سے وار کیا جائے کہ زخمی ہونے سے اُس کا دَمِ مَسفُوح بہہ جائے۔ یا شکار کے موقع پر اس کی نوبت آسکتی ہے کہ شکار پر یر پھینکتے وقت یا گولی سے فائر کرتے وقت یا سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑتے وقت ''بسم اللہ اللہ اکبر'' پڑھے اور اس کے باوجود وہ شکار زندہ پکڑ لیا جائے، تو اسے باقاعدہ ''بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' پڑھ کر ذبح کرنا ہوگا، اگر ذبح سے پہلے وہ مر جائے، تو اب حلال نہ ہوگا، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَبَایَةَ بْنِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ، عَنْ جَدِّہٖ أَنَّهُ قَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ لَیْسَ لَنَا مُدًی، فَقَالَ: مَاأَنْھَرَ الدَّمَ وَذُکِرَاسْمُ اللّٰہِ فَکُلْ، لَیْسَ الظُّفُرَ وَالسِّنَّ، أَمَّا الظُّفُرُ فَمُدَی الْحَبَشَةِ، وَأَمَّا السِّنُّ فَعَظْمٌ، وَنَدَّبَعِیْرٌ فَحَبَسَهُ، فَقَالَ: اِنَّ لِھٰذِہِ الْاِبِلِ أَوَابِدَکَأَوَابِدِالْوَحْشِ، فَمَاغَلَبَکُمْ مِنْھَافَاصْنَعُوْابِهٖ ھٰکَذَا۔

ترجمہ: ''حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! ہمارے پاس چھری نہیں ہوتی (تو ہم کس چیز سے ذبح کریں؟) آپ ﷺ نے فرمایا: جو چیز خون بہادے اور (اُس پر ذبح کے وقت) اللہ عزوجل کا نام لیا گیا ہو، اُسے کھاؤ، ناخن اور دانت سے ذبح نہ کرو، کیونکہ، ناخن حبشیوں کی چھری ہے اور دانت ہڈی ہے۔ اور ایک اونٹ بھاگ گیا، اُسے روک لیا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ان اونٹوں کی عادت بھی وحشی جانوروں جیسی ہے، تو اگر ان میں سے کوئی تمہیں بے بس کردے (کہ اُس پر قابو نہ پاسکو)، تو اُس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرو''۔
(صحیح بخاری:5503)

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی صاحب لکھتے ہیں: ''ذکاۃ اختیاریہ کا رُکن ذبح اور نحر ہے، یعنی بکری اور گائے کو ذبح کیا جائے اور اونٹ کو نحر کیا جائے جبکہ ذبح اور نحر پر

قدرت ہو۔ذبح کی تعریف یہ ہے: سینہ کے بالائی حصہ اور جبڑوں کے درمیان جو رگیں ہیں، اُن کو کاٹ دیا جائے۔اور نحر کی تعریف یہ ہے کہ آخر حلق کی رگوں کو کاٹ دیا جائے اور اگر نحر کی جگہ ذبح اور ذبح کی جگہ نحر کر دیا تب بھی جانور حلال ہوگا، لیکن یہ فعل مکروہ ہے، کیونکہ سنّت یہ ہے کہ اونٹ کو نحر کیا جائے اور باقی جانوروں کو ذبح کیا جائے (بدائع الصنائع) ''الجامع الصغیر'' میں لکھا ہے کہ جانور کے بالائی حصہ یا درمیانی حصہ یا نچلے حصہ غرض حلق کو کسی جگہ سے بھی کاٹ دیا جائے، تو ذبح صحیح ہے۔

ذکاۃ اضطراریہ کی تعریف: ذکاۃ اضطراریہ کا رُکن یہ ہے کہ جانور کے بدن کے کسی بھی حصہ کو زخمی کر دیا جائے، ذکاۃ اضطراریہ شکار میں ہوتی ہے یا اگر اونٹ، گائے یا بکری بھاگ جائے اور انسان اُس کے پکڑنے پر قادر نہ ہو، ہر چند کہ یہ پالتو جانور ہیں، لیکن اس صورت میں یہ بھی شکار کے حکم میں ہیں، خواہ یہ پالتو جانور شہر میں بھاگیں یا جنگل میں، امام محمد سے اِسی طرح مروی ہے، اِسی طرح اگر جانور کنویں میں گر جائے اور اس کو نکال کر ذبح یا نحر کرنے پر قدرت نہ ہو، تو اس صورت میں بھی اس کی اضطراری ذکاۃ جائز ہے''۔

(شرح صحیح مسلم، جلد 6،ص:120)

یہاں جو بات کی جارہی ہے، وہ ذکاۃ اختیاری سے متعلق ہے۔جانور کے حلق کے آخری حصے میں نیزہ وغیرہ سے رگیں کاٹنے کو''نحر'' کہتے ہیں اور حَلَق اور لَبَّہ (سینے کا بالائی حصہ) کے درمیانی جگہ چار رگوں یا کم از کم تین رگوں کو کاٹنے کے عمل کو''ذبح'' کہتے ہیں۔گائے، بھینس، بکری وغیرہ کو ذبح کیا جاتا ہے اور اونٹ کو نحر کیا جاتا ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: اَلذَّبِیْحَۃُ اِسْمُ مَایُذْبَحُ کَالذِّبْحِ بِالْکَسْرِ، وَأَمَّا بِالْفَتْحِ فَقَطْعُ الْأَوْدَاجِ، (حَرُمَ حَیَوَانٌ مِنْ شَأْنِہِ الذَّبْحُ) خَرَجَ السَّمَکُ وَالْجَرَادُ فَیَحِلَّانِ بِلَا ذَکَاۃٍ، وَدَخَلَ الْمُتَرَدِّیَۃُ وَالنَّطِیْحَۃُ وَکُلُّ (مَالَمْ یُذَکَّ: ذَکَاۃً شَرْعِیًّا اِخْتِیَارِیًّا کَانَ أَوِاضْطِرَارِیًّا (وَذَکَاۃُ الضَّرُوْرَۃِ جُرْحٌ) وَطَعْنٌ وَاِنْھَارُدَمٍ (فِیْ أَیِّ مَوْضِعٍ وَقَعَ مِنَ الْبَدَنِ،وَ) ذَکَاۃُ (الْاِخْتِیَارِ ذَبْحٌ بَیْنَ الْحَلْقِ وَاللَّبَّۃِ) بِالْفَتْحِ اَلْمَنْحَرُمِنَ الصَّدْرِ (وَ

عُرُوْقُهُ الْحُلْقُوْمُ) كُلُّهُ وَسَطُهُ أَوْ أَعْلَاهُ أَوْ أَسْفَلُهُ، وَهُوَ مَجْرَى النَّفَسِ عَلَى الصَّحِيْحِ (وَالْمَرِئُ) هُوَ مَجْرَى الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ (وَالْوَدَجَانِ) مَجْرَى الدَّمِ) (حَلَّ) الْمَذْبُوْحُ (بِقَطْعِ أَيِّ ثَلَاثٍ مِّنْهَا)

ترجمہ: ''ذبیحہ اُس جانور کا نام ہے جو ذبح کیا جائے، جیسے ذِبح کسرہ کے ساتھ حیوانِ مذبوح (SLAUGHTERED) کا نام ہے اور فتحہ (زبر) کے ساتھ رگوں کے کاٹنے کا نام ہے۔ جو جاندار شرعاً قابلِ ذبح ہو، وہ شرعی طریقے پر ذبح کئے بغیر حرام ہے، خواہ ذبح اختیاری ہو یا اضطراری۔ ذبح کی قید سے مچھلی اور ٹڈی نکل گئیں، کیونکہ وہ دونوں ذبح کے بغیر حلال ہیں۔ جو جانور بلندی سے گر کر مر گیا یا (کسی جانور کے) سینگ وغیرہ کا زخم لگنے سے مر گیا، وہ بھی حُرمت میں داخل ہو گیا، جو جانور ذبح اختیاری یا اضطراری کے مطابق ذبح نہ کیا گیا ہو (حرام ہے)۔ اضطراری ذبح جانور کا زخمی کرنا، نیزہ مارنا اور خون بہانا ہے یعنی بدن میں جہاں کہیں زخم ہو وہاں سے خون بہانا ذکاۃ اضطراری ہے۔ ذکاۃ اختیاری حَلْق اور لَبَّہ کے درمیان (جانور) کو ذبح کرنا ہے۔ لَبَّہ لام کے فتحہ اور با کی تشدید کے ساتھ (جانور کے سینے کے بالائی حصے میں) ذبح کا مقام ہے۔ ذبح کی رگوں میں سے ایک حُلقوم ہے، خواہ ذبح حُلقوم کے درمیان ہو، اُس کے اوپر ہو یا نیچے۔ اور صحیح یہ ہے کہ حُلقوم سانس کے آنے جانے کی نالی ہے، مَرِیٔ جس نالی سے خوراک اور پانی معدے میں جاتا ہے اور دو رگیں وَدَجان ہیں، یعنی خون کی رگیں۔ ذبح کیا جانے والا جانور (ان چار رگوں میں سے) کسی بھی تین رگوں کے کٹ جانے سے حلال ہو جاتا ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص:356-354)

حلال جانور کو ذبح سے پہلے سُن (Senseless) کرنا

سوال:

آج کل جو طریقے رائج ہیں، مثلاً بجلی کا جھٹکا، پستول سے فائر کرنا یا دیگر کسی ذرائع سے ضرب لگا کر بے ہوش کرنا اور پھر چھری چلانا جبکہ اِس طریقے میں پورا خون نہیں

نکلتا اور وہ مشین سے جلدی جلدی گوشت بنا دیتے ہیں، کیا یہ طریقہ درست ہے؟۔

(میاں شہباز، پاکستان ٹائمز، یو ایس اے)

جواب:

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، وہ ذبح اختیاری ہے۔ایسی صورت میں ذبح اضطراری کا طریقہ اختیار کرنا اگرچہ عبث ہے، لیکن اگر فائر تکبیر کے ساتھ کیا گیا اور جانور کے مرنے سے پہلے ذبح کر دیا گیا تو یہ ذبیحہ حلال ہوگا۔پستول کے فائر، بجلی کے جھٹکے یا کسی ضرب لگانے سے اگر جانور ذبح کرنے سے پہلے مر گیا، تو حلال نہ ہوگا۔حدیث پاک میں بھی جانور کو غیر ضروری تکلیف اور ایذا دینے سے منع فرمایا گیا ہے۔حدیث پاک میں ہے:

وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، فَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ۔

ترجمہ:''اور جب تم (جانور کو) ذبح کرو، تو اَحسن طریقے سے ذبح کرو، تم میں سے ذبح کرنے والے کو چاہئے کہ وہ چھری تیز کرے اور اپنے ذبیحے کو آرام پہنچائے''۔

(صحیح مسلم:5050)

ذبح سے جانور حلال ہونے کے لئے چند شرطیں ہیں: (۱) ذبح کرنے والا عاقل و بالغ ہو۔ (۲) ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا اہلِ کتاب۔ (۳) اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ذبح کرے۔ (۴) ذبح کے وقت جانور زندہ ہو۔ (۵) خود ذبح کرنے والا تکبیر (بِسْمِ اللهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ) کہے۔ (۶) ذبح کا آلہ تیز اور دھار والا ہو، جو خون بہادے، ناخن اور ہڈی نہ ہو اور جانور کی موت کا باعث آلے کا ثقل (یعنی چوٹ) نہ ہو۔ (۷) اَحناف کے نزدیک کم از کم تین رگوں کا کاٹنا ضروری ہے۔

ہمارے بعض یا اکثر معاصر فقیہ ''اہلِ کتاب'' سے متعلق احکام (جن میں اہلِ کتاب کا ذبیحہ اور کتابیہ سے نکاح کا حکم بھی شامل ہے) بیان کرتے یا لکھتے وقت عصر حاضر کے یہود و نصاریٰ کو اِس جواز یا رخصت کا مصداق بننے سے خارج قرار دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ موجودہ یہود و نصاریٰ مشرک ہیں یا سیکولر (لامذہب) ہیں۔اس سلسلے میں ہمارا موقف

یہ ہے کہ جب ختم المرسلین ﷺ پر وحی نازل ہو رہی تھی اور آپ اہلِ کتاب کے حوالے سے احکام بیان فرما رہے تھے، تو اُن کے یہ مشرکانہ یا کفریہ عقائد اُس وقت بھی موجود تھے، مثلاً: (۱) لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾

ترجمہ: ''کفر کرنے والے اہلِ کتاب اور مشرکین اپنے دین کو چھوڑنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس روشن دلیل آجائے، (البینہ: 1)''۔

(۲) اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ ؕ﴿۶﴾

ترجمہ: ''بے شک اہلِ کتاب اور مشرکوں میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں ہوں گے، وہی بدتر مخلوق ہیں، (البینہ: 6)''۔

(۳) لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ ۘ وَ مَا مِنۡ اِلٰہٍ اِلَّاۤ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہُوۡا عَمَّا یَقُوۡلُوۡنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۷۳﴾

ترجمہ: ''بے شک وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے (یہ) کہا کہ: یقیناً اللہ تین میں سے تیسرا ہے، حالانکہ ایک معبودِ (برحق) کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور اگر وہ اپنی اِن (کفریہ) باتوں سے باز نہ آئے، تو اُن میں سے جنہوں نے کفر کیا، اُنہیں ضرور دردناک عذاب پہنچے گا، (المائدہ: 73)''۔

(۴) وَ قَالَتِ الۡیَہُوۡدُ عُزَیۡرُۨ ابۡنُ اللّٰہِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَی الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ قَوۡلُہُمۡ بِاَفۡوَاہِہِمۡ ۚ یُضَاہِـُٔوۡنَ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ قٰتَلَہُمُ اللّٰہُ ۚ۫ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۳۰﴾

ترجمہ: ''اور یہود نے کہا: ''عُزیر اللہ کا بیٹا ہے'' اور نصرانی بولے: ''مسیح اللہ کا بیٹا ہے''، یہ اُن کی خود ساختہ باتیں ہیں، (یہ) اپنے سے پہلے کافروں کی مشابہت کرتے ہیں، ان پر اللہ کی مار ہو، یہ کہاں بھٹکتے پھرتے ہیں، (توبہ: 30)''۔

اس لیے ہماری نظر میں اہلِ کتاب کے بارے میں یہ احکام آج بھی قائم ہیں، لیکن اس کا

مطلب کتابیات سے نکاح یا کتابی ذابح (Butcher) مُقرر کرنے کی حوصلہ فزائی کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کی رخصت شرعی کو بیان کرنا ہے، لہٰذا اگر کوئی کتابی شخص خدا کے نام پر ذبح کرے، تو اس کے جواز کا حکم دیا جائے گا۔ اگر موجودہ یہود ونصاریٰ خدا کے وجود کو مانتے ہوں، تو اُن کا ذبیحہ حلال ہوگا اور اگر پوری طرح دین سے بیزار ہیں کہ خدا کے وجود پر بھی یقین نہیں ہے، تو ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آج کل یہود ونصاریٰ کی ایک بڑی تعداد مُلحد (Atheist) ہے، یعنی الہامی وسماوی مذہب سے اُن کا کوئی نظریاتی واعتقادی تعلق باقی نہیں رہا، ایسے لوگوں کو اہلِ کتاب کے زمرے میں شمار کرنا اور اُن پر اہلِ کتاب کے حکم کا اطلاق کرنا درست نہیں ہوگا۔ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: ترجمہ: ''ذبیحہ کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ ذابح مسلمان ہو اور حالتِ احرام میں نہ ہو اور اگر ذبیحہ شکار ہے، تو ذبح حدودِ حرم سے باہر ہو۔۔۔۔ یا ذابح کتابی ہو، خواہ ذمی ہو یا حربی، ہاں اگر ذبح کے وقت اس کے منہ سے ''بِاسْمِ الْمَسِیْحِ'' سنا ہو، تو پھر ذبیحہ حلال نہیں ہوگا''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ترجمہ: ''مبسوط میں ہے: اگر اہلِ کتاب کا عقیدہ یہ ہو کہ مسیح علیہ السلام ''اِلٰہ'' ہیں یا عزیر علیہ السلام ''اِلٰہ'' ہیں، تو واجب ہے کہ اُن کا ذبیحہ نہ کھایا جائے۔ اور ان کی عورتوں سے نکاح نہ کیا جائے، لیکن شمس الائمہ سرخسی کی ''مبسوط'' میں ہے: نصاریٰ کا ذبیحہ مطلقاً حلال ہے، خواہ وہ تثلیث (Trinity) کا قائل ہو یا نہ ہو۔ اور دلائل کا تقاضا جواز ہے، جیسا کہ ''تمرتاشی'' نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے۔ اور اَولیٰ یہ ہے کہ ضرورت کے بغیر ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے اور اُن سے نکاح نہ کیا جائے، جیسا کہ علامہ کمال الدین ابن ہمام نے تحقیق کی ہے۔ اور ''معراج'' میں ہے: نصاریٰ کے ذبیحے کے (حلال ہونے کے) بارے میں جو شرط ذکی کی ہے، یہ عام روایات کے خلاف ہے، ''فتاویٰ عالمگیری''۔ پس اگر (ذبح کے وقت) اس سے اللہ کا ذکر سنے لیکن وہ اُس سے مسیح علیہ السلام مراد لے رہا ہو تو بعض فقہاء نے کہا: اُس ذبیحے کو کھایا جائے،

سوائے اُس صورت کے کہ وہ صراحت سے کہے کہ: ''بِسْمِ اللهِ الَّذِی هُوَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ''۔ عنایہ میں ہے: ''اس عبارت کا مفاد یہ ہے کہ اگر اہلِ کتاب کا ذبیحہ آ جائے، تو اسے کھا سکتے ہیں''، جیسے کہ کسی کے سامنے کوئی کتابی شخص اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کرے، تو اُسے کھانا جائز ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9،ص:359)''۔علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''جب یہ (یعنی ذبح کی) شرائط پوری نہ ہوں تو ذبیحہ حلال نہیں ہوگا، اور اگر جانور بجلی کے جھٹکے سے مرجائے یا گلا گھٹنے سے مرجائے یا مذکور الصدر رگوں کے کٹنے کے علاوہ کسی اور طریقہ سے مرجائے تو پھر ذبیحہ حلال نہیں ہوگا''۔

فقیہ العصر علامہ نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا گیا: ''یہاں ناروے میں جانوروں کو ذبح کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ لوہے کا ایک ہتھوڑا رسّی کے ذریعہ اوپر لٹک رہا ہوتا ہے، جانور کو عین وسط میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور رسّی کھول دی جاتی ہے اور وہ ہتھوڑا اچانک جانور کے سر پر آ لگتا ہے جس سے وہ بے ہوش ہو جاتا ہے، اس کے بعد اس کو حلال کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں''۔

حضرت فقیہ العصر علامہ بصیر پوری اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: اگر وہ جانور بے ہوش ہو جانے کے بعد زندہ رہ جاتا ہو اور زندگی ہی میں اس کو شریعت کے مطابق ذبح کیا جاتا ہو، تو اس کا گوشت حلال ہے اور اس کا کھانا بلاشبہ جائز ہے اور اگر وہ ذبح کرنے سے پہلے مر گیا ہو تو پھر نا جائز ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 6،ص:123)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَكُرِهَ كُلُّ تَعْذِيبٍ بِلَا فَائِدَةٍ مِثْلُ (قَطْعِ الرَّأْسِ وَالسَّلْخِ) قَبْلَ أَنْ تَبْرُدَ أَيْ تَسْكُنَ عَنِ الْاِضْطِرَابِ

ترجمہ: ''اور ذبح کئے جانے والے حلال جانور کو بے فائدہ کوئی بھی تکلیف دینا مکروہ ہے، جیسے جانور کے ٹھنڈا ہونے اور حرکت واضطراب ختم ہونے یعنی جان نکلنے سے پہلے سر کاٹ دینا اور کھال اتارنا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9،ص:358)''۔

ذبح کئے گئے جانور کی جان نکلنے سے پہلے گردن کاٹ کر سر کو تن سے جدا کرنے کو مکروہ تحریمی

قرار دینے کی حکمت یہ بھی ہے کہ جب تک دماغ کے ساتھ جسم وجان کا رشتہ قائم رہتا ہے تو ذبیحہ جانور کی رگوں سے دَمِ مسفوح (جو کہ حرام ہے) جَذب و اِمتصاص (Suction) کے ذریعے جانور کی رگوں (Veins) سے باہر نکل آتا ہے۔ اور مردار جانور میں (یعنی ذبح کے بغیر طبعی موت یا گلا گھٹ کر مرنے یا چوٹ لگ کر مرنے سے) دَمِ مسفوح جانور کی رگوں کے اندر رہ جاتا ہے اور گوشت میں جذب ہو جاتا ہے اور یہی جانور کی حُرمت کا سبب ہے۔
الغرض ذبح کئے جانے والے جانور کو بجلی کا معمولی جھٹکا یا پستول سے فائر یا کسی بھاری چیز کی اُس کے سر پر ضرب اس لئے لگائی جائے کہ وہ قدرے سُن (Senseless) ہو جائے، لیکن اس میں جان باقی رہے، تو اُس کے بعد شرعی طریقے سے ذبح کرنے سے وہ جانور حلال ہو جائے گا۔ یہ عمل اس لئے کیا جاتا ہے کہ جانور ذبح کے وقت مزاحمت نہ کرے اور آسانی سے چھری چلا کر ذبح کر دیا جائے۔ لیکن اگر اس عمل سے وہ مر جائے تو پھر ذبح کرنے سے بھی حلال نہیں ہوگا بلکہ مَیْتَۃ یعنی مُردار (Dead Animal) کہلائے گا۔

مشینی ذبیحے کا حکم

سوال:

مشین یا چھری سے ذبح کرتے وقت تکبیر کہنا جیسے کچھ لوگ ایک ہی دفعہ کہتے ہیں یا مشین کا بٹن آن کرتے وقت ایک مرتبہ تکبیر کہہ دی جاتی ہے اور ایک منٹ میں سیکڑوں مرغیاں یا ایک گھنٹے میں کئی ہزار جانور ذبح کر دیئے جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چھری پر تکبیر پڑھ دی گئی ہے اور کچھ لوگ ٹیپ ریکارڈ لگا دیتے ہیں، اِس سب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔ (میاں شہباز، پاکستان ٹائمز، یو۔ ایس۔ اے)

جواب:

اگر ذابح (ذبح کرنے والا) ہر مرغی یا جانور کے ذبح کرتے وقت ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہہ کر خواہ ہاتھ سے چھری پھیرے یا کسی آلے کے ذریعے چھری پھیرے، جائز ہے، لیکن اگر یہ شرط نہ پائی جاتی ہو تو ایک وقت میں ایک ہی تکبیر کے ساتھ بہت سے

جانوروں یا مرغیوں کا ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ ذبح کے لئے چھری پھیرتے وقت ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہنا بھی لازمی شرط ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ترجمہ: ''اگر تم اللہ کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو تو اس ذبیحہ سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، (الانعام:118)''۔

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ

ترجمہ: ''اور اس ذبیحہ سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، (الانعام:121)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَمِنْ شَرَائِطِ التَّسْمِيَةِ أَنْ تَكُوْنَ التَّسْمِيَةُ مِنَ الذَّابِحِ حَتّٰى لَوْ سَمّٰى غَيْرُهٗ وَالذَّابِحُ سَاكِتٌ وَهُوَ ذَاكِرٌ غَيْرُ نَاسٍ لَا يَحِلُّ

ترجمہ: ''ذبح کے وقت شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا خود ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہے، یہاں تک کہ اگر دوسرے شخص نے ''بسم اللہ اللہ اکبر'' پڑھا اور ذبح کرنے والا خاموش رہا حالانکہ اسے یاد ہے (کہ وہ ذبح کر رہا ہے)، وہ بھولا نہیں، تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5ص:286)

علامہ غلام رسول سعیدی مصری علماء کی جانب سے جاری کردہ ایک فتویٰ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''اگر مدیر الآلہ (مشینی ذبیحہ کا آپریٹر) مسلمان ہو یا اہلِ کتاب سے ہو اور مشین میں چھری لگی ہو جس سے مذکورُ الصدر رگیں (ساری یا کم از کم تین) کٹ جائیں (اس جگہ یہ شرط بھی ہونی چاہئے کہ مدیر الآلہ ہر جانور کے ذبح کے وقت الگ الگ بسم اللہ پڑھے، سعیدی غفرلہ) تو اس برقی آلہ کو ذابح کے ہاتھ میں چھری کے قائم مقام قرار دیا جائے گا اور یہ ذبیحہ حلال ہوگا اور جب یہ شرائط پوری نہ ہوں تو ذبیحہ حلال نہیں ہوگا، اور اگر جانور بجلی کے جھٹکے (Stunning) سے مرجائے یا گلا گھٹنے سے مرجائے یا مذکورُ الصدر رگوں کے کٹنے کے علاوہ کسی اور طریقہ سے مرجائے تو پھر ذبیحہ حلال نہیں ہوگا''۔

(شرح صحیح مسلم، جلد 6،ص:123)

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے، یہ طریقہ شرعاً درست نہیں ہے اور اس طرح ایک بار

''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہہ کر بٹن دبانے سے یا چھری پر تکبیر پڑھ دینے سے یا ٹیپ ریکارڈر لگا کر جانور ذبح کرنے سے بیک وقت یہ سارے جانور حلال نہیں ہوں گے۔ اس امر کا باقاعدہ موقع پر معائنہ کر کے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اوسطاً ایک منٹ میں کتنے مشینی ذبیحے ہو سکتے ہیں اور پھر اس پر کل یومیہ پروڈکشن کا جائزہ لیا جاسکتا ہے کہ آیا عملی طور پر اُن کے نظام کے تحت روزانہ اتنے شرعی ذبیحے عملاً ممکن ہیں۔ وہ غیر مسلم ممالک جہاں اہلِ فتویٰ علماء کرام موجود ہیں، وہاں علماء اور ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی ہونی چاہیے، جو مَذبح (Slaughter House) کا باقاعدہ جا کر معائنہ کریں اور اس کے ذبح کے طریقۂ کار کو شریعت کے مطابق پائیں، تو اُنہیں اس سلسلے میں سرٹیفکیٹ جاری کریں اور اُس کے بعد بھی وقفے وقفے سے اُس کا اچانک معائنہ (Spontaneous Check) کرتے رہنا چاہیے۔ اگر کسی ملک یا شہر میں خالص انسانی ہاتھ کا ذبیحہ (Un-stunned Meat) دستیاب ہو تو مشینی ذبیحے سے اجتناب بہتر ہے ورنہ بوقتِ ضرورت شرعی شرائط کی پابندی کرنے والے مشینی ذبیحے کا استعمال بھی جائز ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

عقیقے کے جانور کی شرائط

سوال:

کیا عقیقے میں ہر جانور کا ذبح کرنا جائز ہے یا قربانی کے جانور میں عقیقہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟، (محمد آصف اقبال اشرفی، کراچی)۔

جواب:

قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ شامل کیا جاسکتا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے ایسے بچے (بیٹے یا بیٹی) کے عقیقے کا حصہ جس کی پیدائش ایامِ قربانی سے پہلے ہوئی ہو، قربانی کے جانور میں شامل کرنے کا ارادہ کرے، تو یہ شرعاً جائز ہے، کیونکہ یہ بھی نعمت اولاد پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے اور ثواب حاصل کرنے کا

ایک ذریعہ ہے، (ردالمحتار، جلد 9، ص:395، بیروت)''۔

ذبح کے وقت جانور کی گردن الگ ہوجائے تو جانور حرام نہیں ہوتا

سوال:

ہمارے گاؤں کے قرب وجوار کے تمام دیہاتوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر ذبح کرتے ہوئے ذبیحہ کی گردن الگ ہوجائے تو وہ حرام ہوجاتا ہے، خاص کر مرغی کے بارے میں سب کی یہی رائے ہے۔ شریعت کی رُو سے جواب عنایت فرمائیں۔

(محمد فضل الرحمٰن، دواریاں، آزاد کشمیر)

جواب:

ذبح کرتے ہوئے جانور کی گردن الگ ہوجانا مکروہ (تنزیہی) ہے، اِس سے جانور حرام نہیں ہوتا اور اُس کا گوشت کھایا جائے گا۔ علامہ برہان الدین ابوبکر فرغانی مرغینانی لکھتے ہیں: قَالَ: وَمَنْ بَلَغَ بِالسِّكِّيْنِ النُّخَاعَ، أَوْقَطَعَ الرَّأْسَ كُرِهَ لَهُ ذَالِكَ، وَتُوكَلُ ذَبِيْحَتُهُ، وَفِيْ بَعْضِ النُّسَخِ: ''قَطَعَ'' مَكَانَ ''بَلَغَ''، وَالنُّخَاعُ عِرْقٌ أَبْيَضُ فِيْ عَظْمِ الرَّقَبَةِ، أَمَّا الْكَرَاهَةُ فَلِمَا رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: أَنَّهُ نَهٰى أَنْ تُنْخَعَ الشَّاةُ إِذَا ذُبِحَتْ، وَتَفْسِيْرُهُ مَا ذَكَرْنَاهُ، وَقِيْلَ: مَعْنَاهُ أَنْ يَّمُدَّ رَأْسَهُ حَتّٰى يَظْهَرَ مَذْبَحُهُ، وَقِيْلَ: أَنْ يُّكْسَرَ عُنُقُهُ قَبْلَ أَنْ يَّسْكُنَ مِنَ الْإِضْطِرَابِ، وَكُلُّ ذَالِكَ مَكْرُوْهٌ، وَهٰذَا لِأَنَّ فِيْ جَمِيْعِ ذَالِكَ، وَفِيْ قَطْعِ الرَّأْسِ زِيَادَةُ تَعْذِيْبِ الْحَيَوَانِ بِلَا فَائِدَةٍ، وَهُوَمَنْهِيٌّ عَنْهُ۔ وَالْحَاصِلُ: أَنَّ مَافِيْهِ زِيَادَةُ إِيْلَامٍ لَايَحْتَاجُ إِلَيْهِ فِي الذَّكَاةِ مَكْرُوْهٌ۔

ترجمہ:''(صاحب بدایۃ المبتدی) فرمایا: جس نے چھری کو حرام مغز تک پہنچایا یا سر کاٹ دیا تو یہ اس کے لئے مکروہ ہے اور اس کا ذبیحہ کھایا جائے گا۔ اور بعض نسخوں میں ''بَلَغَ'' کے بجائے ''قطع'' ہے اور ''نُخاع'' گردن کی ہڈی میں ایک سفید رگ ہے، بہر حال کراہت اس وجہ سے ہے کہ نبی علیہ السلام نے بکری کو ذبح کے وقت (چھری) نخاع تک پہنچنے سے منع فرمایا ہے اور اس کی تفسیر وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور کہا گیا ہے کہ ''نخاع'' کے معنی

یہ ہیں کہ مذبوح کا سر کھینچا جائے یہاں تک کہ اُس کا مذبح ظاہر ہو جائے اور ایک قول کے مطابق (اس کی تفسیر یہ ہے کہ) جانور کے ٹھنڈا ہونے یعنی جان نکلنے سے پہلے اس کی گردن توڑ دی جائے۔ یہ تمام کام مکروہ ہیں کیونکہ ان تمام صورتوں میں اور جانور کی گردن کاٹنے میں کسی فائدے کے بغیر جانور کو زیادہ تکلیف دینا ہے اور یہ شرعاً منع ہے۔ اِس بحث کا حاصل یہ ہے کہ ہر وہ صورت جس میں کسی ضرورت کے بغیر ذبح کے وقت جانور کو زیادہ تکلیف پہنچائی جائے، مکروہ ہے، (ہدایہ، جلد 7، ص:140)''۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''اِس طرح ذبح کرنا کہ چھری حرام مغز تک پہنچ جائے یا سر کٹ کر جدا ہو جائے، مکروہ ہے مگر وہ ذبیحہ کھایا جائے گا یعنی کراہت اُس فعل میں ہے نہ کہ ذبیحہ میں۔ عام لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ ذبح کرنے میں اگر سر جدا ہو جائے تو اس سر کا کھانا مکروہ ہے، یہ کتبِ فقہ میں نظر سے نہیں گزرا بلکہ فقہاء کا یہ ارشاد کہ ذبیحہ کھایا جائے گا، اُس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سر بھی کھایا جائے گا''۔

(بہارِ شریعت، جلد 3، ص:315)

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں: اِنْ تَمَادَی الذَّابِحُ بِالذَّبْحِ حَتّٰی قَطَعَ النُّخَاعَ، أَوْقَطَعَ کُلَّ الرَّقَبَةِ (اِبَانَةُ الرَّأْسِ)، کُرِہَ الذَّبْحُ عِنْدَ جُمْهُوْرِ الْفُقَهَاءِ غَیْرِالْحَنَابِلَةِ ،لِمَا رُوِیَ عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ نَهٰی عَنِ النَّخْعِ (بُلُوْغُ السِّکِّیْنِ النُّخَاعَ) وَلِأَنَّ فِیْهِ زِیَادَةَ تَعْذِیْبٍ، فَاِنْ فَعَلَ ذَالِكَ لَمْ یَحْرُمْ، لِأَنَّ قَطْعَ النُّخَاعِ یُوْجَدُ بَعْدَ حُصُوْلِ الذَّکَاةِ۔

ترجمہ: ''جب ذبح کرنے والا ذبح کے وقت چھری کو اتنا دور تک لیجائے کہ حرام مغز کاٹ دے یہاں تک کہ پوری گردن کاٹ دے کہ سر الگ ہو جائے، حنابلہ کے سوا جمہور فقہاء کے نزدیک ذبح کی یہ صورت مکروہ ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حرام مغز (یعنی چھری حرام مغز تک پہنچانے) سے منع کیا گیا ہے، اس لئے کہ اس میں زیادہ تکلیف دینا ہے، پس اگر کسی نے ایسا کیا تو (یہ جانور) حرام نہیں ہوگا، اس لئے کہ حرام مغز کا قطع کرنا ذبح کرنے کے حصول کے بعد بھی پایا جاتا ہے''۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد 4، ص:2767)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَکُرِہَ کُلُّ تَعْذِیْبٍ بِلَا فَائِدَۃٍ مِثْلُ (قَطْعِ الرَّأْسِ وَالسَّلْخِ) قَبْلَ أَنْ تَبْرُدَ أَیْ تَسْکُنَ عَنِ الْاِضْطِرَابِ۔

ترجمہ: ''اور ذبح کئے جانے والے حلال جانور کو بے فائدہ کوئی بھی تکلیف دینا مکروہ ہے، جیسے جانور کے ٹھنڈا ہونے اور ساکن ہونے یعنی جان نکلنے سے پہلے سر کاٹ دینا اور کھال اتارنا، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9،ص:358)''۔

جان نکلنے تک گردن کے بدن کے ساتھ جڑے رہنے کا فائدہ یہ ہے کہ دماغ کا بدن کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے اور'' دمِ مسفوح'' (یعنی ذبح کے وقت بہنے والا خون جو حرام ہے) پوری طرح بدن سے نکل آتا ہے۔

نکاح کے مسائل

مجلسِ نکاح کا ایک ہونا شرط ہے

سوال:

میرا نام فرح ناز ہے، میرا نکاح امریکہ میں مقیم ریاض احمد نامی شخص سے ٹیلیفون پر اِس طرح ہوا کہ نکاح خواں جو ہمارے یہاں موجود تھے، نے فون کا اسپیکر آن کیا، دولہے سے قبول کروایا، پھر اُنہوں نے دولہا کے پاس موجود گواہوں سے کہا: کیا اس نے قبول کیا؟، گواہوں نے کہا: ہاں قبول کیا۔ کیا اِس طرح فون پر نکاح ہو جاتا ہے؟۔

(فرح ناز، گارڈن کراچی)

جواب:

فقہائے احناف کی تصریحات کے مطابق نکاح کے لئے ایجاب وقبول ضروری ہے اور اِس کے لئے مجلس کا ایک ہونا شرط ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَمِنْ شَرَائِطِ الْاِیْجَابِ وَالْقَبُوْلِ: اِتِّحَادُ الْمَجْلِسِ لَوْحَاضِرَیْنِ وَاِنْ طَالَ۔

ترجمہ: ''(نکاح کے لئے) ایجاب وقبول کے شرائط یہ ہیں کہ مجلس (نکاح) ایک ہو، اگرچہ دونوں حاضر ہوں خواہ مجلس طویل ہو''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: قَالَ فِی ''الْبَحْرِ'': فَلَوِاخْتَلَفَ الْمَجْلِسُ لَمْ یَنْعَقِدْ، فَلَوْاَوْجَبَ اَحَدُھُمَا فَقَامَ الْاٰخَرُ اَوِاشْتَغَلَ بِعَمَلٍ اٰخَرَ بَطَلَ الْاِیْجَابُ۔

ترجمہ: ''''البحر الرائق'' میں فرمایا: پس اگر مجلس بدل گئی تو (نکاح) منعقد نہیں ہوگا، پس اگر دونوں میں سے کسی ایک نے ایجاب کیا اور دوسرا کھڑا ہو گیا یا کسی کام میں مشغول ہو گیا، تو ایجاب باطل ہو جائے گا''۔۔۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْکِتَابِ وَالْخِطَابِ اَنَّ فِی الْخِطَابِ لَوْقَالَ: قَبِلْتُ فِیْ مَجْلِسٍ اٰخَرَ لَمْ یَجُزْ، وَفِی الْکِتَابِ یَجُوْزُ۔

ترجمہ: ''کتابت اور براہِ راست گفتگو میں فرق ہے، براہِ راست گفتگو میں اگر قبول کا لفظ دوسری مجلس میں ادا کیا تو نکاح جائز نہیں ہوگا جبکہ بذریعہ کتابت جائز ہوگا''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص:65)

مذکورہ صورت میں اگرچہ اسپیکر کے ذریعہ گواہوں کا سننا بھی پایا گیا لیکن اختلافِ مجلس کی خرابی بہر صورت موجود ہے۔ٹیلیفون کے ذریعے نکاح میں ایجاب وقبول ایک مجلس میں نہیں ہوتا،اس لئے فون پر نکاح جائز نہیں ہے۔ایسی صورت میں یہ چاہئے کہ خط یا ٹیلی فون کے ذریعہ لڑکا کسی شخص کو اپنا وکیل مقرر کردے اور وہ وکیل لڑکے کی طرف سے مجلسِ نکاح میں دو گواہوں کے سامنے قبول کرلے،اِس طرح نکاح منعقد ہو جائے گا۔

علامہ شمس الدین سرخسی حنفی لکھتے ہیں:''اگر غائب کسی حاضر شخص کو وکیل بنادے اور وہ وکیل لڑکی کا نکاح اس غائب شخص سے کردے،تو یہ نکاح صحیح ہے،(المبسوط،جلد 5،ص:15)''۔

تاہم اگر آپ دونوں راضی ہیں،تو اب بھی شریعت کے مطابق آپس میں نکاح کرسکتے ہیں اور اس کا طریقہ اوپر درج کردیا گیا ہے۔

محض رشتہ طے کرنے سے نکاح نہیں ہو جاتا

سوال:

میری نابالغہ بیٹی کا نکاح میری غیر موجودگی میں میرے والد یعنی لڑکی کے دادا نے کسی شخص سے طے کردیا۔مختصر تفصیل یہ ہے کہ ہمارا کچھ لوگوں سے اختلاف ہوا یہاں تک کہ جھگڑے کی نوعیت آگئی،جرگہ منعقد ہوا۔مخالف فریق کے کسی آدمی نے اسلحہ تان لیا،ہمارے آدمی نے بندوق لے کر پھینک دی جس سے بندوق کی نالی ٹیڑھی ہوگئی،جھگڑا مزید بڑھا اور کسی فیصلے کے بغیر ختم ہو گیا۔بعد ازاں بندوق کا نقصان بھی ہم نے پورا کیا اور فریقِ مخالف نے اسلحہ کے زور پر ایک رشتہ طلب کیا۔میرے والد صاحب نے اپنی اولاد کی جان کو خطرے میں سمجھتے ہوئے میری بیٹی کا رشتہ دے دیا۔مجھے جب اِس بات کا علم ہوا تو میں نے سرِ عام رَد کردیا۔واضح رہے کہ باقاعدہ گواہوں کی موجودگی میں نکاح نہیں کیا گیا بلکہ محض رشتہ طے کیا گیا تھا۔شریعتِ مطہرہ میں اس بابت کیا حکم ہے،کیا یہ نکاح کہلائے گا یا نہیں؟،(ملک امان،مانسہرہ)۔

جواب:

نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے۔علامہ برہان الدین ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: اَلنِّکَاحُ یَنْعَقِدُ بِالْاِیْجَابِ وَالْقَبُوْلِ

ترجمہ:''نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہوجاتا ہے،(ہدایہ،جلد3،ص:3)''۔

آپ کے بیان کے مطابق چونکہ آپ کے والد نے یہ رشتہ طے کردیا،عرف میں اِسے منگنی(Engagement) کہاجاتا ہے۔منگنی وعدۂ نکاح ہے،نکاح نہیں ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: أَوْهَلْ أَعْطَيْتَنِيهَا أَنَّ الْمَجْلِسَ لِلنِّكَاحِ فَنِكَاحٌ وَإِنْ لِلْوَعْدِ فَوَعْدٌ

ترجمہ:''ایک شخص نے دوسرے سے کہا:'تونے اپنی بیٹی مجھے دی''(دوسرے نے کہا:میں نے دی)اگر یہ مجلس نکاح ہوتو نکاح ہوگااوراگرمجلسِ منگنی ہوتو منگنی ہوگی''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد4،ص:63-62)

تاہم بحیثیت والد آپ ولی اقرب ہیں،بچی کے حق میں آپ کے فیصلے کو دادا پر تقدم حاصل ہے۔مذکورہ صورت میں محض رشتہ طے کیا گیا ہے،اوررشتہ ختم کرنے کے لئے کسی پابندی کی ضرورت نہیں یا کوئی علیحدہ سے طریقۂ کار متعین نہیں ہے اور منگنی ختم ہوجانے کی صورت میں نہ تو مہرواجب ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی حقوق ایک دوسرے سے متعلق لازم ہوتے ہیں۔

نکاح بدستور قائم ہے

سوال:

میری شادی مورخہ 22 فروری 2007ء کومیری خالہ زاد عاصمہ دختر محمد اختر کے ہمراہ بعوض 1125 روپے حق مہر ہوئی۔میری بیوی چار ماہ میرے ساتھ رہی،پھر برطانیہ جانے کے بعد واپس نہیں آئی۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ نہ میں نے اُسے طلاق دی ہے اور نہ ہی کسی عدالت سے خلع حاصل کی ہے،میری اطلاع کے مطابق اب وہ دوسری شادی کررہی ہے۔کیا شریعت اُسے دوسرے نکاح کی اجازت دیتی ہے اور اِس نکاح کی کیا حیثیت ہوگی؟،(حبیب ریاست،ضلع کوٹلی،آزادکشمیر)۔

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے اور حقیقت پر مبنی ہے تو عاصمہ بی بی بدستور آپ کے نکاح میں ہے اور جب تک آپ طلاق نہ دیں یا باہمی رضامندی سے خلع نہ ہو جائے اور اس صورت میں بھی عدت نہ گزر جائے ، اُس کا کسی بھی شخص سے نکاح حرام ہے، باطل ہے اور اُس شخص سے ازدواجی تعلق قطعاً حرام اور زنا کے زمرے میں آئے گا۔ شادی شدہ عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے قطعاً نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ، ترجمہ: ''اور (تم پر حرام کی گئی ہیں) وہ عورتیں جو پہلے سے دوسروں کے نکاح میں ہیں، (النساء:24)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: لَایَجُوْزُ لِلرَّجُلِ اَنْ یَّتَزَوَّجَ زَوْجَةَ غَیْرِہٖ وَکَذٰلِكَ الْمُعْتَدَّةَ کَذَافِی السِّرَاجِ الْوَھَّاجِ۔

ترجمہ: ''کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے نکاح کرے اور اسی طرح ایامِ عدت میں مطلقہ یا بیوہ عورت سے بھی نکاح جائز نہیں ہے، ''السراج الوہاج'' میں اسی طرح لکھا ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:280)''۔

بلوغت سے قبل نکاح کا شرعی حکم

سوال:

ولی اعظم نے اپنی بیٹی کا نکاح میرے بھائی عارف کے ساتھ کیا۔ نکاح کے وقت عارف بالغ تھا اور لڑکی کی عمر تقریباً نو سال تھی۔ نکاح وہاں کے مقامی امام مسجد نے پڑھایا۔ لڑکی کا وکیل اُس کا تایا تھا، تقریب میں تقریباً ایک سو افراد شریک تھے۔ ایجاب وقبول ان الفاظ کے ساتھ ہوا، لڑکی کے تایا نے کہا:

''ایک لاکھ حق مہر کے عوض میں اپنی بیٹی یا بھتیجی کو عارف کے نکاح میں ان گواہوں کی موجودگی میں دیتا ہوں، عارف (لڑکے) نے کہا: میں نے قبول کیا''۔ عرصہ نو سال بعد بغیر کسی طلاق یا خلع لڑکی کے والد نے اُس کی شادی کسی دوسرے شخص سے کردی ہے۔ معلوم

یہ کرنا ہے کہ کیا اولیاء کی طرف سے کیا گیا پہلا نکاح صحیح تھا یا نہیں؟، نیز دوسرے نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، (طارق عزیز، مظفر آباد، آزاد کشمیر معرفت: قاری نذیر حسین)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں لڑکی کے وکیل کے کہے ہوئے الفاظ کے جواب میں لڑکے کے قبول سے نکاح صحیح اور شرعاً نافذ ہوگیا۔ نکاح منعقد ہونے کے لئے یہ ایجاب وقبول کافی ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اَلنِّکَاحُ یَنۡعَقِدُ بِالۡاِیۡجَابِ وَالۡقَبُوۡلِ۔ ترجمہ: ''نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہوجاتا ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:270)''۔

امام حافظ الدین محمد بن محمد بن شہاب المعروف بابن البزاز الکردری حنفی متوفی 827ھ لکھتے ہیں: قَالَ لَہٗ دختر خود فلانۃ را بمن دہ، فَقَالَ: دادم، وَھِیَ صَغِیۡرَۃٌ، اِنۡعَقَدَ، وَاِنۡ لَّمۡ یَقُلۡ قَبِلۡتُ لِاَنَّہٗ تَوۡکِیۡلٌ ★ وَلَوۡقَالَ بمن دادی، لَا، اِلَّااِذَا قَالَ: دادم وَقَالَ الزَّوۡجُ: بذرفتم، اِلَّااِذَا اَرَادَ بدادی التَّحۡقِیۡقَ

ترجمہ: ''ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا: ''اپنی فلاں لڑکی مجھے دے''، تو دوسرے نے جواباً کہا: ''میں نے دی''، لڑکی نابالغہ ہوتو نکاح ہوجائے گا، اگرچہ پہلے شخص نے اس کے بعد ''میں نے قبول کی'' نہ کہا ہو کیونکہ یہ دوسرے کو وکیل بنانا ہے ☆ اگر پہلے شخص نے یہ کہا ہوکہ: ''تونے مجھے دی''، تو پھر نکاح نہیں ہوگا، مگر اس صورت میں جب دوسرے شخص نے کہا کہ: ''میں نے دی'' اور پہلے نے اُس کے جواب میں کہا ہوکہ: ''میں نے قبول کی''، لیکن اگر پہلے شخص نے اپنے قول: ''دادی'' سے استفہام کے بجائے تحقیقِ عقد مراد لی ہو (تو اس صورت میں نکاح درست ہوجائے گا)، (فتاویٰ بزازیہ، جلد 4، ص:110)''۔

لہٰذا مذکورہ بالا گواہوں کی موجودگی میں عارف کا نکاح ولی اعظم کی دختر سے صحیح منعقد ہوگیا، بغیر اس کے طلاق دیئے، یا اس کی زندگی میں اس کے نکاح میں رہتے ہوئے کسی اور شخص سے نکاح کرنا حرام ہے اور اگر نکاح کیا تو منعقد ہی نہیں ہوگا اور زنا کی مرتکب ہوگی۔ شادی شدہ عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے قطعاً نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ، ترجمہ: ''اور (تم پر حرام کی گئی ہیں) وہ عورتیں جو پہلے سے دوسروں کے نکاح میں ہیں، (النساء: 24)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: لَایَجُوْزُ لِلرَّجُلِ اَنْ یَّتَزَوَّجَ زَوْجَةَ غَیْرِہٖ۔

ترجمہ: ''کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے نکاح کرے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 280)

شادی شدہ عورت کا جان بوجھ کر دوسری جگہ نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں، باطل وحرام ہے۔ جن لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ عورت منکوحہ ہے اور یہ جاننے کے باوجود وہ لوگ نکاح کے گواہ بنے یا نکاح پڑھایا، یا یہ نکاح کروایا، اگر انہوں نے یہ کام حلال سمجھ کر کیا ہے، تو ان سب پر توبہ وتجدیدِ اسلام لازم ہے اور شادی شدہ ہیں تو تجدیدِ نکاح بھی لازم ہے۔ اور اگر اس کو حرام سمجھتے ہوئے کیا ہے، تو یہ فسق وفجور ہے اور ضلالت ہے، اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، وہ سب لوگ اپنی اس معصیت پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ یہ اُس صورت میں ہے کہ نابالغہ لڑکی کا باپ بھی مجلس نکاح میں موجود ہے، تو اس کا رَدّ نہ کرنا اس کی رضامندی کی دلیل ہوگا۔ اگر باپ مجلس نکاح میں نہیں تھا تو یہ نکاح اس کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اس نے قبول کیا ہو تو نکاح منعقد ہے اور رَدّ کیا ہو تو نکاح منعقد نہیں ہوا، یا لڑکی نے بلوغت کے وقت اسے رَدّ کر دیا ہو تو اسے خیارِ بلوغ حاصل تھا اور نکاح ختم ہو گیا، لیکن اگر اس نے بلوغت پر رَدّ نہیں کیا تو پھر اسے اس کی رضامندی پر محمول کیا جائے گا۔

پیغامِ نکاح پر پیغام دینا

سوال:

زید نے عمرو کے بیٹے سے اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر دیا اب زید اپنی بیٹی کا نکاح کسی اور شخص سے کروانا چاہتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ جس عورت کی منگنی طے ہو گئی ہو، اُسے نکاح کا پیغام بھیجنا کیسا ہے؟۔ ایسے شخص کے لئے شرعاً کیا وعید ہے؟۔

(عبدالرحمٰن، کراچی)

جواب:

جمہور علماء کا اِس مسئلے پر اتفاق ہے کہ جب کسی شخص کا رشتہ صراحتاً منظور کرلیا جائے اور وہ اِس رشتے کو ترک نہ کرے، تواب دوسرے شخص کے لئے نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں ہے۔ تاہم اگر کسی شخص نے اِس کے باوجود نکاح کرلیا تو نکاح صحیح ہے اور فسخ نہیں کیا جائے گا۔ منگنی پر منگنی کی تحریم اس صورت میں ہے جب رشتہ منظور کرلیا گیا ہو اور اگر رشتہ یا پیغام منظور نہیں ہوا تو دوسرے شخص کا پیغام دینا جائز ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

لَایَبِعِ الرَّجُلُ عَلٰی بَیْعِ أَخِیْہِ، وَلَا یَخْطُبُ عَلٰی خِطْبَةِ أَخِیْہِ، اِلَّا أَنْ یَأْذَنَ لَہٗ۔

ترجمہ: ''کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے، نہ کوئی شخص اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کرے، مگر جب وہ اِس کی اجازت دیدے (تو پھر ممانعت نہیں ہے)''۔

(صحیح مسلم:3453)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''صورتِ مُستفسرہ میں اگرچہ لڑکی والوں کا منگنی طے کر کے اپنے اقرار سے پھرنا اور پہلے پیغام دینے والے سے وعدہ کر کے دوسرے سے نکاح کا ارادہ کرنا شرعاً مذموم و بے جاو قابلِ مواخذہ ہے، قَالَ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی: اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا (عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا) اور اس میں لڑکی والوں اور دوسرا شخص، جس نے کسی کے ساتھ وعدۂ نکاح کے باوجود نکاح کا پیغام دیا ہے، شرعاً دونوں کا فعل معیوب ہے، وَقَدْ صَحَّ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَھٰی عَنِ السَّوْمِ عَلٰی سَوْمِ أَخِیْہِ وَالْخِطْبَةِ عَلٰی خِطْبَةِ أَخِیْہِ۔

ترجمہ: ''صحیح حدیث میں ہے: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھائی کے سودے پر سودے اور بھائی کی منگنی پر منگنی سے منع فرمایا''۔ اس قباحتِ شرعی کے باوجود اگر وہ شخص پہلے پیغام دینے والے سے وعدہ شکنی کر کے اپنی لڑکی کا نکاح دوسرے شخص سے کردیتا ہے، تو یہ نکاح شرعاً صحیح ودرست ہوجائے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11،ص:197)''۔ یعنی جب پہلے پیغام دینے والے کو لڑکی والوں کی طرف سے انکار ہوجائے تواب دوسرے شخص کے لئے

نکاح کا پیغام دینا شریعت کی رُو سے جائز ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے: وَلَا یَخْطُبُ عَلٰی خِطْبَةِ أَخِیْهِ حَتّٰی یَذَرَ،

ترجمہ: ''(کوئی مسلمان) اپنے مسلمان بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نہ دے، یہاں تک کہ اُن کا سلسلہ نامہ و پیام ختم ہو جائے، (صحیح مسلم: 3462)''۔

نوٹ: ہم نے فتاویٰ رضویہ کی دقیق زبان کو عام فہم بنانے کے لئے اپنے الفاظ میں لکھا ہے، مفہوم وہی ہے۔

مہر معاف کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:

اگر کوئی عورت اپنا مہر اپنی خوشی سے معاف کر دے، شوہر کی زندگی میں یا شوہر کے مرنے کے بعد، تو کیا وہ مہر معاف ہو جاتا ہے؟، معاف کرنے کے بعد کیا وہ دوبارہ مطالبہ کر سکتی ہے؟، (منور احمد، ملیر کراچی)۔

جواب:

اگر بیوی نے اپنی خوشی و رضا سے شوہر کو حق مہر معاف کر دیا، تو معاف ہو جاتا ہے، اب عورت دوبارہ مہر لینے کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَصَحَّ حَطُّهَا) لِكُلِّهٖ أَوْ بَعْضِهٖ (عَنْهُ) قَبِلَ أَوْ لَا وَيَرْتَدُّ بِالرَّدِّ كَمَا فِي ''الْبَحْرِ''۔

ترجمہ: ''اور عورت کا کل یا بعض مہر کو شوہر سے ساقط (معاف) کر دینا صحیح ہے، شوہر اِس کو قبول کرے یا نہ کرے اور رَد کر دینے سے رَد ہو جائے گا، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی اِس کی شرح میں لکھتے ہیں: وَقَيَّدَ بِحَطِّهَا لِأَنَّ حَطَّ أَبِيْهَا غَيْرُ صَحِيْحٍ لَوْ صَغِيْرَةً، وَلَوْ كَبِيْرَةً تَوَقَّفَ عَلٰى إِجَازَتِهَا، وَلَا بُدَّ مِنْ رِضَاهَا۔

ترجمہ: ''بیوی کے معاف کرنے کی قید اس لئے لگائی کہ اگر وہ نابالغہ ہے تو اس کے باپ کا مہر معاف کر دینا صحیح نہیں ہے (یعنی باپ کو از خود یہ حق حاصل نہیں ہے) اور اگر عورت بالغہ ہے (اور باپ نے اس کا مہر معاف کر دیا ہے) تو اُس کی اجازت پر موقوف ہے اور اُس کی

رضامندی ضروری ہے (یعنی باپ کو یک طرفہ طور پر یہ حق حاصل نہیں ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص:182)

اگر بیوی شوہر کو اپنا مہر معاف کردے، تو یہ صحیح ہے خواہ شوہر قبول کرے یا نہ کرے، یہاں تک کہ اگر شوہر کی موت یا طلاقِ بائن کے بعد بھی عورت معاف کردے تو معاف ہوجائے گا۔ ہاں مہر معاف کرانے کے لئے شوہر بیوی پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈال سکتا، اور شوہر کا بیوی سے مہر معاف کرنے کا مطالبہ ناجائز ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

حضرت صُہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تَزَوَّجَ امْرَأَةً، فَنَوٰی أَنْ لَّا يُعْطِيَهَا مِنْ صَدَاقِهَا شَيْئًا، مَاتَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَهُوَ زَانٍ۔

ترجمہ: ''جو شخص نکاح کرے اور نیت یہ ہو کہ عورت کو مہر میں سے کچھ نہ دے گا، تو جس روز مرے گا، زانی مرے گا (یہ کلمات زجر و توبیخ اور وعید کے لئے ہیں)''۔

(المعجم الکبیر، رقم الحدیث:7302)

منکوحہ سے دوبارہ ایجاب وقبول

سوال:

کسی نوجوان لڑکے اور لڑکی نے دو گواہوں کے سامنے والدین سے چھپ کر نکاح کیا ہو، بعد میں گھر والے شادی پر رضامند ہوجائیں۔ باقاعدہ خاندان و برادری کے لوگوں کے درمیان شادی کی تقریب منعقد کی جائے اور نکاح خواں سے نکاح بھی پڑھوایا جائے تو کیا یہ دوبارہ نکاح جائز ہے؟، اور مہر کا کیا حکم ہے؟، (ایم۔ آر، دستگیر، کراچی)۔

جواب:

اگر لڑکا لڑکی کا کفو ہے یعنی حَسب، نَسب، پیشہ و مال وغیرہ میں لڑکی کی برابری رکھتا ہے اور نکاح شریعت کے مطابق دو گواہوں کے سامنے ہوا ہے، تو یہ نکاح صحیح ہے۔ اگرچہ والدین کی اجازت اور رضامندی حاصل نہ کرنا نافرمانی کا سبب ہے۔ اب اگر خاندان یا برادری کے سامنے دوبارہ ایجاب وقبول کرتے ہیں، تو اِس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مہر کا

جہاں تک تعلق ہے تو نکاحِ اول کا مہر ہی شوہر پر واجب ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَلَوْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً بِأَلْفِ دِرْهَمٍ ثُمَّ جَدَّدَ النِّكَاحَ بِأَلْفَيْنِ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ، ذَكَرَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ الْمَعْرُوْفُ ''بِخَواهَر زَادَه'' رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِ النِّكَاحِ أَنَّ عَلٰى قَوْلِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمَا اللهُ تَعَالٰى لَا تَلْزَمُهُ الْأَلْفُ الثَّانِيَةُ وَمَهْرُهَا أَلْفُ دِرْهَمٍ وَعَلٰى قَوْلِ أَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى تَلْزَمُهُ الْأَلْفُ الثَّانِيَةُ وَبَعْضُهُمْ ذَكَرَ الْخِلَافَ عَلٰى عَكْسِ هٰذَا قَالَ بَعْضُ مَشَايِخِنَا رَحِمَهُمُ اللهُ الْمُخْتَارُ عِنْدَنَا أَنْ لَّا تَلْزَمُهُ الْأَلْفُ الثَّانِيَةُ كَذَا فِي ''الظَّهِيْرِيَّةِ''۔ وَفَتْوَى الْقَاضِي الْإِمَامِ عَلٰى أَنَّهُ لَا يَجِبُ بِالْعَقْدِ الثَّانِيْ شَيْءٌ إِلَّا إِذَا عَنٰى بِهِ الزِّيَادَةَ فِي الْمَهْرِ فَحِيْنَئِذٍ يَجِبُ الْمَهْرُ الثَّانِيْ، كَذَا فِي الْخُلَاصَةِ۔

ترجمہ: ''اگر کسی عورت سے ایک ہزار درہم (مہر) پر نکاح کیا، پھر دو ہزار درہم پر دوبارہ (تجدید) نکاح کیا، اِس مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے، شیخ امام رحمہ اللہ علیہ جو خواہر زادہ کے نام سے معروف ہیں، کتاب النکاح میں ذکر کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے قول کے مطابق دوسرا ہزار اس پر لازم نہیں ہوگا اور اُس کا مہر ایک ہزار درہم ہی رہے گا۔ اور امام ابو یوسف کا قول ہے کہ دوسرا ایک ہزار لازم ہو جائے گا۔ اور بعض فقہاء کرام نے ائمہ احناف کے اختلاف رائے کو اس کے برعکس بیان کیا ہے۔ ہمارے بعض مشائخ فرماتے ہیں: کہ ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ دوسرا ہزار لازم نہیں ہے، ''ظہیریہ'' میں اسی طرح ہے۔ امام قاضی خان نے فتویٰ دیا ہے کہ دوسرے نکاح سے کچھ بھی لازم نہیں ہوتا مگر جب (شوہر کی) مراد مہر میں زیادتی کی ہو، پس دوسرا مہر بھی واجب ہو جائے گا، جیسا کہ ''خلاصہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 313، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَفِي ''الْكَافِيْ'': جَدَّدَ النِّكَاحَ بِزِيَادَةِ أَلْفٍ لَزِمَهُ الْأَلْفَانِ عَلَى الظَّاهِرِ۔

ترجمہ: ''اور ''کافی'' میں ہے: دوبارہ نکاح ایک ہزار کی زیادتی پر کیا، تو ظاہر مذہب یہ ہے

کہ اب (شوہر پر) دو ہزار واجب ہو گئے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص:181، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔ خلاصۂ کلام یہ کہ خاندان کی عزت بچانے (Face Saving) کے لئے دوبارہ نکاح میں کوئی شرعی خرابی نہیں ہے۔ دوبارہ نکاح پہلے مہر پر ہی منعقد ہو تو درست ہے اور اگر شوہر کی رضامندی سے پہلے مہر پر اضافہ کر کے زیادہ رقم پر دوسرا نکاح منعقد کیا گیا ہو تو مختار قول کے مطابق یہ اضافی مہر شوہر پر لازم ہوگا۔

مہر کی مقدار میں اضافہ

سوال:

ایک خاتون کے نکاح کے وقت حق مہر پچاس ہزار روپے مقرر ہوا، جس کے عوض 3 کنال زمین اُس کے نام منتقل کروا کر حق مہر ادا کر دیا گیا، اِس کا اندراج نکاح نامے میں بھی ہے۔ اب اُس کے سُسرال والے اُس پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ حق مہر کی تین کنال زمین اپنے شوہر کے نام منتقل کردو جبکہ وہ خاتون ایسا کرنا نہیں چاہتی، زمین کے بدلے پیسے لینا بھی نہیں چاہتی۔ شریعت کی رُو سے کیا حکم ہے؟، (ایک دینی بہن، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ خاتون کے سُسرال والوں نے نکاح کے موقع پر حق مہر پچاس ہزار روپے کے عوض اُسے تین کنال زمین دی تھی اور محکمۂ مال کے ریکارڈ میں اس کا انتقال واندراج بھی خاتون کے نام پر ہو چکا ہے اور نکاح نامے میں بھی اس کی صراحت موجود ہے، اب یہ زمین خاتون کی ملکیت ہے۔ اُس کے سسرال والوں کی جانب سے اخلاقی یا سماجی دباؤ ڈال کر اس زمین کو اُس کی ملکیت سے خارج کرنے اور شوہر کے نام منتقل کرانے کا مطالبہ غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر شرعی ہے۔ انہیں اس سے باز آنا چاہئے اور مندرجہ ذیل حدیث پاک میں بیان کی ہوئی اس وعید کا مصداق بننے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ ترجمہ: ''جو شخص کسی کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا بھی ظلماً (یعنی ناحق) لے گا، تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (سزا کے طور پر) سات زمینوں کا طوق

پہنائے گا''۔(صحیح مسلم:4055)

اگر زمین کی قیمت مقررہ مہر سے زیادہ ہے، تو یہ زیادتی شرعاً عورت کے حق میں درست ثابت ہوگی اور ادا کرنے کی صورت میں عورت اُس کی مالک بن جائے گی۔

اپنی مرضی سے مقررہ مہر سے زائد نقد رقم یا کسی جائیداد اور زیور وغیرہ کی صورت میں اپنی بیوی کو''ھبہ''(Gift) کرسکتا ہے اور شرعاً وہ عورت مہر کے طور پر دی گئی اس تمام مال کی مالک اور مختار ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا

ترجمہ:''اور ان (یعنی اپنی بیویوں) میں سے ایک کو تم بہت مال دے چکے ہو تو اس مال میں سے کچھ واپس نہ لو، (النساء:20)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: (وَمَافَرَضَ) بِتَرَاضِيْهِمَا أَوْبِفَرْضِ قَاضٍ مَهْرَالْمِثْلِ (بَعْدَ الْعَقْدِ) الْخَالِ عَنِ الْمَهْرِ (أَوْزِيْدَ) عَلٰى مَاسُمِّيَ فَإِنَّهَاتَلْزَمُهُ بِشَرْطِ قَبُوْلِهَا فِي الْمَجْلِسِ، أَوْ قَبُوْلِ وَلِيِّ الصَّغِيْرَةِ وَمَعْرِفَةِ قَدْرِهَا وَبَقَاءِ الزَّوْجِيَّةِ عَلَى الظَّاهِرِ۔ ''نہر''۔

ترجمہ:''زوجین کی رضامندی سے مہر مقرر ہوا یا نکاح کے وقت تو مقرر نہیں ہوا تھا مگر بعد میں قاضی (حاکم) نے مہرِ مثل مقرر کردیا یا پہلے سے مقررہ مہر پر کچھ اضافہ کیا گیا اور عورت نے اُسے مجلسِ نکاح میں قبول بھی کرلیا ہو یا عورت کے نابالغہ ہونے کی صورت میں اُس کے ولی نے قبول کرلیا اور اس کی مقدار بھی معلوم ہے، اور ابھی عقد بھی باقی ہے تو ظاہر قول کے مطابق یہ مہر شوہر پر لازم ہوجائے گا، بحوالہ''النہر الفائق''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص:180)

اَخیافی (ماں شریک) ماموں سے نکاح حرام ہے

سوال:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اِس بارے میں کہ ہند کا نکاح الف سے ہوا، دونوں کی

ایک بیٹی سعیدہ ہے۔الف کے انتقال کے بعد ہند کا عقدِ ثانی اُس کے بھتیجے ب کے ساتھ ہوا، جس سے اُن کا ایک بیٹا ارشد پیدا ہوا۔سعیدہ کا نکاح ج سے ہوا اور اُن کی ایک بیٹی رضیہ ہے۔معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا سعیدہ کی بیٹی رضیہ کا نکاح ارشد سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟۔

(ضیاء الرحمٰن، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں شریعت کی رُو سے ارشد اور رضیہ کا ایک دوسرے کے ساتھ نکاح حرام ہے۔کیونکہ ارشد، سعیدہ کا اَخیافی ماموں اور سعیدہ، ارشد کی اَخیافی (ماں شریک) بھانجی ہے۔علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اَلْقِسْمُ الْاَوَّلُ الْمُحَرَّمَاتُ بِالنَّسَبِ وَهُنَّ الْاُمَّهَاتُ وَالْبَنَاتُ وَالْاَخَوَاتُ وَالْعَمَّاتُ وَالْخَالَاتُ وَبَنَاتُ الْاَخِ وَبَنَاتُ الْاُخْتِ، فَهُنَّ مُحَرَّمَاتٌ نِكَاحًا وَوَطْأً وَدَوَاعِيَهٗ عَلَى التَّأْبِيْدِ، فَالْاُمَّهَاتُ اُمُّ الرَّجُلِ وَجَدَّاتُهٗ مِنْ قِبَلِ أَبِيْهِ وَأُمِّهٖ وَاِنْ عَلَوْنَ، وَأَمَّا الْبَنَاتُ فَبِنْتُهُ الصُّلْبِيَّةُ وَبَنَاتُ ابْنِهٖ وَبِنْتِهٖ وَاِنْ سَفَلْنَ، وَأَمَّا الْاَخَوَاتُ فَالْاُخْتُ لِاَبٍ وَّاُمٍّ وَّالْاُخْتُ لِاَبٍ وَّالْاُخْتُ لِاُمٍّ وَّكَذَا بَنَاتُ الْاَخِ وَالْاُخْتِ وَاِنْ سَفَلْنَ۔

ترجمہ: ”محرمات نسبیہ میں مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں شامل ہیں۔ان سے نکاح کرنا صحبت کرنا اور کسی بھی قسم کا کوئی شہوانی عمل کرنا دائماً (ہمیشہ کے لئے) حرام ہے۔ماؤں میں دادی، پردادی، نانی، پرنانی اور ان سے اوپر کی دادیاں اور نانیاں داخل ہیں۔اور بیٹیوں میں اُس کی اپنی بیٹی، اُس کی پوتی، نواسی اور اُس سے نچلے درجے کی سب بیٹیاں داخل ہیں اور بہنوں میں حقیقی بہن، علاتی بہن (باپ کی طرف سے سوتیلی) اَخیافی (ماں کی طرف سے سوتیلی) بہنیں داخل ہیں اور اِسی طرح بھتیجیوں اور بھانجیوں میں اِن سے نچلے درجہ کی بھی داخل ہیں“۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:273)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: اَلْمُحَرَّمَاتُ بِسَبَبِ النَّسَبِ عَلَى التَّأْبِيْدِ: هُنَّ اللَّاتِيْ تَحْرُمُ

عَلَى الشَّخْصِ بِالْقَرَابَةِ النَّسَبِيَّةِ، وَهُنَّ أَرْبَعَةُ أَنْوَاعٍ:

ترجمہ: ''نسب کی وجہ سے جو عورتیں ہمیشہ کے لئے حرام ہیں: وہ عورتیں جو کسی شخص پر قرابتِ نسب کے سبب حرام ہیں، اُن کی چار اقسام ہیں:

آگے چل کر تیسری قسم کے تحت لکھتے ہیں:

فُرُوْعُ الْاَبَوَیْنِ أَوْ أَحَدِهِمَا وَإِنْ بَعُدَتْ دَرَجَتُهُنَّ: وَهِيَ الْأَخَوَاتُ الشَّقِيْقَاتُ أَوْ لِأَبٍ أَوْ لِأُمٍّ، وَبَنَاتُهُنَّ، وَبَنَاتُ أَوْلَادِ الْإِخْوَةِ وَالْأَخَوَاتِ وَإِنْ نَزَلْنَ، لِقَوْلِهِ تَعَالَى: وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ (النساء: ۲۳)

ترجمہ: ''والدین کی اولاد یا اُن میں سے کسی ایک کی اولاد اگرچہ وہ کتنے ہی درجہ بعد کی ہو: اور وہ حقیقی بہنیں، اخیافی (صرف ماں شریک) اور علاتی (صرف باپ شریک) بہنیں اور اُن کی بیٹیاں ہیں، اور اِسی طرح بھتیجیوں اور بھانجیوں میں اِن سے نچلے درجہ کی بھی داخل ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اور بھتیجیاں اور بھانجیاں (تم پر حرام کی گئی ہیں)''۔

(فقہ الاسلامی وأدلتہٗ، جلد 9، ص:6626)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۂ نساء آیت 23 میں رشتۂ قرابت کے حوالے سے اُن عورتوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا، جن سے کسی مرد رشتے دار کا نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے، اسی کے ذیل میں ''وَبَنَاتُ الْأُخْتِ'' یعنی تم پر اپنی بھانجیوں کے ساتھ نکاح حرام قرار دیا گیا ہے۔

دعوتِ ولیمہ کی شرعی حیثیت

سوال:

شادی کے بعد ولیمہ کی دعوت کتنی تاخیر سے کی جاسکتی ہے؟۔ آج کل فیشن بن چکا ہے کہ ولیمہ کی دعوت ہفتوں اور بعض اوقات مہینوں کے بعد رکھی جاتی ہے، کیا یہ عمل درست ہے؟۔ کبھی شادی ہال نہ ملنے کے سبب ایسا ہوتا ہے اور کبھی کسی اور مجبوری کے سبب، تو ایسے میں درست عمل کیا ہوگا؟۔ دعوتِ ولیمہ اور دیگر دعوتوں کی قبولیت کے بارے میں

شریعت کا حکم کیا ہے؟،(سید شفاعت علی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

''شبِ زفاف'' کی صبح اپنے دوست، احباب، عزیز و اقارب اور محلے کے لوگوں کی اپنی استطاعت کے مطابق ضیافت کرنا ''ولیمہ'' کہلاتا ہے۔ ولیمہ سنت ہے اور اگر اس دعوت سے مقصود ادائے سنت ہو تو یہ اجر کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ۔ ترجمہ: ''ولیمہ کرو، خواہ ایک بکری سے، (صحیح بخاری: 5167)''۔

(۲) عَنْ أُمِّهِ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ: أَوْلَمَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى بَعْضِ نِسَائِهِ بِمُدَّيْنِ مِنْ شَعِيرٍ

ترجمہ: ''حضرت صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بعض ازواجِ مطہرات کا ولیمہ دو مُد (غلے کو ماپنے کا ایک پیمانہ) جو کے ساتھ کیا تھا''۔

(صحیح بخاری: 5172)

ولیمہ مسنونہ کا ایک شرعی معیار یہ بھی ہے کہ اس میں اپنے قرابت داروں اور رشتہ داروں کے علاوہ فقراء اور ناداروں کو بھی شریک کیا جائے، حدیثِ پاک میں ہے: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيمَةِ، يُدْعَى لَهَا الأَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ، وَمَنْ تَرَكَ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللهَ تَعَالَى وَرَسُولَهُ ﷺ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بُرا کھانا ولیمہ کا وہ کھانا ہے، جس میں (صرف) مالدار لوگ بلائے جاتے ہیں اور فقراء کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور جس نے دعوتِ ولیمہ کو ترک کیا، تو اُس نے اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی، (صحیح بخاری: 5177)''۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: طَعَامُ أَوَّلِ يَوْمٍ حَقٌّ، وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّانِي سُنَّةٌ، وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّالِثِ سُمْعَةٌ، وَمَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللهُ بِهِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (شبِ عروسی

کے بعد) پہلے دِن کا کھانا ثابت ہے، دوسرے دِن کا کھانا سنّت ہے اور تیسرے دن کا کھانا نام ونمود کے لئے ہے، جو شخص (اِن دعوتوں کو) نام ونمود اور تفاخر کے لئے استعمال کرے گا، تو اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اسے رسوا کرے گا، (سُنن ترمذی: 1097)"۔

شریعت میں شادی کے بعد پہلے یا دوسرے دن کی جانے والی ضیافت کو ولیمہ کہا جاتا ہے، اُس کے بعد کی جانے والی دعوت پر ولیمہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔ علامہ نظام الدین حنفی لکھتے ہیں: وَوَلِیمَةُ الْعُرْسِ سُنَّةٌ وَفِیهَا مَثُوبَةٌ عَظِیمَةٌ وَهِیَ إذَا بَنَی الرَّجُلُ بِامْرَأَتِهِ یَنْبَغِی أَنْ یَدْعُوَ الْجِیرَانَ وَالْأَقْرِبَاءَ وَالْأَصْدِقَاءَ وَیَذْبَحَ لَهُمْ وَیَصْنَعَ لَهُمْ طَعَامًا۔

ترجمہ: "دعوتِ ولیمہ سنّت ہے اور اس میں ثوابِ عظیم ہے اور دعوتِ ولیمہ یہ ہے کہ جب یہ شخص اپنی عورت (بیوی) سے زفاف کرے، تو اس کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں، عزیز واقارب اور دوست احباب کے لئے دعوت کرے اور مہمانوں کے لئے جانور ذبح کرے اور اُن کے لئے کھانا تیار کرے"۔ مزید لکھتے ہیں: وَلَا بَأْسَ بِأَنْ یَدْعُوَ یَوْمَئِذٍ مِنَ الْغَدِ وَبَعْدَ الْغَدِ ثُمَّ یَنْقَطِعُ الْعُرْسُ وَالْوَلِیمَةُ کَذَا فِی الظَّهِیرِیَّةِ۔

ترجمہ: "اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ ولیمہ شادی کے اگلے دن کرے یا اُس کے بعد والے دن میں کرے، اس کے بعد کی جانے والی دعوت کو ولیمہ نہیں کہا جائے گا"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 343، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

دعوت کی قبولیت کے حوالے سے شرعی حکم یہ ہے: قَالَ الْبَرَاءُ بْنُ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: أَمَرَنَا النَّبِیُّ ﷺ بِسَبْعٍ وَنَهَانَا عَنْ سَبْعٍ: أَمَرَنَا بِعِیَادَةِ الْمَرِیضِ، وَاتِّبَاعِ الْجَنَازَةِ، وَتَشْمِیتِ الْعَاطِسِ، وَإِبْرَارِ الْقَسَمِ وَنَصْرِ الْمَظْلُومِ، وَإِفْشَاءِ السَّلَامِ، وَإِجَابَةِ الدَّاعِ

ترجمہ: "براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ہمیں سات باتوں کا حکم فرمایا اور سات باتوں سے منع فرمایا: آپ ﷺ نے ہمیں مریض کی عیادت، جنازے کے ساتھ چلنے، چھینک (آنے پر جو شخص "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہے، "یَرْحَمُكَ اللّٰهُ" کہہ کر اُس) کا جواب دینا، کسی نے قسم کھائی ہو تو اُس سے عہدہ برآں ہونے کے لئے اُس کی مدد کرنا،

مظلوم کی مدد کرنا، سلام کو عام کرنا، دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کرنا''۔

(صحیح بخاری:5175)

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمْ اِلَی الْوَلِیْمَةِ فَلْیَاْتِهَا۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو ولیمہ کی دعوت دی جائے تو اُسے چاہئے کہ اُس میں شریک ہو''۔

(صحیح بخاری:5173)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:''بعض فقہاء کے نزدیک ولیمہ کی دعوت قبول کرنا واجب ہے، اِس میں ترک کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور جمہور علماء کے نزدیک سنّت ہے اور افضل یہ ہے کہ ولیمہ کی دعوت ہو تو قبول کرے اور عام دعوت ہو تو اُسے اختیار ہے۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں:''بنایہ'' میں ہے: دعوت ولیمہ کی ہو یا کوئی اور اُس کا قبول کرنا سنّت ہے، لیکن ایسی دعوت جس سے دولت کی نمائش اور نام ونمود مقصود ہو، تو اُسے خاص طور پر اہلِ علم کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں:''الاختیار'' میں ہے: ولیمہ کی دعوت سنّتِ قدیمہ ہے اور جو اسے قبول نہیں کرے گا وہ گنہگار ہوگا ،اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ سنّتِ مؤکدہ ہے جبکہ عام دعوتوں کا یہ حکم نہیں ہے۔''ہدایہ''،''تاتارخانیہ'' میں اِسے واجب قرار دیا ہے۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: جس دعوت میں گانا بجانا اور دیگر مُنکرات ہوں، تو اُن میں شریک نہیں ہونا چاہئے ،اگر مُنکرات کو روک سکے تو روکے ورنہ صبر کرے اور روک نہیں سکتا تو ایسی دعوتوں سے نکل آئے ،خاص طور پر علماء ومشائخ ایسی دعوتوں میں شریک نہ ہوں''۔

(خلاصہ بحث ردالمحتار، جلد9،ص:423-422)

آج کل خاص طور پر شہروں میں مکانات اور آبادیاں تنگ (Conjusted) ہیں، اس لئے ہال یالان بک کرنا یا کسی پارک میں اہتمام کرنا ایک معاشرتی ضرورت ہے۔بعض لوگ بہت بڑے پیمانے پر اہتمام کرتے ہیں، دسیوں ڈشیں (انواع طعام) ہوتی ہیں، یہ ایک طرح طبقاتی برتری کا اظہار ہوتا ہے اور اسے اعلیٰ طبقات سے روابط استوار کرنے کے

لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، جسے آج کل پی آر (Public Relationing) کہا جاتا ہے۔اس طرح کی دعوتیں ولیمہ مسنونہ کی روح اور مقصدیت کے منافی ہیں۔نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اگر شادی کے دوسرے روز محض چند افراد کی ضیافت بطور ولیمہ کردی جائے تو یہ سنت ادا ہو جاتی ہے، بعد کے دنوں میں کی جانے والی ضیافت محض دعوت ہوگی، اُس پر ولیمہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔

پھوپھی زاد بھائی کی بیٹی سے نکاح کا حکم

سوال:

میں اپنے سگے پھوپھی زاد بھائی کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں، کیا یہ نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟، (اکرام الدین، ملیر کینٹ، کراچی)۔

جواب:

جی ہاں! حرمتِ نکاح کا کوئی اور سبب موجود نہ ہو، تو یہ نکاح جائز ہے۔ جب چچازاد اور پھوپھی زاد سے نکاح جائز ہے، تو اُن کی بیٹی سے بطریقِ اولیٰ ہوسکتا ہے۔جن خواتین سے شرعاً نکاح حرام ہے، قرآن مجید سورۂ نساء کی آیات 22 تا 25 میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور پھر مزید فرمایا: وَاُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ

ترجمہ: ''اور ان (مذکورہ محرمات عورتوں) کے علاوہ باقی سب عورتوں کے ساتھ تمہارا نکاح جائز ہے، (النساء:24)''۔

مفتی محمد نور اللہ نعیمی نور اللہ مرقدہٗ سے سوال ہوا: ''آیا زید کی حقیقی خالہ کی حقیقی نواسی سے زید کا نکاح از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟''، آپ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ''ہاں! جائز ہے، اللہ رب العالمین جلّ وعلا نے فرمایا: وَاُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ (پارہ:۵) اور شامی جلد 2، ص:380 میں فتح القدیر سے ہے: وَفُرُوۡعُ اَجۡدَادِہٖ وَجَدَّاتِہٖ بِبَطۡنٍ وَاحِدٍ فَلِھٰذَا تَحۡرُمُ الۡعَمَّاتُ وَالۡخَالَاتُ وَتَحِلُّ بَنَاتُ الۡعَمَّاتِ وَالۡاَعۡمَامِ وَالۡخَالَاتِ وَالۡاَخۡوَالِ (یعنی

اجداد و جدات کے فروع جو ایک بطن سے ہوں (ان سے نکاح جائز ہے)، لہٰذا پھوپھیوں اور خالاؤں سے تو نکاح حرام ہے، (لیکن) پھوپھی زاد، چچا زاد، خالہ زاد اور ماموں زاد بہنوں سے نکاح جائز ہے) اور یونہی کتاب الفقہ جلد 4، ص: 61،62 میں بھی ہے''۔
(فتاویٰ نوریہ، جلد 2، ص: 446)

مہر زیورات کی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے

سوال:

مہرِ معجل اور غیر مُعجل کا کیا مطلب ہے؟، اگر کسی عورت کا مہر ایک لاکھ روپے طے پایا ہو اور نکاح نامے میں اندراج کیا گیا ہو: ''مبلغ ایک لاکھ روپے جملہ مہر مُعجّل (جملہ مہر کے عوض 40 گرام طلائی زیورات دے دیئے ہیں)، اِس صورت میں شوہر کیا مہر ادا کرے گا، طلائی زیورات یا ایک لاکھ روپے یا دونوں ادا کرے گا؟۔ مہوش خانم، کراچی

جواب:

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: ''فقہاءِ کرام نے مہر کی ادا کرنے کی مدت مقرر کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ مہر معجّل (Prompt) ہو یا مُؤجّل (Deferred)، دونوں صورتیں صحیح ہیں۔ مہرِ مُؤجّل میں ادا کرنے کی مدت قریب ہو یا بعید یا یہ طے کیا ہو کہ طلاق یا وفات کی صورت میں جو بھی امر پہلے پیش آئے، مہر اس وقت ادا کیا جائے گا، درست ہے۔ مہرِ مُؤجّل میں ادا کرنے کی مدت کا مدار ہر علاقے کے عرف (Custom) اور عادت (Practice) پر ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ مہرِ مُؤجّل کے ادا کرنے کی جو بھی مدت یا وقت مقرر کیا گیا ہو، وہ مجہول (Un Known) اور جہالتِ فاحشہ پر مبنی نہ ہو کیونکہ ایسی جہالت بعد میں تنازعے کا باعث بنتی ہے''۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد: 9، ص: 6787)
مہرِ معجّل سے مراد فوری اور بروقت ادا کرنا ہے۔ مہرِ معجّل کی صورت میں بیوی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ مہر ادا کرنے سے پہلے شوہر سے قربت کو منع کرے۔ حکومتِ پاکستان کے منظور شدہ نکاح نامے میں مہر ادا کرنے کی دو صورتیں تجویز کی گئی ہے، ایک ''مہرِ معجّل'' اور

دوسری ''مہرِ مؤجّل''۔

مہرِ مؤجّل سے مراد ایسا مہر جس کو فوری ادا کرنا لازم نہ ہو بلکہ اسے مؤخر کر دیا گیا ہو، اسے ہمارے ہاں عرف عام میں غیر معجّل بھی کہتے ہیں۔ زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ یا تو مہر نکاح وقت ادا کر دیا جائے یا اسے عِندَ الطلب (On Demand) قرار دے دیا جائے، اس سے مراد یہ ہے کہ بیوی جب بھی مطالبہ کرے شوہر مہر ادا کرنے کا پابند ہوگا۔ اگر خدانخواستہ کسی نے اپنی زندگی میں اپنی بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو اور اس کا انتقال ہو گیا ہو، تو ترکے کی تقسیم سے پہلے دیگر دُیون (Debts) کی طرح دینِ مہر کی ادائیگی بھی لازمی ہوگی۔ آج کل بعض لوگ مہر کو طلائی زیورات کی شکل میں ادا کر دیتے ہیں، یعنی شوہر کی طرف سے بیوی کو جو زیورات دیئے جاتے ہیں، انہیں مہر قرار دے دیا جاتا ہے، یہ بھی درست ہے اور اس صورت میں بیوی ان زیورات کی مالک ہوگی۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے اس میں طلائی زیورات کو مہر کے عوض قرار دیا گیا ہے یہ درست ہے اور بیوی ان زیورات کی مالک ہے، اس صورت میں اب شوہر کو نقد مہر ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

طلاق کے مسائل

فسخِ نکاح کی شرعی حیثیت

سوال:

میری پہلی شادی 2007ء میں ہوئی، جو ناکام ہوئی اور 2009ء میں بذریعہ کورٹ فسخِ نکاح ہوگیا۔عدت گزارنے کے 11 ماہ بعد اپریل 2010ء کو میرا دوسرا نکاح ہوگیا۔ یونین کونسل سے جو طلاق کا سرٹیفکیٹ لیا جاتا ہے، وہ ہم نے تاخیر سے لیا، جس پر اجراء کی تاریخ 17 مئی 2010ء ہے، کیا میرا نکاح شرعی اعتبار سے جائز ہے؟۔

(ایک دینی بہن، کراچی)

جواب:

خلع ہو یا طلاق یا فسخِ نکاح غیر حاملہ عورت کی عدت تین حیض گزرنا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرۃ:228)''۔

سوائے اس کے کہ وہ سنِ ایاس کو پہنچ چکی ہو یا کسی وجہ سے اُسے حیض نہ آتا ہو، تو اس کی عدت تین ماہ ہے: وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ

ترجمہ: ''اور تمہاری جو عورتیں حیض سے ناامید ہو چکی ہوں یا انہیں سرے سے حیض آتا ہی نہیں اور تمہیں اس امر میں شبہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہے؟) تو ان کی عدت تین ماہ ہے، (الطلاق:4)''۔

عدت کی مذکورہ مدت پوری ہونے کے بعد نکاحِ ثانی کرنے کی اجازت ہے، اس سے قبل ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نکاح یا طلاق کے ثبوت کے لئے دفتری کاغذی کارروائی وقت کی ضرورت ہے، شرعاً اس کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں تاخیر سے یا کاغذی کارروائی کے نہ ہونے سے نکاح میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اگر باقاعدہ گواہوں کی موجودگی میں صحیح طور پر نکاح منعقد ہوا، تو وہ نکاح درست اور جائز ہے۔

جو عدالتی خلع یا فسخِ نکاح کا معاملہ ہے، وہ یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔ اس پر ہمارے الگ فتاویٰ تفہیم المسائل میں موجود ہیں۔ عدالتی خلع یا فسخِ نکاح کی وجوہ شرعی موجود ہوں تو یہ طلاقِ بائن کے حکم میں ہے، جس میں عدت کے اندر اور عدت گزرنے کے بعد نیا مہر مقرر کر کے پہلے شوہر سے براہِ راست عقدِ ثانی ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس نے عدالت کے سامنے طلاق مُغلظہ نہ دی ہو۔

کم سن یا نابالغہ کا معذور سے نکاح

سوال:

ایک شخص نے اپنی شیر خوار، کمسن یا نابالغہ بیٹی کا نکاح معذور (گونگے، اندھے اور بہرے)، پاگل، نشہ خور، گنوار، آوارہ، بیروزگار نوجوان سے کر دیا جبکہ بچی اور لڑکے کی عمر میں سات سے سولہ سال تک کا فرق ہے۔ اس لئے درحقیقت باپ نے اپنے بھائی یا کسی رشتہ دار کی شادی کرنا تھی اور گھر آباد کرنا تھا بطور وٹہ سٹہ باپ نے اس شادی کے بدلے اور عوض میں اپنی معصوم بیٹی کا نکاح کر دیا تھا۔ والد نے نابالغہ بچی کے عوض رقم وصول کر لی ہے، جس کا وہ خود اقراری ہے، اہلِ علاقہ اِس پر گواہ ہیں۔ برادری نے باپ کو نابالغ بچی کے نکاح کر دینے پر مجبور کیا، باپ نے مجبور ہو کر برادری کے اصرار پر اپنی نابالغہ بچی کا نکاح کر دیا جبکہ باپ اب تک انتہائی نادم اور پریشان ہے۔ باپ کم عقل سادہ اور بھولا ہے، جو شفقتِ پدری کے احساس سے محروم ہے۔ اس وقت دونوں خاندانوں میں دشمنی خوفناک حد تک جا پہنچی ہے، فوجداری مقدمات، گرفتاریاں، مار کٹائی اور ہر طرح کی انتقامی کاروائیاں پولیس اور کچہری کے ذریعے تا حال جاری ہیں۔ اب یہ نابالغ بچی جوان اور بالغ ہو چکی ہے، کسی صورت باپ کے کئے ہوئے نکاح کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور اس نکاح سے چھٹکارا چاہتی ہے۔

صورتِ مسئولہ میں باپ کا کیا ہوا نکاح شرعاً منعقد ہوا تھا یا نہیں؟۔ اگر منعقد ہو گیا تھا تو کیا اب خیارِ بلوغ یا فسخ کے لئے آپ کا دارالافتاء اور آپ علماءِ حق کوئی کردار ادا کریں گے یا

مجھے دیوانی عدالتوں میں دولت، عزت اور وقت کے ضیاع کے بعد کوئی آزادی میسر آسکے گی اور کوئی حل نکل سکے گا؟، (خدیجہ پروین معرفت: پروفیسر حافظ محمد ابوبکر، محلہ قدیر آباد، ملتان)۔

جواب:

کچھ خاندان شیر خوار بچیوں یا حمل کا وٹہ سٹہ کردیتے ہیں، یا سرداروں کے فیصلے کے مطابق جرم کے عوض نابالغ بچیوں کو حوالے کرتے ہیں اور کچھ لوگ بچیوں کو بیچتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں حمل یا شیر خوار یا نابالغ بچیاں جن کے نام کی جاتی ہیں، ان منگیتروں میں کچھ اندھے، کچھ گونگے، بہرے، اپاہج یا نیم پاگل ہوتے ہیں اور یہ معاملہ سندھی، بلوچی، سرائیکی اور پٹھان وغیرہ قبائل میں رائج ہے اور بارہا کا مشاہدہ ہے کہ بہت سی بچیوں کی زندگی انتہائی اضطراب وعذاب میں بسر ہوتی ہے، اگر کوئی لڑکی چین کی زندگی بسر کررہی ہو تو لڑکے سے اس کے والدین کہتے ہیں کہ ہماری بچی سے ایسا کررہے ہیں، لہٰذا تم بھی ویسا ہی کرو، اگر ایک کو طلاق ہوجائے تو دوسری کو بھی ضرور طلاق دی جاتی ہے۔

اب قابلِ غور یہ مسئلہ ہے کہ جو اولیاء بچیوں سے ایسا سلوک کرتے ہیں اور ہر مصلحت سے عاری ہوکر محض رسم ورواج یا ذاتی فوائد کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں، آیا ان بچیوں کو بلوغ کے بعد فسخ کا حق حاصل ہوگا یا نہیں۔ شرعِ مُطہر نے ولی کو ولایتِ اجبار کا حق دیا ہے، درمختار میں ہے:

وَوَلَايَةُ اِجْبَارٍ عَلَى الصَّغِيْرَةِ وَلَوْ ثَيِّبًا۔

ترجمہ: "نابالغہ (کے نکاح کے لئے) ولی کو ولایتِ اجبار کا حق حاصل ہے، خواہ وہ ثیبہ ہی ہو، (جلد:4،ص:114)"۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: وَلِلْوَلِيِّ اِنْكَاحُ الصَّغِيْرِ وَالصَّغِيْرَةِ (جَبْرًا) وَلَوْ ثَيِّبًا وَلَزِمَ النِّكَاحُ وَلَوْ بِغَبَنٍ فَاحِشٍ اَوْ بِغَيْرِ كُفْءٍ اِنْ كَانَ الْوَلِيُّ اَبًا وَّجَدًّا

ترجمہ: "اور ولی کو اپنی نابالغ اولاد (لڑکے یا لڑکی) کے نکاح کا جبری حق حاصل ہے، خواہ وہ نابالغہ لڑکی ثیبہ ہو اور ولی کا نکاح لازم ہوجائے گا، خواہ غبن فاحش (مثلاً مہر کا غیر معمولی طور

پر کم ہونا) ہو یا غیر کفو میں ہو، بشرطیکہ ولی باپ یا دادا ہو، (جلد 4،ص:127)''۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ باپ اور دادا نابالغہ کا نکاح جبراً کر سکتے ہیں اگر چہ غبن فاحش کے ساتھ ہو یا غیر کفو میں ہو اور نکاح لازم ہو جائے گا نابالغہ کو بلوغ کے بعد خیار بھی نہیں رہے گا، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ باپ، دادا نے لاپرواہی یا خودغرضی پر مبنی اس اختیار کا غلط استعمال نہ کیا ہو اور اگر ان سے اس اختیار کا سوء استعمال ثابت ہو تو نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ باپ یا دادا سے پدری شفقت کی توقع تھی اور اس نے اپنے اس فعل سے ظاہر کر دیا کہ وہ شفقتِ پدری سے محروم ہے۔ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: لَمْ یُعْرَفْ مِنْھُمَا سُوْءُ الْاِخْتِیَارِ مَجَانَةً وَفِسْقًا وَاِنْ عَرَفَ لَا یَصِحُّ النِّکَاحُ اِتِّفَاقًا وَکَذَا لَوْکَانَ سَکْرَانَ فَزَوَّجَهَا مِنْ فَاسِقٍ اَوْ شَرِیْرٍ اَوْفَقِیْرٍ اَوْذِیْ حِرْفَةٍ دَنِیْئَةٍ لِظُهُوْرِ سُوْءِ اِخْتِیَارِہٖ فَلَا تُعَارِضُهُ شَفَقَتُهُ الْمَظْنُوْنَةُ۔

ترجمہ: ''ان (باپ دادا) سے لاپرواہی یا خودغرضی پر مبنی اختیار کا غلط استعمال معروف نہ ہو اور اگر ولایتِ اجبار کے اختیار کا غلط استعمال معروف ہو (یا ثابت ہو) تو بالاتفاق نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر باپ یا دادا نشے میں تھے اور اُنہوں نے اختیار کا غلط استعمال کرتے ہوئے اپنی نابالغہ بیٹی کا نکاح کسی فاسق (بے دین) یا شریر یا فقیر کسی گھٹیا پیشے والے کے ساتھ کر دیا، تو شفقت مظنونہ (متوقع شفقت پدری) کے ساتھ متعارض نہیں ہے، (یعنی یہ نکاح صحیح نہیں ہوگا)، (جلد:4،ص:129-128)''۔

شریعت نے نابالغ، نابالغہ کی خیرخواہی کا لحاظ کرتے ہوئے ''سوءِ اختیار'' کی وجہ سے باپ دادا کی ولایتِ اجبار کا حق سلب کر دیا اور اسی طرح ولی کا نشے کی حالت میں کیا ہوا نکاح بھی صحیح نہیں ہوگا۔ کفو میں مہرِ مثل کے ساتھ نکاح کر دے تو صحیح ہے۔ ردالمحتار میں ہے: قُلْتُ: وَمُقْتَضَی التَّعْلِیْلِ اَنَّ السَّکْرَانَ اَوِالْمَعْرُوْفَ بِسُوْءِ الْاِخْتِیَارِ لَوْزَوَّجَهَا مِنْ کُفْءٍ بِمَهْرِالْمِثْلِ صَحَّ لِعَدَمِ الضَّرَرِ الْمَحْضِ۔

ترجمہ: ''اس علت کا تقاضا یہ ہے کہ نشے کی حالت میں کر دے یا اُس سے خیارِ ولایت کا غلط

استعمال معروف ہے، لیکن اگر اس نے کفو میں مہر مثل پر نکاح کیا ہے، تو ایسا نکاح ضرر محض نہ ہونے کی بنا پر صحیح ہوگا، (جلد 4، ص:129)"۔

اگر ولی نے ایسے شخص سے نکاح کیا جس سے ظلم وجور کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں نکاح کرنا یا کرانا مکروہ تحریمی ہے اور اگر ظلم وجور کا تعین ہو تو حرام ہے۔ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: وَمَكْرُوْهًا لِخَوْفِ الْجَوْرِ فَإِنْ تَيَقَّنَهُ حَرُمَ ذَالِكَ۔

ترجمہ: "جہاں ظلم کا اندیشہ ہو وہاں نکاح مکروہ ہے اور اگر ظلم یقینی ہے، تو حرام (یعنی مکروہِ تحریمی) ہے (جلد 4، ص:57)"۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ولی کو حقِ ولایت اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ نابالغ اولاد کے حق میں بہتر فیصلے کرے کیونکہ وہ ابھی اپنے حق میں صحیح اور بہتر فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ بالغ اولاد پر ولی کو ولایتِ اجبار حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے مفاد کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر ولی پیسے لے کر یا رسم ورواج یا اپنے ذاتی فوائد کی وجہ سے نابالغ اولاد کے حق میں غلط فیصلہ کرے اور ان کا نکاح اندھے، گونگے، بہرے یا اپاہج یا ایسے شخص سے کرے جو لڑکی کو "روٹی، کپڑا اور مکان" نہ دے سکتا ہو یا بیوی کے دیگر حقوق لازمہ ادا نہ کرسکتا ہو، تو ایسی صورت میں لڑکی کو بعد از بلوغ نکاح فسخ کرنے کا حق حاصل ہوگا، جیسے عنین ومقطوع الذکر میں حاصل ہوتا ہے۔

طلاق اور خلع میں فرق

سوال:

ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، مہر مبلغ ایک لاکھ اسی ہزار روپے مالیت سونے کی شکل میں تھا۔ بوقت طلاق رجسٹرار اور جرگہ کے لوگوں نے کہا کہ مہر ایک لاکھ اسی ہزار روپے لڑکا ادا کرے گا تو لڑکی حق مہر کے بدلے مبلغ ایک لاکھ اسی ہزار روپے بطور خلع لڑکے کو ادا کرے، لہٰذا نہ تو حق مہر ادا کیا گیا اور نہ بطور خلع رقم لڑکے کو ادا کی گئی۔ از روئے شرع کیا یہ طریقہ درست ہے؟۔ اگر لڑکا اپنی مرضی سے طلاق دے رہا ہے تو کیا وہ

خلع کی رقم کا مطالبہ لڑکی سے کرسکتا ہے؟۔(سرنامے کے بعد طلاق نامے کی عبارت کچھ اس طرح ہے:''آج میں نے بوجہ ناچاقی وناسازی طلاقِ ثلاثہ دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کرتا ہوں، آج سے میرا تعلق زوجیت نہیں رہا'')۔طلاق نامے کی نقل منسلک ہے۔

(محمد سجاد، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

جواب:

خلع زوجین کی رضامندی سے ہوتا ہے،یعنی بیوی کچھ مال دے کر خلع حاصل کرے یا مطالبۂ مہر سے دستبردار ہوجائے،اس سے طلاق بائن ہوجاتی ہے۔ مال کے بدلے نکاح زائل کرنے کو خلع کہتے ہیں۔خلع میں عورت کا قبول کرنا شرط ہے اور اس کے الفاظ معین ہیں ان الفاظ کے علاوہ اور لفظوں سے خلع نہ ہوگا۔خلع ایک طلاق بائن کے درجے میں ہوتا ہے۔علامہ برہان الدین ابوبکر علی بن حسن فرغانی مرغینانی لکھتے ہیں:وَاِذَا تَشَاقَّ الزَّوْجَانِ، وَخَافَا أَنْ لَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللهِ فَلَا بَأْسَ بِأَنْ تَفْتَدِيَ نَفْسَهَا مِنْهُ بِمَالٍ يَخْلَعُهَا بِهِ،لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ، فَاِذَا فَعَلَا ذٰلِكَ وَقَعَ بِالْخُلْعِ تَطْلِيْقَةٌ بَائِنَةٌ،وَلَزِمَهَا الْمَالُ۔

ترجمہ:''اور جب زوجین (شوہر وبیوی) کے درمیان جھگڑا اس نوعیت کا ہو کہ دونوں کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت شوہر کو اپنی جان کا فدیہ دیدے، ایسے مال کے ساتھ،جس کے ذریعے شوہر اس کو خلع دیدے۔دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ یعنی''ان دونوں پر کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اس کو فدیہ دیدے''۔پس جب شوہر اور بیوی نے ایسا کرلیا تو خلع کی وجہ سے ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی اور عورت پر مال لازم ہوگا،(ہدایہ،جلد 3،ص:238)''۔منسلکہ طلاق نامے کی رُو سے یہ خلع نہیں بلکہ تین طلاقیں ہیں جو یکطرفہ طور پر شوہر نے بیوی کو دی ہیں۔ایک ساتھ دی گئی یہ تینوں طلاقیں اگرچہ نافذ ہوگئیں اور دونوں ایک دوسرے پر حرام ہوچکے ہیں لیکن ایسا کرنے کی وجہ سے شوہر گنہگار رہا۔شوہر نے عورت کے مطالبے پر طلاق

دی ہو یا اپنی آزادانہ مرضی سے دی ہو، مہر کی ادائیگی شوہر پر لازم ہے اور اسے عورت سے کسی رقم کے مطالبے کا اُسے حق حاصل نہیں۔

بیوی کو ماں کہنے سے ظہار نہیں ہوگا

سوال:

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کہہ دے کہ: ''تو میری ماں یا بہن ہے''، یا کسی کام کے کرنے کے لئے عموماً کہہ دیا جاتا ہے کہ ''میری ماں فلاں کام کردے''، اِس سے شرعاً کیا حکم ثابت ہوتا ہے؟۔ اِسی طرح اگر عورت شوہر سے ظِہار کے الفاظ کہے تو کیا حکم ہے؟۔
(شفاعت علی، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

ظِہار کی تعریف: جب کوئی شخص اپنی بیوی یا اُس کے کسی عضو کو اپنی ماں یا کسی اور مَحرم کی پُشت یا کسی ایسے عُضو سے تشبیہ دے جس کی طرف دیکھنا حرام ہو، اس کو فقہی اصطلاح میں ''ظِہار'' کہتے ہیں۔ علامہ برہان الدین ابوبکر فرغانی حنفی لکھتے ہیں: وَاِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِامْرَاَتِہٖ: اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ، فَقَدْ حَرُمَتْ عَلَیْہِ لَایَحِلُّ لَہٗ وَطْؤُھَا وَلَا مَسُّھَا، حَتّٰی یُکَفِّرَ عَنْ ظِھَارِہٖ لِقَوْلِہٖ تَعَالٰی: {وَالَّذِیْنَ یُظَاھِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِھِمْ}
ترجمہ: ''جب کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: تو مجھ پر میری ماں کی پُشت کی مثل ہے، تو وہ (عورت) اُس پر حرام ہوجاتی ہے اور اب اُس سے عملِ زوجیت جائز نہیں اور نہ ہی اُس کو چھونا اور بوسہ دینا جائز ہے، حتیٰ کہ شوہر اس ظِہار کا کفارہ ادا کردے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مجادلہ کی آیت:3 میں ارشاد فرمایا، (ہدایہ، جلد 3، ص:250)''۔
ظِہار کا حکم: ظِہار کرنے سے بیوی شوہر پر حرام ہوجاتی ہے، اگر شوہر دوبارہ رجوع کرنا چاہے، تو اسے کفارہ دینا ہوگا۔
ظِہار کا کفارہ: سورۂ مُجادلہ آیت:4 کی رُو سے آج کے حالات میں ظِہار کا کفارہ یہ ہے: رجوع (یعنی بیوی کے ساتھ قربت) سے پہلے دو ماہ مسلسل روزے رکھنا، اگر اس پر قدرت

نہ ہوتو ساٹھ مساکین کو دو وقت کا پیٹ بھر کھانا کھلانا ہے۔

آپ نے سوال میں شوہر کی طرف سے بیوی کے لئے جو کلمات ذکر کیے ہیں، یہ کلام لغو اور باطل ہے، اِس سے نہ تو ظہار ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی طلاق۔ البتہ اس طرح کا کلام مکروہ (تحریمی) ہے۔ حدیث مبارک میں اس عمل کو مکروہ فرمایا ہے: عَنْ أَبِیْ تَمِیْمَةَ الْهُجَیْمِیِّ: أَنَّ رَجُلاً قَالَ لِامْرَأَتِهٖ یَا أُخَیَّةُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: أُخْتُكَ هِیَ؟، فَکَرِهَ ذَالِكَ وَنَهٰی عَنْهُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوتمیمہ ہجیمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو اپنی بیوی سے یہ کہتے ہوئے سنا: ''اے میری بہنا!''، تو نبی ﷺ نے فرمایا: کیا یہ تیری بہن ہے؟، تو آپ نے اس کو ناپسند فرمایا اور اس سے منع فرمایا''۔ (سُنن ابوداود: 2203)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لَوْقَالَ لَهَا: أَنْتِ أُمِّیْ لَایَکُوْنُ مُظَاهِرًا وَیَنْبَغِیْ أَنْ یَکُوْنَ مَکْرُوْهًا وَمِثْلُهٗ أَنْ یَقُوْلَ یَا ابْنَتِیْ وَیَا أُخْتِیْ وَنَحْوُهٗ وَلَوْقَالَ لَهَا أَنْتِ عَلَیَّ مِثْلُ أُمِّیْ أَوْ کَأُمِّیْ یَنْوِیْ، فَاِنْ نَوَی الطَّلَاقَ وَقَعَ بَائِنًا وَاِنْ نَوَی الْکَرَامَةَ أَوِ الظِّهَارَ فَکَمَا نَوٰی هٰکَذَا فِیْ فَتْحِ الْقَدِیْرِ۔

ترجمہ: ''اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تو میری ماں ہے، تو یہ ظِہار نہیں ہوگا، لیکن ایسا کہنا مکروہ ہے۔ اور اِسی کی مثل یہ ہے کہ کوئی شخص (اپنی بیوی کو) کہے: اے میری بیٹی! یا اے میری بہن! یا اس طرح کے کلمات کہے، تو یہ بھی ناپسندیدہ تو ہے، مگر اس سے ظِہار نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے کہا: تو مجھ پر میری ماں کی مثل ہے یا تو میری ماں کی طرح ہے، تو اگر وہ طلاق کی نیت کرتا ہے، تو طلاق بائن واقع ہوگی اور اگر اُس نے اس کے اِعزاز کے لئے کہا یا ظہار کی نیت سے کہا، تو اُس کے مطابق ہوگا (یعنی اعزاز کے لئے کہا تو کچھ نہیں، ظہار کی نیت سے کہا تو ظِہار ہوگا)، جیسا کہ ''فتح القدیر'' میں ہے''۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 507)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: أَنْتِ أُمِّیْ بِلَا تَشْبِیْهٍ فَاِنَّهٗ بَاطِلٌ وَّاِنْ نَوٰی۔

ترجمہ: ''کسی شخص نے تشبیہ دیئے بغیر اپنی بیوی کو کہا: ''تو میری ماں ہے''، تو اُس کا یہ قول باطل ہے، خواہ اس نے طلاق کی نیت سے کہا ہو، (ردالمحتار، جلد 5، ص:98)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ بیوی کو محض ماں، بہن یا بیٹی کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ نبی کریم ﷺ نے اِس کو ناپسند فرمایا لہٰذا اسے اس پر توبہ کرنی چاہئے۔ اگر بیوی شوہر سے ظہار کے الفاظ کہے تو ظہار نہیں بلکہ لغو ہے۔

ماں کا تربیتِ اولاد کا حق کب ساقط ہوتا ہے؟

سوال:

میرے بیٹے نے سات سال قبل ایک کرسچن لڑکی کو مسلمان کر کے نکاح کیا اور خود ملازمت کے سلسلے میں سعودیہ چلا گیا، بعد میں اپنی بیوی کو بھی بلالیا۔ بظاہر تو وہ نماز وغیرہ پڑھتی تھی لیکن غیر موجودگی میں بائبل پڑھتی اور تمام عیسائی رسومات بھی ادا کرتی تھی، جس پر دونوں میں جھگڑا ہوتا، اِسی دوران ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ آخر انجام یہ ہوا کہ اُس نے طلاق مانگ لی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اِس بچی سے میرا کوئی واسطہ نہیں اسے تم خود رکھو۔ اب سوا دو سال بعد اُس نے بچی کی کفالت کا کیس کر دیا ہے۔ بچی میری (دادی کے) پاس رہتی ہے، میں اُس کی پرورش اسلامی طریقے سے کرنا چاہتی ہوں۔ کیا اُس کی عیسائی ماں کو، جو کہ اسلام قبول کر کے مرتد ہو چکی ہے، بچی کی پرورش کا حق حاصل ہے؟۔

(ایک دینی بہن، کراچی)

جواب:

شرعاً بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہوتا ہے لیکن اگر ایسے اسباب پائے جائیں جو اُس کے حق کو ساقط کر دیں، تو بچے کو اس کی پرورش میں نہیں دیا جائے گا۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''نکاح قائم رہے یا (بذریعۂ طلاق) تفریق ہو جائے، (دونوں صورتوں میں) بچے کی پرورش کا سب سے زیادہ حق اس کی ماں کو حاصل ہے، لیکن اگر وہ مرتدہ ہو جائے یا

(فسق و) فجور میں مبتلا ہو جائے ، بچے کے دین یا اخلاق کے فساد کا اندیشہ ہو تو (پھر اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے) "کافی" میں بھی اسی طرح ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1 ص: 541 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

ترجمہ: "بچے کی پرورش کا حق حقیقی ماں کو حاصل ہے، اگرچہ زوجین کے درمیان جدائی واقع ہوگئی ہو، لیکن اگر وہ (ماں) مرتدہ ہوگئی ہے یا فاجرہ ہے (تو اُسے حقِ پرورش حاصل نہیں ہے)"۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ترجمہ: "اور حاصلِ کلام یہ ہے کہ پرورش کرنے والی (ماں) اگر فاسقہ ہے اور اس کے پاس رہنے سے بچے کے ضائع ہونے (یا اس کی عادات واطوار بگڑنے) کا اندیشہ ہے تو اُس (ماں) کا حق پرورش ساقط ہو جائے گا، اور اگر فاسق نہ ہو تو بچے کے باشعور ہونے تک زیادہ حق دار وہی ہے، اس کے بعد اس سے لے لیا جائے گا، جیسے "کتابیہ" ماں کا حکم ہے"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5 ص: 204,205)

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اس کے مطابق آپ کے بیٹے کی سابقہ بیوی مُرتدّہ ہے، کیونکہ اس نے اسلام قبول کیا اور پھر اس نے ترک اسلام کر کے مسیحیت کو اختیار کیا۔

خلع کی صورت میں حق مہر کا حکم

سوال:

بیوی کی جانب سے "خلع" لینے کی صورت میں حق مہر کا کیا حکم ہے؟۔

جواب:

مال کے بدلے میں نکاح زائل کرنے کو "خلع" کہتے ہیں، یعنی بیوی کچھ مال دے کر خلع حاصل کرے یا حق مہر کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائے، خلع سے طلاقِ بائن واقع ہو جاتی ہے۔ علامہ برہان الدین ابوبکر علی بن حسن فرغانی مرغینانی لکھتے ہیں:

وَاِذَا تَشَاقَّ الزَّوْجَانِ، وَخَافَا أَنْ لَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللهِ فَلَا بَأْسَ بِأَنْ تَفْتَدِيَ نَفْسَهَا مِنْهُ بِمَالٍ يَخْلَعُهَا بِهٖ، لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ، فَاِذَا فَعَلَا ذَالِكَ: وَقَعَ بِالْخُلْعِ تَطْلِيْقَةٌ بَائِنَةٌ، وَلَزِمَهَا الْمَالُ۔

ترجمہ: ''اور جب زوجین (شوہر و بیوی) کے درمیان جھگڑا اس نوعیت کا ہو کہ دونوں کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت شوہر کو اپنی جان کا فدیہ دیدے، ایسے مال کے ساتھ، جس کے ذریعے شوہر اس کو خلع دیدے۔ دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ یعنی'' ان دونوں پر کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اس کو فدیہ دیدے''۔ پس جب شوہر اور بیوی نے ایسا کرلیا تو خلع کی وجہ سے ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی اور عورت پر مال لازم ہوگا، (ہدایہ، جلد 3، ص:238)''۔ عورت سے شوہر کا ازدواجی تعلق قائم ہو چکا ہو تو اُسے ''مدخولہ'' کہتے ہیں ورنہ ''غیر مدخولہ'' کہتے ہیں۔

خلع سے متعلق مختلف صورتوں میں درپیش مسائل درج ذیل ہیں:

(۱) عورت ''مدخولہ'' ہے اور وہ اپنا مہر وصول کر چکی ہے اور خلع کسی مقررہ مقدارِ مال پر ہوا ہے، تو عورت کو وہ مال شوہر کو دینا ہوگا اور اس کے بعد دونوں کو ایک دوسرے سے کسی طرح کے مطالبے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

(۲) امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر عورت نے اپنا مہر وصول نہیں کیا اور اس نے مقررہ مال پر خلع کیا ہے، تو وہ اسے شوہر کو ادا کرنا ہوگا اور اب اسے مہر کے مطالبے کا حق نہیں ہوگا۔

(۳) خلع مقررہ مال پر ہوا ہے اور عورت ''غیر مدخولہ'' ہے اور وہ اپنا پورا مہر وصول کر چکی ہے، تو عورت کو وہ مال شوہر کو دینا ہوگا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک شوہر کو اپنی مُطلّقہ بیوی سے نصف مہر واپس لینے کا حق نہیں ہوگا۔ یہ وضاحت اس لئے کی گئی کہ ''غیر مدخولہ'' عورت کو طلاق ہو جائے تو وہ صرف نصف مہر کی حق دار ہوتی ہے۔

(۴) اگر عورت ''غیر مدخولہ'' ہے اور اس نے اپنا مہر وصول نہیں کیا تھا اور خلع مقررہ مال پر ہوا ہے تو شوہر عورت سے ''بدلِ خلع'' یعنی طے شدہ مال لے گا اور امام اعظم کے نزدیک عورت کو

شوہر سے نصف مہر کے مطالبے کا حق نہیں ہوگا۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری سمجھی گئی کہ ''غیر مدخولہ'' عورت کو عام حالات میں طلاق ہوجائے تو وہ نصف مہر کی حق دار ہوتی ہے۔

(۵) اگر شوہر نے مہر کے علاوہ مقررہ مال پر خلع کیا، تو امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمہما اللہ کے نزدیک یہی ہے کہ شوہر اس مال کا حق دار ہوگا اور عورت مہر کے مطالبے کی حقدار نہیں ہوگی۔ (مُلخّص از فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:489)

خلع کی صورت میں شوہر پر نفقہ واجب ہے

سوال:

خلع کی صورت میں نان نفقہ کا کیا حکم ہے؟، (پرویز نبی شیخ، کراچی)۔

جواب:

خلع واقع ہونے کی صورت میں بھی شوہر پر نفقہ واجب ہے، ہاں! اگر خلع اس شرط پر ہوا کہ عورت شوہر پر نفقہ معاف کردے، تو اِس صورت میں عورت نفقہ کی حق دار نہیں۔ علامہ ابوبکر بن علی بن محمد الحدّادی یمنی متوفّٰی ۸۰۰ھ لکھتے ہیں: وَلَوْ خَلَعَهَا بَعْدَ الدُّخُوْلِ فَلَهَا النَّفَقَةُ وَالسُّكْنٰى اِلَّا اِذَا خَلَعَهَا بِشَرْطِ اَنْ تُبْرِئَهٗ مِنَ النَّفَقَةِ وَالسُّكْنٰى فَاِنَّهٗ يُبْرَأُ مِنَ النَّفَقَةِ دُوْنَ السُّكْنٰى لِاَنَّ السُّكْنٰى خَالِصُ حَقِّ اللهِ تَعَالٰى فَلَا يَصِحُّ الْاِبْرَاءُ عَنْهُ۔

ترجمہ: ''پس اگر دخول کے بعد خلع واقع ہوا ہے، تو بھی شوہر پر عورت کا نفقہ اور سکنیٰ (رہائش) واجب ہے، اگر اس شرط پر خلع ہوئی کہ عورت نفقہ اور سکنیٰ معاف کردے گی، تو (شوہر) نفقہ سے بری ہوجائے گا لیکن سکنیٰ (رہائش کا اہتمام کرنا) اُس کے ذمے لازم رہے گا، اس لئے کہ سکنیٰ خالصتاً اللہ کی جانب سے مقرر کردہ حق ہے، اس سے براءت درست نہیں ہے، (الجوہرۃ النیرۃ، الجزء الثانی، ص:265)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَلَا تَقَعُ الْبَرَاءَةُ عَنْ نَفَقَةِ الْعِدَّةِ فِی الْخُلْعِ وَالْمُبَارَاَةِ وَالطَّلَاقِ بِمَالٍ اِلَّا بِالشَّرْطِ فِی قَوْلِهِمْ۔

ترجمہ: ''خلع، مبارات (شوہر کا بیوی سے یہ کہنا کہ میں تجھ سے بری ہوا) اور مال کے عوض

طلاق کی صورت میں شوہر عدت کے نفقے سے بری نہیں ہوگا، سوائے اس صورت کے کہ دونوں نے آپس میں طے کرلیا ہو کہ زمانہ عدت کے نفقے سے بری ہوگا''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:489)

حقِ پرورش کے استحقاق کے لئے عمر کا تعین

سوال:

میری شادی 1996ء میں ہوئی اور ایک بیٹا 1997ء میں ہوا، جس کا نام اریب احمد ہے۔ 1997ء میں ہی اُس خاتون سے بذریعہ خلع علیحدگی ہوگئی، بیٹا اُس نے میرے پاس ہی چھوڑ دیا، تب سے اب تک میرے پاس ہی ہے اور اب اُس کی عمر 13 سال ہے۔ اُس کی ماں کا اُس وقت سے اب تک کچھ پتا نہیں ہے اور نہ ہی اُس نے کوئی رابطہ کیا ہے۔ اسلامی قوانین کے تحت مجھے بتائیں کہ میرے بیٹے کی کفالت و پرورش کا حق مجھے حاصل ہے؟۔ (گلزار احمد، بلاک 2 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

آپ کے بیٹے کی پرورش ونگہداشت کا حق سات سال تک یا جب تک وہ ضروری بشری امور میں دوسروں کا محتاج ہوتا ہے، اس کی ماں کا تھا۔ اسے فقہ اسلامی میں ''حقِ حضانت'' کہتے ہیں اور انگریزی میں Custody یا Bringing up یا Guardianship کہتے ہیں۔ چونکہ اُس کی والدہ یعنی آپ کی سابقہ بیوی خود ہی اپنے حق سے دست بردار ہوگئی، نہ بچے کو اپنی نگرانی میں لیا اور نہ ہی اس کا مطالبہ کیا، لہٰذا اب یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔ اب آپ کا بیٹا عمر کی اُس حد سے نکل چکا ہے اور اس کی مالی کفالت بہرصورت آپ ہی کے ذمے تھی، جو آپ نے پوری کی۔ اب اسکی بہتر تعلیم وتربیت کریں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اسے سعادت مند اور صالح بنائے۔ اُس کی ماں کا اتا پتا معلوم کرنا آپ کی ضرورت نہیں ہے، ہاں! کبھی وہ اپنے بیٹے سے ملنا چاہے تو آپ ماں بیٹے کو ملنے کا موقع دیں اور قطع رحمی نہ کریں۔ اور جب آپ کا بیٹا خود کفیل ہو جائے تو اس پر

لازم ہے کہ آپ کی اطاعت کرے اور حتی المقدور اپنی ماں کی بھی خدمت کرے، اگر وہ اس کی خدمت کی محتاج ہو۔ پرورش کرنے والی ماں ہو یا کوئی اور عورت شریعت میں اُس کی مدت لڑکے کے لئے فقہاء کرام نے سات سال بتائی ہے اور آپ کا بیٹا ماشاء اللہ 13 سال کا ہو چکا ہے، اب اس کی تربیت کا حق آپ کو حاصل ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ثُمَّ الْعَصَبَاتُ بِتَرْتِيْبِ الْاِرْثِ، فَيُقَدَّمُ الْاَبُ ثُمَّ الْجَدُّ ثُمَّ الْاَخُ الشَّقِيْقُ، ثُمَّ لِاَبٍ ثُمَّ بَنُوْهُ كَذَالِكَ، ثُمَّ الْعَمُّ۔

ترجمہ: ''پھر عصبہ مرد حضرات وارث ہونے کی ترتیب پر یعنی پہلے باپ، پھر دادا، پھر حقیقی بھائی، پھر باپ کی طرف سے سگا بھائی، پھر بھائی کے بیٹے اس ترتیب پر، پھر چچا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5، ص:212، 213)

خرید وفروخت کے مسائل

تکافل اور انشورنس میں فرق

سوال:

براہ کرم مختصراً یہ بیان فرمادیں کہ تکافل کیا ہے، اس میں اور انشورنس میں بنیادی طور پر کیا فرق ہے جس کی بنا پر انشورنس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ نیز تکافل کے کام کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ کیا یہ اسلامی شرعی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں؟۔ یہ بھی بیان کیجئے کہ آپ کو حاصل تمام معلومات کی روشنی میں کیا داؤد فیملی تکافل کے ساتھ تکافل کا معاملہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی بیان کیجئے کہ اس سے حاصل ہونے والی رقم سے حج یا عمرہ بھی کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

جواب:

تکافل کا نظریہ اسلام کے ''عاقلہ'' کے نظریے سے ماخوذ ہے اور یہ نظریہ اسلام سے پہلے عرب کے قبائلی نظام پر قائم معاشرے میں موجود تھا اور اسلام نے اسے جاری رکھا۔ وہ یہ کہ اگر کسی قبیلے کا کوئی فرد کسی دوسرے قبیلے کے فرد کو خطاءً قتل کردیتا، تو اس (قتل خطا) کی دیت قاتل کے قبیلے کے عصبہ وارثوں پر عائد ہوتی۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: ''معاقل، معقلہ کی جمع ہے اور یہ دِیت (Blood Money) کے معنی میں ہے اور اسے ''عَقل'' کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ خوں ریزی کو روکتی ہے اور ''عقل'' بھی اِسی معنی میں ہے، کیونکہ عقل (سلیم) انسان کو ایسے امور سے روکتی ہے، جو اس کے لیے نقصان دہ ہوں۔ اور ''عاقلہ'' اہل دیوان کو کہتے ہیں اور وہ لشکر کے لوگ ہیں۔ اور امام شافعی کے نزدیک یہ قبیلے والے ہیں، یعنی جو اس کی اصل (یا نسب) سے ہیں، تو اُن پر قتل کے نتیجے میں عائد ہونے والی پوری دیت واجب ہوگی۔۔۔ اس کے بعد اس کی تفصیلی احکام بیان کئے گئے ہیں۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''اھل الدیوان''، دیوان سے مراد وہ رجسٹر ہے، جس میں ایسے لوگوں کا اندراج ہو اور روایت ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر

فاروق رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے یہ رجسٹر مرتب کیے، یعنی والیوں اور قاضیوں کے لیے مرتب کیے اور کہا جاتا تھا کہ فلاں اہل دیوان میں سے ہے، یعنی اس کا نام اس رجسٹر میں درج ہے، ''غرر الافکار'' میں فرمایا: اگر وہ مجاہد (غازی) ہے، تو اس کی عاقلہ وہ لوگ ہیں، جن کی کفالت ''دیوانُ الغزاۃ'' (مجاہدین کے دفتر یا مرکز) سے ہوتی ہے۔ اور اگر وہ ''کاتب'' ہے، تو اس کی عاقلہ دیوان ''دیوان الکتاب'' ہے، اسے آج کل سیکریٹریٹ کہتے ہیں۔ عاقلہ ایک شہر (یعنی کسی قصبے یا دیہات) کے باشندے بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔
علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''میں کہتا ہوں اور ''ہدایہ'' میں ہے: ایک بستی والے دوسری بستی والوں کی دِیت ادا نہیں کریں گے، جبکہ ہر بستی کا ''دیوان'' الگ الگ ہو''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 10، ص: 66-265)

موجودہ دور میں ہم ''اہل دیوان'' کا اطلاق مختلف پیشہ ورانہ تنظیموں پر بھی کر سکتے ہیں، جیسے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی ہے، اس میں جو ڈرائیور کام کرتے ہیں، وہ سب اور کمپنی ماہانہ کچھ رقم ایک ''اجتماعی کفالتی فنڈ'' میں جمع کریں۔ اگر خدانخواستہ بشری غلطی سے کسی ڈرائیور سے حادثہ ہو جائے اور وہ خود زخمی ہو جائے تو اس کے علاج کے مصارف اس فنڈ سے ادا کیے جائیں یا اُس کی گاڑی کی ٹکر سے کسی کی موت واقع ہو جائے، تو اس ''قتل خطا'' کی دیت اُس فنڈ سے ادا کی جائے۔

الغرض اسلام میں ایک اجتماعی کفالتی نظام کا نظریہ موجود ہے۔ اور ''اسلامی تکافل'' اسی اصول پر قائم ہے۔ اور اسی نظریے کے تحت پالیسی ہولڈر کے پریمیم (قسط) میں سے ایک حصہ اُس کے نام پر مضاربت کے اصول پر سرمایہ کاری کے ''پول فنڈ'' میں جمع ہوتا ہے، جو ''شراکت دار کا سرمایہ کاری فنڈ'' یعنی Participant investment Fund (PIF) کہلاتا ہے اور ایک حصہ ''وقف فنڈ'' میں جاتا ہے اور وقف کے فنڈ کا سرمایہ بھی مضاربت کے اصولوں پر سرمایہ کاری میں لگایا جاتا ہے اور اسی فنڈ سے ضرورت کے موقع پر شراکت دار کی کفالت کی جاتی ہے۔ اور اس کے قواعد وضوابط طے شدہ اور

SECP سے منظور شدہ ہیں اور یہ سارا نظام شریعت کے مطابق (Sharia'h Complaint) ہے۔

اسی طرح اسلام میں کسی مشکل یا ناگہانی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے منصوبہ بندی (Planning) کا تصور بھی موجود ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ''تعبیر رؤیا (خوابوں کی تعبیر)'' کا علم عطا فرمایا تھا۔ انہیں جھوٹے الزام میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہاں اُن کے جیل کے دو ساتھیوں نے خواب دیکھے اور آپ نے ان کو تعبیر بتائی۔ اُن کی تعبیر کے عین مطابق ایک ساتھی بادشاہ کے دربار میں پہنچا اور ساقی (Butler) بن گیا۔

اس دوران بادشاہ نے دو خواب دیکھے، جو یہ تھے: ''بادشاہ نے کہا: میں نے سات فربہ گائیں دیکھی ہیں، جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور (میں نے) سات سرسبز خوشے دیکھے اور دوسرے (سات) سوکھے ہوئے (خوشے دیکھے)، اے میرے درباریو! میرے اس خواب کی تعبیر بتاؤ، اگر تم خواب کی تعبیر بتا سکتے ہو، انہوں نے کہا: یہ تو پریشان خواب ہیں اور ہم خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔ اور ان دو قیدیوں میں سے جو قید سے رہائی پا چکا تھا، اُس نے ایک مدت کے بعد یوسف کو یاد کیا (اور کہا:) میں تم کو اس خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں، مجھے (یوسف کے پاس) بھیج دو، (یوسف:45-43)''۔

چنانچہ وہ قید خانے میں گیا اور یوسف علیہ السلام سے اِن خوابوں کو بیان کیا اور ان کی تعبیر پوچھی۔ یوسف علیہ السلام نے یہ تعبیر بتائی:

''یوسف نے کہا: تم سات سال لگاتار فصل کاشت کرو گے، پھر تم جو فصل کاٹو، تو اسے اس کے خوشوں میں چھوڑ دینا، ماسوا اس قلیل (مقدار) کے جس کو تم کھاؤ۔ پھر اس کے بعد سات سال سخت (یعنی قحط سالی کے) آئیں گے، وہ اس غلے کو کھا جائیں گے، جو تم نے پہلے جمع کر رکھا تھا، ماسوا تھوڑے سے غلے کے، جس کو تم محفوظ رکھو گے، (یوسف:48)''۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں آنے والے مشکل حالات سے عہدہ برا

ہونے کے لیے منصوبہ بندی کا مشورہ دیا۔ اور جب آپ پر لگایا گیا الزام غلط ثابت ہو گیا اور آپ کے پاکیزہ کردار کو تسلیم کر لیا گیا، تو آپ پورے وقار کے ساتھ شاہِ مصر کی دعوت پر دربار میں گئے اور آپ نے فرمایا: ''مجھے زمین کے خزانوں کا نگراں مقرر کر دیجئے، میں حفیظ وعلیم ہوں (یعنی قومی امانتوں کی حفاظت کا اہل ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کس سے لیا جائے اور کس کو دیا جائے)، (یوسف:55)''۔

اِن تعارفی کلمات سے آپ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ اسلام میں ''نظریہ تکافل'' کا تصور ہمیشہ سے موجود رہا ہے، لیکن موجودہ دور میں نہ تو قبائلی نظام ہے، نہ ہی عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور عہد خلافت راشدہ کی طرح اسلامی ریاست کا ایسا بیت المال ہے جو کسی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ہر ہر شہری کی مدد کرے اور نہ ہی خاندانی نظام اِس قدر مربوط اور منظم ہے کہ کسی مشکل صورتِ حال یا ضرورت کے موقع پر ایک دوسرے کی مدد کو پہنچیں یا کفالت کی ذمہ داری قبول کریں۔

اِس لیے اب اِس کے لیے باقاعدہ منظم قانونی ادارے وجود میں آچکے ہیں اور وہ ملکی قانون کے تحت قائم ہیں، ریاستی نظام میں Security & Exchanges Commission of Pakistan (SECP) کی صورت میں اِن اداروں کو قانون کے تابع رکھنے کے لیے ایک نگراں اور Regulatory ادارہ موجود ہے۔ چند سالوں سے اسلامی تکافل پر مبنی ادارے باقاعدگی سے کام کر رہے ہیں اور یہ کام کاروباری بنیاد پر ہو رہا ہے، کیونکہ اتنے بڑے کام رضا کارانہ بنیاد پر نہیں ہو سکتے۔

تکافل کو سمجھنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ انشورنس کیا ہے؟

انشورنس بنیادی طور پر خرید وفروخت کا عقد (عقد معاوضہ) ہے، کیوں کہ اس میں مشتری (خریدار) اپنی رقم (ثمن) اس لئے دیتا ہے کہ بائع (بیچنے والا) اس کے معاوضے میں اس کو کم یا زیادہ مبیع (رقم) دے۔ یہاں بائع سے مراد انشورنس پالیسی کا خریدار (policy holder/ insured person) ہے، ثمن سے مراد

انشورنس پالیسی کی قیمت (premium) ہے، مشتری سے مراد انشورنس پالیسی کا فروخت کنندہ (insurer/insurance company) ہے اور مبیع (subject matter) سے مراد (insurance policy) ہے۔ گویا انشورڈ (پالیسی ہولڈر) اپنی کم رقم (پریمیم) کے بدلے میں انشورر (انشورنس کمپنی) سے ایک غیر یقینی واقعے مثلاً (جنرل انشورنس کی صورت میں) حادثہ یا (لائف انشورنس کی صورت میں) طبعی یا حادثاتی موت، مستقل معذوری وغیرہ کے رونما ہونے کی صورت میں زیادہ رقم (کلیم کی وصولی) کے خریدنے کا عقد کرتا ہے، یا غیر یقینی واقعہ کے رونما نہ ہونے کی صورت میں پریمیم سے دست بردار ہونے کا عقد کرتا ہے۔ اِن تمام صورتوں میں کم رقم کے ذریعے زیادہ رقم خریدی جارہی ہے جو کہ سود ہے، نیز کلیم (Claim) واقع ہونے کی صورت میں ادائیگی سے زیادہ رقم کی وصولی ہورہی ہے اور کلیم واقع نہ ہونے کی صورت میں اپنی رقم سے ہاتھ دھونا پڑرہا ہے اور یہ صراحتاً جوا، مَیْسِر اور قمار ہے، جبکہ مذکورہ سبب جس کی وجہ سے زیادہ رقم کے ملنے یا اپنی رقم سے ہاتھ دھونے کا اندیشہ ہے، مکمل طور پر غیر یقینی (غَرر) ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ وہ غرر (Uncertainity) جو کسی خرید وفروخت کے معاہدہ (عقد معاوضہ) میں واقع ہو، اور وہ غرر فاحش ہے، اس بنا پر یہ عقد ناجائز قرار پاتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انشورنس دراصل ایک عقد معاوضہ ہے اور عقد معاوضہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ غیر شرعی عناصر سے پاک ہو، لیکن جب انشورنس کا بنظر غائر جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں ربا (Usury/interest)، غَرر (uncertainty) مَیْسِر (gambling) اور بیع الکالی بالکالی (مبیع اور ثمن دونوں کا ادھار ہونا) جیسے غیر شرعی عناصر پائے جاتے ہیں، اس بنا پر علماء کرام کی اکثریت نے انشورنس کو ناجائز قرار دیا ہے۔

بیمہ کے موجودہ نظام کے شرعی مفاسد:

(۱) بیمہ کمپنی اپنے جمع شدہ سرمایہ کو گردش میں رکھنے کے لئے دوسرے صنعتی وتجارتی اداروں کو سود پر قرض فراہم کرتی ہے اور سود حرامِ قطعی ہے۔ اس طرح بیمہ کرانے والا بالواسطہ

سودی معاملے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(۲) بیمہ کرانے والے کو اگر قرض لینا ہو تو بیمہ کمپنی اس کو بھی سود پر قرض دیتی ہے۔

(۳) بیمہ کرانے والا اگر دو یا تین قسطیں دینے کے بعد باقی اقساط ادا نہ کرے تو اس کی رقم اس کو واپس نہیں دی جاتی، جو کہ ظلم اور ناجائز عمل ہے۔

(۴) بیمہ کمپنی مدت پوری ہونے کے بعد بیمہ کرانے والے کو اس کی اصل رقم سود سمیت لوٹاتی ہے، سود لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔

(۵) مدت پوری ہونے سے پہلے اگر کوئی شخص طبعی موت مر جائے یا کسی حادثہ میں ہلاک ہو جائے تو اس کو پہلی صورت میں پوری مدت کی رقم اور دوسری صورت میں دگنی رقم دی جاتی ہے، اب اس کو اس کی جمع شدہ اقساط سے زائد رقم جو دی جاتی ہے، اس کو اگر شرط لازم قرار دیا جائے (جیسا کہ عملاً اسی طرح ہے) تو یہ عقد صحیح نہیں ہے اور اگر اس کو تبرّع اور احسان قرار دیا جائے تو یہ واقع کے خلاف ہے۔

(۶) زندگی کا بیمہ کرانے والا اپنے کسی وارث کے نام بیمہ کی رقم نامزد کر دیتا ہے اور وہ رقم مرنے کے بعد اس وارث کو ملتی ہے اور یہ نامزدگی وصیت ہے اور اسلام میں وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وُرثاء کے حصص مقرر کر دیئے ہیں اور امام دارقطنی حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ "وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے"۔

اس کے برعکس اسلامی تکافل میں نامزد شخص (Nominee) متوفّٰی کے تمام شرعی وارثوں کے نمائندے کی حیثیت سے کمپنی سے رقم وصول کرتا ہے اور یہ اس کی شرعی، قانونی اور اخلاقی ذمے داری ہوتی ہے کہ اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق تمام ورثاء کو ان کے حصے کی رقم پہنچائے۔

اسلام چوں کہ قیامت تک مسلمانوں کے لئے ضابطۂ حیات ہے اور ہمیشہ کے لئے قابل عمل ہے، اس لئے اسلامی شریعت کے ماہرین اور علماء پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ صرف

حرام قرار دے کر نفس مسئلہ سے پہلوتہی نہ کریں بلکہ ممکنہ حد تک اس کا متبادل بھی پیش کریں تاکہ امت کی اکثریت کو حرام سے بچا کر جائز اور حلال کاموں اور کاروبار کی طرف راغب کیا جاسکے۔

تکافل کے عمل کے ذریعے ناگہانی نقصان اٹھانے والے تاجر اور دیگر حضرات کی مدد کی جاتی ہے اور شریک کے نقصان کے بوجھ کو تمام شرکاء پر اس طرح تقسیم کردیا جاتا ہے کہ ہر فرد ایک خفیف سی قربانی دے کر تمام شرکاء کے لئے مالی تحفظ فراہم کرتا ہے، یہ مقصد قرآن وسنّت کی تعلیمات کے مطابق ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (۱) وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

ترجمہ: ''نیکی اور خداخوفی میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور سرکشی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔

(۲) وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اور جو کچھ بھی ان کو دیا جائے وہ اپنے دلوں میں اس کی کوئی حاجت محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ، ان کو خود سخت ضرورت ہو اور جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچالئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں، (الحشر:9)''۔

احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ ،عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَنَا اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ، فَمَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ وَلَمْ يَتْرُكْ وَفَاءً فَعَلَيْنَا قَضَاؤُهٗ، وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں پر اُن کے نفوس سے زیادہ میرا حق ہے، سو جو شخص قرض چھوڑ کر مرا اور اس کو ادا کرنے کے لئے اس کے پاس مال نہیں تھا، تو اس قرض کو ادا کرنا ہم (یعنی اسلامی ریاست) پر لازم ہے

اور جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ اس کے وارثوں کا ہے، (صحیح بخاری:6731)"۔

(۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَنَا اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ، فَمَنْ مَاتَ وَتَرَكَ مَالًا فَمَالُهٗ لِمَوَالِی الْعَصَبَةِ، وَمَنْ تَرَكَ كَلًّا اَوْ ضِیَاعًا فَاَنَا وَلِیُّهٗ، فَلِاُدْعٰی لَهٗ۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں پر اُن کے نفوس سے زیادہ میرا حق ہے، سو جو شخص مال چھوڑ کر مرے گا، وہ مال اس کے وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا اور جو شخص نادار یتیم بچے اور نقصان چھوڑ کر مرا تو اس کا ولی میں ہوں اس کے لئے مجھے بلایا جائے، (صحیح بخاری:6745)"۔

امام بخاری ایک طویل حدیث حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد سے فرمایا:

(۳) اِنَّكَ اَنْ تَدَعَ وَرَثَتَكَ اَغْنِیَاءَ، خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَدَعَهُمْ عَالَةً یَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ فِیْ اَیْدِیْهِمْ۔

ترجمہ: "اگر تم نے اپنے ورثاء کو خوشحال چھوڑا، تو یہ اُس سے بہتر ہے کہ تم ان کو تنگ دست چھوڑ دو اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے رہیں، (صحیح بخاری:2742)"۔

تکافل کا جائزہ:

اب جبکہ تکافل کو انشورنس کے متبادل کے طور پر پیش کیا گیا ہے تو ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کے کام کرنے کے طریقہ کار کو سمجھا جائے۔ تکافل کمپنی کے کام کرنے کا طریقہ کار حسب ذیل ہے:

۱۔ سب سے پہلے صاحبانِ حصص (Share Holders) شراکت داری کے اصولوں کے تحت ایک تکافل کمپنی قائم کرتے ہیں جس میں ہر شریک (Sharehoder/Partner) ایک طے شدہ تناسب سے اپنا سرمایہ ملاتا ہے، اس سرمایہ کو Paid up capital یا ابتدائی "رأس المال" کہا جاتا ہے۔ اس کمپنی کے اصول و قواعد تحریر کئے جاتے ہیں، اس

کے کام کرنے کا طریقہ کار وغیرہ طے کیا جاتا ہے اور متعلقہ ادارے ایس ای سی پی (Securiteis & Exchange Commission of Pakistan) سے اس کو منظور بھی کروایا جاتا ہے تاکہ کمپنی قانونی طور پر وجود میں آجائے۔اس کمپنی کی حیثیت شخص معنوی یا شخص قانونی (Legal Entity) کی ہوتی ہے۔ابتدائی راس المال سے جو فنڈ بنایا جاتا ہے اس کو Share Holders Fund (SHF) کہا جاتا ہے اور اس کی ملکیت صاحبانِ حصص کے پاس ہی رہتی ہے۔

۲-اس کے بعد اسلامی فقہ خصوصاً اسلامی فقہ مالی پر دسترس رکھنے والے کم از کم تین علماء و اسکالرز پر مشتمل ایک شریعہ بورڈ قائم کیا جاتا ہے۔ یہ شریعہ بورڈ کمپنی کے قیام سے لے کر اس کے تمام مالی معاملات کی انجام پذیری کے ہر مرحلے پر نہ صرف شرعی رہنمائی فراہم کرتا ہے بلکہ اس کے تمام معاملات کی باضابطہ نگرانی بھی کرتا رہتا ہے تاکہ غیر شرعی امور سے اجتناب کیا جاسکے۔

۳-شریعہ بورڈ وقف کے شرعی اصولوں کے تحت ایک دستاویز تیار کرتا ہے،جس میں واقف، متولی،موقوف علیہم،مالِ موقوف،مصارفِ وقف،آمدن وقف وغیرہ سے متعلق قواعد وضوابط تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ سب سے اہم دستاویز ہوتی ہے اور یہی وہ بنیادی دستاویز ہے جو تکافل کو انشورنس سے نہ صرف ممتاز کرتی ہے بلکہ اس کے طریقہ کار کو اسلامی شرعی اصولوں سے بھی ہم آہنگ کرتی ہے۔

۴-اس کے بعد صاحبان حصص (Share Holders)،ایک مخصوص رقم سے اصل وقف قائم کرتے ہیں اور اس کا منافع ''موقوف علیہم'' پر تصدق کر دیتے ہیں،اس طرح وہ رقم ان کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔یہاں پر یہ بات ضروری ہے کہ اصل وقف قائم کرنے کے لئے جو رقم مختص کی جاتی ہے،اس سے ایسی غیر منقولہ جائیداد خریدی جائے،جس سے منافع حاصل ہوتا رہے اور تبرع کی صورت میں دیے جانے والے عطیات سے اس کی آمدن میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔واضح رہے کہ یہ مشروط

وقف (Conditional Waqf) ہوتا ہے اور صرف طے شدہ شرائط کے تحت عطیہ دہندگان ہی اس کے موقوف علیہم (Beneficiaries) ہو سکتے ہیں۔ یہ وقف ''موقوف علیہم'' کے مستقبل کے اُن نقصانات کی تلافی کرتا ہے، جن کا ان عطیات دہندگان سے وعدہ کیا ہے، یہ سب شرائط وقف نامہ میں تحریر ہوتی ہیں۔ اس وقف کو Participant Takaful Fund (PTF) کہا جاتا ہے اور یہ ''مِلکِ لِلّٰہ'' ہوتا ہے۔

۵- تکافل کمپنی کا انتظامی سربراہ (سی ای او) اس کا چیف متولی ہوتا ہے، جو وثیقۂ وقف کے تحت تمام امور انجام دیتا ہے۔ کمپنی کا سربراہ کمپنی کے کاموں کی انجام دہی کے لئے ایسے افراد کا تقرر کرتا ہے جو اس کی نگرانی میں وقف کے قواعد وضوابط کے مطابق کام کرتے ہیں۔

۶- جو افراد یا ادارے مخصوص شرائط کے تحت اس تکافل وقف فنڈ میں عطیات (Contributions) دیتے ہیں، وہ اس وقف فنڈ کے ''موقوف علیہم'' بن جاتے ہیں۔ جب وہ وقف فنڈ میں عطیہ دیتے ہیں، تو اُن کی حیثیت عطیہ دہندگان (Donars/Contributors) کی ہوتی ہے۔ عطیات ان کی ملکیت سے نکل کر وقف کی آمدن میں شامل ہو جاتے ہیں، جبکہ عطیات (Contributions) دینے کے بعد وہ ''موقوف علیہم'' بن جاتے ہیں۔ اور وہ ضرورت کے وقت وقف فنڈ سے منفعت حاصل کرنے کے حق دار بن جاتے ہیں۔

۷- وقف نامہ میں دیے گئے اختیارات کے تحت تکافل کمپنی شرعی تقاضوں کے مطابق شریعہ بورڈ کی رہنمائی میں تبرع اور مضاربت کی بنیاد پر ایسے مالی عقود تیار کرتی ہے، جو افراد یا اداروں کی مستقبل کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ ان کو کاروباری اصطلاح میں مصنوعات (Products) کہا جاتا ہے، جن کی شریعہ بورڈ منظوری دیتا ہے اور ان کے شریعت کے مطابق ہونے کی سند (Shariah Compliant Certificate) جاری کرتا ہے۔ اس کے بعد متعلقہ حکومتی ادارے سے بھی اس کی منظوری لی جاتی ہے، تاکہ شرعی اور قانونی تقاضوں کی تکمیل ہو جائے۔

۸- اس کے بعد وہ پروڈکٹ (Product) عوام الناس کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

جب کوئی فرد یا ادارہ اس کو حاصل کرتا ہے، تو وہ جو عطیہ دیتا ہے، وہ وقف فنڈ میں چلا جاتا ہے۔ شخصی فیملی تکافل میں وقف فنڈ کے علاوہ ایک اور فنڈ بھی ہوتا ہے جو شرعی مضاربت کے اصولوں پر کام کرتا ہے، اس دوسرے فنڈ کو Participant Investment Fund (PIF) کہا جاتا ہے۔ اس میں جو رقم دی جاتی ہے اس کی ملکیت عطیہ دہندگان کے پاس ہی رہتی ہے۔ کمپنی مضارِب کی حیثیت سے اس رقم سے شریعت کے مطابق کاروبار کرتی ہے اور طے شدہ طریقہ کار کے مطابق شرکاء کا حصہ ان کے کھاتے میں جمع ہوتا رہتا ہے۔

انشورنس اور تکافل کمپنی میں یہی سب سے بڑا فرق ہے کہ انشورنس کمپنی میں حاصل ہونے والا پریمیم براہ راست انشورنس کمپنی کی ملکیت میں چلا جاتا ہے، جس کی وجہ سے یہ عقد معاوضہ بن جاتا ہے اور چوں کہ انشورنس میں عقد معاوضہ کی شرائط کا خیال نہیں رکھا جاتا، اس کی وجہ سے اس میں شرعی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، جو اس عقد (انشورنس) کو ناجائز کردیتی ہیں۔ اسی بنا پر اسلام میں انشورنس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور تکافل کو اس کے متبادل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے امور سے معلوم ہوتا ہے کہ: انشورنس کا عقد چوں کہ غیر شرعی عناصر کی وجہ سے ناجائز ہے لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔ جبکہ تکافل شرعی طریقہ کار کی وجہ سے جائز ہے، لہٰذا اس میں شمولیت بھی جائز ہے۔ ہم نے داؤد فیملی تکافل لمیٹڈ کے نظام اور طریقۂ کار کا مطالعہ کیا اور اِسے خلافِ شرع اُمور سے مُبرّا پایا، اِسی طرح اِس کی مصنوعات کا بھی ہم نے جائزہ لیا اور اُنہیں شریعت کے مطابق پایا۔ اور جیّد مُفتیانِ کرام پر مشتمل اس شریعہ بورڈ اِس کے جملہ اُمور کی نگرانی بھی کر رہا ہے اور یہ ادارہ اِس امر کا پابند ہے کہ اپنی تمام مصنوعات اور مالی معاملات کی شریعہ بورڈ سے توثیق کرائے۔ لہٰذا ہم قرار دیتے ہیں کہ داؤد فیملی تکافل کی پالیسی لینا جائز ہے۔ اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال اور جائز ہے، جس سے تمام شرعی امور بشمول حج وعمرہ بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔

مرمت کی اشیاء کا حکم

سوال:

ہم بیگ کی ریپیئرنگ کا کام کرتے ہیں، کسی بیگ کی قیمت 500یا800 یا 1500 روپے ہوتی ہے، اُس میں ہماری مزدوری 150 یا250 یا400روپے ہوتی ہے، لوگ مہینوں اپنے بیگ واپس نہیں لے جاتے جبکہ ہم نے دکان پر نوٹس بورڈ پر لکھا ہوا ہے: ''15 دن بعد دکاندار کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے''۔گاہک دودو، چھ چھ مہینے بعد بھی آتے ہیں اور کبھی آتے ہی نہیں ہیں۔ایسی صورت میں کیا ہم اُن کے بیگ فروخت کر کے اپنی مزدوری وصول کرنے کے بعد بقیہ رقم خیرات کر سکتے ہیں؟۔(محمد خالد، سیکٹر 3، نارتھ کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مرمت (Repairing) کے لئے آنے والے بیگ آپ کے پاس لوگوں کی امانت ہیں۔لوگوں کی اطلاع کے لئے آپ نے دکان پر جو نوٹس آویزاں کیا ہے، یہ بہتر ہے، لیکن عموماً ہر شخص اِس جانب متوجہ نہیں ہوتا یا لوگ سرسری طور پر دیکھ کر صرفِ نظر کر دیتے ہیں۔لہٰذا ضروری ہے کہ گاہکوں کو شروع میں باقاعدہ اس سے آگاہ کیا جائے تاکہ اُنہیں معلوم ہو جائے۔ چیزوں کی مرمت کا کام ''عقدِ اجارہ'' ہے اور اجارہ میں اَجیر اپنی محنت کرنے کے بعد اُجرت کا حق دار بنتا ہے، لیکن اُجرت پیشگی (Advance) بھی لی جاسکتی ہے، جیسے آج کل مکانات کا کرایہ پیشگی یعنی مہینے کے شروع میں لے لیا جاتا ہے۔گاہک کی چیز کی حفاظت آپ کی ذمہ داری ہے اور آپ کی طرف سے کسی غفلت یا تعدّی کے بغیر وہ چیز چوری ہو جائے تو آپ پر تاوان نہیں ہے۔آپ کو ایک سال تک گاہک کا انتظار کرنا ہوگا اور اگر ایک سال تک وہ نہ آئے تو آپ اُسے بیچ کر اپنی اُجرت وضع کر سکتے ہیں اور باقی رقم مالک یا اُس کا وارث تلاش کر کے اُسے دے دیں اور اگر اس کا کوئی اَتا پتا نہ ملے تو اس کے نام پر ثواب کی نیت سے صدقہ کر دیں۔

ویزے کی خرید وفروخت

سوال:

زید نے سعودی عرب سے ویزا دو لاکھ روپے پاکستانی کرنسی کے مطابق خریدا، وہ ویزوں کا کاروبار کرتا ہے، اُس نے وہ ویزا بکر کو تین لاکھ روپے میں بیچ دیا۔ زید کا ایسا منافع لینا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟۔ (قاری محمد ادریس، کالج روڈ، ڈسکہ، سیالکوٹ)

جواب:

ویزا اگر کسی خاص شخص کے نام پر جاری ہوا ہے، تو اس کے استعمال کرنے کا حق اُسی کو حاصل ہے، اس میں رَدوبدل کرنا شرعاً وقانوناً ناجائز ہے البتہ جو شخص ویزوں کا کاروبار کرتا ہے اور وہ ویزے جاب کے حوالے سے ہوتے ہیں، مثلاً انجینئر، اکاؤنٹنٹ، ڈاکٹر، الیکٹریشن، معمار، مزدور وغیرہ کہ جو اُس کا حامل (Bearer) ہو، وہ اس پر سعودی عرب کے سفارتخانے یا قونصل خانے سے اپنے پاسپورٹ پر ویزا لگوا سکتا ہے، تو ویزا خریدنے والا جسے چاہے، اُسے فروخت کرسکتا ہے، کیونکہ آپ نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ شخص ویزوں کا کاروبار کرتا ہے۔ بعض صورتوں میں ویزا جاری کرنے والا ادارہ اپنے ریکروٹمنٹ ایجنٹ کو مختلف کاموں (Jobs) کے مفت ویزے جاری کرتا ہے اور وہ انہیں کمیشن بھی دیتا ہے، تو اس صورت میں انہیں لوگوں سے مزید رقم نہیں لینی چاہئے۔ الغرض یہ ویزا جاری کرنے والے اور ویزا حاصل کرنے والے فرد یا ادارے کی معاہدے کی شرائط پر منحصر ہے۔ یہ حقوق کی بیع ہے، جو آج کل رائج ہے اور اگر یہ کاروباری بنیاد پر ہے تو وہ شخص اس پر نفع لے سکتا ہے، کاروبار نفع ہی کے لئے ہوتا ہے، نفع کا مدار طلب اور رَسد پر ہوتا ہے، لیکن نفع منصفانہ ہو تو اچھا ہے، لوگوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔

حقِ شُفعہ کی شرعی حیثیت

سوال:

میں بچپن سے بزرگوں سے سنتا آرہا ہوں کہ ''وہ حقِ شُفع کا دعویدار ہے''، میں اِس کے معنی ومفہوم سے آج تک نابلد ہوں۔

(۱) شرع میں اس کے کیا معنیٰ ومفہوم ہیں؟۔ (۲) یہ کب، کہاں اور کس کے حق میں استعمال ہوتا ہے؟۔ (۳) اس کے دعویدار کو کیا کیا فائدہ پہنچتا ہے اور مقابل پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟۔ (۴) مُروّجہ پاکستانی قوانین میں اس کے متعلق کیا کچھ ہے؟۔

(جلیل احمد، F.B ایریا، کراچی)

جواب:

غیر منقول جائیداد کو کسی شخص نے جتنی رقم کے عوض خریدا، اُتنے ہی میں اُس جائیداد کے مالک ہونے کا حق جس دوسرے شخص کو حاصل ہوجاتا ہے، اُسے شریعت کی اصطلاح میں ''شفیع'' اور اُس حق کو ''حقِ شُفعہ'' کہتے ہیں۔

شُفعہ کا حق غیر منقولہ جائیداد (Immovable Property) میں ہوتا ہے، یعنی جب کوئی شخص اپنی ملکیتی زمین کو فروخت کرنا چاہے، تو پہلے اپنے شفیع (Preemptor/Intercessor) کو پیشکش کرے کہ آیا وہ اِسے خریدنا چاہتا ہے، اگر وہ خریدنا چاہتا ہے، تو بازاری قیمت یا طے شدہ قیمت پر اُسے دیدے، یعنی اُس کا حق کسی بھی دوسرے خریدار پر مُقدّم ہے۔

اگر زمین کا مالک اُسے (شفیع) کو نظر انداز کر کے یا اُس کی لاعلمی میں کسی اور شخص پر اپنی زمین فروخت کرتا ہے، تو اُسی قیمت پر شفیع کو اُس زمین کے لینے کا جبری (Bounden/Compulsory/Obligatory) حق حاصل ہے، یعنی بائع (Seller) کی مرضی کے برعکس وہ اِسے خرید لے گا اور دوسرے خریدار کی بیع کالعدم ہوجائے گی۔ تفصیلی دلائل درجِ ذیل ہیں:

علامہ بدرالدین ابومحمد محمود بن احمد العینی لکھتے ہیں: وَقِيْلَ: هِيَ تَمَلُّكُ الْعَقَارِ عَلٰى مُشْتَرِيْهِ جَبْرًا بِمِثْلِ ثَمَنِهٖ، وَقَالَ أَصْحَابُنَا: اَلشُّفْعَةُ تَمَلُّكُ الْبُقْعَةِ جَبْرًا عَلَى الْمُشْتَرِيْ بِمَا قَامَ عَلَيْهِ، وَقِيْلَ: هِيَ ضَمُّ بُقْعَةٍ مُشْتَرَاةٍ إِلٰى عَقَارِ الشَّفِيْعِ بِسَبَبِ الشَّرِكَةِ أَوِ الْجِوَارِ، وَهٰذَا أَحْسَنُ،

ترجمہ: ''ایک قول کے مطابق کسی مشتری نے جو زمین خریدی ہے، اُسی قیمت پر پڑوسی کو جبراً مالک بننے کا جو حق حاصل ہوتا ہے، اُسے شفعہ کہتے ہیں۔ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ خریدار کو اس کا معاوضہ دے کر اس کی خریدی ہوئی زمین پر جبراً ملکیت کے حق کو شفعہ کہتے ہیں۔ ایک تعریف (یوں کی جاتی) ہے: کہ شرکت یا پڑوس کی بنا پر خریدی ہوئی زمین کے ٹکڑے کو شفیع کا اپنی زمین کے ساتھ ملانا اور یہ (تعریف) زیادہ اچھی ہے''۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد 12، ص: 101، دارالکتب علمیہ، بیروت)

شفعہ کی تعریف میں تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے: وَشَرْعًا: تَمْلِيْكُ الْبُقْعَةِ جَبْرًا عَلَى الْمُشْتَرِيْ بِمَا قَامَ عَلَيْهِ بِمِثْلِهٖ لَوْمِثْلِيًّا، وَإِلَّا فَبِقِيْمَتِهٖ (وَسَبَبُهَا اِتِّصَالُ مِلْكِ الشَّفِيْعِ بِالْمُشْتَرٰى) بِشَرِكَةٍ أَوْ جِوَارٍ۔

ترجمہ: ''شریعت میں شفعہ کے معنی ہیں: خریدار کو ایک حصہ جس ثمنِ مثلی یا قیمت میں پڑا ہو، اُس حصے کا جبراً کسی کو مالک بنانا ''شفعہ'' ہے اور اِس کا سبب شفیع کی ملک کا خریدی ہوئی چیز کے ساتھ اتصال ہے، خواہ شرکت کی وجہ سے اتصال ہو یا جوار (پڑوس) کی وجہ سے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 262-260)

شُفعہ کب، کہاں اور کیسے حاصل ہوتا ہے: حدیثِ پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيْدِ قَالَ: وَقَفْتُ عَلٰى سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ، فَجَاءَ الْمِسْوَرُ بْنُ مَخْرَمَةَ، فَوَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى إِحْدٰى مَنْكِبَيَّ، إِذْ جَاءَ أَبُوْ رَافِعٍ مَوْلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا سَعْدُ ابْتَعْ مِنِّيْ بَيْتَيَّ فِيْ دَارِكَ، فَقَالَ سَعْدٌ: وَاللّٰهِ مَا أَبْتَاعُهُمَا، فَقَالَ الْمِسْوَرُ: وَاللّٰهِ لَتَبْتَاعَنَّهُمَا، فَقَالَ سَعْدٌ: وَاللّٰهِ لَا أَزِيْدُكَ عَلٰى أَرْبَعَةِ آلَافٍ مُنَجَّمَةٍ، أَوْ مُقَطَّعَةٍ قَالَ

أَبُوْرَافِعٍ: لَقَدْ أُعْطِيْتُ بِهَا خَمْسَمِائَةِ دِيْنَارٍ، وَلَوْلَا أَنِّيْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: اَلْجَارُ أَحَقُّ بِسَقَبِهِ، مَا أَعْطَيْتُكَهَا بِأَرْبَعَةِ آلَافٍ وَأَنَا أُعْطٰى بِهَا خَمْسَمِائَةِ دِيْنَارٍ، فَأَعْطَاهَا إِيَّاهُ۔

ترجمہ:''عمرو بن شرید بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس کھڑا ہوا تھا، اسی اثنا میں حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ آئے، پس انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ایک کندھے پر رکھا، اسی وقت نبی ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ آئے، تو انہوں نے کہا: اے سعد! تم مجھ سے اپنی حویلی کے عوض میرے دو گھر خرید لو، حضرت سعد نے کہا: اللہ کی قسم! میں ان دو گھروں کو نہیں خریدوں گا۔ حضرت مسور بن مخرمہ نے کہا: اللہ کی قسم! تم ان دو گھروں کو ضرور خرید لو، تب حضرت سعد نے کہا: اللہ کی قسم! میں تم کو ان گھروں کے عوض قسط وار چار ہزار درہم سے زیادہ نہیں دوں گا۔ حضرت ابورافع نے کہا: مجھے ان گھروں کے عوض پانچ سو دینار مل رہے ہیں اور اگر میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ پڑوسی اپنے پڑوس کی وجہ سے خریدنے کا زیادہ حق دار ہے، تو میں تم کو یہ چار ہزار درہم کے عوض فروخت نہ کرتا جب کہ مجھے ان کے عوض پانچ سو دینار مل رہے ہیں پھر اُنہوں نے حضرت سعد کو وہ گھر فروخت کر دیئے، (صحیح بخاری:2258)''۔

نوٹ: واضح رہے کہ اس زمانے میں دینار سونے کا ہوتا تھا اور درہم چاندی کا۔

(۲) عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْجَارُ أَحَقُّ بِشُفْعَتِهِ يُنْتَظَرُ بِهِ وَإِنْ كَانَ غَائِبًا إِذَا كَانَ طَرِيْقُهُمَا وَاحِدًا۔

ترجمہ:''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پڑوسی اپنے پڑوس میں شُفعہ کرنے کا زیادہ حق دار ہے، اگر وہ غائب ہو تو اس کا انتظار کیا جائے گا، جبکہ اُن کا راستہ ایک ہو، (سُنن ترمذی:1369)''۔

(۳) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِيْ كُلِّ مَا لَمْ يُقْسَمْ، فَإِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ، وَصُرِفَتِ الطُّرُقُ، فَلَا شُفْعَةَ۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ ہر غیر منقسم (Undivided) چیز میں شُفعہ ہے اور جب حدود واقع ہوگئیں اور راستے تقسیم ہوگئے، تو اب شُفعہ نہیں (یعنی شرکت کی وجہ سے جو شُفعہ تھا، وہ اب نہیں رہا)''۔
(صحیح بخاری:2257)

(۴) عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَضٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِيْ كُلِّ شِرْكَةٍ لَمْ تُقْسَمْ، رَبْعَةٍ أَوْ حَائِطٍ، لَا يَحِلُّ لَهٗ أَنْ يَبِيْعَ حَتّٰى يُؤْذِنَ شَرِيْكَهٗ، فَإِنْ شَاءَ أَخَذَ، وَإِنْ شَاءَ تَرَكَ، فَإِذَا بَاعَ وَلَمْ يُؤْذِنْهُ فَهُوَ أَحَقُّ بِهٖ۔

ترجمہ:''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہر شرکت والے غیر منقسم مکان یا باغ میں رسول اللہ ﷺ نے شُفعہ کا فیصلہ فرمایا، اس کو شریک سے اجازت لئے بغیر فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اگر وہ (شریک) چاہے تو لے لے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے، پھر اگر وہ شریک کو خبر دیئے بغیر فروخت کر دے، تو شریک اُس کا زیادہ حق دار ہے، (صحیح مسلم:4125)''۔

حقِ شُفعہ اتّصال کے سبب حاصل ہوتا ہے اور اتصال میں تین فریق شامل ہیں:
(۱) جس کی عینِ مبیع میں شرکت ہو۔ (۲) شرکت تھی، اب بٹوارا ہوگیا لیکن راستے اور پانی میں شراکت باقی ہے۔ (۳) پڑوسی

علامہ برہان الدین ابوبکر علی بن حسن الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: قَالَ: اَلشُّفْعَةُ وَاجِبَةٌ لِلْخَلِيْطِ فِيْ نَفْسِ الْمَبِيْعِ، ثُمَّ لِلْخَلِيْطِ فِيْ حَقِّ الْمَبِيْعِ، كَالشِّرْبِ وَالطَّرِيْقِ، ثُمَّ لِلْجَارِ، أَفَادَ هٰذَا اللَّفْظُ ثُبُوْتَ حَقِّ الشُّفْعَةِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْ هٰؤُلَاءِ، وَأَفَادَ التَّرْتِيْبَ۔

ترجمہ:''(صاحب ''بدایۃ المبتدی'' نے) فرمایا: نفسِ مبیع میں جو شریک ہے، شُفعہ اُس کیلئے ثابت ہے، پھر جو حقِ مبیع میں شریک ہے، اُسے شُفعہ کا حق حاصل ہے، جیسے پانی کا گھاٹ یا کنواں مشترک ہو، پھر پڑوسی کے لئے، اِس لفظ (ثُمَّ) نے ان میں سے ہر ایک کے لئے حقِ شُفعہ کا فائدہ دیا اور ترتیب کا بھی فائدہ دیا، (ہدایہ، جلد 7، ص:3)''۔ یعنی تینوں کا حقِ شُفعہ مساوی درجے میں نہیں ہے بلکہ اسی ترتیب کے مطابق ہے۔

جس کا عینِ مبیع میں حصہ ہو، اُسے شریک سے تعبیر کیا گیا ہے اور جس کا حقوقِ مبیع میں اشتراک ہو، اُس کو ''خلیط'' اور پڑوسی کو ''شفیع'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں: وَأَمَّا التَّرْتِيْبُ، فَلِقَوْلِهِ عليه السلام: اَلشَّرِيْكُ أَحَقُّ مِنَ الْخَلِيْطِ، وَالْخَلِيْطُ أَحَقُّ مِنَ الشَّفِيْعِ، فَالشَّرِيْكُ فِيْ نَفْسِ الْمَبِيْعِ، وَالْخَلِيْطُ فِيْ حُقُوْقِ الْمَبِيْعِ، وَالشَّفِيْعُ هُوَالْجَارُ، وَلِأَنَّ الْاِتِّصَالَ بِالشَّرِكَةِ فِي الْمَبِيْعِ أَقْوٰى، لِأَنَّهُ فِيْ كُلِّ جُزْءٍ، وَبَعْدَهُ الْاِتِّصَالُ فِي الْحُقُوْقِ، لِأَنَّهُ شِرْكَةٌ فِيْ مَرَافِقِ الْمِلْكِ، وَالتَّرْجِيْحُ يَتَحَقَّقُ بِقُوَّةِ السَّبَبِ، وَلِأَنَّ ضَرَرَ الْقِسْمَةِ إِنْ لَمْ يَصْلُحْ عِلَّةً صَلَحَ مُرَجِّحًا۔

ترجمہ: ''بہر حال ترتیب نبی ﷺ کے فرمان کے سبب ہے کہ شریک، خلیط سے زیادہ حق دار ہے اور خلیط، شفیع سے زیادہ حق دار ہے۔ شریک نفس مبیع میں ہے اور خلیط حقوقِ مبیع (جیسے راستہ، پانی وغیرہ) میں اور شفیع پڑوسی ہے اور اس لئے مبیع میں شرکت کی صورت میں اتصال زیادہ قوی ہے کہ یہ ہر جزء میں ہے اور اس کے بعد حقوق میں اتصال ہے، اس لئے کہ یہ منافع ملک میں اتصال ہے اور ترجیح سبب کی قوت سے پیدا ہوتی ہے اور تقسیم کا نقصان اگر چہ علت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، (مگر) ترجیح (Preference) دینے کی صلاحیت تو رکھتا ہے، (ہدایہ، جلد 7، ص: 7-6)''۔

یعنی اصل سبب اِتصال (Adjacency) یعنی باہم ملا ہوا ہونا ہے، تو اِتصال جس قدر قوی ہوگا، شُفعہ کی بنا پر خریداری کا جبری حق بھی اُتنا ہی قوی ہوگا۔

علامہ برہان الدین ابوبکر علی بن حسن الفرغانی حنفی نے شُفعہ کے متعلق جو لکھا ہے، آسان الفاظ میں اُس کا مفہوم درج ذیل ہے:

(۱) ایک شخص زمین کی ملکیت میں شریک ہے اور اُس کا دوسرا شریک اپنا حصہ فروخت کرنا چاہتا ہے، تو اِس شریک کا حق سب سے مُقدّم ہے۔

(۲) ایک شخص فروخت کی جانے والی زمین کی ملکیت میں تو شریک نہیں ہے، لیکن اس کی زمین اس کے ساتھ متصل ہے اور اس بنا پر دونوں کا راستہ مشترک ہے یا پانی کا کنواں یا/

گھاٹ مشترک ہے، تو اسے فقہ کی اصطلاح میں ''خلیط'' کہتے ہیں۔ شریک کے بعد بطور شفیع پھر اس خلیط کا حق مُقدّم ہے، یعنی یہ اصل مبیع میں تو شراکت نہیں ہے، لیکن حقوق ومنافع میں شراکت ہے۔

(۳) ایک شخص کی زمین دوسرے شخص کی زمین کے ساتھ متصل ہے، نہ ملکیت میں شراکت ہے، نہ حقوق میں، بس صرف پڑوس کی بنا پر اُس کی زمین دوسرے شخص کی زمین کے ساتھ ملی ہوئی ہو اور وہ اُسے فروخت کرنا چاہتا ہے، تو پھر کسی بھی دوسرے خریدار کے مقابلے میں حقِ اتصال کی بنا پر اُس پڑوسی کا حق مُقدّم ہے، خواہ فروخت کرنے والے کی مرضی ہو یا نہ ہو، اِسی بنا پر اِس حق کو جبری یا اجباری کہا جاتا ہے، یعنی یہ بائع کی مرضی کے برعکس بھی نافذ ہوجاتا ہے اور کسی بھی دوسرے شخص کے ساتھ اُس کی بیع کالعدم ہوجاتی ہے۔ اسلام کے قانونِ شُفعہ کو پاکستان کے دیوانی قانون (Civil Law) میں تسلیم کیا گیا ہے اور یہ پاکستان میں نافذ العمل ہے۔

عقدِ معاوضہ کا شرعی حکم

سوال:

میں ایک پرائیویٹ کنسٹرکشن کمپنی میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔ پروجیکٹ کے حصول کے لئے Tender جمع کروایا جاتا ہے، اگر پروجیکٹ مل جائے تو پہلا مرحلہ ایڈوانس کی وصولیابی کا ہوتا ہے جس کے لئے انشورنس کمپنی تیسرے فریق کی حیثیت سے شامل ہوتی ہے۔ وہ اس پروجیکٹ کے دورانیہ کی ضمانت لے لیتی ہے اور ہمیں Bond مہیا کردیتی ہے، جس کے بعد پارٹی سے ایڈوانس ملتا ہے۔ اس کام کے عوض انشورنس کمپنی ہم سے کچھ رقم پریمئم کی مد میں لیتی ہے اور ساتھ ہی پروجیکٹ کی مدت کے مطابق ایک طے شدہ رقم وصول کرتی ہے، جو میعاد پوری ہونے پر ہمیں واپس کردیتی ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ: انشورنس کمپنی جو پریمئم لے رہی ہے، کیا وہ سود میں شمار ہوگا؟۔

(معرفت: مولانا علی عمران صدیقی)

جواب:

مُروجہ انشورنس کمپنیاں سودی معاملات پر مشتمل ہیں۔ انشورنس دراصل ایک عقد معاوضہ ہے اور عقد معاوضہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ غیر شرعی عناصر سے پاک ہو، لیکن جب انشورنس کا بنظر غائر جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں ربا (Usury/interest)، غَرَر (uncertainty) مَیسِر (Gambling) اور بیع الکالی بالکالی (مبیع اور ثمن دونوں ادھار ہونا) جیسے غیر شرعی عناصر پائے جاتے ہیں، اس بنا پر علماء کرام کی اکثریت نے انشورنس کو ناجائز قرار دیا ہے۔

انشورڈ (پالیسی ہولڈر) اپنی کم رقم (پریمیم) کے بدلے میں انشورر (انشورنس کمپنی) سے ایک غیر یقینی واقعے مثلاً (جنرل انشورنس کی صورت میں) حادثہ یا (لائف انشورنس کی صورت میں) طبعی یا حادثاتی موت، مستقل معذوری وغیرہ کے رونما ہونے کی صورت میں زیادہ رقم (کلیم کی وصولی) کے خریدنے کا عقد کرتا ہے، یا غیر یقینی واقعہ کے رونما نہ ہونے کی صورت میں پریمیم سے دست بردار ہونے کا عقد کرتا ہے۔ اِن تمام صورتوں میں کم رقم کے ذریعے زیادہ رقم خریدی جارہی ہے جو کہ سود ہے، نیز کلیم (Claim) واقع ہونے کی صورت میں ادائیگی سے زیادہ رقم کی وصولی ہورہی ہے اور کلیم واقع نہ ہونے کی صورت میں اپنی رقم سے ہاتھ دھونا پڑ رہا ہے اور یہ صراحتاً جوا یا مَیسر ہے، جبکہ مذکورہ سبب جس کی وجہ سے زیادہ رقم کے ملنے یا اپنی رقم سے ہاتھ دھونے کا اندیشہ ہے مکمل طور پر غیر یقینی (غرر) ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ وہ غرر جو کسی خرید وفروخت کے معاہدہ (عقد معاوضہ) میں واقع ہو وہ غَرَرِ فاحش سے پاک ہو، کیونکہ جس عقد میں غرر فاحش ہو، وہ عقد ناجائز ہوجاتا ہے۔

البتہ یہ سہولت تکافل سے لی جاسکتی ہے کیونکہ تکافل شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں انشورنس کمپنی کی خرابیوں اور مفاسد سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ شرعی طریقۂ کار کی وجہ سے جائز ہے۔ انشورنس اور تکافل کمپنی میں یہی سب سے بڑا فرق ہے کہ انشورنس کمپنی میں حاصل ہونے والا پریمیم براہ راست انشورنس کمپنی کی ملکیت میں چلا جاتا ہے جس کی وجہ

سے یہ عقد معاوضہ بن جاتا ہے اور چوں کہ انشورنس میں عقد معاوضہ کی شرائط کا خیال نہیں رکھا جاتا، اس کی وجہ سے اس میں شرعی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، جو اس عقد (انشورنس) کو ناجائز کردیتی ہیں۔ اسی بنا پر اسلام میں انشورنس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور تکافل کو اس کے متبادل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

فیکٹری کے مُتصل غیر قانونی مکانات کا انخلا

سوال:

ہماری فیکٹری بلاک 22 فیڈرل بی ایریا (صنعتی زون) میں واقع ہے، فیکٹری کی دیوار کے ساتھ ہی 20 سال پرانی ایک کچی آبادی ہے، جو کافی دور تک پھیلی ہوئی ہے، یہاں کے رہنے والوں نے اب پکے مکانات بنالئے ہیں۔ یہ آبادی غیر قانونی ہے، لیز نہیں ہے۔ فیکٹری میں بوائلر دیوار کے ساتھ ہی لگے ہوئے ہیں اور کسی حادثے کی صورت میں دیوار کے ساتھ والے رہائشیوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کیا اِس نقصان سے بچنے کیلئے ہم دیوار کے ساتھ رہائشیوں سے وہ جگہ قیمتاً خرید سکتے ہیں؟۔ اُس جگہ کو خرید کر ہم پارکنگ وغیرہ کے لئے بھی استعمال کرسکتے ہیں تاکہ کسی حادثے کی صورت میں جانی نقصان کا خدشہ نہ رہے، (محمد انور، بلاک 22، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اُس کے مطابق فیکٹری کی چار دیواری سے ملحق آبادی والے لوگ قابض ہیں، لہٰذا آپ اُن قابضین سے مکانات کے عوض قیمت دے کر جگہ خالی کراسکتے ہیں اور اُسے پارکنگ کے لئے استعمال کرسکتے ہیں، اس طرح خدانخواستہ حادثاتی طور پر بوائلر پھٹ جانے کے عوض جانی نقصان کے امکانات کم ہوسکتے ہیں۔ ایک اچھی صورت یہ ہے کہ حکومت کسی قریبی علاقے میں مفت جگہ دیدے یا فیکٹری والے خود خریدلیں اور فیکٹری والے ان کو چھوٹے چھوٹے یونٹس مکان یا فلیٹ بناکر دے دیں اور حکومت اس کے عوض یہ جگہ فیکٹری مالکان کو باقاعدہ الاٹ کردے، اس طرح مسئلے کا حل بھی

نکل آئے گا اور سب کچھ قانون کے دائرے میں ہوگا۔

حلال جانور کے دَمِ مَسفوح اور بعض دیگر ممنوعہ اعضا کی بیع

سوال:1

کیا کسی مسلمان تاجر کے لئے حلال جانور کے وہ اجزاء جن کا کھانا جائز نہیں ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: وَرُوِیَ عَنْ مُجَاهِدٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: كَرِهَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مِنَ الشَّاةِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَيَيْنِ وَالْقُبُلَ وَالْغُدَّةَ وَالْمَرَارَةَ وَالْمَثَانَةَ وَالدَّمَ۔ ان مذکورہ بالا اجزاء کا بیچنا جائز ہے یا نہیں اور مسلمان صارف کے لئے اُس کا خریدنا جائز ہے یا نہیں؟۔ کیا مسلمان تاجر یہ اشیاء کسی غیر مسلم کو بیچ سکتا ہے؟، مثلاً بعض مذبح خانے والے خون کو کھاد یا مرغی کی خوراک وغیرہ بنانے کے لئے فروخت کرتے ہیں۔

سوال:2

جو جانور بغیر ذبح کے مرجائے مثلاً مری ہوئی مرغی، بھینس، گائے وغیرہ، ایسے مُردار کا فروخت کرنا جائز ہے؟۔

سوال:3

مرغیوں کے لئے جو غذا تیار کی جاتی ہے، اُس میں خون ملایا جاتا ہے، کیا مرغی خانے کے مالکان کو قصداً خون سے مرغیوں کی خوراک بنانا جائز ہے؟، اگر اس غذا میں سور کا خون یا چربی ہو تو اُس کا کیا حکم ہے؟، اور اس غذا کے بنانے میں حلال مذبوحہ جانور کے خون اور حلال غیر مذبوحہ جانور کے خون میں کوئی فرق ہے؟۔

(محمد نجیب خان، حلال آگہی وتحقیقاتی کونسل)

جواب:1

کسی بھی شے کی خرید وفروخت کے جائز ہونے کے لئے شرعی ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ شے جس سے نفع حاصل کرنا مسلمان کے لئے جائز ہو، اُس کی خرید وفروخت بھی جائز ہے۔ نفع حاصل کرنا صرف اپنے کھانے کے استعمال میں لانے کا نام نہیں بلکہ جانوروں کو

کھلانے کے لئے بھی ہوسکتا ہے، کھانے کے علاوہ اور کاموں میں استعمال کرنا بھی نفع ہی میں شامل ہے۔ ردالمحتار علی الدر المختار میں ہے: (وَيَجُوْزُ بَيْعُ دُهْنٍ نَجِسٍ) أَيْ مُتَنَجِّسٍ كَمَا قَدَّمْنَاهُ فِي الْبَيْعِ الْفَاسِدِ (وَيَنْتَفِعُ بِهِ لِلْاِسْتِصْبَاحِ) فِيْ غَيْرِ مَسْجِدٍ كَمَا مَرَّ۔

ترجمہ: ''ناپاک تیل کی بیع جائز ہے، یعنی ایسا تیل جو کسی نجس چیز کے ملنے سے ناپاک ہوگیا ہو، جیسا کہ ہم بیع فاسد کے باب میں پہلے بیان کرچکے ہیں۔ اور اُس نجس تیل سے مسجد کے علاوہ (دیگر مقامات پر) چراغ جلاکر نفع حاصل کرنا جائز ہے، جیسا کہ پہلے گزرا (یعنی مسجد کی تقدیس کی وجہ سے مسجد میں اُس تیل سے چراغ جلانا ناجائز ہے)''۔ (جلد 7،ص:371)

علامہ علاؤالدین ابوبکر کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ بیع فاسد کے عدمِ جواز پر شوافع کے استدلال کو نقل کرکے اُس کا جواب دیتے ہیں: وَالْمَنْهِيُّ عَنْهُ يَكُوْنُ حَرَامًا وَالْحَرَامُ لَا يَصْلُحُ سَبَبًا لِثُبُوْتِ الْمِلْكِ لِأَنَّ الْمِلْكَ نِعْمَةٌ وَالْحَرَامُ لَا يَصْلُحُ سَبَبًا لِاسْتِحْقَاقِ النِّعْمَةِ، وَلِهٰذَا بَطَلَ بَيْعُ الْخَمْرِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالدَّمِ فَكَذَا هٰذَا، وَلَنَا أَنَّ هٰذَا بَيْعٌ مَشْرُوْعٌ فَيُفِيْدُ الْمِلْكَ فِي الْجُمْلَةِ، اِسْتِدْلَالًا بِسَائِرِ الْبِيَاعَاتِ الْمَشْرُوْعَةِ، وَالدَّلِيْلُ عَلٰى أَنَّهُ بَيْعٌ أَنَّ الْبَيْعَ فِي اللُّغَةِ مُبَادَلَةُ شَيْءٍ مَرْغُوْبٍ بِشَيْءٍ مَرْغُوْبٍ مَالًا كَانَ أَوْ غَيْرَ مَالٍ۔

ترجمہ: ''(شوافع کہتے ہیں:) جس شے سے روکا گیا ہو، وہ شے حرام ہوجاتی ہے اور حرام شے ثبوتِ ملک کا ذریعہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اِس لئے کہ ملکیت ایک نعمت ہے اور حرام شے استحقاقِ نعمت کا سبب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اِس لئے خنزیر، شراب، مُردار اور (ذبح کے وقت بہنے والے) خون کی بیع باطل ہے، تو اِسی طرح یہاں بھی یہی حکم ہوگا۔ ہمارا (اَحناف کا) استدلال یہ ہے کہ یہ ایک مشروع بیع ہے، لہٰذا تمام مشروع بیوع سے استدلال کرتے ہوئے (ہم کہہ سکتے ہیں کہ) یہ بیع بھی فی الجملہ ملک کا فائدہ دیتی ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ ایک بیع ہے اور لغت میں بیع پسندیدہ چیز کے پسندیدہ چیز کے ساتھ تبادلے کو کہتے ہیں، خواہ وہ (پسندیدہ چیز) مال ہو یا مال نہ ہو''۔

(بدائع الصنائع، جلد خامس، ص:443)

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ اشیاء میں سے صرف ''دَمِ مَسفوح'' (یعنی حلال جانور کے ذبح کے وقت بہنے والے خون) کی حُرمت قرآن سے ثابت ہے، لہٰذا یہ حرام قطعی ہے اور باقی اشیاء کی کراہت حدیث پاک سے ثابت ہے لیکن یہ کراہت انسان کے کھانے کے حوالے سے نفاستِ طبعی کے سبب ہے اور مکروہِ تحریمی ہے۔ علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں: ''حلال جانوروں کے اجزاء میں سے اُن چیزوں کا بیان جن کا کھانا حرام ہے، وہ سات چیزیں ہیں: (۱) ذبح کے وقت بہنے والا خون، (۲) نَر جانور کا آلۂ تناسل، (۳) خصیتین، (۴) مادہ جانور کی شرمگاہ، (۵) غدود، (۶) مثانہ (جہاں پیشاب جمع ہوتا ہے)، (۷) پِتّا۔ یہ حُرمت اللہ عزّوجل کے اِس قول کی بنا پر ہے کہ: وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ

(اور وہ (نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اُن کے لئے پاک چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں، الاعراف: 157)۔ اور یہ سات چیزیں وہ ہیں جن کو نفیس طبیعتیں ناپسند کرتی ہیں، پس یہ حرام ہیں اور مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بکری کی نسل سے نر کا آلۂ تناسل، خصیتین، مادہ کی شرمگاہ، غدود اور پِتّا، پیشاب کا مثانہ اور ذبح کے وقت بہنے والے خون کو ناپسند فرمایا، اِس سے مراد کراہتِ تحریمی ہے، اُس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چھ چیزوں اور دَمِ مَسفوح کو کراہت میں جمع فرمایا اور دَمِ مَسفوح حرامِ قطعی ہے (یعنی اس قرینے کی بنا پر باقی چیزوں کی کراہت، کراہتِ تحریمی پر محمول ہوگی)۔۔۔۔ مزید لکھتے ہیں: وَالْمَرْوِيُّ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللهُ أَنَّهُ قَالَ: ''اَلدَّمُ حَرَامٌ وَأَكْرَهُ السِّتَّةَ، أَطْلَقَ اِسْمَ الْحَرَامِ عَلَى الدَّمِ الْمَسْفُوحِ وَسَمَّى مَاسِوَاهُ مَكْرُوهًا لِأَنَّ الْحَرَامَ الْمُطْلَقَ مَاثَبَتَتْ حُرْمَتُهُ بِدَلِيلٍ مَقْطُوعٍ بِهِ، وَحُرْمَةُ الدَّمِ الْمَسْفُوحِ قَدْ ثَبَتَتْ بِدَلِيلٍ مَقْطُوعٍ بِهِ وَهُوَ النَّصُّ الْمُفَسَّرُ مِنَ الْكِتَابِ الْعَزِيزِ قَالَ اللهُ تَعَالَى عَزَّ شَانُهُ: (قُلْ لَّآ أَجِدُ فِي مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ إِلَّآ أَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ) وَانْعِقَادُ الْإِجْمَاعِ أَيْضًا عَلٰى حُرْمَتِهٖ، فَأَمَّا

حُرْمَةُ مَاسِوَاهُ مِنَ الْأَشْيَآءِ السِّتَّةِ فَمَا ثَبَتَتْ بِدَلِيْلٍ مَقْطُوْعٍ بِهٖ بَلْ بِالْاِجْتِهَادِ أَوْ بِظَاهِرِ الْكِتَابِ الْعَزِيْزِ الْمُحْتَمَلِ لِلتَّأْوِيْلِ أَوِ الْحَدِيْثِ لِذٰلِكَ فَصَلَ بَيْنَهُمَا فِي الْاِسْمِ فَسَمّٰى ذٰلِكَ حَرَامًا وَذَا مَكْرُوْهًا،

ترجمہ: ''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت ہے اُنہوں نے فرمایا: ''دَمِ مَسفُوح حرام ہے اور باقی اشیاء کو میں مکروہ قرار دیتا ہوں، (امام اعظم نے) دَمِ مَسفُوح پر حرام کا اطلاق کیا اور خون کے سوا باقی اشیاء کو مکروہ کہا ہے، اس لئے کہ حرام مطلق وہ ہے، جس کی حُرمت دلیل قطعی سے ثابت ہو اور بہنے والے خون کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہے اور وہ ایک ایسی نَص سے ثابت ہوتی ہے، جس کی خود قرآن مجید میں تفسیر کردی گئی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''آپ کہہ دیجئے کہ جو اَحکام مجھ پر نازل ہوئے، میں ان میں کسی چیز کو جسے کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا، سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا ذبح کے وقت بہنے والا خون یا خنزیر کا گوشت، (الانعام:145)''۔ اور اس کی حرمت پر اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے جبکہ اس کے علاوہ جو دوسری چھ اشیاء ہیں، تو ان کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت نہیں ہوئی بلکہ اجتہاد یا ظاہرِ کتاب سے ثابت ہوئی ہے، جس میں تاویل کا بھی احتمال ہے یا پھر حدیث کے ساتھ ثابت ہوئی ہے، اسی لئے اِن کے نام میں بھی فرق کیا ہے، اُسے حرام قرار دیا اور باقی اشیاء کو مکروہ کہا ہے، (بدائع الصنائع، جلد خامس، ص:90)''۔

ہمارے فقہائے کرام نے ''دَمِ مَسفُوح'' کی بیع کی حُرمت کا قول اِس بنا پر کیا تھا کہ یہ مال نہیں ہے، چنانچہ علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: بَيْعُ الْمَيْتَةِ وَالدَّمِ وَالْحُرِّ بَاطِلٌ لِأَنَّهَا لَيْسَتْ أَمْوَالًا فَلَا تَكُوْنُ مَحَلًّا لِلْبَيْعِ۔

ترجمہ: ''مُردار، ذبح کے وقت بہنے والا خون اور آزاد آدمی کی بیع باطل ہے کیونکہ یہ چیزیں مال نہیں ہیں، تو یہ بیع کا محل بھی نہ ہوں گی، (ہدایہ مع فتح القدیر، جلد 6، ص:371)''۔

لیکن اب دَمِ مَسفُوح مال بن چکا ہے اور جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ یہ مرغیوں کی خوراک (Poltry Feed) اور کھاد (Fertilizer) میں استعمال ہوتا ہے اور ان صنعتوں سے

وابستہ لوگ اسے خریدتے ہیں، تو مَذبح (Butchery، Slaughter House) والوں کے لئے اُسے فروخت کرنا اور اُس کی قیمت لینا جائز ہے، البتہ انسان کے کھانے یا پینے کے حوالے سے اُس کی حُرمت قطعی، ابدی اور دائمی ہے۔

مرغیوں کی خوراک کا شرعاً طیّب وطاہر ہونا ضروری نہیں ہے اور تیار خوراک میں اِس کی ماہیت بھی بدل جاتی ہے۔ دمِ مسفوح کی بیع قیاس کی بنا پر فقہائے کرام نے ممنوع قرار دی ہے، لیکن اِس کی بیع کی حُرمت پر کوئی نَصِ صریح نہیں ہے۔ اب چونکہ اس کی ایک منفعت ثابت ہے لہٰذا یہ مال ہے اور استحساناً اس کی بیع جائز ہے۔

دَمِ مَسفوح کی اس بیع کی اباحت کا قول اُسی اصول پر مبنی ہے، جس کے تحت ہمارے فقہائے کرام نے نجس العین اشیاء کی بیع کو منفعت کی بنا پر مباح قرار دیا ہے۔

علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابو بکر الفرغانی لکھتے ہیں: قَالَ: وَلَا بَأسَ بِبَيْعِ السِّرْقِيْنِ، وَيُكْرَهُ بَيْعُ الْعَذِرَةِ، وَقَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللهُ: لَايَجُوْزُ بَيْعُ السِّرْقِيْنِ أَيْضًا لِأَنَّهُ نَجِسُ الْعَيْنِ، فَشَابَهَ الْعَذِرَةَ وَجِلْدَ الْمَيْتَةِ قَبْلَ الدِّبَاغِ، وَلَنَا: أَنَّهُ مُنْتَفَعٌ بِهِ، لِأَنَّهُ يُلْقٰى فِي الْاَرَاضِيْ لِاسْتِكْثَارِ الرَّيْعِ، فَكَانَ مَالًا، وَالْمَالُ مَحَلٌّ لِلْبَيْعِ، بِخِلَافِ الْعَذِرَةِ، لِأَنَّهُ لَايُنْتَفَعُ بِهَا اِلَّا مَخْلُوْطًا، وَيَجُوْزُ بَيْعُ الْمَخْلُوْطِ هُوَالْمَرْوِيُّ عَنْ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللهُ، وَهُوَ الصَّحِيْحُ، وَكَذَا يَجُوْزُ الْاِنْتِفَاعُ بِالْمَخْلُوْطِ لَا بِغَيْرِ الْمَخْلُوْطِ فِي الصَّحِيْحِ۔

ترجمہ: ''امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: گوبر کی بیع میں کوئی حرج نہیں اور پاخانہ کی بیع مکروہ ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گوبر کی بیع بھی جائز نہیں، اس لئے کہ وہ نجس العین ہے، تو یہ پاخانہ اور دباغت سے پہلے مُردار کی کھال کے مشابہ ہوگیا۔ اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اس سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اس کو پیداوار بڑھانے کے لئے زمینوں میں ڈالا جاتا ہے، تو یہ مال ہوگیا اور مال بیع کا محل ہے، بخلاف پاخانہ کے، اس لئے کہ اِس سے مخلوط ہونے کی صورت ہی میں نفع اٹھایا جاتا ہے اور مخلوط کی بیع جائز ہے، امام محمد رحمہ اللہ سے یہی روایت ہے اور یہی صحیح ہے اور صحیح روایت کے مطابق ایسے ہی مخلوط سے انتفاع جائز

ہے جبکہ غیر مخلوط سے جائز نہیں ہے، (ہدایہ، جلد 7، ص: 224)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَ رَجِیْعِ آدَمِیٍّ لَمْ یَغْلِبْ عَلَیْہِ التُّرَابُ) فَلَوْ مَغْلُوْبًا بِہٖ جَازَ کَسِرْقِیْنٍ وَبَعْرٍ، وَاکْتَفٰی فِی "الْبَحْرِ" بِمُجَرَّدِ خَلْطِہٖ بِتُرَابٍ۔

ترجمہ: "آدمی کے پاخانے کی بیع باطل ہے، جس میں مٹی غالب نہ ہو اور اگر مٹی غالب ہو اور وہ مغلوب ہو، تو بیع جائز ہے، جیسے گوبر اور مینگنی کی بیع جائز ہے اور "البحر الرائق" میں تو محض مٹی کے مل جانے پر اکتفا کیا ہے (یعنی مٹی کے غالب ہونے کی بھی قید نہیں لگائی)"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 7، ص: 179، بیروت)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(و) یَطْہُرُ (زَیْتٌ) تَنَجَّسَ (بِجَعْلِہٖ صَابُوْنًا) بِہٖ یُفْتٰی لِلْبَلْوٰی۔

ترجمہ: "ناپاک تیل صابون بنانے سے پاک ہوجاتا ہے، عمومِ بلویٰ کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے"۔

علامہ ابن عابدین شامی اِس کے تحت لکھتے ہیں: ثُمَّ اعْلَمْ أَنَّ الْعِلَّۃَ عِنْدَ مُحَمَّدٍ ھِیَ التَّغَیُّرُ وَانْقِلَابُ الْحَقِیْقَۃِ، وَأَنَّہٗ یُفْتٰی بِہٖ لِلْبَلْوٰی کَمَا عُلِمَ مِمَّا مَرَّ، وَمُقْتَضَاہُ عَدَمُ اخْتِصَاصِ ذَالِکَ الْحُکْمِ بِالصَّابُوْنِ، فَیَدْخُلُ فِیْہِ کُلُّ مَاکَانَ فِیْہِ تَغَیُّرٌ وَانْقِلَابُ حَقِیْقَۃٍ وَکَانَ فِیْہِ بَلْوٰی عَامَّۃٌ۔

ترجمہ: "پھر جان لو کہ امام محمد کے نزدیک (ناپاک تیل سے بنائے ہوئے) صابن کے جواز کی علت اُس کا بدل جانا اور ماہیت کا تبدیل ہونا ہے، اور عمومِ بلویٰ کی وجہ سے اِس پر فتویٰ دیا جاتا ہے، جیسا کہ ابھی گزرا، اِس علت کا تقاضا یہ ہے کہ (ماہیت کی تبدیلی) کی بنا پر جواز کے حکم کو صابن کے ساتھ خاص نہ کیا جائے، اس میں وہ تمام چیزیں داخل ہوں گی، (جس کے اجزائے ترکیبی میں کوئی ناپاک چیز ہے) کہ مُرکّب بن جانے سے ماہیت بدل جاتی ہے اور اس میں عمومِ بلویٰ بھی ہے، یعنی لوگوں کی بڑی تعداد ضرورت کی بنا پر اس میں مبتلا ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 1، ص: 450)"۔

دَمِ مَسفوح کے علاوہ حلال جانور کے وہ اَعضاء جن کو حدیثِ مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے، اُن کا کھانا مکروہِ تحریمی ہے، لیکن اگر وہ کسی مصنوع (Product) میں یا کسی بھی صنعت میں استعمال ہوتے ہوں، تو یہ شرعاً مال ہیں اور منفعت کی بنا پر ان کی خرید وفروخت جائز ہے۔

جواب:2

مُردار جانور حرام ہے (لیکن اِس عموم سے بالاتفاق مچھلی اور ٹڈی مستثنیٰ ہیں)۔
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ
ترجمہ: ''تم پر (یہ) چیزیں حرام کی ہیں: مُردار اور بہتا ہوا خون، (البقرہ:173)''۔
(2) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ۔ ترجمہ: ''تم پر مُردار (کا کھانا) حرام کیا گیا ہے''۔
(المائدہ:3)

(3) اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ
ترجمہ: ''تم پر (یہ) چیزیں حرام کی ہیں: مُردار اور بہتا ہوا خون، (النحل:115)''۔
علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: (بَطَلَ بَيْعُ مَالَيْسَ بِمَالٍ كَالدَّمِ) الْمَسْفُوحِ فَجَازَ بَيْعُ كَبِدٍ وَّطِحَالٍ (وَالْمَيْتَةِ) سِوٰى سَمَكٍ وَّجَرَادٍ،
ترجمہ: ''ایسی اشیاء جو مال نہ ہوں، جیسے ذبح کے وقت بہنے والا خون اور مُردار کی بیع باطل ہے، تلی اور کلیجی کی بیع جائز ہے (یعنی اِن پر دَمِ مَسفوح کا اطلاق نہیں ہوتا) اور (شکار کے ذریعے) جو مچھلی اور ٹڈی مرجائے، وہ حلال ہے (یعنی اُس پر مردار کا اطلاق نہیں ہوتا)''۔
(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 7، ص:171)
امام احمد رضا قادری قدِّس سرُّہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''جو جانور حلال مرجائے، اُس کو مسلمان کا بکری (فروخت) کرکے اپنی ضرورت پوری کرنی جائز ہے یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: جو جانور مُردار ہوگیا، بغیر ذبح شرعی کے مرگیا، اُس کا بیچنا حرام ہے اور اس کے دام حرام، (فتاویٰ رضویہ، جلد 17، ص:171)''۔ مُردار یعنی ایسا حلال جانور جو ذبح

کئے بغیر مر جائے، اُس کا گوشت کھانا اور فروخت کرنا بالاتفاق جائز نہیں۔ ہاں! اُس کی کھال کو دباغت کے بعد فروخت کر کے نفع حاصل کیا جا سکتا ہے۔

علامہ برہان الدین ابوبکر فرغانی حنفی لکھتے ہیں: قَالَ: وَكُلُّ إِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ، وَجَازَتِ الصَّلٰوةُ فِيْهِ، وَالْوُضُوْءُ مِنْهُ إِلَّا جِلْدَ الْخِنْزِيْرِ وَالْآدَمِيِّ، لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَيُّمَا إِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ ترجمہ: ''(صاحبِ ''بدایۃ المبتدی'' نے) فرمایا: ہر وہ کھال جو دباغت (کے ذریعے پاک) کرلی گئی ہو، وہ پاک ہے اور اُس پر نماز پڑھنا جائز ہے اور اُس سے (بصورت مشکیزہ) وضو کرنا جائز ہے، سوائے خنزیر اور آدمی کی کھال کے (یعنی خنزیر کے نجس العین اور حرام قطعی ہونے کی وجہ سے اس کی کھال سے نفع اٹھانا حرام ہے اور انسان کی کرامت کی وجہ سے اس کی کھال سے انتفاع حرام ہے)، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ہر وہ کھال جو دباغت کرلی گئی ہو، پاک ہے، یعنی خنزیر کی کھال اصلاً نجس ہونے کی وجہ سے اور انسان کی کھال حُرمت انسانیت کی وجہ سے)''۔

فقہاءِ احناف کے نزدیک اُس کے بال اور ہڈیاں پاک ہیں اور اُن کا استعمال جائز ہے۔

علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: وَشَعْرُ الْمَيْتَةِ وَعَظْمُهَا طَاهِرٌ وَقَالَ الشَّافِعِيُّ نَجَسٌ لِأَنَّهٗ مِنْ أَجْزَاءِ الْمَيْتَةِ، وَلَنَا أَنَّهٗ لَاحَيَاةَ فِيْهِمَا، وَلِهٰذَا لَايَتَأَلَّمُ بِقَطْعِهِمَا فَلَا يَحُلُّهُمَا الْمَوْتُ إِذِ الْمَوْتُ، زَوَالُ الْحَيَاةِ وَشَعْرُ الْإِنْسَانِ وَعَظْمُهٗ طَاهِرٌ، وَقَالَ الشَّافِعِيُّ نَجَسٌ لِأَنَّهٗ لَايُنْتَفَعُ بِهٖ وَلَايَجُوْزُ بَيْعُهٗ، وَلَنَا أَنَّ عَدَمَ الْإِنْتِفَاعِ وَالْبَيْعِ لِكَرَامَتِهٖ فَلَا يَدُلُّ عَلٰى نَجَاسَتِهٖ۔

ترجمہ: ''مُردار کے بال اور اُس کی ہڈی پاک ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ یہ نجس ہیں، کیونکہ یہ مُردار کے اجزاء میں سے ہیں۔ اور ہماری دلیل یہ ہے کہ بال اور ہڈی میں حیات نہیں ہے اور اِسی وجہ سے ان کے کاٹے جانے سے وہ تکلیف محسوس نہیں کرتا، پس ان میں موت بھی حلول نہیں کرے گی (حُلول کے معنی ہیں: کسی چیز کا دوسری چیز کے اندر شامل ہو کر یک جان ہو جانا)، کیونکہ موت تو حیات کا زوال ہے۔ اور انسان کے

بال اور اُس کی ہڈی پاک ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ناپاک ہے، کیونکہ اِس سے نفع نہیں لیا جاتا اور اِس کی بیع جائز نہیں ہے۔ اور ہماری دلیل یہ ہے کہ انسان کے بال اور ہڈی سے نفع اٹھانا اور فروخت کا ممنوع ہونا انسان کے اِکرام کی وجہ سے ہے، لہٰذا یہ اس کی نجاست پر دلیل نہ ہوگی، (ہدایہ، جلد 1،ص:,6263,65)"۔

جواب:3

جیسا کہ پہلے سوال کے جواب میں ہم نے لکھا کہ مرغیوں کی خوراک کا شرعاً طیّب وطاہر اور حلال ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ وہ حلال وحرام کے مکلف نہیں ہیں اور تیار خوراک میں اِس کی ماہیت بھی بدل جاتی ہے۔ دمِ مسفوح کی بیع کو استحساناً جائز قرار دیا ہے۔ اگر مرغیوں کی خوراک (Poltry Feed) اور غذا کی تیاری میں ذبیحہ جانور کے خون کے ساتھ غیر مَذبُوحہ جانور کا خون یا مُردار جانور کا گوشت یا سور کی چربی شامل ہو،تو اس کا حکم بھی یہی ہے۔ جب یہ اشیاء دیگر اجزاءِ ترکیبی (INGREDIANTS) کے ساتھ مل کر پولٹری فیڈ کی شکل اختیار کرلیتی ہیں، تو ان کی ماہیت بدل جاتی ہے اور سابق حکم باقی نہیں رہتا، یہ حکم تیار شدہ پولٹری فیڈ خریدنے یا استعمال کرنے کا ہے۔ البتہ مسلمان کے لئے حلال ذبیحہ کے خون، مُردار کے گوشت اور سور کی چربی کا استعمال کرنا یا کھانا کسی بھی طور پر جائز نہیں ہے اور حرام ہے۔ اِسی طرح کسی مسلمان کو سور یا اُس کے اجزاء کی خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے، اگرچہ وہ اُس کی ماہیت تبدیل کرنے کے لئے ہی خریدے، جیسے کوئی شراب اِس لئے خریدے کہ اُس کو سرکہ میں تبدیل کرے گا، ناجائز وگناہ ہے۔

الکحل کا شرعی حکم

سوال:1

آج کل کے دور میں ماکولات ومشروبات صنعت اختیار کر گئے ہیں، ان کی تیاری میں کافی بڑی مقدار میں اجزاءِ ترکیبی درکار ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ایک ہزار لیٹر

کے ڈرم میں کوئی مشروب تیار ہورہا ہو اور اُس میں ایک پاؤ الکحل ملایا جائے، جو کہ اشربۂ اربعہ محرّمہ کے علاوہ ہو۔ اب نسبت کے حوالے سے اُس کی نسبت اعشاریہ میں بنے گی۔ سوال یہ ہے کہ کسی چیز میں اَعشاریہ صفر صفر پانچ (005ء) یعنی پانچ فی ہزار یا نصف فی صد یا 05ء) کوئی حرام چیز ہو تو صارف کے لئے اس کے استعمال کا کیا حکم ہے۔ کیا "اَلْقَلِیْلُ کَالْمَعْدُوْمِ" کے تحت اس کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے یا پھر اسے حرام قرار دیا جائے گا؟۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات اُس چیز کا علم سوائے صنعت کار کے کسی کو نہیں ہوتا، کیونکہ بین الاقوامی قوانین کے تحت اگر کوئی جزءِ ترکیبی دو فیصد سے کم ہے تو اس کو ظاہر کرنا لازمی نہیں ہے۔

سوال:2

موجودہ غذائی صنعت کے اندر بعض دفعہ حرام اجزائے ترکیبی اتنی قلیل مقدار میں استعمال ہوتی ہیں کہ نہ صنعت کار اس کا اظہار کرتا ہے اور نہ ہی صارف کو اس کا ادراک ہوتا ہے۔ کیا ہم ماہرین کی اس رائے پر اسے قیاس کرسکتے ہیں کہ شراب جب سرکہ میں تبدیل ہوتی ہے (سرکہ جو کہ بالاتفاق حلال ہے) اس حلال سرکہ میں بھی ماہرینِ فن کے مطابق کم از کم دو فیصد الکحل موجود ہوتا ہے، لیکن چونکہ بظاہر اس سکر پر ترشی غالب آجاتی ہے، لہٰذا شریعتِ مُطہرہ نے اس دو فیصد کو معدوم قرار دیا ہے، تو کیا ہم ان جگہوں پر بھی اس مسئلہ کو سامنے رکھتے ہوئے اُن اشیاء کو حلال قرار دیں گے، جن میں حرام اجزائے ترکیبی دو فیصد یا اس سے کم مقدار میں استعمال ہوتے ہیں، کیا اس میں صارف اور صنعت کار کے لئے حکم یکساں ہے یا الگ الگ؟، (محمد نجیب خان، حلال آگہی وتحقیقاتی کونسل)۔

سوال:3

ہم اہلیانِ ڈنمارک ایک اہم شرعی مسئلے پر رہنمائی چاہتے ہیں: یورپ میں اکثر مشروبات (بشمول سوڈا واٹر) کی تیاری کے وقت بعض اجزا (Ingredients) کو الکحل میں حل کیا جاتا ہے۔ ذائقہ اور رنگ دار بنانے والے اجزا (Colourings and

(Flavorings) کو پہلے الکحل میں حل (Dissolve) کیا جاتا ہے، یعنی الکحل مُحلِّل (Solvent) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پھر اتنی حرارت دی جاتی ہے کہ الکحل بخارات کی صورت میں اُڑ جاتا ہے، تیار ہونے کے بعد الکحل کی پیمائش کرنا ممکن نہیں ہو پاتا یعنی 0.03 فیصد سے بھی کم۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ ان مشروبات کے استعمال سے نشہ نہیں ہوتا۔ کیااِن مشروبات کا استعمال جائز ہے؟، (طارق امین، ڈنمارک)۔

جواب:

چار شرابیں حرام قطعی ہیں۔

علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابوبکر الفرغانی حنفی ہدایہ میں لکھتے ہیں: قَالَ: وَالْاَشْرِبَةُ الْمُحَرَّمَةُ اَرْبَعَةٌ: اَلْخَمْرُ وَهِیَ عَصِیْرُ الْعِنَبِ اِذَا غَلٰی وَاشْتَدَّ وَقَذَفَ بِالزَّبَدِ، وَالْعَصِیْرُ اِذَا طُبِخَ حَتّٰی یَذْهَبَ اَقَلُّ مِنْ ثُلُثَیْهِ، وَهُوَ الطِّلَاءُ الْمَذْکُوْرُ فِی ''الْجَامِعِ الصَّغِیْرِ''، وَنَقِیْعُ التَّمْرِ وَهُوَ السَّکَرُ، وَنَقِیْعُ الزَّبِیْبِ اِذَا اشْتَدَّ وَغَلٰی۔

ترجمہ: ''(صاحبِ ''بدایۃ المبتدی'') فرمایا: جو شرابیں حرام ہیں، وہ چار ہیں: (۱) خمر اور یہ انگور کا شیرہ ہے، جبکہ (گل سڑ کر) جوش مارے اور تیز ہوجائے اور جھاگ چھوڑے (۲) انگور کا شیرہ جب پکا دیا جائے یہاں تک کہ دو ثلث کے قریب اُڑ جائے (یعنی ایک ثلث کے لگ بھگ رہ جائے) اور یہ وہی طِلا ہے، جو ''الجامع الصغیر'' میں مذکور ہے۔ (۳) نقیعُ التَّمر: (بھگوئے ہوئے کھجوروں کا شربت) یہ سَکَر (شراب، نشہ آور) ہے۔ (۴) نقیعُ الزّبیب: بھگوئے ہوئے مُنَقّٰی، کشمش کا شربت، جبکہ تیز ہوجائے اور جوش مارے، (جلد 7، ص:285)''۔

اَشْرِبۂ اَرْبعہ کے علاوہ بقیہ شرابوں کا حکم:

صاحبِ ہدایہ (جلد 7، ص:293 پر) مزید لکھتے ہیں: وَقَالَ فِی ''الْجَامِعِ الصَّغِیْرِ'': وَمَا سِوٰی ذٰلِکَ مِنَ الْاَشْرِبَةِ، فَلَا بَأْسَ بِهٖ، قَالُوْا: هٰذَا الْجَوَابُ عَلٰی هٰذَا الْعُمُوْمِ، وَالْبَیَانِ لَا یُوْجَدُ فِیْ غَیْرِهٖ، وَهُوَ نَصٌّ عَلٰی اَنَّ مَا یُتَّخَذُ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِیْرِ وَالْعَسَلِ وَالذُّرَةِ

حَلَالٌ عِنْدَ أَبِیْ حَنِیْفَةَ رَحِمَهُ اللهُ، وَلَا یُحَدُّ شَارِبُهُ عِنْدَهُ وَإِنْ سَکِرَ مِنْهُ، وَلَا یَقَعُ طَلَاقُ السَّکْرَانِ مِنْهُ بِمَنْزِلَةِ النَّائِمِ، وَمَنْ ذَهَبَ عَقْلُهُ بِالْبَنْجِ وَلَبَنِ الرِّمَاكِ۔

ترجمہ: ''امام محمد رحمہ اللہ نے ''الجامع الصغیر'' میں فرمایا: جوان (چار حرام قطعی شرابوں) کے علاوہ شراب ہیں، اُن (کے استعمال) میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فقہاء نے فرمایا: یہ جواب اِس عموم اور بیان کے مطابق ''جامعِ صغیر'' کے علاوہ کسی اور کتاب میں موجود نہیں ہے اور یہ جواب اِس بات پر نَص ہے کہ جو شراب، گیہوں، جَو، شہد اور جُوار سے بنائی جاتی ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال ہے اور اُس کے پینے والے کو اگر نشہ آ جائے، تو اس پر ''حدِ خمر'' جاری نہیں ہوگی اور اس نشے کی حالت میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوگی، جیسے نیند کی حالت میں کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے دے یا بھنگ اور گھوڑی کے دودھ سے جس کی عقل زائل ہو جائے، اُن کی طلاق واقع نہیں ہوتی''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس پر حُرمت قطعی کا حکم جاری نہیں ہوگا، اسے نشہ آور ہونے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ مکروہِ تحریمی قرار دیا جا سکتا ہے۔

صاحبِ ہدایہ کی اِس عبارت پر شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''علامہ ابوالحسن مرغینانی نے ''الجامع الصغیر'' کی عبارت کی جو تخریج کی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ ''الجامع الصغیر'' کی اس عبارت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان چار شرابوں کے علاوہ باقی شرابوں کو نشہ کی حد تک پینا بھی امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے، بلکہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک خَمر تو حرامِ قطعی ہے باقی تین شرابیں (باذق، سکر اور نقیع الزبیب) حرام ظنّی ہیں اور ان چار کے علاوہ باقی چیزوں کی شراب پینے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ ان کو اس مقدار سے کم پیا جائے جس سے نشہ ہو جاتا ہے، کیونکہ نشہ آور ہونے کی مقدار پینے کے حرام ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، جو مشروب بھی اتنی مقدار میں پی لیا جائے جس سے نشہ ہو جائے وہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرام ہے، خود علامہ ابوالحسن مرغینانی نے لکھا ہے کہ: ''مختصر (قدوری) میں ہے: چھواروں اور کشمش کے نبیذ کو جب ہلکا جوش دیا

جائے ،تو وہ حلال ہے،خواہ گاڑھا ہو جب کہ اس کو ظن غالب ہو کہ اس کے پینے سے نشہ نہیں ہوگا اور اس کا پینا لہو اور طرب کی وجہ سے نہ ہو (بلکہ طاقت کے لئے ہو) یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 4، ص:320)''۔

علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابو بکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: قَالَ: وَنَبِيْذُ الْعَسَلِ وَالتِّيْنِ وَنَبِيْذُ الْحِنْطَةِ وَالذُّرَةِ وَالشَّعِيْرِ حَلَالٌ وَإِنْ لَّمْ يُطْبَخْ، وَهٰذَا عِنْدَ أَبِيْ حَنِيْفَةَ وَأَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُمَا اللهُ إِذَا كَانَ مِنْ غَيْرِ لَهْوٍ وَّطَرَبٍ، لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ''اَلْخَمْرُ مِنْ هَاتَيْنِ الشَّجَرَتَيْنِ''، وَأَشَارَ إِلَى الْكَرْمَةِ وَالنَّخْلَةِ، خَصَّ التَّحْرِيْمَ بِهِمَا، وَالْمُرَادُ بَيَانُ الْحُكْمِ۔۔۔۔ وَعَصِيْرُ الْعِنَبِ، إِذَا طُبِخَ حَتّٰى ذَهَبَ ثُلُثَاهُ وَبَقِيَ ثُلُثُهٗ، حَلَالٌ وَإِنِ اشْتَدَّ، وَهٰذَا عِنْدَ أَبِيْ حَنِيْفَةَ وَأَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُمَا اللهُ، وَقَالَ مُحَمَّدٌ وَمَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ: حَرَامٌ، وَهٰذَا الْخِلَافُ فِيْمَا إِذَا قَصَدَ بِهِ التَّقَوِّيَ، أَمَّا إِذَا قَصَدَ بِهِ التَّلَهِّيَ فَلَا يَحِلُّ بِالْاِتِّفَاقِ، وَعَنْ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللهُ مِثْلُ قَوْلِهِمَا، وَعَنْهُ: أَنَّهٗ كَرِهَ ذٰلِكَ، وَعَنْهُ: أَنَّهٗ تَوَقَّفَ فِيْهِ، لَهُمْ فِيْ إِثْبَاتِ الْحُرْمَةِ قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ''كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ''، وَقَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ''مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ''، وَيُرْوٰى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَا أَسْكَرَ الْجَرَّةُ مِنْهُ فَالْجُرْعَةُ مِنْهُ حَرَامٌ'' وَلِأَنَّ الْمُسْكِرَ يُفْسِدُ الْعَقْلَ، فَيَكُوْنُ حَرَامًا قَلِيْلُهٗ وَكَثِيْرُهٗ كَالْخَمْرِ، وَلَهُمَا قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ''حُرِّمَتِ الْخَمْرُ لِعَيْنِهَا، وَيُرْوٰى: ''بِعَيْنِهَا قَلِيْلُهَا وَكَثِيْرُهَا، وَالسُّكْرُ مِنْ كُلِّ شَرَابٍ، ''خَصَّ السُّكْرَ بِالتَّحْرِيْمِ فِيْ غَيْرِ الْخَمْرِ إِذِ الْعَطْفُ لِلْمُغَايَرَةِ لِأَنَّ الْمُفْسِدَ هُوَ الْقَدَحُ الْمُسْكِرُ وَهُوَ حَرَامٌ عِنْدَنَا، وَإِنَّمَا يَحْرُمُ الْقَلِيْلُ مِنْهُ، لِأَنَّهٗ يَدْعُوْ لِرِقَّتِهٖ وَلَطَافَتِهٖ إِلَى الْكَثِيْرِ، فَأُعْطِيَ حُكْمَهٗ، وَالْمُثَلَّثُ لِغِلْظَةٍ لَا يَدْعُوْ وَهُوَ فِيْ نَفْسِهٖ غِذَاءٌ، فَبَقِيَ عَلَى الْإِبَاحَةِ وَالْحَدِيْثُ الْأَوَّلُ غَيْرُ ثَابِتٍ عَلٰى مَا بَيَّنَّاهُ، ثُمَّ هُوَ مَحْمُوْلٌ عَلَى الْقَدَحِ الْأَخِيْرِ، إِذْ هُوَ الْمُسْكِرُ حَقِيْقَةً۔

ترجمہ:''(صاحب ''بدایۃ المبتدی'' نے) فرمایا: شہد، انجیر، گیہوں، جُوار اور جَو کی نبیذ حلال ہے، اگرچہ پکائی نہ جائے اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف (شیخین) رحمہا اللہ کے

نزدیک ہے، جبکہ لہو و سرور کے بغیر ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انگور اور کھجور کی جانب اشارہ کر کے فرمایا: ''خمر ان دونوں درختوں کی ہوتی ہے''، آپ ﷺ نے تحریم کو ان دونوں کے ساتھ خاص فرمایا اور مراد حکم کو بیان کرنا ہے''۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: ترجمہ: ''انگور کا شیرہ جب پکالیا جائے اور اس کا دو تہائی اُڑ جائے اور ایک تہائی باقی رہ جائے، تو وہ حلال ہے، خواہ وہ گاڑھا اور تیز ہو، یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کا نظریہ ہے اور امام محمد، امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: یہ حرام ہے، یہ اختلاف اُس وقت ہے، جب اس تیز شیرہ سے قوت حاصل کرنے کا ارادہ کیا جائے اور اگر شیرہ لہو و لعب کے قصد سے پیا جائے، تو پھر یہ بالاتفاق حرام ہے۔امام محمد (کے اِس کے بارے میں تین اَقوال ہیں:) ایک قول شیخین (امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف) کے موافق جواز کا ہے، دوسرا قول کراہت کا ہے اور تیسرا قول توقف کا ہے۔جو ائمہ حُرمت کے قائل ہیں، اُن کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''ہر نشہ آور چیز خمر ہے''، اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے'' اور نبی ﷺ سے یہ بھی روایت ہے: ''جس کا ایک مٹکا نشہ دے، اُس کا ایک گھونٹ بھی حرام ہے''، اور اس لئے کہ نشہ آور چیز عقل کو فاسد کرتی ہے، اس لئے خمر کی طرح اس کی قلیل اور کثیر مقدار حرام ہوگی۔اور امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''خمر بعینہٖ حرام ہے'' اور ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی قلیل و کثیر مقدار بعینہٖ حرام ہے اور ہر نشہ آور شراب حرام ہے''۔رسول اللہ ﷺ نے خمر کے علاوہ دیگر مشروبات میں سے بطور خاص نشہ آور مقدار کو حرام کیا ہے، کیونکہ عطف تغایُر (Dissimilarity) کے لئے ہوتا ہے، نیز فسادِ عقل کا سبب وہ آخری پیالہ ہے، جو نشہ دیتا ہے اور وہ ہمارے نزدیک حرام ہے، اور خمر کی قلیل مقدار اس لئے حرام کی ہے کہ وہ اپنی رقّت اور لطافت کی وجہ سے زیادہ مقدار میں پینے کی تحریک (Stimulation) پیدا کرتی ہے، اس لئے قلیل خمر کو بھی کثیر خمر کا حکم دیا گیا ہے اور تہائی مقدار تک رہ جانے والی شراب اپنے گاڑھے پن اور حدّت کی وجہ سے زیادہ

پینے کی تحریک پیدا نہیں کرتی، نیز وہ فی نفسہٖ غذا ہے، اس لئے اپنی اباحت پر باقی رہے گی۔ ائمۂ ثلاثہ کی پیش کردہ پہلی حدیث (جس کی کثیر مقدار نشہ آور ہو، اُس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے) ثابت نہیں ہے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کرچکے ہیں، نیز اس کی حُرمت اُس آخری جام پر محمول ہے (جس سے نشہ آگیا ہو)، کیونکہ وہی حقیقۃً نشہ آور ہے"۔

(ہدایہ، جلد 7، ص:296 تا 299)

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: "خَمر کے علاوہ دیگر شرابوں کی قلیل مقدار جو نشہ آور نہ ہو، وہ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک جائز ہے۔ اِس لئے الکحل بھی اگر اسی قلیل مقدار میں ہو تو وہ بھی جائز ہے، کیونکہ الکحل انگور اور کھجور سے نہیں بنائی جاتی بلکہ شہد، شیرہ، مختلف دانے، جَو، اَنناس، گندھک، ادرک کی جڑ اور دیگر نشاستہ دار اشیاء سے بنائی جاتی ہے۔ جبکہ خمر کے لئے صرف انگور سے بنایا جانا کافی نہیں بلکہ انگور کا کچا شیرہ جو پڑے رہنے سے جھاگ چھوڑ دے، وہ خمر کہلاتا ہے، اِس لئے الکحل پر خمر کی تعریف صادق نہیں آتی۔ اور الکحل کی وہ مقدار جو نشہ کی حد تک نہ پہنچے، امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 4، ص:322)"۔

الکحل ایک ایسا نامیاتی مُرکّب ہے، جس میں بہت سارے نامیاتی مُرکبات حل ہوتے ہیں۔ الکحل کو مختلف اشیاء مثلاً ادویات (Medicine)، عطریات (Perfumes) اور مشروبات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ الکحل ایک اہم مُرکب ہے، اِس لئے کیمیائی تعاملات میں اِس کو مُحلِّل (Solvent) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ الکحل کسی شے میں حل کردیا جائے تو اُس کی ماہیت میں کوئی فرق نہیں آتا، اُس کی حقیقت برقرار رہتی ہے، اگر چاہیں تو الکحل کو کیمیائی عمل سے دوبارہ علیحدہ کرسکتے ہیں۔ الکحل کی کئی اقسام ہیں:

(1) ایتھائل الکحل (2) میتھائل الکحل (3) پرپائل الکحل (4) میتھانول الکحل

الکحل کی تیاری کا عمل:

شہد (Honey)، شیرہ (Ostracized Solution)، مختلف دانے

(Corns)، جَو (Barley)، اناس (Pineapple)، گندھک (Sulpher)، ادرک (Ginger) کی جڑ اور دیگر نشاستہ دار (Carbohydrate) اشیاء سے الکحل بنائی جاتی ہے۔ ایک خاص طریقۂ کار، جسے عملِ تخمیر (Fermentation) کہتے ہیں، کے ذریعہ اُس نشاستہ (Carbohydrate) کو ایک کیمیائی خمیر (Enzyme) کے ذریعے شوگر میں تبدیل کرتے ہیں، پھر ایک دوسرے کیمیائی خمیر (Enzyme) کے ذریعے شوگر کو گلوکوز میں اور ایک تیسرے کیمیائی خمیر (Enzyme) کے ذریعے گلوکوز سے الکحل بنایا جاتا ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی اِس حوالے سے اپنی تحقیق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میتھے نول (Methanol) کو وسیع پیمانے پر مُحلّل (Solvent) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اِس سے Formaldehyde تیار کی جاتی ہے، یہ بہت زہریلا مُرکّب ہے، اِس سے اندھا پن بلکہ بعض اوقات موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ اِس لئے میتھے نول کو ایتھے نول (Ethanol) میں شامل کردینے سے ایتھے نول پینے کے قابل نہیں رہتا یعنی ڈی نیچر (Denature) ہوجاتا ہے۔

ایتھے نول:

زمانہ قدیم سے ایتھے نول چینی کے محلول یا غلے کے نشاستے کی تخمیر سے تیار کیا جاتا رہا ہے۔ تخمیر (Fermentation) ایک حیاتی کیمیائی (Bio Chemical) عمل ہے، جو خمیر (Yeast) یا دیگر باریک جراثیموں (Micro Organisms) میں پائے جانے والے Enzymes کی موجودگی میں واقع ہوتا ہے۔ یہ Enzymes پیچیدہ نامیاتی عمل انگیز ہیں، جن کا عمل مخصوص ہوتا ہے۔ عملِ تخمیر سے محلول میں 12 فیصد ایتھے نول پیدا ہوتا ہے۔ تخمیر شدہ محلول کی کسری کشید (Fractional Distillation) سے 95 فیصد ایتھے نول حاصل ہوتی ہے، جسے Rectified Spirit بھی کہتے ہیں۔ مکمل طور پر غیر آبیدہ الکحل (سو فیصد خالص) حاصل کرنے کے لئے 5 9 فیصد ایتھے نول میں CxO ملا کر آمیزے (Mixture) کو کشید (Extract) کرلیتے ہیں۔ Distillate

یعنی کشید شدہ محلول کو خالص یا مُطلق الکحل (Absolute Alchohol) کہتے ہیں۔ ایتھے نول (Ethanol) کو نا قابل استعمال مشروب بنا دینے کے لئے اس میں میتھے نول (Mathanol) جیسی زہریلی اشیاء ملادی جاتی ہیں ۔ یہ الکحل کو ڈی نیچر کرنا (Denaturing Of Alchohol) کہلاتا ہے۔جب ایتھائل الکحل میں میتھائل الکحل ملا کر اُسے ڈی نیچر (Denature) کر دیا جاتا ہے،تو اُسے Methylated Spirit کہتے ہیں،(شرح صحیح مسلم،جلد سادس،ص:220)''۔

فقہائے اُمّت کا اِس پر اِجماع ہے کہ انگور یا کھجور سے کشید کیا ہوا الکحل،خواہ وہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر،اُس کی حِلّت یا طہارت کا کوئی طریقہ نہیں ہے، بہر صورت حرام اور نجس ہے۔ لیکن اگر اُس کی ماہیت تبدیل کر دی جائے اور اُسے سرکہ بنالیا جائے ،تو اس صورت میں حلال اور پاک ہو جائے گا۔

الکحل اور اسپرٹ کی ایک خاص مقدار نشہ آور ہوتی ہے، قلیل مقدار جو نشہ کی حد کو نہ پہنچے، امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک جائز ہے ۔مشروبات میں ایتھائل الکحل استعمال ہوتا ہے،جس کا فارمولا C_2H_5OH ہے، یہ ایک زہریلا مائع ہے،جس کا مسلسل استعمال انسانی صحت کے لئے مُضِر ہوسکتا ہے ۔ فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق الکحل یا اسپرٹ کا قلیل مقدار میں استعمال اُس صورت میں جائز ہے، جب طبّی ضروریات یعنی علاج کے لئے یا قوت حاصل کرنے کے لئے مُقوِّی (Tonic) کے طور پر استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر اِس کا استعمال لہو ولعب یا عیش وطَرَب (Enjoyment) کے لئے ہو تو پھر یہ استعمال مکروہِ تحریمی ہے اور ناجائز ہے۔فقہائے کرام نے ممکنہ مفاسد سے بچنے کے لئے سَدِّ ذرائع کے طور پر امام محمد رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دیا تھا، جو حکمتِ دین کا تقاضا تھا۔لیکن موجودہ دور میں چونکہ قلیل ترین مقدار میں الکحل کا استعمال اَدویہ (Medicine) اور اشیائے خورد و نوش میں کثرت سے ہو رہا ہے ، اِس لئے ہم امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اِس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تمام فقہاء کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ انگور اور کھجور سے کشید کئے گئے الکحل کی مقدار خواہ قلیل ہو یا کثیر، حرام اور نجس ہے۔ اِن کے علاوہ دیگر اشیاء سے عملِ تخمیر (Fermentation) کے بعد الکحل بنایا گیا ہو تو الکحل کی وہ مقدار جو نشہ کی حد تک نہ پہنچے، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال ہے۔ لیکن اگر کوئی ضرورت پر مبنی اِس جواز میں غُلُو کرتا ہے اور اِسے نشے کی عادت کے طور پر یا عَیش وطَرَب کے لئے استعمال کرتا ہے، تو یہ مکروہِ تحریمی ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ ''بین الاقوامی قانون کے تحت کسی مُرکّب میں اگر کوئی جزوِ ترکیبی دو فیصد سے کم ہو تو اُس کو ظاہر کرنا لازمی نہیں ہے''، تو ہمارے تفصیلی اور مدلّل فتویٰ کے بعد اِس میں کسی تردُّد میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ عام مشاہدہ یہی ہے کہ تمام اشیاء کے اجزائے ترکیبی (Ingredients) اُس کی پیکنگ پر لکھے ہوتے ہیں اور الکحل سے پاک اشیاء پر جلی حروف میں Alchohol Free یا Non Alchoholic (یعنی الکحل سے پاک) لکھا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے کیونکہ الکحل کی اِتنی قلیل مقدار ملانے کے باوجود وہ مُرکّب بدستور حلال اور جائز ہے۔ ہاں! وہ لوگ جو الکحل سے ہر طور بچنا چاہتے ہیں، اُن کی سہولت اجزائے ترکیبی کی صحیح معلومات فراہم کرنے میں ہے۔ الغرض اگر کسی دوا (Medicine) یا مُقوِّی (Tonic) یا مشروب (Syrup) میں الکحل کی اتنی معمولی مقدار ملی ہو، جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، یا اُس سے قدرے زائد ہو اور نشہ آور نہ ہو اور اُس دوا، ٹانک یا مشروب کے اجزاءِ ترکیبی (Ingredients) میں اُس کا ذکر نہ ہو، تو بھی اُس کے استعمال میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

مسئلہ مذکورہ کے بارے میں شیخ الحدیث علامہ مفتی محمد عبدالستار سعیدی کی رائے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

مُفتی اہلسنت، محقق شہیر حضرت علامہ مولانا مفتی محمد منیب الرحمٰن ہزاروی مدظلہ العالی کی تمام

تصانیف تحقیقی اور نافع خلائق ہیں۔

اس وقت پیش نظر کتاب میں حضرت موصوف کا ''الکحل'' کے شرعی حکم کے بارے میں مفصل، مدلل ومبرہن فتویٰ راقم کے سامنے ہے۔

آپ نے ''الکحل'' کی ماہیت، اقسام اور اجزاء ترکیبیہ پر انتہائی فاضلانہ ومحققانہ تبصرہ فرمانے کے بعد اس کا شرعی حکم بیان فرمایا ہے اور اسے کتب فقہاء کے حوالوں سے مزین فرمایا ہے۔

راقم الحروف حضرت مفتی صاحب کی تحقیق سے اتفاق کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعرفان میں مزید برکتیں عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

حافظ محمد عبدالستار سعیدی

ناظم تعلیمات جامعہ نظامیہ رضویہ، اندرون لوہاری گیٹ لاہور

11 ذوالقعدہ، 1435ھ، 7 ستمبر 2014ء

خنزیر کی کھال کے استعمال کا شرعی حکم

سوال:(۱)

خنزیر کی کھال یا بالوں سے استفادہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔

(راحت چاند، نائب صدر سیالکوٹ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری)

جواب:

خنزیر کی کھال یا بالوں کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ خنزیر نجس العین ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اِس کی حُرمت کو بیان کرنے کے بعد فرمایا:

فَاِنَّهٗ رِجْسٌ ترجمہ:''کیونکہ وہ ناپاک ہے،(الانعام:145)''۔

علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: قَالَ وَكُلُّ اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ، وَجَازَتِ الصَّلٰوةُ فِيْهِ، وَالْوُضُوْءُ مِنْهُ اِلَّا جِلْدَ الْخِنْزِيْرِ وَالْاٰدَمِيِّ، لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ

السَّلَامُ اَیُّمَا اِھَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَھُرَ،

ترجمہ:''(صاحبِ قدوری نے) فرمایا: ہر وہ کھال جو دِباغت (کے ذریعے پاک) کرلی گئی ہو، وہ پاک ہے اور اُس پر نماز پڑھنا جائز ہے اور اُس سے (بصورت مشکیزہ) وضو کرنا جائز ہے، سوائے خنزیر اور آدمی کی کھال کے (یعنی انسان کی جلد کا استعمال اکرامِ انسانیت کی وجہ سے حرام ہے اور خنزیر کی کھال نجس العین ہونے کی وجہ سے حرام ہے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو چمڑا رنگ لیا جائے، وہ پاک ہے''۔

مزید لکھتے ہیں: وَحُجَّةٌ عَلَى الشَّافِعِیِّ فِیْ جِلْدِ الْکَلْبِ، وَلَیْسَ نَجَسَ الْعَیْنِ، اَلَاتَرٰی اَنَّهٗ یُنْتَفَعُ بِهٖ حِرَاسَةً وَاصْطِیَادًا، بِخِلَافِ الْخِنْزِیْرِ لِاَنَّهٗ نَجِسُ الْعَیْنِ، اِذِالْهَاءُ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی ''فَاِنَّهٗ رِجْسٌ'' مُنْصَرِفٌ اِلَیْهِ لِقُرْبِهٖ۔

ترجمہ:''(یہ حدیث اپنے عموم کی وجہ سے) کتے کی کھال کے حق میں امام شافعی کے خلاف حجت ہے کیونکہ کتا نجس العین نہیں ہے، کیا آپ کا مشاہدہ نہیں ہے کہ کتے سے نگہبانی اور شکار پکڑنے کے طور پر نفع لیا جاتا ہے، برخلاف سور کے، کیونکہ وہ نجس العین ہے، اللہ تعالیٰ کے قول (فَاِنَّهٗ رِجْسٌ) میں ضمیر خنزیر کی طرف راجع ہے کیونکہ یہی قریب ہے، (ھدایہ، جلد 1، ص:62,63,64)''۔ نجس العین سے مراد وہ چیز ہے جو شرعاً اپنی ذات اور ماہیت میں ناپاک ہو۔

خنزیر کے بال بھی ناپاک ہیں، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَشَعْرُ الْمَیْتَةِ) غَیْرَ الْخِنْزِیْرِ عَلَی الْمَذْهَبِ (وَعَظْمُهَا وَعَصَبُهَا) عَلَی الْمَشْهُوْرِ (وَحَافِرُهَا وَقَرْنُهَا) اَلْخَالِیَةُ عَنِ الدُّسُوْمَةِ۔۔۔۔۔۔ طَاهِرٌ۔

ترجمہ:''ظاہر الروایت کے مطابق خنزیر کے علاوہ ہر مُردار کے بال، ہڈی، پٹھے، کُھر اور سینگ جو چربی سے خالی ہوں، پاک ہیں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 1، ص:320)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں:''خنزیر نجس العین ہے اور اس کا ہر جزوِ بدن ایسا ناپاک کہ اصلاً صلاحیتِ طہارت نہیں رکھتا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 4، ص:475)''۔ علامہ

زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں: وَأَمَّا الْخِنْزِيْرُ فَشَعْرُهُ وَعَظْمُهُ وَجَمِيْعُ أَجْزَائِهِ نَجِسَةٌ وَرَخَّصَ فِيْ شَعْرِهِ لِلْخَرَّازِيْنَ لِلضَّرُوْرَةِ لِأَنَّ غَيْرَهُ لَا يَقُوْمُ مَقَامَهُ عِنْدَهُمْ، وَعَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى: أَنَّهُ كَرِهَ لَهُمْ ذٰلِكَ أَيْضًا وَلَا يَجُوْزُ بَيْعُهُ فِي الرِّوَايَاتِ كُلِّهَا، وَإِنْ وَقَعَ شَعْرُهُ فِي الْمَاءِ الْقَلِيْلِ نَجَّسَهُ عِنْدَ أَبِيْ يُوْسُفَ، وَعِنْدَ مُحَمَّدٍ لَا يَنْجُسُ، وَإِنْ صَلّٰى مَعَهُ جَازَ عِنْدَ مُحَمَّدٍ، وَعِنْدَ أَبِيْ يُوْسُفَ لَا يَجُوْزُ إِذَا كَانَ أَكْثَرَ مِنْ قَدْرِ الدِّرْهَمِ، وَاخْتَلَفُوْا فِيْ قَدْرِ الدِّرْهَمِ قِيْلَ وَزْنًا وَقِيْلَ بَسْطًا كَذَا فِي ''السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ''۔ وَذَكَرَ السِّرَاجُ الْهِنْدِيُّ أَنَّ قَوْلَ أَبِيْ يُوْسُفَ بِنَجَاسَتِهِ هُوَ ظَاهِرُ الرِّوَايَةِ وَصَحَّحَهُ فِي ''الْبَدَائِعِ'' وَرَجَّحَهُ فِي ''الْاِخْتِيَارِ''۔

ترجمہ: ''رہا خنزیر تو اُس کے بال اور اُس کی ہڈی اور اُس کے تمام اجزاء نجس ہیں، البتہ ضرورت کی بنا پر اُس کے بالوں سے جُفت سازوں (Shoe Maker) کو جوتی گانٹھنے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز اس کے قائم مقام نہیں ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اِس کو بھی مکروہ کہا ہے اور فقہاءِ اَحناف کے تمام اقوال کے مطابق خنزیر کے بالوں کی بیع جائز نہیں ہے اور خنزیر کا بال کم (غیر جاری) پانی میں گر جائے، تو امام ابو یوسف کے نزدیک وہ پانی ناپاک کر دے گا اور امام محمد کے نزدیک نجس نہیں ہوگا۔ (اگر کپڑوں میں اس کا بال ہوتو) امام محمد کے نزدیک اُس پر نماز جائز ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک نماز ناجائز ہوگی، جبکہ درہم کی مقدار سے زائد ہو۔ اور درہم کی مقدار میں (ائمہ کا) اختلاف ہے، بعض نے وزن کا اعتبار کیا ہے اور بعض نے اُس کے پھیلاؤ (Size) کا، ''السراج الوہاج'' میں اِسی طرح ہے، ''سراج الہندی'' نے ذکر کیا کہ امام ابو یوسف نے جو خنزیر کے بال کو ناجائز کہا ہے، یہی (فقہِ حنفی کی) ظاہر الروایہ ہے، ''بدائع الصنائع'' میں اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے، ''الاختیار'' میں بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے''۔

(البحر الرائق، جلد 1، ص: 191)

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی نے اِس پر حرفِ آخر کے طور پر لکھا ہے کہ:

''قدیم فقہاء نے جو ضرورت کی بنا پر خنزیر کے بالوں سے جوتی گانٹھنے کی اجازت دی تھی، وہ اُس زمانہ کے اعتبار سے تھی کیونکہ اُس وقت جوتی گانٹھنے کے لئے شاید اِس سے زیادہ اورکوئی مضبوط چیز میسر نہیں تھی، لیکن اب چونکہ زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے اور جوتی گانٹھنے کے لئے مختلف نوع کے مضبوط دھاگے اور مٹیریل ایجاد ہو چکا ہے، اِس لئے اب خنزیر کے بالوں کا کسی بھی حال میں استعمال جائز نہیں ہے، (تبیان القرآن، جلد 6، ص:534)''۔

مُردار جانور کی کھال کے استعمال کا شرعی حکم

سوال:(۲)

حلال جانور جو طبعی موت مر گیا ہو یعنی جسے باقاعدہ ذبح نہ کیا گیا ہو، کیا اُس کی جلد سے استفادہ جائز ہے؟۔

جواب:

ہر وہ حلال جانور جسے شریعت کے مطابق ذبح کیا گیا ہو، اُس کا گوشت کھانا جائز ہے جبکہ ذبح کرنے والا اس کا اہل ہو اور اس کی کھال سے نفع اٹھانا بھی جائز ہے۔ اگر حلال جانور کو شریعت کے مطابق ذبح نہ کیا گیا اور وہ طبعی موت مر جائے تو اُسے ''مَیْتَۃٌ'' (مُردار Dead Animal) کہتے ہیں اور اُس کا گوشت کھانا حرام ہے۔ البتہ اس کی کھال اتار کر دباغت کر دی جائے تو اس سے نفع اٹھانا جائز ہے۔ احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ یَقُوْلُ: اِذَا دُبِغَ الْاِھَابُ فَقَدْ طَھُرَ۔

ترجمہ:'' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کھال کو رنگ (یعنی دباغت کر) لیا جائے، تو وہ پاک ہو جاتی ہے''۔

(صحیح مسلم:812)

(۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ مَرَّ بِشَاۃٍ مَطْرُوْحَۃٍ، اُعْطِیَتْھَا مَوْلَاۃٌ لِّمَیْمُوْنَۃَ، مِنَ الصَّدَقَۃِ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اَلَا اَخَذُوْا اِھَابَھَا فَدَبَغُوْہُ فَانْتَفَعُوْا بِہٖ؟

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک جگہ سے گزر ہوا اور آپ نے مُردہ بکری پڑی ہوئی دیکھی، جو حضرت میمونہ کی باندی کو صدقہ میں ملی تھی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: انہوں نے اس کی کھال کیوں نہ اتار لی کہ وہ اس کو رنگ لیتے اور اس سے نفع اٹھاتے، (صحیح مسلم:809)''۔

(۳) حَدَّثَنِی ابْنُ وَعْلَةَ السَّبَئِیُّ قَالَ: سَأَلْتُ عَبْدَاللهِ بْنَ عَبَّاسٍ، قُلْتُ: اِنَّانَكُوْنُ بِالْمَغْرِبِ، فَيَأْتِيْنَا الْمَجُوْسُ بِالْأَسْقِيَةِ فِيْهَا الْمَاءُ وَالْوَدَكُ، فَقَالَ اِشْرَبْ، فَقُلْتُ: أَرَأْیٌ تَرَاهُ؟، فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: دِبَاغُهٗ طَهُوْرُهٗ۔

ترجمہ: ''ابن وعلہ سبئی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا: ہم مغربی ممالک میں رہتے ہیں، ہمارے پاس آتش پرست مشکوں میں پانی اور چربی لے کر آتے ہیں، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اِس سے پانی پی لیا کرو، میں نے پوچھا: کیا یہ بات آپ اپنی رائے سے فرما رہے ہیں؟، حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ کھال رنگنے سے پاک ہو جاتی ہے، (صحیح مسلم:815)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: اَلدِّبَاغُ یَمْنَعُ النَّتْنَ وَالْفَسَادَ، وَالَّذِیْ یَمْنَعُ عَلٰی نَوْعَیْنِ: حَقِیْقِیٌّ کَالْقَرَظِ وَالشَّبِّ وَالْعَفْصِ وَنَحْوِهٖ وَحُکْمِیٌّ کَالتَّتْرِیْبِ وَالتَّشْمِیْسِ وَالْاِلْقَاءِ فِی الرِّیْحِ۔

ترجمہ: ''دباغت (کھال کو) بدبودار ہونے اور سڑنے سے روکتی ہے اور اِس کے دو طریقے ہیں: حقیقی جیسے قَرَظ (ایک قسم کا درخت) کے پتوں سے، شَبّ (یعنی ایک قسم کی کڑوی خوشبو، جس سے کھال رنگی جاتی ہے) بلوط کے درخت کے پتوں سے یا اِس کی مثل اور چیزوں سے کھال کا رنگنا۔ اور (دوسری قسم) حکمی ہے جیسے مٹی یا راکھ کے ذریعے اور دھوپ میں یا ہوا میں ڈال کر کھال کو پاک کیا جاتا ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 1، ص:317-316)

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی امام نووی کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''ہر اس

چیز کے ساتھ مُردار کی کھال کو رنگنا جائز ہے، جو کھال کے فُضلات (Waste,Rubbish) کو پاک اور صاف کردے، اور اس سے کھال کا فساد (سڑنا اور بدبودار ہونا) ختم ہوجائے، مثلاً انار کے چھلکوں، قرظ کے پتوں، نوشادر (اور دیگر کیمیائی اجزاء) سے''۔
(شرح صحیح مسلم، جلد 1، ص: 1047)

دباغت کا طریقہ:

دباغت (Tannage) کا ایک طریقہ یہ ہے کہ چمڑے کو دھوپ میں ڈال دیا جائے یہاں تک کہ اس کے اندر کی بدبودار رطوبت سورج کی شعاعوں سے اُڑ جائے یا مٹی لگا کر یا نمک لگا کر یا کوئی بھی کیمیکل استعمال کر کے اُس کے اندر کی بدبودار رطوبت کو خارج کردیا جائے اور وہ نرم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد مزید کیمیائی عمل کے ذریعے جوتے بنانے اور چرمی لباس (Leather Garments) اور دیگر مصنوعات کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔

قرض پر دی ہوئی رقم پر مُضاربت جائز نہیں

سوال:

میں نے اپنے دوست کو اُس کی کاروباری معاونت کے لئے کچھ رقم بطور قرض دی تھی، کیا اب میں اُس رقم کو بطور شراکت اُس کے کاروبار میں شامل کرسکتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اسلامی طریقہ اصولِ مضاربت کے تحت نفع ونقصان کی بنیاد پر کام کیا جاسکتا ہے؟۔
(سید شفاعت علی، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

آپ نے اپنے دوست کو وہ رقم معاونت کے لئے قرض دی تھی، اُس کو مضاربت میں بدلنا درست نہیں ہے، علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں: وَأَمَّا الْمُضَارَبَةُ بِدَیْنٍ فَإِنْ کَانَ عَلَی الْمُضَارِبِ فَلَا یَصِحُّ، ترجمہ: ''وہ رقم جو کسی پر دَین (قرض) ہے، اُسی مقروض کے ساتھ دَین کی اُس رقم کا عقدِ مُضاربت شرعاً صحیح نہیں ہے، (کیونکہ یہ دَین ہے اور عقدِ مُضاربت عین پر ہوتا ہے)، (البحر الرائق، جلد 7، ص: 448)''۔

البتہ جب قرض کی یہ رقم آپ کو وصول ہوجائے ،تو آپ اُس شخص سے اُس رقم پر عقدِ مُضاربت کر سکتے ہیں اور یہ جائز ہوگا۔لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ مُضاربت میں ربُّ المال(Capital Provider)اور مضارِب(Working Partner) کے درمیان منافع کی تقسیم کا تناسب (Ratio) پہلے سے طے ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو۔اوراگر خدانخواستہ نقصان ہوتو مضارِب کی محنت ضائع ہوگی اور بے ثمر رہے گی اور ربُّ المال سارا نقصان برداشت کرے گا۔نقصان کی صورت میں حاصل شدہ کل نفع سے اس کی تلافی کی جائے گی ،علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَمَا هَلَكَ مِنْ مَالِ الْمُضَارَبَةِ يُصْرَفُ إِلَى الرِّبْحِ) لِأَنَّهُ تَبَعٌ (فَإِنْ زَادَ الْهَالِكُ عَلَى الرِّبْحِ لَمْ يَضْمَنْ)

ترجمہ:''مالِ مضاربت میں سے جو مال ہلاک ہوا، اس کی کمی نفع سے پوری کی جائے گی، کیونکہ نفع اصل زر (رأس المال) کے تابع ہے، پس اگر نقصان اتنا ہوا کہ نفع سے اس کو پورا نہیں کرسکتا،تو مضارب پر ضمان نہیں ہے (بلکہ یہ نقصان ربُّ المال پر عائد ہوگا)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 8،ص:385)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: رَجُلٌ دَفَعَ لِآخَرَ أَمْتِعَةً وَقَالَ: بِعْهَا وَاشْتَرِهَا وَمَا رَبِحْتَ فَبَيْنَنَا نِصْفَيْنِ فَخَسِرَ فَلَا خُسْرَانَ عَلَى الْعَامِلِ۔

ترجمہ:''ایک شخص (رَبُّ المال) نے دوسرے شخص (مُضارِب) کو کچھ سامان دیا اور کہا: اس سے خرید وفروخت (یعنی کاروبار) کرو اور جو نفع آئے ،وہ ہمارے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا اور (اگر بالفرض) اُسے (کاروبار میں) نقصان ہوگیا،تو عامل (یعنی مُضارِب) کے ذمے نقصان میں سے کچھ نہیں آئے گا (بس اسے صرف محنت کی اجرت نہیں ملے گی)،(ردالمحتار، جلد:8،ص:374)''۔

شراکت کی ایک قسم

سوال:

ایک کاروبار میں چار شراکت دار ہیں ،ایک شریک پچاس فیصد ،دوسرا 25 فیصد

اور دو شریک ساڑھے بارہ، ساڑھے بارہ فیصد کے شراکت دار ہیں۔ 25 فیصد کا شراکت دار اکثر و بیشتر دیگر شرکاء کو بتائے بغیر اپنی ذاتی رقم کاروبار میں لگاتا اور پھر واپس لے لیتا تھا، ایک وقت ایسا آیا کہ جتنی ریکوری کی رقم جمع ہوتی تھی، اُس میں سے کچھ رقم وہ بغیر کسی کو بتائے لے جاتا تھا، جب حساب ہوا تو پتا چلا کہ ایک بہت بڑی رقم لے چکا ہے۔ پوچھنے پر اُس نے جواب دیا کہ جب ضرورت پڑتی تھی، تو میں اپنی ذاتی رقم بھی لگاتا تھا، اب لے گیا تو کیا ہوا، جمع کروادوں گا۔ اس عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔ (عبدالرؤف، کریم آباد، کراچی)

جواب:

یہ شرکت ''عنان'' کے قبیل سے ہے، جس میں تمام فریق اپنے اپنے مال کے ضامن ہوتے ہیں اور شراکت دار ایک دوسرے کے وکیل و امین بھی ہوتے ہیں۔ کسی بھی شریک کو یہ اختیار نہیں کہ بقیہ شراکت داروں کی اجازت و رضا کے بغیر رقم کاروبار میں لگائے یا نکالے اور نہ ہی یہ اختیار ہے کہ جو رقم شراکت کے کاروبار سے آئی، وہ دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے استعمال میں لائے کہ یہ دھوکا اور غبن کے زمرے میں آتا ہے، جو شرعاً حرام اور ناجائز ہے اور شریعت میں اِس عمل کی ممانعت اور شناعت بھی بیان کی گئی ہے۔ حدیث مبارک میں اِس کی شناعت کو یہ بیان فرمایا: مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا
ترجمہ: ''جس نے ہمیں دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں، (صحیح مسلم:283)''۔

شراکت داروں کے ایک دوسرے کے مال کے امین ہونے کے سبب ایک دوسرے کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری اُن پر عائد ہوتی ہے، جو امانت داری کو چھوڑتا ہے یا حیلے بہانوں سے خیانت کی راہیں تلاش کرتا ہے، وہ گمراہ ہے، حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُرَيْدَةَ ،عَنْ أَبِيهِ ،عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلَى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقًا فَمَا أَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ غُلُولٌ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کسی کو ہم کسی کام کے لئے مقرر کریں اور اسے اس کی اجرت ادا کردیں تو اپنی

اجرت کے علاوہ وہ جو کچھ بھی لے گا، وہ غبن کے زمرے میں آئے گا''۔

(سُنن ابوداؤد:2936)

بیع منعقد نہ ہونے پر ایڈوانس کی رقم کا استحقاق

سوال:

محمد سعید قریشی نے اپنا مکان 19 جنوری 2012ء کو محمد شاہد اقبال کو تین ماہ کی مدت میں ادائیگی کے معاہدے کے تحت فروخت کیا تھا۔ محمد شاہد نے بطور ٹوکن پچاس ہزار روپے سعید قریشی کو دیئے اور گواہان کے سامنے کہا کہ فریقین میں سے کسی کی مجبوری کی صورت میں ایک یا دو ماہ کی مدت کا اضافہ کیا جاسکتا ہے، لہٰذا معاہدہ کی مدت پوری ہونے پر باہمی رضامندی سے مزید دو ماہ کا اضافہ کیا۔ اس نئے معاہدے کے وقت شاہد اقبال نے ایک لاکھ پچانوے ہزار روپے ادا کئے، اس نئے معاہدے کے وقت شاہد اقبال نے اپنی بہن اور میرے گواہ کے سامنے اس بات کی تاکید کی کہ مکان ہر صورت خالی کرنا ہوگا یا قبضہ نہ دینے کی صورت میں ڈبل رقم ادا کرنا ہوگی اور محمد شاہد کی طرف سے مکمل رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں محمد سعید کو دی ہوئی رقم ضبط کرنے کا اختیار ہوگا، لہٰذا محمد سعید نے ایک مکان خریدنے کا معاہدہ کیا جس کا ٹوکن ایک لاکھ پچاس ہزار روپے ادا کیا اور اس مکان کی کل ادائیگی کی تاریخ 27 جون 2012ء مقرر کی۔ محمد شاہد اقبال نے نئے معاہدے کی مدت پوری ہونے سے قبل مکمل رقم نہ ہونے کی صورت میں بقیہ رقم کی ادائیگی سے انکار کردیا۔ جس کے سبب سعید قریشی کی آگے دوسرے مکان کے لئے دی ہوئی رقم ایک لاکھ پچاس ہزار روپے اور اسٹیٹ ایجنٹ کو دیئے ہوئے دس ہزار روپے ضائع ہوگئے۔ مذکورہ رقم کے نقصان کا ذمہ دار کون ہوگا؟، (محمد سعید قریشی، گجر نالہ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

اسلامی تعلیمات کے مطابق تجارت و معاملات میں دیانت، امانت، صداقت اور عہد و پیمان کی پابندی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور یہ خوبیاں اسلامی تعلیمات کا طرۂ امتیاز

ہیں۔صورتِ مسئولہ میں مشتری (خریدار) کی جانب سے بائع (فروخت کنندہ) پر یہ شرط لگانا فاسد ہے کہ قبضہ نہ دینے کی صورت میں ایڈوانس کی رقم دوگنی واپس کرنی ہوگی ،اسی طرح بائع کی طرف سے یہ شرط کہ مذکورہ مدت میں بقایا رقم نہ دی تو ایڈوانس کی رقم ضبط ہو جائے گی، یہ شروطِ فاسدہ ہیں لیکن اِن سے بیع فاسد نہیں ہوتی بلکہ بیع صحیح منعقد ہوگئی،اب فریقین پر معاہدے کی تکمیل لازم تھی۔شریعت میں مالی جرمانہ جائز نہیں ہے،ہاں! کوئی شخص اگر کسی شخص کا مال ضائع کردے تو اس سے مال کی قیمت لی جاسکتی ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ: اَلْمَالُ بِالْمَالِ یعنی اگر کسی کا حقیقی مالی نقصان ہوجائے تو وہ اس کے بدلے مال لے سکتا ہے۔شریعت میں تعزیر بالمال منسوخ ہے،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: مَعْنَی التَّعْزِیْرِ بِأَخْذِ الْمَالِ عَلَی الْقَوْلِ بِهٖ اِمْسَاکُ شَیْءٍ مِّنْ مَّالِهٖ عِنْدَ مُدَّةٍ لِّیَنْزَجِرَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ الْحَاکِمُ اِلَیْهِ، لَا اَنْ یَّأْخُذَهُ الْحَاکِمُ لِنَفْسِهٖ أَوْ لِبَیْتِ الْمَالِ، کَمَا یَتَوَهَّمُهُ الظَّلَمَةُ، اِذْ لَایَجُوْزُ لِأَحَدٍ الْمُسْلِمِیْنَ أَخْذُ مَالِ أَحَدٍ بِغَیْرِ سَبَبٍ شَرْعِیٍّ،وَفِیْ ''شَرْحِ الْاٰثَارِ'': اَلتَّعْزِیْرُ بِالْمَالِ کَانَ فِیْ اِبْتِدَاءِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ نُسِخَ۔ ترجمہ:''(جن فقہاء کرام نے) تعزیر بالمال (یعنی مالی جرمانے کے جواز کی) بات کی ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کا وہ مال کچھ مدت کے لئے روک لیا جائے تاکہ وہ جرم سے باز آجائے ،پھر حاکم وہ مال واپس کردے گا، یہ معنی نہیں کہ حاکم اس مال کو اپنے لئے یا بیت المال کے لئے وصول کرے جیساکہ ظالم (حکمرانوں) نے سمجھ رکھا ہے، کیونکہ کسی مسلمان کو شرعی وجہ کے بغیر کسی کا مال لینا جائز نہیں ہے۔''شرح الآثار'' میں ہے کہ تعزیر بالمال ابتدائے اسلام میں جائز تھی، پھر منسوخ ہوگئی''۔
(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6،ص:77)

ایسی صورت میں جب فریقین میں سے کوئی ایک فریق معاہدہ پورا نہ کرسکے،تو دوسرا فریق اُس بیع کو اٹھالے ،حدیث پاک میں ہے: مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا أَقَالَهُ اللّٰهُ عَثْرَتَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ ترجمہ:''جس نے کسی مسلمان سے اقالہ کیا (یعنی بیع کی پابندی سے آزاد کردیا) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کی لغزش دور فرمادے گا،(سُنن ابن ماجہ:2199)''۔

لہٰذا شریعت کی رُو سے آپ کے لئے محمد شاہد اقبال کی رقم ضبط کرنا جائز نہیں ہے اور آپ نے جس شخص سے معاہدہ کیا تھا، اُس کے لئے بھی آپ کی ایڈوانس کی رقم کو بلا معاوضہ ضبط کرنا ناجائز ہے۔ البتہ اسٹیٹ ایجنٹ نے اگر معاہدہ طے کرنے کا معاوضہ لیا ہے تو وہ اپنی محنت کا معاوضہ لے سکتا ہے، اگرچہ اَخلاقاً اُسے اِس طرح نہیں کرنا چاہئے۔ اور اگر اس نے سودا مکمل ہونے پر فیصد کمیشن یا کوئی بھی مخصوص رقم طے کی تھی، تو بیع کے منعقد نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لئے لینا جائز نہیں ہے۔

سیلز انوائس کی خرید وفروخت

سوال:

ہمارا کاروبار آئرن اینڈ اسٹیل کا ہے، ہم پاکستان اسٹیل مل کے ڈیلر ہیں اور بیرونِ ممالک سے آئرن امپورٹ کرتے ہیں۔ ملکی قانون کے مطابق ہم جو مال منگواتے ہیں یا پاکستان اسٹیل مل دیتی ہے، اُس کو ہم ایسا شخص جو سیلز ٹیکس ڈپارٹمنٹ میں رجسٹرڈ ہو، کو فروخت کرتے ہیں۔ مگر چونکہ پنجاب اور کراچی ریٹیلر مارکیٹ میں چھوٹے دکاندار ہونے کی وجہ سے تمام لوگ رجسٹرڈ نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے تمام کاروباری لوگ جو آئرن اسٹیل بزنس سے تعلق رکھتے ہیں، وہ ان غیر رجسٹرڈ لوگوں کو مال فروخت کرتے ہیں اور اپنی سیلز ٹیکس انوائس کسی دوسرے رجسٹرڈ شخص کو بیچتے ہیں۔ کیونکہ انوائس کے ساتھ مال فروخت کرنے پر قیمت زیادہ ملتی ہے اور بغیر انوائس کے کم قیمت میں دینا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے ہم مال چھوٹے دکاندار کو دیتے ہیں اور سیلز ٹیکس انوائس کسی اور فرم کو دیتے ہیں اور کچھ مال ہم ڈائرکٹ مل والوں کو دیتے ہیں، وہ انوائس کے ساتھ لیتے ہیں، مارکیٹ میں تمام امپورٹر اور ڈیلرز اِسی طرح کرتے ہیں۔ ہمارا یہ انوائس کسی دوسری فرم کو کاٹنا گناہ تو نہیں؟۔

(۲) دوسری صورت یہ کہ بعض کمپنیاں ہم سے انوائس مانگتی ہیں، اگر ہمارے پاس مال یا اُس کی انوائس نہیں ہے، تو ہم مارکیٹ سے کسی دوسرے امپورٹر یا ڈیلر سے خرید کر اُس کمپنی کو فراہم کرتے ہیں۔ 200 روپے یا 300 روپے فی ٹن کی انوائس میں اپنا نفع رکھ کر انوائس۔

آ گے فروخت کر دیتے ہیں، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟، (محمد رضوان، آرام باغ، کراچی)۔

جواب:

Sales Invoice سے مراد ایسی دستاویز ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ خریدار نے یہ سامان بائع سے خریدا ہے، اِس سامان کی مقدار، کوالٹی اور قیمت بھی اس اِنوائس میں درج ہوتی ہے، ممکن ہے کہ انوائس پر خریدار کا نام نہ ہوتو اس کا حامل (Bearer) اِس کا مالک مُتصور ہوگا۔

آپ نے جو صورت سوال میں بیان کی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائع اور خریدار Sales Invoice کے لین دین میں اُس مال کا سودا نہیں کرتے۔ مال کا قبضہ بائع سے خریدار کو منتقل ہوتا ہے اور نہ ہی مال کی قیمت بائع مشتری کو دیتا ہے، بلکہ یہ محض اس دستاویز (Sales Invoice) کی بیع وشراء ہے اور اس پر کچھ مالی منفعت حاصل ہوتی ہے۔ کسی شخص کے پاس پہلے سے اس طرح کا مال موجود ہوتا ہے یا وہ مارکیٹ سے سستا خرید لیتا ہے اور پھر اِس Sales Invoice کے ذریعے اُس مال کو زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ بہر صورت یہ غَرَر اور دھوکا ہے اور ایسی دستاویز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، بائع ومشتری دونوں اِس دھوکا دہی میں شریک ہوتے ہیں۔ اِس میں غرر یہ ہے کہ آخری مرحلے میں جو شخص اپنا مال اس دستاویز کے ذریعے فروخت کرتا ہے، وہ خریدار پارٹی کو یہ باور کراتا ہے کہ یہ مال اُس نے حقیقت میں اسی قیمت پر دستاویز جاری کرنے والی پارٹی سے خریدا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ایک صورت آپ نے یہ بیان کی ہے کہ اس کی باقاعدہ تجارت ہوتی ہے کہ ایک شخص دوسرے سے یہ دستاویز خرید لیتا ہے اور پھر کچھ نفع رکھ کر تیسرے شخص یا پارٹی کو بیچ دیتا ہے، تو یہ تمام فریق اس دھوکا دہی میں شریک مُتصور ہوں گے اور ناجائز ذریعہ سے نفع حاصل کریں گے، یہ بیع شرعاً ناجائز ہے۔

ثالث کا مُدّعی اور مُدّعیٰ علیہ کے بجائے اپنے حق میں فیصلہ باطل ہے

سوال:

شہباز عالم اور عطامحی الدین دونوں کاروباری شراکت دار تھے، چند وجوہات کی بنا پر کاروبار سے علیحدگی کا فیصلہ کیا اور کشیدگی سے بچنے کے لئے محمد شریف کو بطور ثالث مقرر کیا۔ محمد شریف نے ہم دونوں سے اپنے حق میں ایک تحریر لکھوائی جس کا متن یہ ہے: ''محمد شریف جو بھی فیصلہ کرے گا، ہم اُسے دل وجان سے مانیں گے اور جو نہ مانے گا، وہ جھوٹا ہونے کے ساتھ ساتھ ایمان سے بھی فارغ ہوگا۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ دونوں فریق اس بات کے پابند ہوں گے کہ کسی اور پنچایت میں نہیں جائیں گے اور نہ ہی کسی سے مشاورت کریں گے''۔ بعدازاں محمد شریف نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے بحیثیت ثالث فریقین کے مابین مصالحتی کردار ادا کرنے کے بجائے خود کو فریق بناتے ہوئے فیصلہ دیا کہ کاروبار سے متعلق عطامحی الدین کی جانب سے متذکرہ رقم محمد شریف سے متعلق ہے، لہٰذا تمام رقم محمد شریف کو دی جائے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جتنی رقم عطامحی الدین نے شہباز عالم سے لینی تھی، کم وبیش اتنی ہی رقم شہباز عالم نے عطامحی الدین سے لینی ہے اور حساب کتاب کی رو سے کسی کے حصے میں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ یہ رقم محمد شریف سے متعلق ہے، بلکہ جولسٹ عطا نے دی اس میں رقم کی آمد کا اعتراف موجود ہے، گویا فیصلہ بدنیتی پر مبنی تھا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ: فریقین کے مابین مصالحتی کردار ادا کرنے کے لئے ثالث مقرر کیا جاتا ہے اور اگر ثالث کسی ٹھوس ثبوت اور گواہی کے بغیر اپنے حق میں فیصلہ دے دے تو ایسی صورت میں فریقین کا فیصلے سے انکار یا اختلاف کرنے سے وہ ایمان سے خارج ہو جائیں گے؟۔

فریقین یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ متذکرہ رقم کا ثالث سے کوئی لینا دینا نہیں اور رقم کا تمام تر حصول کاروباری اور دیگر تحریروں میں بطور ثبوت موجود ہے، حتیٰ کہ گواہان بھی حیات ہیں۔ ایسی صورت میں ثالث کا اپنے حق میں فیصلہ دینا اور فریقین کو کسی پنچایت یا کسی ادارے سے رجوع نہ کرنے کا پابند کرنا کس حد تک درست اور جائز ہے؟۔ (شہباز عالم، کراچی)

جواب:

فریقین کے مابین درست فیصلے کے لئے جس تیسرے شخص کو مقرر کیا جائے، اُسے ''حَکَم''، ''ثالث'' یا ''پنچ'' کہتے ہیں۔ تحکیم یعنی حَکَم بنانے کا رکن ایجاب وقبول ہے، یعنی فریقین یہ کہیں کہ ہم نے فلاں کو حَکَم بنایا اور وہ شخص جسے حَکَم بنایا، قبول کرلے۔ باہمی تنازعات میں حَکَم بنانے کی مشروعیت قرآن وسنّت اور تعامل صحابہ سے ثابت ہے۔ شرعاً حَکَم بنانے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے۔

محمد شریف صاحب نے ثالثی کے لئے جو تحریر مُرتب کی ہے، وہ بھی حدِ شرعی سے تجاوز ہے۔ تحریر مرتب کرنے والے اور اس پر دستخط کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے، اس پر حدیث پاک میں شدید وعید آئی ہے۔ عَنْ بُرَیْدَۃَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْءٌ مِنَ الْاِسْلَامِ فَاِنْ کَانَ کَاذِباً فَھُوَ کَمَا قَالَ، وَاِنْ کَانَ صَادِقاً لَمْ یَعُدْ اِلَی الْاِسْلَامِ سَالِماً۔

ترجمہ: ''حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص یہ کہے کہ (مثلاً اگر میں جھوٹا ہوں تو) میں اسلام سے بری ہوں، پس اگر وہ جھوٹا ہے، تو وہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ اُس نے کہا۔ اور اگر وہ سچا ہے، تب بھی وہ اسلام کی طرف سالم نہ لوٹے گا، (سُنن نسائی، رقم الحدیث: 3781)''۔

شرعاً کسی قاضی یا حَکَم کا فیصلہ امکانِ تہمت کی وجہ سے اس کے والدین، بیوی یا اولاد کے حق میں بھی قابلِ قبول نہیں ہے اور باطل ہے، تو اپنی ذات کے حق میں بطریقِ اَولیٰ باطل ہوگا۔ محمد شریف صاحب نے، جنہیں فریقین نے اتفاقِ رائے سے حَکَم یا ثالث بنایا تھا، حد سے تجاوز کیا، لہٰذا ان کا فیصلہ باطل اور کالعدم ہے۔ بہتر ہوگا کہ شہباز عالم اور عطامحی الدین خود آپس میں تصفیہ کرلیں یا کسی غیر جانبدار شخص کو ثالث بنائیں یا عدالت سے رجوع کریں۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی حنفی لکھتے ہیں:

وَحُکْمُ الْحَاکِمِ لِاَبَوَیْهِ وَزَوْجَتِهٖ وَوَلَدِهٖ بَاطِلٌ وَالْمَوْلیٰ وَالْمُحَکَّمُ فِیْهِ سَوَاءٌ وَھٰذَا لِاَنَّهٗ

لَاتُقْبَلُ شَهَادَتُهُ لِهٰؤُلَاءِ لِمَكَانِ التُّهْمَةِ، فَكَذٰلِكَ لَايَصِحُّ الْقَضَاءُ لَهُمْ، بِخِلَافِ مَا إِذَا حَكَمَ عَلَيْهِمْ، لِأَنَّهُ تُقْبَلُ شَهَادَتُهُ عَلَيْهِمْ لِإِنْتِفَاءِ التُّهْمَةِ، فَكَذَا الْقَضَاءُ

ترجمہ:''اپنے والدین، بیوی اور اولاد کے حق میں قاضی یا حَکَم کا فیصلہ باطل ہے اور یہ اس لئے کہ جب کسی شخص کی گواہی اِن اشخاص (والدین، بیوی اور اولاد) کے حق میں قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ اس پر جانبداری کی تہمت لگ سکتی ہے، تو پھر ان کے حق میں ایسے شخص کی قضا بھی (بطریقِ اَولیٰ) قابلِ قبول نہیں ہوگی (کیونکہ قضا کا اہل ہونے کے لئے شہادت کا اہل ہونا شرط ہے)، اس کے برعکس اگر کوئی اِن اشخاص (یعنی والدین، اولاد اور بیوی) کے خلاف فیصلہ دیتا ہے، تو وہ فیصلہ صحیح مانا جائے گا، اس لئے کسی شخص کی اِن اشخاص کے خلاف گواہی بھی قابلِ قبول ہے، کیونکہ خلاف گواہی دینے میں کوئی تہمت کا ہدف نہیں بنتا، اِسی طرح ان اشخاص کے خلاف قاضی کا فیصلہ بھی صحیح مانا جائے گا (کیونکہ یہاں تہمت کا ہدف بننے کا امکان نہیں ہے)، (ہدایہ، جلد 5، ص:373)''۔

مشترکہ کاروبار میں منافع کی تقسیم کا اصول

سوال:

چند بھائیوں کا مشترکہ کاروبار ہے، بھائیوں نے آپس میں یہ طے کیا ہوا ہے کہ جو پارٹنر کاروبار کو جتنا زیادہ وقت دے گا، اسکو اس وقت کے حساب سے محنتانہ ملے گا اور کچھ رقم فکس کرلی جو کہ ہر بھائی کو ہر ماہ برابر ملتی ہے۔ اس صورتحال میں مفتی صاحب نے فرمایا کہ شراکت دار کو محنتانہ نہیں ملے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھائی 6 گھنٹے ڈیوٹی دیتا ہے، تو کوئی 8-9 گھنٹے، تو کوئی 12 گھنٹے دیتا ہے۔ اگر سب کو برابر کردیں تو جو شخص 12 گھنٹے دیتا ہے، وہ بھی 6 گھنٹے پر آسکتا ہے، جس سے کاروبار متاثر ہوسکتا ہے۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص زیادہ وقت دیتا ہے، اُس کا شیئر زیادہ کردیں اور جو ٹائم کم دیتا ہے، اُس کا شیئر کم کردیں۔ یہ طریقہ کسی بھی بھائی کو قبول نہیں ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل تجویز فرمائیں کہ ہر بھائی کاروبار میں زیادہ سے زیادہ وقت دے اور اس کو اس کا

صلہ بھی ملے یا کوئی اور حل ارشاد فرمائیں، جس سے شرعی تقاضوں کو بھی پورا کیا جا سکے۔

(عبداللہ، کراچی)

جواب:

شراکت کے کاروبار میں منافع کی تقسیم کے بارے میں یہ اصول ہے کہ شراکت دار باہمی رضامندی سے فیصد یا تناسب کسی بھی شرح کے ساتھ آپس میں منافع کی تقسیم کا فارمولا طے کرلیں۔ اِس میں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی شریک کا کاروبار میں حصہ کم ہو لیکن شرحِ منافع اُسے زیادہ دی جائے یا جو شریک کاروبار میں مہارت زیادہ رکھتا ہے یا دوسرے شرکاء کی بہ نسبت زیادہ وقت دیتا ہے، اُسے شرح منافع زیادہ دی جائے، جیسا کہ فقہ حنفی کی معروف کتاب المجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے: یَتَقَوَّمُ الْعَمَلُ بِالتَّقْوِيْمِ أَيْ اَنَّ الْعَمَلَ يَتَقَوَّمُ بِتَعْيِيْنِ الْقِيْمَةِ، وَيَجُوْزُ أَنْ يَكُوْنَ عَمَلُ شَخْصٍ أَكْثَرَ قِيْمَةً بِالنِّسْبَةِ إِلَى عَمَلِ شَخْصٍ آخَرَ مَثَلًا إِذَا كَانَ رَأْسُ الْمَالِ مَالَ الشَّرِيْكَيْنِ فِيْ شَرِكَةِ عِنَانٍ مُتَسَاوِياً وَكَانَ مَشْرُوْطًا عَمَلَ كِلَيْهِمَا فَإِذَا شُرِطَ لِأَحَدِهِمَا حِصَّةٌ زَائِدَةٌ فِي الرِّبْحِ جَازَ، لِأَنَّهُ يَجُوْزُ أَنْ يَكُوْنَ أَحَدُهُمَا أَكْثَرَ مَهَارَةً مِنَ الْآخَرِ فِي الْبَيْعِ وَالشِّرَاءِ وَعَمَلُهُ أَزْيَدُ وَأَنْفَعُ۔

ترجمہ: ''کام بھی ان چیزوں میں سے ہے، جن کی قیمت مقرر کی جاتی ہے یعنی عمل کی باقاعدہ قیمت مقرر کی جاسکتی ہے، اس لئے یہ جائز ہے کہ ایک شخص کا عمل دوسرے شخص کے عمل سے زیادہ قیمتی قرار پائے۔ مثلاً دو شراکت داروں نے ایک شرکت قائم کی، سرمایہ دونوں کا برابر تھا اور یہ بھی شرط تھی کہ دونوں کام کریں گے، اُس کے باوجود اگر معاہدۂ شرکت میں یہ شرط بھی رکھ دی جائے کہ ایک شریک منافع میں سے زائد حصہ لے گا، یہ شرط جائز ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اُس شریک کا کام دوسرے شریک سے زیادہ ماہرانہ ہو اور کاروبار کے لئے زیادہ نفع بخش ہوتا ہو، (مجلۃ الاحکام العدلیہ، مادہ:1345)''۔

صدرالشریعہ مفتی امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ نے ''بہارِ شریعت'' میں منافع کی تقسیم کی مختلف صورتوں کو اِس طرح بیان فرمایا: ''اگر دونوں نے اِس طرح شراکت کی کہ مال دونوں کا

ہو گا، مگر کام فقط ایک ہی کرے گا اور نفع دونوں لیں گے اور نفع کی تقسیم مال کے حساب سے ہوگی یا برابر لیں گے یا کام کرنے والے کا زیادہ ملے گا، تو جائز ہے اور اگر کام نہ کرنے والے کو زیادہ ملے گا، تو شرکت ناجائز ہے۔ یونہی اگر یہ ٹھہرا کہ کُل نفع ایک شخص لے گا، تو شرکت نہ ہوئی اور اگر کام دونوں کریں گے مگر ایک کام زیادہ کرے گا اور دوسرا کم اور جو زیادہ کام کرے گا، نفع میں اُس کا حصہ زیادہ قرار پایا یا برابر قرار پایا، یہ بھی جائز ہے، (حصہ دہم، شراکت کا بیان)''۔ لہٰذا زیادہ وقت دینے والے شریک کا حصہ فیصد یا تناسب بڑھا دیا جائے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی شریک کے لئے اُس کے زیادہ وقت دینے کے عوض الگ سے محنتانہ مقرر کرلیا جائے، کیونکہ اس میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ جتنا محنتانہ اُس کے لئے مقرر کیا گیا ہے، پورے کاروبار میں اتنا ہی منافع ہو یا اُس سے کم ہو، تو دونوں صورتوں میں باقی شرکاء کو کچھ نہیں ملے گا، جو شراکت کی روح کے خلاف ہے۔ البتہ یہاں یہ کیا جاسکتا ہے کہ تقسیمِ منافع کے وقت اگر دیگر شرکاء اپنی مرضی سے زیادہ کام کرنے والے شریک کا حصہ ٔ تناسب بڑھا دیں اور اپنا حصہ ٔ تناسب کم کرلیں تو پھر اس میں شرعی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن اسے معاہدہ کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

بیعانے کو ضبط کرنے کا حکم

سوال:

ہمارے والد مرحوم کا ترکہ ایک مکان تھا، جسے فروخت کر کے ہم تمام ورثاء کے درمیان شرعی تقسیم کر چکے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اِس مکان کی فروخت سے قبل ایک شخص محمد ریاض صاحب نے بیعانہ کے طور پر بارہ لاکھ روپے دیئے اور ملک سے باہر چلے گئے، تین سال گزر گئے پھر واپس لوٹ کر نہیں آئے۔ مکان ہم نے دوسرے شخص کو فروخت کر دیا ہے۔ وہ بارہ لاکھ روپے آج تک میرے پاس محفوظ رکھے ہیں۔ اب میرے بہن بھائیوں کا مطالبہ ہے کہ وہ رقم سب کے درمیان تقسیم کی جائے، آپ سے شرعی حکم معلوم کرنا ہے کہ کیا کیا جائے، اگر تقسیم ہوگی تو کس تناسب سے؟۔ ہم دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ (قمر جاوید، نصیر آباد، کراچی)

جواب:

مذکورہ بیعانے کی رقم پر آپ یا آپ کے دیگر بہن بھائیوں کا کوئی حق نہیں ہے، اُسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کے پاس وہ رقم اُس شخص کی امانت ہے، اِسے اُس شخص تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔ غالب گمان یہ ہے کہ وہ شخص کسی اسٹیٹ ایجنٹ کی معرفت آپ کے پاس آیا ہوگا، اس سے بھی اُس کا یا اُس کے خاندان والوں کا اَتا پتا معلوم کیا جاسکتا ہے۔ تاہم آپ اُس رقم کو امانت کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھیں اور اس کے بارے میں مسلسل معلومات کرتے رہیں۔ اگر اُس شخص یا اُس کے کسی شرعی وارث کا کسی بھی طریقے سے پتا نہ چل سکے تو اُس رقم کو اُس کی طرف سے صدقہ کردیں، جس کا ثبوت آپ کے پاس موجود و محفوظ رہنا چاہئے، اگر بعد میں وہ کبھی واپس آجائے اور اس تصدق سے مطمئن ہو تو آپ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو جائیں گے، ورنہ آپ کو اس کی رقم ادا کرنی ہوگی اور اس تصدُّق کا آپ کو اجر ملے گا۔

اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ جرمانے کے طور پر رقم ضبط کی جانے چاہئے تھی، تو شریعت میں مالی جرمانہ جائز نہیں ہے، ہاں! کوئی شخص اگر کسی شخص کا مال ضائع کردے تو اس سے مال کی قیمت لی جاسکتی ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ: اَلْمَالُ بِالْمَالِ یعنی اگر کسی کا مالی نقصان ہو جائے تو وہ اس کے بدلے مال لے سکتا ہے۔ شریعت میں تعزیر بالمال منسوخ ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: مَعْنَى التَّعْزِيْرِ بِأَخْذِ الْمَالِ عَلَى الْقَوْلِ بِهٖ إِمْسَاكُ شَيْءٍ مِّنْ مَّالِهٖ عِنْدَ مُدَّةٍ لِيَنْزَجِرَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ الْحَاكِمُ إِلَيْهِ، لَا أَنْ يَّأْخُذَهُ الْحَاكِمُ لِنَفْسِهٖ أَوْ لِبَيْتِ الْمَالِ، كَمَا يَتَوَهَّمُهُ الظَّلَمَةُ، إِذْ لَا يَجُوْزُ لِأَحَدٍ الْمُسْلِمِيْنَ أَخْذُ مَالِ أَحَدٍ بِغَيْرِ سَبَبٍ شَرْعِيٍّ، وَفِيْ ''شَرْحِ الْآثَارِ'': اَلتَّعْزِيْرُ بِالْمَالِ كَانَ فِيْ اِبْتِدَاءِ الْإِسْلَامِ ثُمَّ نُسِخَ۔

ترجمہ: ''(جن فقہاء کرام نے) تعزیر بالمال (یعنی مالی جرمانے کے جواز کی) بات کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کا وہ مال کچھ مدت کے لئے روک لیا جائے تا کہ وہ جرم سے باز آجائے، پھر حاکم وہ مال واپس کردے گا، یہ معنی نہیں کہ حاکم اس مال کو اپنے لئے یا بیت

المال کے لئے وصول کرے جیسا کہ ظالم (حکمرانوں) نے سمجھ رکھا ہے، کیونکہ کسی مسلمان کیلئے شرعی جواز کے بغیر کسی دوسرے مسلمان کا مال لینا جائز نہیں ہے۔''شرح الآثار'' میں ہے کہ تعزیر بالمال ابتدائے اسلام میں جائز تھی، پھر منسوخ ہوگئی''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6،ص:77)

مُضاربت در مُضاربت کا جواز

سوال:

میرا ایک دوست نذیر احمد کاروبار کے سلسلے میں مجھے رقم دینا چاہتا ہے جبکہ وہ یہ رقم کسی اور شخص سے لے گا۔نفع ونقصان کا کیا طریقہ مقرر ہوگا تاکہ سود سے بچا جاسکے اور زکوٰۃ کس طرح ادا کی جائے گی؟۔(علی احمد، بہار کالونی، کراچی، مستقل قیام: خاران)۔

جواب:

آپ کے بیان کے مطابق پہلے شخص نے نذیر احمد کو جو رقم دی ہے، اگر اُس نے مضاربت کے لئے رقم دی ہے اور نذیر احمد کو یہ بھی اجازت دی ہے کہ آگے کاروبار میں لگادے، تو یہ مضاربت جائز ہوگی۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(لَا) یَمْلِكُ (الْمُضَارَبَةَ) وَالشَّرِكَةَ وَالْخَلْطَ بِمَالِ نَفْسِهِ (إِلَّا بِإِذْنٍ أَوْ اِعْمَلْ بِرَأْيِكَ)

ترجمہ:''مُضارِب، مالک (رَبُّ المال) کی اجازت کے بغیر اسی مال کو آگے (کسی دوسرے شخص کو) مضاربت، شرکت یا اُس مال کو اپنے مال میں خِلط ملط (Mix) کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، سوائے اس صورت کے کہ رَبُّ المال (Capital Provider) اسے اس امر کی اجازت دیدے یا اُس سے یہ کہے کہ اپنی سوچ کے مطابق کام کرو''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 8،ص:377)

شخصِ اوّل رَبُّ المال اور نذیر احمد مُضارِبِ اوّل کہلائے گا اور رَبُّ المال کی اجازت سے یہ مضاربت درست ہوگی۔نذیر احمد نے آپ کے ساتھ کاروبار عقدِ مضاربت کے اصول پر کیا اور نذیر احمد آپ کے حق میں ربُّ المال (ثانی) اور آپ مضارب ہیں، جو نفع دونوں

کے درمیان طے ہوگا، مثلاً نصف، نصف یا جوبھی تناسب آپ دونوں نے باہمی رضامندی سے طے کیا ہو، تو آپ اُس پر مقررہ نفع نذیر احمد کو دیں گے اور نذیر احمد اپنے نفع میں سے رَبُّ المال اوّل کو حصہ دے گا جو اُس نے اُس سے طے کیا ہے۔ لیکن آپ کا یہ عمل اس صورت میں درست ہوگا کہ شخصِ اول (ربُّ المال) نے آپ کو اس طرح تصرُّف کا اختیار دیا ہو جو صورت ہم نے فتاویٰ ''الدر المختار'' کے حوالے سے لکھی ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی مضاربت کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (وَكَوْنُ الرِّبْحِ بَيْنَهُمَا شَائِعًا) فَلَوْ عُيِّنَ قَدْرًا فَسَدَتْ (وَكَوْنُ نَصِيبِ كُلٍّ مِّنْهُمَا مَعْلُوْمًا) عِنْدَ الْعَقْدِ۔ ترجمہ: ''فریقین کے درمیان نفع کا تناسب معلوم ہو، اگر (کسی فریق کیلئے) نفع کی خاص مقدار مقرر کر لی جائے، تو عقدِ مضاربت فاسد ہو جائے گا اور (نفع میں سے) ہر فریق کا حصہ عقد کے وقت ہی طے ہونا ضروری ہے''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 8، ص:376)

مضاربت اس صورت میں جائز ہے کہ ''ربُّ المال'' اور ''مضارب'' کے درمیان نفع کی تقسیم کا تناسب پہلے سے طے شدہ ہو، مثلاً یہ کہ فریقین کے درمیان نفع برابر برابر تقسیم ہوگا یا مضارب کو 60 فیصد اور رب المال کو چالیس فیصد ملے گا وغیرہ۔ خدانخواستہ نقصان کی صورت میں حاصل شدہ کل نفع سے اس کی تلافی کی جائے گی۔ علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَمَا هَلَكَ مِنْ مَّالِ الْمُضَارَبَةِ يُصْرَفُ اِلَى الرِّبْحِ) لِاَنَّهٗ تَبَعٌ (فَاِنْ زَادَ الْهَالِكُ عَلَى الرِّبْحِ لَمْ يَضْمَنْ)

ترجمہ: ''مالِ مضاربت میں سے جو مال ہلاک ہوا، اس کی کمی نفع سے پوری کی جائے گی، کیونکہ نفع اصل زر (رأس المال) کے تابع ہے، پس اگر نقصان اتنا ہوا کہ نفع سے اس کو پورا نہیں کر سکتا، تو مضارب پر ضمان نہیں ہے (بلکہ یہ نقصان ربُّ المال پر عائد ہوگا)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 8، ص:385)

زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے حصے کے نفع اور دیگر ذاتی اموال کو ملا کر حساب کریں اگر نصاب کی مقدار کو پہنچیں اور جملہ شرائطِ زکوٰۃ بھی پائی جائیں تو اپنی اُس تمام

ملکیت پر زکوٰۃ ادا کریں، اِسی طرح آپ کا شراکت دار اپنے حصے کے نفع اور راٴس المال ودیگر اموال کو ملا کر مجموعی مالیت پر زکوٰۃ ادا کرے۔ البتہ اگر ربُّ المال مضارب کو یہ اختیار دیدے یعنی اپنا وکیل بنالے کہ آپ اُس مال کی حد تک راٴس المال (Principal Amount) اور میرے حصے کے منافع کی زکوٰۃ ادا کردیا کریں تو زکوٰۃ جائز طور پر ادا ہوجائے گی۔

بینک کو کرائے پر جگہ دینا

سوال:

میں خیابانِ اتحاد پر اپنی ایک پراپرٹی سعودی بینک ''سامبا'' کو کرائے پر دینا چاہتا ہوں۔ کرائے کی مد میں ملنے والی رقم میرے لئے جائز ہے یا ناجائز؟۔

(محمد مدثر شیخ، کراچی)

جواب:

ہمارے نزدیک یہ اجارہ جائز ہے اور اس اجارہ کی صورت میں بطور کرایہ ملنے والی رقم جائز ہے۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر فرغانی مرغینانی لکھتے ہیں:

مَنْ حَمَلَ لِذِمِّيٍّ خَمْرًا: فَإِنَّهُ يَطِيبُ لَهُ الْأَجْرُ، عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَقَالَ أَبُوْيُوسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمَا اللهُ: يُكْرَهُ لَهُ ذَالِكَ، لِأَنَّهُ إِعَانَةٌ عَلَى الْمَعْصِيَةِ، وَقَدْ صَحَّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَعَنَ فِي الْخَمْرِ عَشْرًا: حَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَ إِلَيْهِ۔ وَلَهُ أَنَّ الْمَعْصِيَةَ فِي شُرْبِهَا وَهُوَ فِعْلُ فَاعِلٍ مُخْتَارٍ، وَلَيْسَ الشُّرْبُ مِنْ ضَرُوْرَاتِ الْحَمْلِ، وَلَا يُقْصَدُ بِهِ، وَالْحَدِيْثُ مَحْمُوْلٌ عَلَى الْحَمْلِ الْمَقْرُوْنِ بِقَصْدِ الْمَعْصِيَةِ۔

ترجمہ: ''امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جس نے ذمی کے لئے شراب کی بار برداری کی، تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے لئے اس کی اجرت حلال ہے''، امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے فرمایا: ''یہ اجرت اس کے لئے مکروہ ہے کیونکہ یہ معصیت

پر مدد کرنا ہے اور حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شراب کے بارے میں دس اشخاص پر لعنت فرمائی: (ان میں) شراب اٹھانے والا اور جس کے لئے اٹھائی جائے (دونوں) شامل ہیں، امامِ اعظم کی دلیل یہ ہے کہ معصیت پینے میں ہے اور وہ ایک فاعل مختار کا (دانستہ) فعل ہے اور اٹھانے کے لئے پینا لازم نہیں ہے اور نہ یہ (ہر صورت ہی میں) مقصود ہوتا ہے اور حدیث میں بیان کی گئی لعنت اُس اٹھانے پر محمول ہے جو معصیت کے ارادے سے ہو''۔ (ہدایہ، جلد 7،ص:235)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَجَازَ (حَمْلُ خَمْرِ ذِمِّيٍّ) بِنَفْسِهٖ أَوْ دَابَّتِهٖ (بِأَجْرٍ) لَا عَصْرُهَا لِقِيَامِ الْمَعْصِيَةِ بِعَيْنِهٖ۔

ترجمہ: ''اور (کسی شخص کا) اجرت پر ذمی کی شراب خود یا اپنی سواری پر اٹھانا جائز ہے، اور شراب نچوڑنے کی اجرت جائز نہیں کہ اس میں معصیت بعینہٖ موجود ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9،ص:478-477، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حدیثِ مبارک میں (حمل) اٹھانا مطلق نہیں بلکہ مقید ہے یعنی ہر اٹھانا مراد نہیں بلکہ پینے پلانے کے لئے اٹھانا مراد ہے ورنہ جو تائب شخص محض شراب کی بوتل پھینکنے کے لئے اٹھائے تو کیا وہ لعنتی ہوگا نیز وہ صحابۂ کرام جنہوں نے حرمتِ شراب پر شراب کے برتن اٹھا کر شراب بہائی کیا وہ بھی اس کے مستحق ہونگے؟ معاذ اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان کا منشا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شراب نوشی کا گناہ شراب کی بوتل یا گلاس اٹھاتے ہی شروع ہوجاتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی وقارالدین قادری رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''بینک کی ہر ''ملکیت'' حرام نہیں ہے اور نہ بینک کا تمام روپیہ حرام ہے۔ اس لئے جب بینک کھولا جاتا ہے تو کچھ فنڈ بینک والے اپنے پاس جمع کرتے ہیں، اس سے بینک شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس میں سود کی رقم بھی شامل ہوتی ہے، اس طرح وہ مخلوط آمدنی ہے۔ مخلوط (حلال وحرام مکس) مال میں سے جائز کام کی مزدوری لینا جائز ہے۔ اگر مخلوط مال سے

مزدوری ناجائز ہو تو اس وقت کون شخص ہے؟، جو یقین سے کہہ سکے کہ اس کے مال میں کوئی ناجائز پیسہ ملا ہوا نہیں ہے۔ یوں تو ساری دنیا کا نظام ختم ہو جائے گا اس لئے آپ کا یہ قیاس صحیح نہیں ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد سوم، ص:223 تا 325)''۔ اس مسئلے کی تفصیلی مطالعہ کے لیے فتاویٰ رضویہ طبع جدید جلد نمبر 19، صفحہ نمبر 440 تا 444 کو بھی ملاحظہ فرمالیں۔

عقدِ فاسد کو فسخ کرنا واجب ہے

سوال:

زید نے بکر کو اٹھارہ سال پہلے ایک دکان پانچ لاکھ روپے پگڑی پر دی اور یہ طے ہوا کہ تاحیات یہ دکان تمہارے پاس رہے گی اور بکر ماہانہ تین ہزار روپے زید کو ادا کرے گا، جبکہ اُس کی برابر کی دکانیں دو سو روپے ماہانہ کرائے پر ہیں۔ تین ہزار روپے ماہانہ صرف اس شرط پر ادا کرے گا کہ دکان تاحیات بکر کے پاس رہے گی، اب زید بکر سے دکان خالی کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے، تو شرعاً اس مسئلے کا حل کیا ہوگا؟، (محمد انصر نورانی، کراچی)۔

جواب:

فقہاءِ کرام نے پگڑی سسٹم کے تحت دکان یا مکان کی بیع کو حرام لکھا ہے اور اس سسٹم کے تحت جائیداد لینے یا دینے سے کرایہ دار مالک نہیں بنتا بلکہ اصل مالک کی ملکیت برقرار رہتی ہے۔ پگڑی میں قبضہ کی بیع کی جاتی ہے، جو شرعاً باطل ہے۔ بیع باطل کا حکم یہ ہے کہ قبضے کے عوض حاصل کی گئی رقم واپس کرنا ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں یہ عقد، عقدِ فاسد ہے کیونکہ بطور پگڑی جائیداد کو خریدنا، بیچنا شرعاً جائز نہیں، لہٰذا اس عقد کو باقی نہ رکھنا بھی واجب تھا، عاقدین میں سے کوئی ایک بھی اس کو فسخ کر دے تو دوسرے کو اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے۔ ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

وَالْعَقْدُ الْفَاسِدُ وَاجِبُ الْفَسْخِ شَرْعاً، إِمَّا مِنْ أَحَدِ الْعَاقِدَيْنِ أَوْ مِنَ الْقَاضِيْ إِذَا عَلِمَ بِذَالِكَ، لِأَنَّهُ مَنْهِيٌّ عَنْهُ شَرْعًا۔

ترجمہ: ''اور عقدِ فاسد کا فسخ کرنا شرعاً واجب ہے، عاقدین میں سے کوئی ایک فسخ کرے یا

(اگر وہ فسخ نہ کریں اور) جب قاضی کے علم میں آئے تو قاضی اُس عقد کو فسخ کر دے، اس لئے کہ شرعاً (عقدِ فاسد سے) روکا گیا ہے، (فقہ الاسلامی واَدلتہٗ ،جلد 4،ص:3090)''۔

سونے کی تجارت کا جائز طریقہ

سوال:

میں سونے کے کاروبار سے وابستہ ہوں اور یہی میرے رزقِ حلال کا ذریعہ ہے۔ میں نے اپنے کاروبار سے وابستہ ایک دوکاندار کو سات سال پہلے 5000 گرام سے زائد سونا جمع کرایا جو کہ گذشتہ چار سال سے 4000 گرام سونا اُن کے پاس جمع ہے، جبکہ پانچ سو گرام سے سات سو گرام تک ماہانہ رولنگ رہتی ہے۔صرف اُس کی اجرت وصول کرتا ہوں۔اب تقریباً 3300 گرام سے 3400 گرام سونا اُن کے استعمال میں ہے، جو تقاضے کے باوجود مجھے واپس کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور وہ سونا اُن کے استعمال میں ہے۔سوال یہ ہے کہ ازروئے شریعت اس سونے کی زکوٰۃ مجھ پر واجب ہے یا جن کے پاس میرا سونا موجود ہے، اُن پر واجب ہے؟۔(۲) میں اُس سونے کی اب تک کی زکوٰۃ ادا کر چکا ہوں ،کیا اِس ادا کردہ زکوٰۃ کا اُن صاحب سے مطالبہ کرسکتا ہوں؟۔(۳) میرا جو سونا اُن کے زیرِ استعمال ہے ،کیا میں اُس کے منافع کا حق دار ہوں ؟۔(۴) اب میں مضاربت کی بنیاد پر اس معاملے کو آگے چلانا چاہوں تو اس کے لئے ازروئے شریعت کیا حکم ہے؟،(عبیداللہ قادری،15 القیصر بلڈنگ،ڈنڈاس اسٹریٹ،صدر،کراچی)۔

جواب:

اگر چہ حدیث کی رُو سے بیع صرف میں دست بدست یعنی نقدلین دین کرنا ہی صحیح طریقہ ہے،لیکن مسلمانوں کے درمیان بڑے پیمانے پر یہ تعامُل چل پڑا ہے کہ ایڈوانس دے کر آرڈر پر زیورات بنواتے ہیں اور آخر میں ادائیگی ہوتی ہے۔شریعت نے لوگوں کی آسانی کی خاطر تعامل اور عرف کو بھی بعض اوقات نص کی طرح مؤثر قرار دیا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: سُئِلَ الْحَانُوْتِیُّ عَنْ بَیْعِ الذَّھَبِ بِالْفُلُوْسِ نَسِیْئَۃً،

فَأَجَابَ: بِأَنَّهُ يَجُوزُ إِذَا قُبِضَ أَحَدُ الْبَدَلَيْنِ، لِمَا فِي "الْبَزَّازِيَّةِ" لَوِ اشْتَرَى مِائَةَ فَلْسٍ بِدِرْهَمٍ يَكْفِي التَّقَابُضُ مِنْ أَحَدِ الْجَانِبَيْنِ۔ قَالَ: وَمِثْلُهُ مَا لَوْ بَاعَ فِضَّةً أَوْ ذَهَبًا بِفُلُوسٍ كَمَا فِي "الْبَحْرِ" عَنِ "الْمُحِيطِ"۔

ترجمہ: "حانوتی سے سونے کی بیع پیسوں کے عوض ادھار فروخت کرنے کی بابت سوال کیا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر بدلین (ثمن اور مبیع) میں سے ایک پر قبضہ ہو گیا ہو، تو جائز ہے، کیونکہ فتاویٰ "بزازیہ" میں ہے: اگر سو پیسے ایک درہم کے عوض خریدے اور ایک جانب سے (یعنی ثمن پر بائع کا یا مبیع پر مشتری کا) قبضہ ہو گیا تو جواز کے لئے کافی ہے اور انہوں نے کہا: اسی طرح اگر چاندی یا سونا پیسوں (یعنی رقم) کے عوض بیچا اور ایک جانب سے ثمن یا مبیع پر قبضہ ہو گیا، تو یہ بھی جائز ہے، جیسا کہ "محیط" کے حوالے سے "البحر الرائق" میں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 7، ص: 314)"۔

آپ کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو سونا زیورات کی شکل میں آپ دکانداروں کو دیتے ہیں، اُن کی حیثیت باہمی رضامندی سے طے کر کے دکاندار پر فروخت کر دیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ آپ قیمت طے کر کے بطور قرض دیں، اس صورت میں دکاندار اُن زیورات کا مالک ہو اور آپ کی رقم اُس پر دَین (قرض) ہو گی۔ اس سے قرض کی ادائیگی کا طریقہ طے کر لیں کہ وہ ہفتہ وار یا ماہانہ اقساط میں ادا کرے یا یکمشت ادا کرے گا اور اس کے لئے مدت یا تاریخ کا تعین کر دیں۔ اُن پر لازم ہو گا کہ آپ کا قرض حسب وعدہ ادا کرے۔ اگر خدانخواستہ وہ ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے تو رقم وہی رہے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اپنے زیورات مضاربت کی بنیاد پر دکاندار کو دے دیں اور ان پر جو نفع ہو، اس کا تناسب باہم طے کر لیں، مثلاً ہر ایک کا حصہ پچاس فیصد یا ایک کا 60 فیصد اور دوسرے کا 40 فیصد یا جو آپ دونوں کے درمیان طے ہو۔ مال دکاندار کے حوالے کرتے وقت مال کی تفصیل اور شرائط مضاربت ایک دستاویز میں گواہان کی موجودگی میں درج کر دیں اور ایک مدت یا تاریخ طے کر لیں کہ اس مدت یا اُس تاریخ تک جو مال

فروخت ہو چکا ہوگا، اس کا نفع آپس میں طے شدہ تناسب کے وقت تقسیم کرلیا جائے گا اور آپ جب عقدِ مضاربت ختم کرنا چاہیں، تو جو مال اُس وقت تک فروخت نہیں ہوا، اسے آپ واپس لے لیں گے۔

مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں آپ پر مال اور اپنے حصے کے منافع کی زکوٰۃ فرض ہے۔ دکاندار پر صرف اس کے منافع کے حصے کی زکوٰۃ فرض ہے۔قرض میں چونکہ ہر فریق کی ملکیت ناقص ہوتی ہے۔قرض خواہ کی ملکیت اس لئے ناقص ہوتی ہے کہ مکمل ملکیت کے لئے (۱) مال پر قبضہ (۲) مال پر تصرُّف (یعنی خرچ کرنے اور رو کے رکھنے کا اختیار ہونا) ضروری ہے۔قرض دینے والا مال کا حقیقی مالک ہے مگر قرض دینے کے بعد اُس کی ملکیت تو قائم ہے لیکن تصرُّف موجود نہیں۔مقروض کی ملکیت اس لئے مکمل نہیں کہ اس کے پاس تصرُّف تو ہے مگر وہ اس مال کا قانونی مالک نہیں ہے۔فقہ حنفی کے مطابق اگر مقروض صاحب حیثیت اور دیانت دار ہے کہ قرض واپس کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور قرض کی ادائیگی سے انکاری بھی نہیں ہے یا اگر مقروض انکاری ہے اور قرض دہندہ کے پاس ٹھوس شہادتیں یا تحریری دستاویز موجود ہیں، چونکہ ایسی صورت میں قرض وصول کرنے کی قوی امید موجود ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے یہ مال قرض دہندہ کے قبضے اور تصرُّف میں ہو، لہٰذا اس قرض کی زکوٰۃ قرض خواہ پر واجب ہے۔اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہر سال اپنے واجب الوصول (Receiveable) قرض کی رقم کو اپنی کل مالیت میں جمع کر کے زکوٰۃ ادا کرتا رہے، ہوسکتا ہے اس کی برکت سے قرض جلد وصول ہو جائے ورنہ قرض کی رقم جب بھی وصول ہوگی تو پچھلے تمام سالوں کی اکٹھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔آپ نے مذکورہ شخص کو جو سونا دیا وہ بطور قرض تھا، لہٰذا اُس سونے کی زکوٰۃ کی ادائیگی آپ پر واجب ہوگی۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً قرض ایک لاکھ روپے ہے اور تین سال کی زکوٰۃ واجب ہے، تو پہلے سال کی ڈھائی ہزار روپے کی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد دوسرے سال اصل زر =/97,500 روپے رہ جائے گا، پھر دوسرے سال کی زکوٰۃ منہا کرنے کے بعد =/95062.50

روپے رہ جائیں گے اور اس پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے، اُس میں یہ بیان نہیں کیا کہ آپ نے اُسے سونا کس عقد کے تحت دیا تھا، آیا قیمت کا تعین کر کے قرض کے طور پر دیا تھا یا مُضاربت کی بنیاد پر۔ اگر بطور قرض دیا تھا، تو اُس کا حکم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اُس کی زکوٰۃ آپ پر واجب ہے، خواہ سال بہ سال دیتے رہیں یا رقم ملنے پر تمام سالوں کی زکوٰۃ دیں۔

اس صورت میں آپ نے جس اجرت کا ذکر کیا ہے، آپ اس کے حقدار نہیں ہیں بلکہ یہ رقم جو آپ نے گذشتہ سالوں میں وصول کی ہے، قرض کی اصل رقم سے وضع ہوتی رہے گی اور اگر آپ نے یہ مُضاربت کی بنیاد پر دیا تھا تو وہ آپ کا مال ہے اور اُس کی زکوٰۃ آپ پر واجب ہے، سال بہ سال دیں یا ملنے پر اکٹھی گذشتہ تمام سالوں کی دیں۔ اور جو اپنے حصے کا منافع آپ لیتے رہے ہیں وہ آپ کے مال میں جمع ہو جاتا ہے اور اس مجموعی مال کی زکوٰۃ آپ یقیناً دیتے رہے ہوں گے۔

مارکیٹ میں دکان داروں کا باہم لین دین

سوال:

زید کا ایک مکتبہ ہے، اُس کی خرید و فروخت اِس طرح ہے کہ مارکیٹ سے مال کتب خریدتا ہے۔ دکاندار کو کہتا ہے کھاتہ میں لکھ لینا یا وہ پرچی بنا کر رکھ لیتا ہے، اجل مقرر نہیں کرتا، لین دین کبھی نقد اور کبھی کتابوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اِسی طرح جب زید کی دکان سے خریدار خریدتا ہے، وہ بھی کہہ دیتا ہے کاپی پر لکھ لینا، ادائیگی کی تاریخ مقرر نہیں ہوتی جبکہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، جو ادھار بیع ہو، اُس کی اجل اگر مقرر نہ ہو یا اجل مجہول ہو تو بیع فاسد ہوتی ہے کیا زید کی خرید و فروخت بیع فاسد کے زمرہ میں ہے یا نہیں۔ جبکہ اِسی طرح کے کاروبار کا تعامل ہے۔ کتابوں کے کاروبار کے علاوہ دوسری اشیاء کا کاروبار عموماً ایسا ہی ہوتا ہے، (محمد رفیق، مکتبہ مہریہ رضویہ، جامعہ روڈ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ)۔

جواب:

اصولی طور پر فقہی ضابطہ تو یہی ہے کہ بیع مؤجل یعنی ادھار کی بیع میں اَجَل مقرر ہونی چاہئے کیونکہ جہالت بعد میں نزاع کا باعث بنتی ہے۔لیکن یہاں مارکیٹ میں ایک تَعامُل (General Practice) جاری ہے۔علامہ محمد خالد الاتاسی لکھتے ہیں:

اَلْمَعْرُوْفُ عُرْفًا کَالْمَشْرُوْطِ شَرْطاً أَيِ الْمَعْرُوْفُ الْمُعْتَادُ بَيْنَ النَّاسِ، وَاِنْ لَمْ يُذْكَرْ صَرِيْحًا، فَهُوَبِمَنْزِلَةِ الصَّرِيْحِ، لِدَلَالَةِ الْعُرْفِ عَلَيْهِ۔

ترجمہ: ''جو (لوگوں کا) عرف ہو، وہ شرط کے قائم مقام ہے۔یعنی جو عادت لوگوں کے درمیان معروف ہو، اگرچہ صریحاً ذکر نہ کی جائے، وہ بمنزلہ صریح کے ہوتی ہے، کیونکہ عرف اُس پر دلالت کرتا ہے''۔مزید لکھتے ہیں: اَلْمَعْرُوْفُ بَيْنَ التُّجَّارِ كَالْمَشْرُوْطِ بَيْنَهُمْ۔

ترجمہ: '' تاجروں کے درمیان جو عرف ہوتا ہے، وہ اُن کے درمیان مشروط کی طرح ہے''، (شرح الجلۃ، مادّہ 44-43، جلد 1، ص:100)''۔پس جو عرف بن جائے، وہ مشروط کی طرح ہے۔اس تعامُل سے تنازعات بھی جنم نہیں لیتے، فریقین ایک دوسرے کے لئے توسُّع رکھتے ہیں، لہٰذا یہ بیع استحساناً جائز ہے۔اِسی طرح مال یا کتابوں کے عوض کتابوں/ سامان کی بیع بھی جائز ہے۔اس میں اعتباراً ایک چیز کو مبیع (Sold item) اور دوسری کو ثمن (Price) تصور کرلیا جاتا ہے۔

قبضے سے پہلے بیع کا شرعی حکم

سوال:

زید کتابوں کا تاجر ہے، ایک دکاندار سے کتابیں آرڈر آتا ہے، وہ بذریعہ فون یا خط دوسرے دکاندار سے کہہ دیتا ہے کہ اس پتے پر مال بھیج کر بل زید کے کھاتے میں لکھ دینا۔وہ مال پر قبضہ کرنے سے پہلے اُسے دوسری پارٹی پر فروخت کر دیتا ہے۔اور دوسرا دکاندار اس کے کھاتے میں حساب لکھ دیتا ہے۔کیا یہ جائز ہے جبکہ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ مالِ منقول کی بیع قبل القبض ناجائز ہے۔

جواب:

یہ بات درست ہے کہ مالِ منقول (Movable Proparty) کو قبضے سے پہلے کسی دوسرے شخص پر آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ حدیثِ پاک میں ہے: لَاتَبِعْ مَالَیْسَ عِنْدَکَ ترجمہ: ''جو چیز تمہارے پاس یعنی تمہارے قبضے میں نہ ہو، اُس کی بیع نہ کرو، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 3497)''۔ اِس کے جواز کی صورت یہ ہے کہ آپ دوسرے دکاندار کے ساتھ کمیشن کا معاملہ طے کردیں، اِس طرح کہ میں آپ کے لئے گاہک تلاش کروں گا اور وہ جتنی مالیت کی کتابیں خریدیں گے، اُن پر میرا کمیشن اتنے فیصد ہوگا، جو بھی مقدار فریقین کے درمیان اتفاقِ رائے سے طے ہوجائے۔ اِس طرح وہ دکاندار خود براہِ راست بائع ہوگا اور گاہک مشتری ہوگا اور آپ جائز طور پر اپنے کمیشن کے حقدار ہوں گے۔ چونکہ مختلف کتابوں پر کمیشن یا ڈسکاؤنٹ کی شرح مختلف ہوتی ہے، اِس لئے ہر سودے کے لئے کمیشن کی الگ الگ شرح بھی طے کرسکتے ہیں۔ یہ صورت بلا تردُّد جائز ہے۔

جو صورت آپ نے بیان کی ہے یہ ہمارے ہاں عرف (Custom) اور تعامُل (General Practice) بن چکا ہے اور عرف بھی نَص کی طرح مؤثر ہوتا ہے۔

جیسا کہ آپ نے لکھا ہے: اردو بازار لاہور ہو یا اردو بازار کراچی کتاب فروش دکانداروں کا یہ عُرف وعادت ہے اور تعامُل ہے جو جاری وساری ہے۔ بعض پبلشرز کا اپنے شہر سے باہر (Out Station) کتابوں کی ترسیل کا نظام ہوتا ہے، جبکہ ایک عام دکاندار اگر مطلوبہ کتابیں اپنے طور پر بھیجے تو اُسے مہنگی پڑتی ہیں۔ اور دکانداروں کے اس تعامُل میں بالعموم کوئی نزاع بھی پیدا نہیں ہوتا۔ پبلشر دکاندار اپنے کھاتے میں رقم کا اندراج کرلیتا ہے اور بعد میں آرڈر دینے والے دکاندار سے وصول کرلیتا ہے۔

اسلامی بینکنگ کے لئے بھی جو ''المعائر الشرعیہ'' مسلّمہ اور نافذ العمل ہیں، اُن کے مطابق مثلاً جاپان سے وہاں کا تاجر مال کی شپنگ کرکے تمام دستاویزات (Documents) کراچی میں اپنے کلائنٹ تاجر کو بھیج دیتا ہے اور کراچی کا تاجر مال کی ملکیت کی ان

دستاویزات کو اسلامی بینک کے حوالے کردیتا ہے اور اسے قبضۂ حکمی (Constructive Possession) سے تعبیر کر کے عقدِ مرابحہ کرلیا جاتا ہے اور بنک رقم کی ادائیگی کردیتا ہے۔

کمیشن پر عقد جائز ہے

سوال:

ایجنٹ حضرات کمیشن پر کام کرتے ہیں، وہ ایک طرف سے آرڈر لیکر کمپنی کو آرڈر لکھوادیتے ہیں۔ کمپنی ان کو 10 یا 05 فیصد کمیشن دیتی ہے، کیا یہ کمیشن جائز ہے؟۔ اِسی طرح پراپرٹی ڈیلر جب کسی کا پلاٹ یا مکان، دکان وغیرہ فروخت کرتے ہیں تو بائع اور مشتری دونوں سے کمیشن لیتے ہیں جوکہ ان کے درمیان طے ہوتا ہے، دو فیصد یا ایک فیصد یا کبھی اِس سے بھی کم، کیا یہ جائز ہے؟۔ منڈیوں میں دلالی بھی لی جاتی ہے، اِس کا کیا حکم ہے؟۔

جواب:

پراپرٹی ڈیلر کا کمیشن، آڑھت کا کاروبار اور بطور کمیشن ایجنٹ، کمیشن لینا جائز ہے، بشرطیکہ فریقین عقد پر ثمن اور کمیشن کا معاملہ واضح ہو اور کسی فریق کے ساتھ دھوکا نہ ہو۔

آڑھت کا کاروبار

سوال:

منڈیوں میں آڑھت کا کاروبار ہوتا ہے، دکاندار زمیندار کا مال بیچتا ہے تو اُس سے آڑھت لیتا ہے، کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے کہ کسی زمیندار کو دکاندار نے اخراجات کے لئے ایڈوانس رقم دی ہوتی ہے، وہ زمیندار اسی دکان پر مال بیچنے کا پابند ہوتا ہے، اور کبھی اِس طرح بھی اِس سے آڑھت زیادہ لی جاتی ہے اگر آڑھت جائز ہے تو یہ پابندی اور زائد آڑھت کیا یہ بھی جائز ہے؟۔

جواب:

دلّال کو عربی میں سمسار کہتے ہیں، اِسی کو انگریزی میں Agent/Broker اور Middleman کہتے ہیں۔ اصولی طور پر آڑھت، دلالی یا کمیشن کا کاروبار جائز ہے،

بشرطیکہ کمیشن کی شرح طے ہو اور کسی قسم کی دھوکا دہی نہ ہو۔صحیح بخاری میں سمسار (کمیشن ایجنٹ) کے ساتھ عقد کے جواز کی ایک صورت اَثرِ عبداللہ بن عباس کے حوالے سے ہے:
لَابَأْسَ أَنْ يَّقُوْلَ: بِعْ هٰذَا الثَّوْبَ، فَمَا زَادَ عَلٰى كَذَا وَكَذَا فَهُوَلَكَ، وَقَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ: إِذَا قَالَ: بِعْهُ بِكَذَا، فَمَا كَانَ مِنْ رِبْحٍ فَهُوَلَكَ، أَوْ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ، فَلَابَأْسَ بِهٖ۔
ترجمہ: ''ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ ''یہ کپڑا اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو رقم تمہیں ملے وہ تمہاری ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔تابعی ابن سیرین نے کہا: ایک شخص نے (کمیشن ایجنٹ) سے یہ کہا کہ یہ چیز اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو نفع ملے، وہ تمہارا ہے یا اُس نفع میں ہم دونوں نصف نصف کے حق دار ہوں گے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، (صحیح بخاری، باب: أَجْرِ السَّمْسَرَةِ، جلد 2، ص:670)''۔ایڈوانس کی رقم جو کمیشن ایجنٹ یا آڑھتی زمیندار کو دیتا ہے، وہ قرض ہے اور اس کے عوض زمیندار کو اس امر کا پابند کرنا کہ وہ مال صرف اُس کی معرفت بیچے گا اور کمیشن بھی دوسروں سے زائد لے گا، یہ قرض پر منفعت ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًا۔ ترجمہ: ''ہر وہ قرض جو (اصل رقم پر زائد) کسی منفعت کا باعث ہو، تو ایسی منفعت سود ہے، (کنز العمال: 15516)''۔یعنی قرض پر منفعت حرام ہے، لہٰذا یہ طریقہ کار ناجائز ہے۔

اسلامی بینک کا منافع حلال ہے

سوال:

کیا اسلامی بینک شرعی اصولوں کے مطابق کام کرتے ہیں اور اِن کے ساتھ لین دین اور نفع لینا جائز ہے؟۔

جواب:

اسلامی بینک کے بچت کھاتے میں کلائنٹ اور بینک کے مابین ''عقدِ مضاربت'' ہوتا ہے۔نفع میں دونوں کا تناسب طے ہوتا ہے۔کلائنٹ ''رَبُّ المال'' اور بینک ''مضارِب'' ہوتا ہے۔اسلامی بینک میں یہ اکاؤنٹ کھولنا اور اس کا منافع لینا جائز ہے۔مضاربت شرعی

میں خدانخواستہ نقصان کی صورت میں نقصان ''رَبُّ المال'' کا ہوتا ہے اور مضارِب کی محنت بے ثمر ہو جاتی ہے۔

کاروبار میں سود کی ایک صورت

سوال:

ہم کسی گاہک کو مالِ تجارت ادھار اِس شرط پر دیتے ہیں اگر اس کی ادائیگی 3 ماہ میں کی جائے گی تو 15 فیصد نفع لیں گے اور اگر اُس کی ادائیگی گاہک 6 ماہ میں کرے گا تو 18 فیصد نفع لیں گے، کیا یہ سود کے زمرے میں آئے گا؟ (محمد ہارون، نیو کراچی)۔

جواب:

بیع کے صحیح ہونے کی شرط بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی اور ثمن (قیمت) کا مُتعیّن ہونا ہے، کیونکہ یہاں ثمن مُتعیّن نہیں ہے بلکہ مدّت کے عوض قیمت بڑھ جاتی ہے، یہ سود ہے۔ اُس کے جواز کی صورت یہ ہے کہ ثمن اور مدت کا تعین کرلیں اور ادائیگی میں تاخیر کے سبب قیمت میں اضافہ نہ ہو۔

قسطوں پر سامان لینے پر جو اضافی رقم ادا کی جاتی ہے، وہ سود میں شمار نہیں ہوتی، مفتی وقارالدین قادری علیہ الرحمۃ'' سے سوال کیا گیا کہ:

(قسطوں پر سامان لینا کیسا ہے؟ مثلاً ایک چیز کی قیمت نقد =/17,000 روپے ہے اور قسطوں پر ہم اُس چیز کو لیتے ہیں، تو اس کی قیمت =/21,000 روپے ہو جاتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ نقد رقم سے جو زیادہ روپے دینے پڑتے ہیں، یہ سود ہے یا نہیں؟)۔ مالک بتادیتا ہے کہ آپ قسطوں پر لیں گے تو آپ کو اتنے روپے زیادہ دینے پڑیں گے''؟) آپ نے جواب میں لکھا: ''فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمتوں میں فرق کرنا جائز ہے اور اس طرح بیع کرنا کہ یہ چیز نقد دس روپے کی ہے اور ادھار پندرہ روپے کی، یہ جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں قسطوں پر سامان لینا جائز ہے اور قسطوں کی صورت میں جو زیادہ پیسہ دیا جاتا ہے، یہ سود نہیں ہے۔ اس میں ناجائز ہونے کی صورت مندرجہ ذیل ہوگی کہ اگر مالک

سے قیمت متعین کر کے کوئی چیز خریدی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اتنے روپے مالک کے خریدار کے ذمے واجب ہیں اور خریدار اُس چیز کا مالک ہو گیا اب خریدار مالک کو یہ روپیہ نقد نہ دے بلکہ یہ کہے کہ میں قسطوں میں اِس سے زیادہ ادا کروں گا، تو اِس صورت میں یہ زیادتی سود ہے اور حرام ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد سوم ص: 271)''۔

البتہ علامہ مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ لکھا ہے: ''یہ چیز نقد دس روپے کی ہے اور ادھار پندرہ روپے کی ہے، یہ جائز ہے''۔ یہ درست نہیں کہ ثمن کو مُعلّق رکھ کر بات کی جائے، بلکہ کسی ایک قیمت کا بیع کے وقت متعین کرنا ضروری ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو۔ ثمن مؤجل (Deffered Payment) کی صورت میں عقد کے وقت ثمن کا تعین اور ادائیگی کی مدت کا تعین ضروری ہے۔

چنانچہ امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: نَهٰی رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنْ بَیْعَتَیْنِ فِیْ بَیْعَةٍ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دو بیعوں کو ایک بیع میں کرنے سے فرمایا ہے، (جامع ترمذی: ص: 147، مطبوعہ: ضیاء القرآن)''۔

امام ترمذی ''بَیْعَتَیْنِ فِیْ بَیْعَةٍ'' کی ایک صورت بیان فرماتے ہیں:

وَقَدْ فَسَّرَ بَعْضُ اَهْلِ الْعِلْمِ قَالُوْا: بَیْعَتَیْنِ فِیْ بَیْعَةٍ اَنْ یَّقُوْلَ اَبِیْعُكَ هٰذَا الثَّوْبَ بِنَقْدٍ بِعَشَرَةٍ وَبِنَسِیْئَةٍ بِعِشْرِیْنَ۔

ترجمہ ''بعض اہل علم نے ''بَیْعَتَیْنِ فِیْ بَیْعَةٍ'' کی تفسیر کی ہے کہ ایک شخص کہے کہ میں تمہیں یہ کپڑا نقد دس کا اور ادھار بیس کا بیچتا ہوں، (جامع ترمذی: ص: 147، مطبوعہ: ضیاء القرآن)''۔

شوکانی اس حدیث پر طویل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: فِیْهَا الدَّلَالَةُ عَلَی الْمَنْعِ مِنَ الْبَیْعِ اِذَا وَقَعَ عَلٰی هٰذِهِ الصُّوْرَةِ وَهِیَ اَنْ یَّقُوْلَ نَقْدًا بِکَذَا وَنَسِیْئَةً بِکَذَا اِلَّا اِذَا قَالَ مِنْ اَوَّلِ الْاَمْرِ نَسِیْئَةً بِکَذَا فَقَطْ وَکَانَ اَکْثَرَ مِنْ سِعْرِ یَوْمِهٖ۔

ترجمہ: ''اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ جب بیع اس صورت پر واقع ہو کہ بائع

کہے کہ یہ چیز نقد اتنے کی اور ادھار اتنے کی تو یہ بیع ناجائز ہے(کیونکہ اس صورت میں قیمت متعین نہیں ہوتی بلکہ معلق رہتی ہے)، البتہ اگر وہ ابتداءً کہے کہ یہ چیز ادھار اتنے کی ہے خواہ وہ مقررہ قیمت اس دن کی بازاری قیمت سے زیادہ ہو، تو یہ بیع جائز ہے''۔

(نیل الاوطار، جلد:4،ص:20، دارالوفاء)

فتاویٰ عالمگیری میں بڑی صراحت کے ساتھ اس بیع کو ناجائز قرار دیا ہے:

رَجُلٌ بَاعَ عَلٰی اَنَّهٗ بِالنَّقْدِ كَذَا اَوْ بِالنَّسِيْئَةِ بِكَذَا اَوْ عَلٰی اَنَّهٗ اِلٰی شَهْرٍ بِكَذَا وَاِلٰی شَهْرَيْنِ بِكَذَا لَمْ يَجُزْ كَذَا فِي الْخُلَاصَةِ۔

ترجمہ:''ایک شخص نے اس طور پر بیع کی کہ یہ چیز نقد اتنے کی ہے اور ادھار اتنے کی ہے یا ایک ماہ کے ادھار پر اتنے کی ہے اور دو ماہ کے ادھار اتنے کی ہے تو یہ ناجائز ہے، اسی طرح خلاصہ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد:3،ص:136)۔اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اس صورت میں قیمت معلق رہتی ہے۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی ''فتاویٰ عالمگیری'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:''مگر صورتِ مسئولہ میں یہ ضرور ہے کہ نقد یا ادھار دونوں میں سے ایک صورت کو معین کر کے بیع کرے اور اگر معین نہ کیا، یوہیں مجمل رکھا کہ نقد اتنے کو اور ادھار اتنے کو تو یہ بیع فاسد ہوگی اور ایسا کرنا جائز نہ ہوگا، (فتاویٰ امجدیہ، جلد:3،ص:181، مکتبہ رضویہ، کراچی)۔

بعض عبارات میں اس کے خلاف موہم ہیں، یہاں ہم ان کا مطلب بیان کرتے ہیں مثلاً امام ابن ہمام متوفّٰی:861ھ بیان فرماتے ہیں:

فَاِنَّ كَوْنَ الثَّمَنِ عَلٰی تَقْدِيْرِ النَّقْدِ اَلْفًا وَعَلٰی تَقْدِيْرِ النَّسِيْئَةِ اَلْفَيْنِ لَيْسَ فِيْ مَعْنَى الرِّبَا۔ ''نقد کی صورت میں قیمت کا ہزار ہونا اور ادھار کی صورت میں دو ہزار سود کے معنی میں نہیں ہے، (فتح القدیر، جلد:6،ص:410)''۔

علامہ ابن ہمام نے اس عبارت میں یہ بتلایا ہے کہ یہ سود نہیں ہے، یہ نہیں کہا کہ یہ بیع جائز ہے اس میں عدم جواز کی وجہ ''بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ'' ہے۔

اسی طرح ملا علی قاری ہروی متوفی :1014ھ فرماتے ہیں:

فَسَّرُوا الْبَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ عَلَى وَجْهَيْنِ: اَحَدُهُمَا اَنْ يَقُوْلَ: بِعْتُكَ هٰذَا الثَّوْبَ بِعَشَرَةٍ نَقْدًا اَوْ بِعِشْرِيْنَ نَسِيْئَةً اِلٰى شَهْرٍ، فَهُوَ فَاسِدٌ عِنْدَ اَكْثَرِ اَهْلِ الْعِلْمِ لِاَنَّهُ لَا يَدْرِيْ اَيُّهُمَا جَعَلَ الثَّمَنَ وَثَانِيْهِمَا اَنْ يَقُوْلَ: بِعْتُكَ هٰذَا الْعَبْدَ بِعَشَرَةِ دَنَانِيْرَ عَلٰى اَنْ تَبِيْعَنِيْ جَارِيَتَكَ بِكَذَا فَهٰذَا اَيْضًا فَاسِدٌ لِاَنَّهُ بَيْعٌ وَشَرْطٌ۔

ترجمہ: ''بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ'' کی دوصورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ بائع یوں کہے کہ میں یہ کپڑا تم کو نقد دس روپے کا بیچتا ہوں یا ایک ماہ کے ادھار پر بیس روپے کا تو اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے کیونکہ اس صورت میں معین نہیں ہوا کہ اس نے کس قیمت کو ثمن قرار دیا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کہے میں تم کو یہ غلام دس دینار میں بیچتا ہوں کہ تم بھی اپنی کنیز مجھ کو اتنے میں بیچ دو اور یہ بیع بھی فاسد ہے کیونکہ یہ بیع اور شرط ہے''۔

(مرقاۃ المفاتیح، ج:6،ص:88)

''بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ'' کی یہاں دوصورتیں بیان کی ہیں لیکن جس صورت کو عالمگیری نے ناجائز قرار دیا ہے اس سے یہاں تعرض نہیں کیا گیا۔

بطور قرض دی ہوئی رقم پر زیادہ وصول کرنا سود ہے

سوال:

میرا نام ہما راشد ہے، شادی کے سوا سال بعد میرے سسر کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے بعد پتا چلا کہ وہ تقریباً 80 ہزار کے مقروض ہیں۔ قرض دینے والوں نے تنگ کرنا شروع کردیا، تو میرے شوہر نے مجھ سے کہا کہ تم اپنا زیور فروخت کردو میں تمہیں بعد میں بنوادوں گا۔ میں نے اپنی چار تولے سونے کی چھ چوڑیاں اور دو تولے کا ایک سونے کا سیٹ اپنے شوہر کے ساتھ لے کر صدر گئی اور 35 ہزار میں فروخت کردیا۔ رقم دیتے وقت میں نے کہا تھا کہ جب گھر بکے گا تو میں اپنا چھ تولہ سونا واپس لوں گی۔ اب میرے شوہر کہتے ہیں: ہاں ہم تم کو ضرور دیں گے، تم نے ہمارے والد کا قرضہ اتروایا ہے مگر تم نے میرے

ہاتھ میں 35 ہزار روپے دیئے تھے، ہم بھی تم کو 35 ہزار ہی واپس دیں گے، کیونکہ میرے بھائی بہن مالی طور پر کمزور ہیں۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے کہ گھر فروخت ہونے کے بعد مجھے میرا سونا واپس ملے گا یا رقم ؟۔ کیا مجھ پر فرض تھا کہ اپنے سسر کا قرض میں اتاروں۔

(ہما راشد، بفرزون، کراچی)

جواب:

آپ کا رقم دیتے وقت یہ کہنا کہ ''جب گھر بکے گا تو میں اپنا چھ تولہ سونا واپس لوں گی''، اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آپ نے اپنے شوہر کو سونا بطور قرض دیا تھا، لہٰذا اب آپ اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرسکتی ہیں اور شوہر پر لازم ہے کہ آپ کا قرض ادا کرے۔ اس موقف کو آپ کے اس بیان سے بھی تقویت ملتی ہے کہ: ''میرے شوہر نے مجھ سے کہا: تم اپنا زیور فروخت کردو، میں تمہیں بعد میں بنوادوں گا''، ظاہر ہے بعد میں سونے کا زیور ہی بنوا کر دینا ہوگا۔

وراثت کے مسائل

ترکے تقسیم اور مشترکہ کاروبار کا شرعی حکم

سوال:

میرے والدہ کا انتقال 1980 اور والد کا 1984 میں ہوا۔ ورثاء میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں، سب کم عمر تھے، پرورش، تربیت اور شادیاں چچا تایا اور پھوپھیوں نے کی۔ والد کی ایک دکان تھی، جس کی مالیت پانچ لاکھ روپے تھی، والد کے انتقال کے بعد اُسے کرائے پر دے دیا، ماہانہ =/3800 روپے 1986 تا 1992 کرایہ آتا رہا، اس کرائے کی رقم سے سوا دو لاکھ روپے کا پگڑی پر فلیٹ لے لیا۔ 1993 میں مزمل اور منصور دونوں بھائیوں نے دکان کی ذمہ داری سنبھالی، کرائے کی رقم سے سوا دو لاکھ کا مکان پگڑی پر خریدا اور 70 ہزار کا مال دکان میں ڈالا۔ اسی دوران مزمل اور منصور نے ایک جائیداد اور بنالی اور پگڑی پر دکان خریدی۔ پانچ سال قبل سب سے چھوٹے بھائی مدثر کی شادی پر 13 لاکھ روپے کا ایک مکان خریدا، جس کی مالیت آج 22 لاکھ روپے ہے۔ جس وقت مزمل اور منصور نے دکان سنبھالی ایک لاکھ ستر ہزار روپے مدثر نے انشورنس کے لے لئے تھے، تینوں بہنوں کو بھی انشورنس کی رقم ادا کردی گئی ہے، مگر مزمل اور منصور نے ایک لاکھ دس ہزار روپے اپنی دکان میں لگائے دیئے، جس کا ابھی تک حساب نہیں ہوا، ان دونوں نے پیسے نہیں لئے۔ چھوٹے بیٹے مدثر نے دکان پر کوئی مالی اور محنت طلب کام نہیں کیا۔ کیا اس کا حصہ دوسری دکان اور مکان میں بنتا ہے؟۔ اب اس جائیداد میں 3 بہنوں اور 3 بھائیوں کا کیا حصہ بنتا ہے؟، (مزمل، کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے: (1) ترکے سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کئے جاتے ہیں (2) اس کے بعد متوفّٰی کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو باقی ترکے سے قرض کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اگر اُس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اُس وصیت

کو پورا کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو وضع کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثا کے درمیان مندرجہ ذیل تناسب (Ratio) کے مطابق تقسیم ہوگا۔

ترکے کے 9 حصے کئے جائیں گے، ان میں سے ہر بیٹے کو فی کس دو دو حصے (کل چھ حصے) اور ہر بیٹی کو فی کس ایک ایک حصہ (کل تین حصے) ملے گا۔ چونکہ ترکہ والد کے انتقال کے فوراً بعد تقسیم نہیں ہوا، اس لئے دکان سے حاصل ہونے والی آمدنی ترکے میں شامل ہوگی اور اگر اس سے مزید کوئی چیز خریدی ہے، تو اسے بھی ترکے میں شامل کیا جائے گا۔ جن بھائیوں اور بہنوں کی انشورنس کی رقم ترکے میں سے لی ہے، وہ قرض ہے، اس کو مجموعی ترکے میں شامل کرکے ترکے کی تقسیم کے وقت ان کے حصے میں سے وضع کرلیا جائے، اسی طرح جن بھائیوں نے ترکے کے مال میں سے رقم لے کر اپنے کاروبار میں لگائی ہے، اس کا بھی یہی حکم ہے۔ واضح رہے کہ ترکے کی تقسیم کے وقت ہر چیز کی تقسیم کا حکم الگ الگ نہیں بیان کیا جاتا، ترکے (مثلاً مکان، دکان، پلاٹ، زیورات، بینک اکاؤنٹ، ڈیپازٹ سرٹیفکیٹس وغیرہ) میں سے ہر چیز کو فروخت کرکے یا اس کی موجودہ قیمت لگا کر مجموعی مالیت نکالی جاتی ہے اور پھر اس سب مال کی شریعت کے مطابق تقسیم ہوتی ہے۔ ترکے کی آمدنی میں سے اگر کسی وارث نے کوئی دکان خریدی ہے، تو یہ طے کرنا ورثاء کا کام ہے کہ آیا وہ رقم اُس نے بطور قرض لے کر اپنے ذاتی کاروبار کے لئے دکان خریدی تھی اور ذاتی کاروبار کررہا تھا؟، اگر جواب ہاں میں ہے، تو یہ رقم قرض ہے اور اسے کل ترکے میں جمع کرکے ترکے کی تقسیم کے وقت اس کے حصے میں سے وضع کی جاتی ہے، دکان کا نفع ونقصان اسی کا ہوگا۔ اگر دوکان اس نے مشترکہ جائیداد کے طور پر لی تھی، تو اس کا نفع ونقصان مشترکہ ہے، البتہ جو عامل بھی (Working Partner) ہے، وہ اپنی محنت کی اجرت لے سکتا ہے۔ اور یہ اجرتِ مثل ہو۔ یہ فیصلہ کرنا تمام وارثوں کا کام ہے یا اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان کی برادری میں عرف کیا ہے، یا کمیونٹی کے بزرگوں کی ایک ثالثی کمیٹی بنا کر اس سے فیصلہ کرالیں اور اسے

سب قبول کریں اور فیصلہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے منصفانہ فیصلہ کریں۔

باہمی رضامندی سے جائیداد کی تقسیم کے بعد مزید حصے کا مطالبہ درست نہیں

سوال:

میرے والد کے ترکے میں ہم دو بھائی وارث ہیں، جبکہ ترکے میں ایک مکان اور دو پلاٹ ہیں۔ ہم دونوں بھائیوں نے باہمی رضامندی سے وراثت کو اس طرح تقسیم کیا کہ بڑے بھائی نے دونوں پلاٹ لے لئے اور مجھے مکان دے دیا، جس کا قبضہ میرے پاس ہے۔ تقسیم کے وقت مکان اور پلاٹوں کی قیمت مساوی تھی، جس کی قانونی دستاویز گواہوں کے دستخط کے ساتھ میرے پاس موجود ہے۔ لہٰذا اب میرا بھائی میرے مکان کی ملکیت سے مزید حصہ مانگ رہا ہے، کیا اُس کا مطالبہ جائز ہے؟۔ (راؤ عطا محمد، نواب شاہ)

جواب:

آپ کی بیان کردہ صورتِ حال کے مطابق باہمی رضامندی سے فریقین تقسیم پر راضی ہو گئے اور مذکورہ جائیداد کی قیمت بھی مساوی تھی، لہٰذا اب کسی فریق کو دعوے کا حق حاصل نہیں۔ علامہ برہان الدین علی بن ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: وَلَوِ اخْتَلَفَا فِی التَّقْوِیْمِ لَمْ یَلْتَفِتْ اِلَیْہِ، لِاَنَّہٗ دَعْوَی الْغَبَنِ، وَلَا مُعْتَبَرَ بِہٖ فِی الْبَیْعِ، فَکَذَا فِی الْقِسْمَۃِ لِوُجُوْدِ التَّرَاضِیْ، اِلَّا اِذَا کَانَتِ الْقِسْمَۃُ بِقَضَاءِ الْقَاضِیْ، وَالْغَبَنُ فَاحِشٌ، لِاَنَّ تَصَرُّفَہٗ مُقَیَّدٌ بِالْعَدْلِ۔

ترجمہ: ”اگر دونوں (شریک) قیمت لگانے میں اختلاف کریں، تو اس کی جانب التفات نہیں کیا جائے گا، اِس لئے کہ یہ غبن کا دعویٰ ہے اور اس کا بیع میں اعتبار نہیں کیا جاتا، اسی طرح باہمی رضامندی سے جو تقسیم ہو جائے، اس میں بھی غبن کا اعتبار نہیں ہوگا، مگر اُس صورت میں جب قاضی کے فیصلے کے تحت تقسیم ہوئی ہو اور غبن فاحش ہو (یعنی دونوں حصوں کی طے کردہ قیمت میں نمایاں فرق ہو اور ایسا لگے کہ ایک فریق کے ساتھ کھلا دھوکا ہوا ہے)، تو پھر اس تنازعے پر توجہ دینا ہوگی، کیونکہ قاضی کے تصرُّف کے لئے عدل کی قید

ہے''۔ مزید لکھتے ہیں: وَاِذَاكَانَ أَرْضٌ وَبِنَاءٌ، فَعَنْ أَبِي يُوسُفَ رَحِمَهُ اللهُ أَنَّهُ يُقْسَمُ كُلُّ ذٰلِكَ عَلَى اِعْتِبَارِ الْقِيمَةِ، لِاَنَّهُ لَايُمْكِنُ اِعْتِبَارُ الْمُعَادَلَةِ اِلَّا بِالتَّقْوِيمِ، وَعَنْ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللهُ: أَنَّهُ يُقْسَمُ الأَرْضُ بِالْمَسَاحَةِ، لِأَنَّهُ هُوَالْاَصْلُ فِي الْمَمْسُوحَاتِ۔ ثُمَّ يَرُدُّ مَنْ وَقَعَ الْبِنَاءُ فِي نَصِيبِهِ، أَوْ مَنْ كَانَ نَصِيبُهُ أَجْوَدَدَرَاهِمَ عَلَى الْاٰخَرِحَتّٰى يُسَاوِيَهُ، فَتَدْخُلُ الدَّرَاهِمُ فِي الْقِسْمَةِ ضَرُوْرَةً كَالْأَخِ لَاوِلَايَةَ لَهُ فِي الْمَالِ، ثُمَّ يَمْلِكُ تَسْمِيَةَ الصَّدَاقِ ضَرُوْرَةَ التَّزْوِيجِ۔

ترجمہ: ''اور جب زمین اور عمارت پر مشتمل جائیداد کی (تقسیم) ہو، تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ ہر ایک کو قیمت کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے گا، اس لئے کہ (حصوں کے) برابر برابر ہونے کا اعتبار قیمت لگانے ہی سے ممکن ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ زمین کو پیمائش کر کے تقسیم کیا جائے گا، اِس لئے کہ قابلِ پیمائش اشیاء میں یہی اصل ہے، پھر جس کے حصہ میں عمارت واقع ہوئی ہو یا جس کا حصہ عمدہ ہو، وہ دوسرے کو کچھ نقد رقم دے یہاں تک کہ وہ اس کے برابر ہو جائے، تو ضرورت کی بنا پر دراہم (یعنی نقد رقم) تقسیم میں داخل ہوں گے، جیسے بھائی کو اپنی چھوٹی بہن کے مال میں تصرُّف کا اختیار نہیں ہے، لیکن نکاح کے صحیح ہونے کے لئے ضرورت کی بنا پر مہر مقرر کرنے کا اختیار ہے، (ہدایہ، جلد 7، ص: 87-78)''۔

آپ کے بیان اور گواہوں کی موجودگی میں لکھی گئی قانونی دستاویز کے مطابق جائیداد کی تقسیم کے وقت مکان اور دو پلاٹوں کی قیمت برابر تھی اور یہ تقسیم بھی باہمی رضامندی سے ہوئی تھی، اِس لئے اب آپ کے بھائی کا آپ سے مزید حصے کا مُطالبہ درست نہیں ہے۔ جو تقسیم باہمی رضامندی سے ہو چکی ہے، وہ شرعاً مؤثر اور نافذ ہے اور آپ کے مکان سے آپ کے بھائی کو مزید کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

ذوی الارحام میں ترکے کی تقسیم

سوال:

میری خالہ زاد بہن فرح ناز کا 7 جنوری 2012ء کو انتقال ہوگیا، اُس نے اپنی شادی کے لئے میرے پاس کچھ زیور رکھوایا تھا۔ نہ تو اُس کے والدین حیات ہیں اور نہ ہی کوئی بھائی، بہن۔ ورثاء میں اُس کے تین بھانجے اور ایک بھانجی ہے، جبکہ دو ماموں اور دو خالائیں بھی حیات ہیں۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ فرح ناز کی پھوپھی بھی امریکہ سے آئی ہوئی ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ مرحومہ کے بھانجے، بھانجی، ماموں، خالہ اور پھوپھی میں سے ترکے کا حق دار کون ہے؟، (فوزیہ عمران، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اسلامی قانونِ وراثت کی رُو سے ذوی الفروض اور عصبات کے بعد جو رشتے دار وارث بنتے ہیں، اُنہیں شرعی اصطلاح میں ''ذَوِی الْاَرْحَام'' کہا جاتا ہے۔ ذَوِی الارحام اُس وقت وارث ہوں گے، جب عصبات میں سے کوئی موجود نہ ہو اور نہ ہی اَصحابِ فرائض میں سے وہ لوگ موجود ہوں، جن پر مال دوبارہ رَد کیا جاسکتا ہے۔ یہ ذَوِی الارحام چار اقسام پر مشتمل ہیں: (۱) میت کی بیٹیوں یا پوتیوں کی اولاد (۲) میّت کے اصول یعنی وہ لوگ جن کی اولاد میں خود میت ہے، یعنی جدِّ فاسد یا جدۂ فاسدہ (۳) جو میت کے ماں باپ کی اولاد میں سے ہوں، حقیقی بھائیوں کی بیٹیاں، عَلّاتی (باپ شریک) بھائیوں کی بیٹیاں، اَخیافی (ماں شریک) بھائیوں کے بیٹے بیٹیاں اور ہر قسم کی بہنوں کی بیٹیاں (۴) جو میت کے دادا، دادی، نانا، نانی کی اولاد میں سے ہوں۔ اِن میں ترتیب یہ ہے کہ پہلی قسم کے وارث موجود ہوں تو دوسری قسم کے لوگ وارث نہیں بنیں گے، دوسری قسم کے ہوتے ہوئے تیسری قسم والے وارث نہیں ہوں گے اور تیسری قسم کے ہوتے ہوئے چوتھی قسم کے وارث نہیں ہوں گے۔ شیخ سراج الدین محمد بن رشید سجاوندی حنفی لکھتے ہیں: وَذَوُو الْاَرْحَامِ اَصْنَافٌ اَرْبَعَةٌ:۔۔۔۔ وَالصِّنْفُ الثَّالِثُ: یَنْتَمِیْ اِلَی اَبَوَیِ الْمَیِّتِ، وَھُمْ اَوْلَادُ الْاَخَوَاتِ

وَبَنَاتُ الْإِخْوَةِ وَبَنُوالْإِخْوَةِ لِأُمٍّ۔ وَالصِّنْفُ الرَّابِعُ يَنْتَمِي إِلَى جَدَّيِ الْمَيِّتِ أَوْ جَدَّتَيْهِ، وَهُمُ الْعَمَّاتُ وَالْأَعْمَامُ لِأُمٍّ وَالْأَخْوَالُ وَالْخَالَاتُ۔۔۔۔۔۔ وَرَوٰى أَبُويُوسُفَ وَالْحَسَنُ بْنُ زِيَادٍ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ، وَابْنُ سَمَاعَةَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللهُ: أَنَّ أَقْرَبَ الْأَصْنَافِ الصِّنْفُ الْأَوَّلُ، ثُمَّ الثَّانِي، ثُمَّ الثَّالِثُ، ثُمَّ الرَّابِعُ كَتَرْتِيبِ الْعَصَبَاتِ، وَهُوَالْمَأْخُوذُ بِهٖ۔

ترجمہ: ''ذَوِی الْاَرْحام کی چار قسمیں ہیں۔ (اُن میں سے) تیسری قسم میت کے والدین کی طرف منسوب ہوتی ہے اور (وہ یہ ہیں:) (ہر قسم کی) بہنوں کی اولاد (یعنی میت کے بھانجے، بھانجیاں) اور (میت کے ہر قسم کے) بھائیوں کی بیٹیاں (یعنی بھتیجیاں) اور اَخیافی (یعنی ماں شریک) بھائیوں کی بیٹے ہیں۔ اور چوتھی قسم میت کے دادا، نانا یا دادی، نانی کی طرف منسوب ہوتی ہے، وہ (ہر قسم کی) پھوپھیاں، اَخیافی چچا، (ہر قسم کے) ماموں اور خالائیں ہیں ۔۔۔ امام ابو یوسف اور حسن بن زیاد نے امام اعظم رحمہ اللہ سے اور ابن سماعہ نے امام محمد بن حسن سے اور اُنہوں نے امام اعظم رحمہ اللہ سے روایت فرمایا ہے کہ ذوی الارحام کی اقسام میں سے میت کے سب سے زیادہ قریب قسمِ اوّل ہے، پھر قسمِ ثانی، پھر قسمِ ثالث اور پھر قسمِ رابع یعنی عصبات کی ترتیب کی طرح ہے۔ اور اِسی کو اختیار کیا گیا ہے، (سراجی، ص: 85,86,87)''۔ صورتِ مسئولہ میں فرح ناز کا ترکہ اُس کے بھانجے اور بھانجیوں کے درمیان (یعنی لڑکے کے لئے لڑکی کا دُگنا کے تناسب سے) تقسیم ہوگا اور اُس کے ماموں، خالائیں اور پھوپھی محروم رہیں گی۔

کسی کی زمین یا مکان پر ظلماً قبضے کی سزا

سوال:

ہمارے والد محمد عزیز حسین مرحوم نے 1950ء میں 300 مربع گز کا ایک پلاٹ PECHS میں بحیثیت ممبر حاصل کیا تھا۔ اُس پلاٹ پر دو کمرے، غسل خانہ اور باورچی خانہ بنا کر ہم وہاں رہنے لگے۔ اِن دو کمروں کے بنانے میں والد صاحب کے بڑے

بھائی نے بھی تھوڑی سی معاونت کی لیکن وہ قطعی ایسی نہیں تھی کہ وہ یا اُن کی اولاد کسی طور پر بھی پلاٹ پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر سکیں۔ دو کمرے والد صاحب نے اپنے بڑے بھائی کو رہنے کے لئے دے دیئے، جس میں تا حال مقیم ہیں، جبکہ مکان کا پراپرٹی ٹیکس، پانی وسیوریج ٹیکسز اور بلدیاتی ٹیکس سمیت دیگر ٹیکسز کی ادائیگی میں (راقم) خود ہی کر رہا ہوں۔

یہاں اس بات سے آگاہی فراہم کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ گزشتہ کئی دہائیوں سے ہمارے والد مرحوم کے بڑے بھائی سید اختیار حسین (مرحوم) کی بیوہ (فیروزی بیگم) اور ان کا بیٹا (مصلح حسین) اور اس کا خاندان فتویٰ حاصل کرنے کے باوجود انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ گھر کے دو کمروں پر قابض ہیں اور مکان کے زُمرے میں آنے والے تمام تر واجب الادا ٹیکسز سے مُبرّا ہیں، جبکہ اسی دوران انہوں نے فیڈرل بی ایریا میں موجود اپنا ذاتی گھر فروخت کر کے گلشن اقبال میں دو منزلہ گھر بھی تعمیر کرایا ہے اور اس گھر کی ایک منزل پر ان کا بڑا بیٹا سید انتظار حسین اپنے خاندان کے ساتھ مقیم ہے جبکہ دوسری منزل کرائے پر اٹھا رکھی ہے۔

اس بات سے آگاہی بھی فراہم کرنا ضروری ہے کہ میرے (راقم) والد مرحوم اپنے گھر کے دو کمروں کو خالی کرانے کے انتظار میں ہی دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے، جبکہ ہماری والدہ بھی انتظار کی گھڑیاں برداشت نہ کر سکیں اور تقریباً 4 سال قبل خالق حقیقی سے جا ملیں۔

ہمارے والد صاحب نے اپنے بڑے بھائی سید اختیار حسین کے انتقال کے بعد کئی سالوں تک اس بات کا بھی انتظار کیا کہ مرحوم سید اختیار حسین کے پانچ بیٹوں اور دو بیٹیوں میں سے باقی رہ جانے والی تین بیٹیوں کی شادی ہو جائے، تمام بیٹیوں اور ایک بیٹے کی شادی ہونے کے بعد ہمارے والد مرحوم نے نہ صرف بیشتر مرتبہ دونوں کمروں کو خالی کرنے کا مطالبہ کیا بلکہ اس سلسلے میں انہیں فتویٰ بھی فراہم کیا لیکن بدقسمتوں نے فتویٰ کو بھی اہمیت نہیں دی۔

جناب عالی! مکان (گھر) کے قانونی وارث چار افراد بشمول دو بھائی غلام مصطفیٰ عزیز، محمد ثاقب عزیز اور دو بہنیں عِفّت اظہر زوجہ سید اظہر حسین اور صباحت رئیس زوجہ سید رئیس حسین پر مشتمل ہے اور میری (راقم) کی کوشش ہے کہ گھر کا بڑے ہونے کے ناطے جلد

از جلد وارثوں کو ان کا حق پہنچا دوں جبکہ وارثوں کو ان کا حق پہنچانے کے لئے مکان (گھر) کا خالی ہونا ضروری ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے کہ 1: مذکورہ فتویٰ حاصل کرنے کے بعد مکان (گھر) کے دو کمروں پر قابضین کی کیا سزا یا جزا ہو سکتی ہے؟۔2: ایسی صورت میں ہمارے (راقم) اور قانونی وارثین کے لئے کیا حکم ہے؟، (غلام مصطفیٰ عزیز)۔

جواب:

اگر آپ کا بیان درست اور حقیقت پر مبنی ہے اور مذکورہ مکان کسی شراکت کے بغیر آپ کے والد کی ملکیت ہے اور اُن کے انتقال کے بعد اُن کا ترکہ ہے، تو یہ تمام شرعی ورثاء کے درمیان اصولِ وراثت کے قوانین کے تحت تقسیم ہوگا۔ مذکورہ قابضین کا اُس مکان پر اپنا قبضہ قائم رکھنا حرام ہے، انہیں اِس سے باز آنا چاہئے اور مندرجہ ذیل حدیث پاک میں بیان کی ہوئی اس وعید کا مصداق بننے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ ''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا، طَوَّقَهُ اللهُ إِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ''۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا بھی ظلماً (یعنی ناحق) لے گا، تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (سزا کے طور پر) سات زمینوں کا طوق پہنائے گا، (صحیح مسلم: 4129)''۔

مُحدِّثین کرام نے اس حدیث کی تشریح دو طرح سے کی ہے۔ ایک یہ کہ اس ظلم کی سزا کے طور پر سات زمینوں کا طوق اُس کے گلے میں پہنایا جائے گا، دوسری یہ کہ ناحق غصب کی ہوئی زمین کا طوق اس کے گلے میں پہنایا جائے گا اور اسے حکم دیا جائے گا کہ اسے سات زمینوں تک گھسیٹتا پھرے۔ اُخروی عذاب کی وعیدیں احادیث میں بکثرت موجود ہیں۔ آپ کے موجودہ مکان پر فریقِ ثانی کا کوئی حق متعلق نہیں ہے۔

آپ کے تایا جب تک آپ کے والد کی اجازت سے آپ کے گھر کی بالائی منزل پر رہے، یہ فعل اور فائدہ اٹھانا ان کے لئے جائز تھا۔ جب سے آپ یا آپ کے والد نے اُن سے مکان کے بالائی حصے کو خالی کرنے کا مطالبہ کیا، اُس کے بعد اُن کا وہاں قیام خلافِ شرع اور خلافِ قانون ہے۔ اُنہیں بلا تاخیر آپ کا مکان خالی کر دینا چاہئے اور جتنا عرصہ وہ بلا اجازت

رہے، اتنے عرصے کا اُنہیں کرایہ دینا چاہئے، اور یہ رقم تمام شرعی ورثاء شریعت میں اُن کے مقررہ حصوں کے تناسب سے تقسیم ہوگی۔ پراپرٹی ٹیکس قانوناً مالک مکان پر عائد ہوتا ہے، البتہ اپنے حصے کی بجلی، گیس اور پانی کا بل اُنہیں ادا کرنا چاہئے۔

آپ نے لکھا ہے کہ فتویٰ دکھانے کے باوجود آپ کے تایا اور اُن کے پسماندگان نے مکان خالی نہیں کیا اور شرعی فتوے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اِس صورت میں ایک نیا فتویٰ لینے کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنے ملکیتی مکان کو قابضین سے خالی کرانے کے لئے قانونی طریقہ اختیار کریں اور عدالت سے رجوع کریں، کیونکہ عدالت کے پاس یہ اختیارات ہوتے ہیں کہ وہ حکومتی اداروں کو مکان خالی کرانے کا حکم جاری کرسکتی ہے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے عدالتی اَحکام کی تعمیل کے پابند ہوتے ہیں۔ فتویٰ تو شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے ہوتا ہے اور اسے وہ لوگ مانتے ہیں جنہیں آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جواب دہی کی فکر ہوتی ہے اور اِس پر ایمان ہوتا ہے۔

قاتل وارث نہیں بنتا

سوال:

موسیٰ ولد بخش قوم سیہڑ کئی سال قبل قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے تھے، اُن کے دو بچے ایک بیٹا محمد نواز اور ایک بیٹی عاشو مائی تھے۔ عاشو مائی کی کوئی اولاد نہیں، واضح رہے کہ عاشو مائی کو اس کے شوہر نے تشدد کر کے قتل کر دیا تھا قتل کی وجہ اولاد نہ ہونا تھی۔ عاشو مائی کے بعد محمد نواز کا انتقال 22 اکتوبر 1992ء کو ہوا محمد نواز کی اہلیہ پہلے انتقال کر چکی تھی اور محمد نواز کے ایک بیٹے غلام قاسم کا بھی 1991ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ اب محمد نواز کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ موسیٰ کی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی؟۔ عاشو مائی کی جائیداد سے اُس کے شوہر کو حصہ ملے گا محمد نواز کا ایک بیٹا غلام قاسم جو اُس کی زندگی میں انتقال کر گیا تھا، اُس کو محمد نواز کی جائیداد سے حصہ ملے گا؟، (محمد حق نواز، سیکٹر 4، نارتھ کراچی)

جواب:

مُتوفّٰی موسیٰ ولد بخش کی جائیداد 21 حصوں میں منقسم ہوگی، محمد نواز کے تینوں بیٹوں کو 18 حصے (فی کس 6 حصے) ملیں گے اور ایک بیٹی کو 3 حصے ملیں گے۔ محمد نواز کے مُتوفّٰی بیٹے غلام قاسم کا انتقال محمد نواز کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا لہٰذا اُسے محمد نواز کی جائیداد سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، غلام قاسم کی اولاد کو بھی ترکے سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ موسیٰ کی وفات کے وقت غلام قاسم کے بفرضِ محال زندہ رہنے کی صورت میں اپنے والد کے ترکے میں سے جو حصہ مل سکتا تھا، اگر تمام ورثاء باہمی رضامندی سے اُتنا یا اُس سے کچھ کم غلام قاسم مرحوم کی اولاد کو دیدیں، تو یہ ایک اَحسن عمل ہوگا، تبرُّع اور فضل واحسان ہوگا اور سب کو اللہ تعالیٰ سے اجر ملے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝

ترجمہ: ''اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر قرابت دار، یتامیٰ اور مساکین آجائیں (جو شرعاً وارث نہیں بن سکتے)، تو انہیں بھی (رضاکارانہ طور پر) ترکے میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو اور لوگ (یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ (اپنی وفات) کے بعد (خدانخواستہ) کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ جاتے، تو انہیں ان کے (رُلنے اور بے یار ومددگار ہونے کا کتنا) خوف ہوتا، تو انہیں چاہئے کہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور درست بات کہیں، (النساء:9-8)''۔ تو قرآن نے بتایا کہ اپنے پسماندگان پر کسی ایسے مشکل مرحلے کا تصور کر کے غیر وارث نادار اور کمزور رشتے داروں پر ترس کھا کر تقسیم وراثت کے وقت ان کی مدد کرلیا کرو۔ قرآن کا یہ حکم ایجابی (Obligatory) تو نہیں ہے، استحبابی ہے (Optional)، اس کی حیثیت مقاصدِ خیر کے لئے ترغیب کی ہے اور اس ترغیب میں ربّ العالمین نے حکمت وموعظت کا طریق اختیار فرمایا ہے کہ ایسا وقت کسی کے بھی مالی لحاظ سے کمزور و نادار پسماندگان پر آسکتا ہے۔

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ عاشو مائی کے شوہر نے اُسے قتل کیا ہے تو شوہر کو اُس کے ترکے سے حصہ نہیں ملے گا۔ کیونکہ قاتل اپنے مقتول کی وراثت سے محروم رہتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قاتل وارث نہیں ہوتا ہے، (سُنن ترمذی:2109)''۔

امام سراج الدین محمد بن عبدالرشید سجاوندی حنفی نے وراثت سے محرومی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا: وَالْقَتْلُ الَّذِیْ یَتَعَلَّقُ بِهٖ وُجُوْبُ الْقِصَاصِ أَوِ الْكَفَّارَةِ،

ترجمہ: ''(اُن میں سے ایک) وہ قتل ہے جس کے نتیجے میں (سزا کے طور پر) قصاص یا کفارہ واجب ہوتا ہے، (سراجی، ص:12)''۔

ترکے کی تقسیم میں تاخیر سے جائیداد کی قیمت میں فرق پر تاوان نہیں

سوال:

گھر کے سربراہ کا انتقال ستمبر 2006ء میں ہوا، ورثاء میں 7 بیٹے، 2 بیٹیاں اور ایک بیوہ شامل اور بقیدِ حیات ہیں۔ ترکہ میں ایک مکان اور ایک دکان شامل ہے، جس کی مجموعی مالیت 2006ء میں تقریباً پانچ کروڑ روپے بنتی تھی۔ تین بڑے بیٹوں نے جائیداد تقسیم نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور عرصہ پانچ سال وراثت تقسیم نہیں کی گئی۔ تقسیم نہ کرنے کے فیصلے میں چھوٹے چاروں بیٹوں اور دونوں بیٹیوں کو شریک نہیں کیا اور نہ ہی فیصلے سے مُطّلع کیا۔ اِس عرصہ میں (2006ء تا 2012ء) ولی مختار دو بڑے بھائیوں کے ساتھ مل کر باقی تین بھائیوں کی کسی خاص مد اور شرط کے بغیر ماہانہ امداد کرتے رہے۔ عرصہ پانچ سال گزرنے کے بعد 2012ء میں حالات کے پیشِ نظر تقسیم کا فیصلہ کیا گیا، اب پراپرٹی کی ویلیو کم ہونے کی وجہ سے ترکے کی مالیت آدھی یعنی ڈھائی کروڑ رہ گئی ہے۔ اِس تمام معاملے کی ذمہ داری کس پر آتی ہے اور باقی ورثاء اُس وقت کی مالیت کے نصاب سے دعویٰ کر سکتے ہیں؟، ولی مختار اتنا صاحبِ حیثیت ہے کہ اُس وقت (2006ء) کے نصاب کے مطابق

بھی ادا کر سکتا ہے، (محمد کبیر الدین اعظم، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مُتوفّی کا ترکہ 128 حصوں میں تقسیم ہوگا، بیوہ کو 16 حصے، سات بیٹوں کو 98 حصے (فی کس 14 حصے) اور دونوں بیٹیوں کو 14 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے۔

مُورِث کے انتقال کے وقت اگر تمام اولاد بالغ تھی، تو وہ ترکے کی تقسیم کا مطالبہ کر سکتے تھے اور اس کا انہیں شرعی و قانونی حق حاصل تھا۔ سب وُرَثاء کا ترکے کی تقسیم کا مطالبہ نہ کرنا، اُن کی طرف سے رضاءِ سُکوتی (Silent Permission) کی دلیل ہے۔ اصولی طور ترکے کی تقسیم میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے، ہر حق دار کو اُس کا حق مل جانا بہتر ہے۔ باقی غیر منقولہ جائیداد (مکان و پلاٹ وغیرہ) کی قیمتیں بالعموم وقت گزرنے کے ساتھ بڑھ جاتی ہے اور کبھی قومی و بین الاقوامی حالات کی وجہ سے کم بھی ہو جاتی ہیں، اس لئے اسے بدگمانی پر محمول نہیں کرنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے سوچا ہو کہ وقت گزرنے کے ساتھ قیمت بڑھ جائے گی، تاہم اس کمی کا تاوان اُن سے وصول نہیں کیا جا سکتا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

بچے کی تربیت کا حق

سوال:

بچے (بیٹے) کی پیدائش کے وقت میری بیوی کا انتقال ہوگیا، اب بچے کی عمر نو ماہ ہے، پیدائش سے اب تک بچے کی پرورش میں اور میری والدہ کر رہی ہیں۔ میری بیوی جاب کرتی تھی، سسرال والوں کے مطالبے پر میں نے تمام جہیز کا سامان، مہر کی رقم اور اُس کے جتنے پیسے تھے، سب اُنہیں دے دیئے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ بچے کی پرورش ہم کریں گے، بچہ 12-10 دن نانا، نانی کے پاس بھی رہتا ہے۔ میں صرف اپنے بچے کا بہتر مستقبل چاہتا ہوں۔ میں شرعی حکم جاننا چاہتا ہوں، (خالد حسین، بفرزون، کراچی)۔

جواب:

شادی کے موقع پر دلہن کو اُس کے والدین کی جانب سے جو زیورات، سامان، لباس اور دیگر اشیاء بطور جہیز دی جاتی ہیں، خواہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، وہ دلہن کی ملکیت ہوتی ہیں۔ اگر کبھی قضاءِ الٰہی سے اُس خاتون کا انتقال ہو جائے تو وہ تمام سامان اُس کے ترکے میں شامل ہو کر قانونِ وراثت کے اصولوں کے مطابق اُس کے ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: فَاِنَّ كُلَّ أَحَدٍ يَعْلَمُ اَنَّ الْجِهَازَ مِلْكُ الْمَرْأَةِ، وَاَنَّهُ اِذَا طَلَّقَهَا تَأْخُذُهُ كُلَّهُ، وَاِذَا مَاتَتْ يُوْرَثُ عَنْهَا وَلَا يَخْتَصُّ بِشَيْءٍ مِّنْهُ۔

ترجمہ: ''پس ہر شخص یہ جانتا ہے کہ جہیز عورت کی ملکیت ہوتا ہے، اور جب شوہر اس کو طلاق دے دے تو وہ تمام جہیز لے لے گی، اور جب اس عورت کا انتقال ہو جائے تو وہ جہیز بطور ترکہ اس کے وارثوں کو ملے گا اور اِس سے کسی چیز کی تخصیص نہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، صفحہ:709)

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''جہیز ہمارے بلاد کے عرفِ عام شائع سے خاص مِلکِ زوجہ ہوتا ہے، جس میں شوہر کا کچھ حق نہیں، طلاق ہوئی تو کل لے گئی اور مر گئی تو اسی کے ورثاء پر تقسیم ہوگا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص:202، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔ آپ کی بیوی کے جہیز کا تمام سامان، اگر کچھ اُن کی رقم تھی، وہ تمام رقم اور مہر، اُن کا ترکہ شمار ہوگا۔ اور حسبِ تناسب اُن کے ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگا۔ اولاد ہونے کی صورت میں شوہر کو بیوی کے ترکے سے چوتھائی حصہ ملتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ، ترجمہ: ''اور اگر اُن (تمہاری بیویوں) کی اولاد ہو، تو تمہارے لئے اُن کے (کل) ترکے کا چوتھائی حصہ ہے، (النسا:12)''۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کی فوت شدہ بیوی کے ترکے کی تقسیم اس تناسب سے ہوگی: کل ترکہ بارہ حصوں میں تقسیم ہوگا۔ مُتوفّاۃ کے والد کو 2 حصے، والدہ کو 2 حصے، شوہر کو 3 حصے اور بیٹے کو پانچ حصے ملیں گے۔

ماں فوت ہوجائے تو سات سال کی عمر تک بچے کی پرورش ونگہداشت کا حق نانی کو حاصل ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (ثُمَّ) أَيْ عَدَمُ الْأُمِّ بِأَنْ مَاتَتْ أَوْلَمْ تَقْبَلْ أَوْأَسْقَطَتْ حَقَّهَا أَوْتَزَوَّجَتْ بِأَجْنَبِيٍّ (أُمُّ الْأُمِّ) وَإِنْ عَلَتْ عِنْدَ عَدَمِ أَهْلِيَّةِ الْقُرْبٰى،

ترجمہ: ''ماں موجود نہ ہو، وہ فوت ہوجائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حق حضانت ساقط کر دے، یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کرلے جو بچے کے لئے اجنبی ہے، تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق حاصل ہے، یہ استحقاق بالترتیب اوپر تک جائے گا، اگر قریب والے میں پرورش کی اہلیت نہ ہو''۔

مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق سنِ شعور کو پہنچنے تک بچے کی پرورش کا حق شرعاً اُس کی نانی کو حاصل ہے اور آپ کے بیان کے مطابق وہ اِس کا مطالبہ بھی کررہے ہیں، تو آپ بچہ اُن کی تحویل میں دے دیں اور اُس کا خرچ بھی برداشت کریں اور اُنہیں بچے کو آپ سے ملاتے رہنا چاہیے۔ جب بچہ سنِ شعور کو پہنچ جائے، تو آپ اُسے اپنی تحویل میں لے سکتے ہیں۔ ولی ہونے کے اعتبار سے یہاں بھی وہی ترتیب ملحوظ ہے، جو وراثت میں معتبر ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ثُمَّ الْعَصَبَاتُ بِتَرْتِيْبِ الْإِرْثِ، فَيُقَدَّمُ الْأَبُ ثُمَّ الْجَدُّ

ترجمہ: ''پھر عصبہ مرد حضرات وارث ہونے کی ترتیب پر یعنی پہلے باپ، پھر دادا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5، ص:213-203، بیروت)

تقسیمِ ترکہ اور زکوٰۃ کا حکم

سوال:

میری اہلیہ کا انتقال ہوگیا ہے، ترکے میں سونے کے زیورات اور گھریلو سامان ہے۔ قرض کے علاوہ تقریباً16 سال کی زکوٰۃ واجب الادا ہے، مرحومہ کی نیت یہی رہی کہ زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ ورثاء میں والد، والدہ، شوہر دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟۔ نیز زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے کیا کرنا ہوگا، کیا صرف تہائی ترکے سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا کل ترکے سے؟۔ (سید راشد حسین، یاسین آباد کراچی)

جواب:

شریعت کی رُو سے میت کے ترکے میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے تین ضروری اُمور نمٹانے کے بعد ترکے کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) میت کے کفن دفن کے مصارف کی ادائیگی۔ (۲) میت کے ذمے اگر کوئی قرض ہو تو اس کی ادائیگی (۳) میت نے اپنی وفات سے پہلے اگر کوئی وصیت کی ہے تو تہائی ترکے کی حد تک اُس کا نفاذ۔ اِس کے بعد آپ کی فوت شدہ بیوی کا ترکہ حسبِ ذیل تناسب سے 72 حصوں میں تقسیم ہوگا:

شوہر کو 18 حصے، والد کو 12 حصے، والدہ کو 12 حصے، دونوں بیٹوں کو 20 حصے (فی کس 10 حصے) اور دونوں بیٹیوں کو 10 حصے (فی کس 5 حصے) ملیں گے۔ اولاد ہونے کی صورت میں شوہر کو بیوی کے ترکے سے چوتھائی حصہ ملتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ، ترجمہ: ''اور اگر اُن (تمہاری بیویوں) کی اولاد ہو، تو تمہارے لئے اُن کے (کل) ترکے کا چوتھائی حصہ ہے، (سورۃ النسا: 12)''۔

اپنی زندگی میں کسی شخص نے زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو مرنے کے بعد زکوٰۃ ساقط ہوگئی، اگر مرنے سے پہلے اُس نے وصیت کی ہو، تو کل ترکے کے تہائی حصے سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اور اگر زکوٰۃ کی رقم زیادہ ہو جو تہائی حصے سے پوری ادا نہیں ہوسکتی، تو اگر (بالغ) ورثاء اجازت دیں تو کل مال سے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: قَالَ أَصْحَابُنَا رَحِمَهُمُ اللهُ تَعَالٰى اِذَا مَاتَ مَنْ عَلَيْهِ الزَّكَاةُ سَقَطَتِ الزَّكَاةُ بِمَوْتِهٖ كَذَا فِى الْمُحِيْطِ۔

ترجمہ: ''ہمارے اصحابِ (احناف) رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب کسی ایسے شخص کا انتقال ہوگیا جس پر زکوٰۃ واجب تھی، اُس کی موت (کے سبب) اُس پر سے زکوٰۃ ساقط ہوگئی، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 176)''۔

ردالمحتار مع الدرالمختار میں ہے: وَاِلٰى أَنَّهَا لَا تُؤْخَذُ مِنْ تَرِكَتِهٖ لِفَقْدِ النِّيَّةِ اِلَّا اِذَا أَوْصٰى

فَتُعْتَبَرُ مِنَ الثُّلُثِ، وَتَمَامُهُ فِي "الْبَحْرِ"، زَادَ فِي "الْجَوْهَرَةِ" أَوْ تَبَرَّعَ وَرَثَتُهُ۔

ترجمہ: "(جس شخص پر زکوٰۃ واجب ہے، وہ مر گیا تو) اُس کے ترکے سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی، کیونکہ میت سے نیت متصور نہیں ہے (اور عبادت کے لئے نیت لازم ہے) ہاں! اگر اُس نے وصیت کی ہو تو تہائی ترکے سے (زکوٰۃ) لی جائے گی، اس کی تفصیل "البحر الرائق" میں ہے، "جوہرہ" میں یہ اضافہ ہے کہ اگر میت کے تمام ورثاء بطورِ تبرُّع اس پر واجب الاداز کوٰۃ ادا کرنا چاہیں، (تو درست ہے، بشرطیکہ تمام ورثاء عاقل وبالغ ہوں اور اپنی رضامندی سے اجازت دیں یا بعض اپنے حصے سے اجازت دیں)، (جلد 3، ص: 174)"۔

موت کی صورت میں زکوٰۃ ساقط ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آخرت میں اُس سے باز پرس نہیں ہوگی، باز پرس یقیناً ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ اسلام کا رکن ہے اور فرض قطعی ہے۔ اگر ورثا رضا کارانہ طور پر میت کے ترکے میں سے اس پر واجب الادا تمام سالوں کی زکوٰۃ نکال کر ادا کریں، تو یہ اُن کی سعادت ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے اُمید رکھنی چاہئے کہ وہ مرحومہ کو اس کی مسئولیت سے بری فرما دے، یہ محض اللہ کے کرم پر منحصر ہے۔ ورثاء چونکہ اپنے اپنے حصے میں سے دیں گے، تو اُنہیں بھی یقیناً اجر ملے گا۔ لیکن جو وارث راضی نہ ہو تو اس کے حصے سے زبردستی زکوٰۃ کی رقم منہا نہیں کی جائے گی۔

ترکے کا مسئلہ

سوال:

میرے شوہر طلعت حسین شاہ مرحوم ہائی کورٹ میں وکیل تھے، اُن کے انتقال کے بعد ہائی کورٹ سے تین لاکھ روپے بحیثیت Nominee مجھے ملنا تھے، میرے شوہر نے Nomination Form بھر لیا تھا لیکن موت نے مہلت نہ دی اور وہ فارم جمع نہ ہو سکا اور اِس سے پہلے ایک حادثے میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اب کورٹ والوں کا کہنا ہے کہ چونکہ Nomination Form ہم تک نہیں پہنچا، اس لئے اب یہ رقم اُن کے بھائی اور بہن کو بھی ملے گی۔ طلعت حسین کے ورثاء میں ایک بیوہ (ارم طلعت) ایک بیٹی مژگان

طلعت، ایک بھائی محمد عارف شاہ اور ایک بہن کشور جہاں موجود ہیں، جبکہ میرے شوہر کے دو بھائی (ذیشان نبی اور اقبال نبی) کا انتقال میرے شوہر کی زندگی میں ہو چکا تھا۔شریعت کی رُو سے میں اپنا اور اپنی بیٹی کا حصہ معلوم کرنا چاہتی ہوں،(ارم طلعت، کراچی)۔

جواب:

ہماری رائے میں ادارے کی جانب سے ملنے والے واجبات حکومت کی طرف سے مرحوم کی بیوہ کے لئے تبرُّع اور فضل واحسان (Donatoin or Gift) ہیں، یہ مرحوم کا ترکہ نہیں کہ اسے شرعی ورثاء میں اصولِ شرع کے مطابق تقسیم کیا جائے۔مثلاً پنشن حکومت کی طرف سے تبرُّع (گفٹ) ہے، یہ ترکہ نہیں ہے اور حکومت اپنے قوانین کے مطابق وفات یافتہ سرکاری ملازم کی بیوہ کو دیتی ہے، لہٰذا اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ حکومت یا محکمے کی طرف سے جو مالیاتی رعایت حکومت کی طرف سے تبرُّع (Donation) ہیں، اُن میں ان کے قوانین جاری ہوں گے۔

البتہ مرحوم کی اپنی جمع کی ہوئی رقم اور دوسرا ترکہ بھی، اگر کچھ ہے، تو وہ اصولِ وراثت کے قوانین کے تحت تمام ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگا۔متوفی کا ترکہ 8 حصوں میں تقسیم ہوگا، بیوہ کو 1/8 یعنی آٹھ میں سے ایک حصہ، بیٹی کو کل ترکے کا نصف یعنی 4 حصے ملیں گے اور بھائی کو دو حصے اور بہن کو ایک حصہ ملے گا۔طلعت حسین کے جن دو بھائیوں کا انتقال اُن کی زندگی میں ہوگیا تھا، اُنہیں یا اُن کی اولاد کو طلعت حسین کے ترکے سے کچھ نہیں ملے گا۔

شادی کا خرچ ترکے سے منہا نہیں کیا جائے گا

سوال:

میرے شوہر کے انتقال کو 17 سال ہو چکے ہیں، اُن کے دو فلیٹ تھے، ضرورت پڑنے پر میں نے بیچ کر بچوں کی پرورش اور شادیوں پر خرچ کئے۔میرے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے، اب میرے شوہر کا ایک 120 گز کا مکان ہے، جس میں ہم رہتے ہیں۔بیٹی کی شادی پر ایک لاکھ روپے کم پڑ رہے تھے، جو میں نے شوہر کا ایک فلیٹ بیچ کر پورے کئے

تھے اور باقی رقم بیٹے کی شادی پر خرچ ہوئی۔شادی پر خرچ کی گئی رقم ورثاء کے شرعی حصوں سے لی جائے گی، اگر ایسا ہے تو جو رقم بیٹوں کی شادی پر خرچ ہوئی کیا وہ بھی اُن کے حصے سے کاٹی جائے گی؟۔ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ (شمیم اختر، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو ترکے کی تقسیم سے پہلے کے اُمور مثلاً مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگیٔ قرض اور اگر کوئی وصیت کی ہو تو تہائی مال کی حد تک وصیت کے نفاذ کے بعد آپ کے مُتوفّٰی شوہر کا ترکہ 8 حصوں میں تقسیم ہوگا، بیوہ کو 1/8، تینوں بیٹوں کو 6 حصے (فی کس 2 حصے) اور ایک بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔

جن دو فلیٹوں کا آپ نے ذکر کیا، وہ مرحوم کا ترکہ شمار ہوں گے اور حسبِ تناسب ورثاء کے درمیان تقسیم ہوں گے۔شادیوں کے اخراجات ترکے سے منہا نہیں کیے جائیں گے کہ شادی کے مصارف آپ کے شوہر کے ذمے لازم نہیں تھے۔امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ”شادی کا صَرف مانگنا محض بے معنی ہے، جس کی شرعِ مُطہر میں کچھ اصل نہیں، مصارفِ شادی زید پر دَین (قرض) نہ تھے کہ اُس کے ترکے سے لئے جائیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص:170)“۔

اِس مسئلے کا حل یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کے مُتوفّٰی شوہر کے ترکے کی مجموعی مالیت لگائی جائے اور تمام مالیت حسبِ تناسب ورثاء کے درمیان تقسیم کرنے کے بعد (لڑکے اور لڑکیوں میں سے) ہر ایک کی شادی پر ہونے والے اخراجات اُس کے حصے سے منہا کر دیئے جائیں اور ہر وارث کے حصے میں ان اخراجات کو وضع کرنے کے بعد جو رقم آئے، وہ اُسے دے دی جائے۔ اگر والدہ یا بھائی رضا کارانہ طور پر بہن کی شادی کے اخراجات اپنے ذمے لینا چاہیں، تو یہ اُن کی طرف سے پھر تبرُّع اور حسنِ سلوک ہوگا اور بہن کو اُس کا پورا حصہ ملے گا۔

حادثات وسانحات میں وفات پانے والوں کی امدادی رقوم کی تقسیم

سوال:

گذشتہ دنوں بلدیہ ٹاؤن میں فیکٹری میں آتشزدگی کا جو سانحہ ہوا تھا، میری بہن پروین زوجہ محمد حامد اُس میں جاں بحق ہوگئی۔ گورنمنٹ آف پاکستان کے اعلامیے کے مطابق ورثاء کو مبلغ نولاکھ روپے دیئے گئے ہیں۔ قانونی ورثاء میں (۱) محمد حامد (شوہر) (۲) محمد رفیق (والد) (۳) رئیسہ بیگم (والدہ) اور (۴) محمد شفیق (بھائی) ہیں۔ اس رقم کی تقسیم کس طرح ہوگی؟، (محمد شفیق، سرجانی ٹاؤن)۔

جواب:

کوئی فوت شدہ شخص اپنی وفات کے وقت جو مال چھوڑ کر جاتا ہے۔ اُسے شریعت کی اصطلاح میں وِرثہ، ترکہ یامالِ موروث (INHERITANCE) کہتے ہیں۔ حادثات وسانحات کے بعد وفات پانے والوں کے پسماندگان یاوُرثاء کو جو امدادی رقوم دی جاتی ہیں، یہ ترکہ یعنی وفات شدہ شخص کا اپنا چھوڑا ہوا مال نہیں ہے، ورنہ آپ کے سوال کی نوبت ہی نہ آتی، اُس کے لئے اسلام کا قانونِ وراثت پہلے سے موجود ہے اور وہ مُروّجہ ملکی قانون کی رُو سے بھی مؤثر اور نافذ العمل ہے۔ اس طرح کے سانحات یا حادثات (مثلاً آتش زنی، کسی عمارت کا منہدم ہوجانا اور لوگوں کا ملبے تلے دب کر مرجانا، بس، ٹرین یا ہوائی جہاز کے حادثے میں مرجانا، بمب بلاسٹ، خودکش حملے یا دہشت گردی کے کسی واقعے میں ہلاک ہوجانا وغیرہ) میں حکومت وفات یافتہ شخص کے ورثاء کو مدادی رقم دیتی ہے، بعض اوقات نجی افراد یا فلاحی ادارے بھی امدادی رقوم کا اعلان کرتے ہیں۔

اس طرح کے سانحات میں امدادی رقم کی تقسیم کے لئے حکومت کا کوئی قانون یا روایت پہلے سے موجود ہے، تو وہ اس پر عمل کرسکتی ہے، جیسے حکومت وفات یافتہ سرکاری ملازم کی پنشن اس کی بیوہ کو دیتی ہے، لیکن اگر وہ دوسری شادی کرلے، تو اُس کے بعد پنشن روک دی جاتی ہے۔ اور اگر بیوی پہلے وفات پاگئی ہے یا بیوہ کچھ عرصے کے بعد وفات پاگئی ہو تو اُس

کے بعد اگر وفات یافتہ شخص کی 21 سال سے کم عمر کی اولاد ہے، تو اُن کو وہ پنشن جاری کی جاتی ہے، ورنہ پنشن بند کردی جاتی ہے۔ اور اگر حکومت کا پہلے سے کوئی قانون موجود نہیں ہے تو اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق وفات یافتہ شخص کے شرعی ورثاء میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس سلسلے میں حکومت قانون سازی کرے اور اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق وفات یافتہ شخص کے شرعی ورثاء میں تقسیم کرے۔ اگر وفات یافتہ شخص کی بیوہ اور نابالغ اولاد ہو (یعنی اولاد یتیم رہ جائے) تو حکومت اُن کے لئے بھی یہ رقم مختص کرسکتی ہے، اسی طرح اگر والدین زندہ ہیں اور صرف یہی ایک بیٹا (یا بیٹی) اُن کا کفیل تھا، تو اُن کیلئے بھی مختص کرسکتی ہے۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے اگر اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم کی جائے، تو ورثاء کے حصے حسبِ ذیل ہوں گے:

کل 6 حصے ہوں گے، شوہر کو 3 حصے، والدہ کو ایک حصہ اور والد کو بطور عصبہ 2 حصے ملیں گے، بھائی کو کچھ نہیں ملے گا۔

ترکے کی تقسیم سے قبل مکان استعمال کرنے والے وارث سے دیگر ورثاء کا کرائے کا مطالبہ

سوال:

والد صاحب کے انتقال کو تقریباً 6 سال ہونے والے ہیں، وراثت میں ایک مکان چھوڑا۔ ورثاء میں اُن کی بیوہ، تین بیٹے اور تین بیٹیاں (سب شادی شدہ) ہیں۔ ایک بیٹا ملک سے باہر ہے اور دو بیٹے اُس مکان میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ اُس مکان میں دو دکانیں بھی ہیں جو کرائے پر دی رکھی ہیں، گذشتہ تین سال سے کرایہ ہر ماہ شرعی حصص کے تناسب سے تمام ورثاء کے درمیان تقسیم ہوجاتا ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ مکان میں جو دو بھائی رہتے ہیں، کیا اُن کا اُس مکان میں رہنا صحیح ہے، اور اُن کو وہاں رہنے کا کرایہ دینا چاہئے یا نہیں؟۔ کیا ہمارا یہ مطالبہ درست ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر کوئی وارث یہ مطالبہ کرے کہ مکان فروخت کر کے مجھے میرا حصہ دے دیا جائے اور جب تک مکان فروخت نہیں ہوتا تو

کرایہ لگایا جائے، تو کیا اُس کا یہ مطالبہ درست ہے؟۔ اگر مکان میں رہائش پذیر ورثاء سے کرایہ لیا جائے تو کب سے شمار ہوگا؟، (بدرالنساء، L-63 پاک کوثر ٹاؤن، ملیر)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی وفات یافتہ شخص کے ترکے کو تقسیم کرنے سے قبل تین قسم کے مصارف وضع کیے جاتے ہیں: (۱) مصارف تکفین وتدفین (2) متوفی کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو قرض کی ادائیگی (3) اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہوتو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک وصیت کا نفاذ، بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو۔ یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ آپ کے والد کا ترکہ 72 حصوں میں تقسیم ہوگا، بیوہ (یعنی آپ کی والدہ) کو 9 حصے، تینوں بیٹوں کو 42 حصے (فی کس 14 حصے) اور تین بیٹیوں کو 21 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے۔

شرعاً ہونا تو یہ چاہئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، تمام ورثاء کے درمیان ترکہ تقسیم کردیا جائے، کیونکہ تقسیم میں تاخیر سے پیچیدگیاں اور خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ تمام ورثاء کو حقِ وراثت حاصل ہے اور اپنے اپنے حصوں کے بقدر تمام ورثاء جائیداد میں تصرُّف کا حق رکھتے ہیں۔ آپ نے سوال میں لکھا ہے کہ ورثاء میں بیوہ، تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، جن میں سے دو بیٹے اور بیوہ اُس مکان میں رہتے ہیں، تقسیمِ ترکہ کے نتیجے میں جتنی جگہ اُن کے حصے میں آتی ہے، اُسی قدر تصرُّف کا اختیار اُنہیں حاصل ہے، دوسرے ورثاء کے حصے میں اُن کی اجازت کے بغیر تصرُّف نہیں کرسکتے۔ اگر بغیر اجازت دوسرے ورثاء کے حصے کو برتا، تو اُن کے مطالبے پر اُس جگہ کا کرایہ دینا ہوگا۔ لیکن اگر آپ کے دو بھائی اور والدہ دوسرے ورثاء کی اجازت سے رہتے رہے ہیں یا اُنہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، تو یہ اُن کی طرف سے تبرُّع اور احسان سمجھا جائے گا اور ان پر کسی قسم کا کوئی کرایہ لازم نہیں ہوگا۔

وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے

سوال:

میرا نام ہما راشد ہے، میرے والد صاحب کی عمر اِس وقت تقریباً 70-65 کے درمیان ہے، والدہ 18 سال سے بیمار تھیں، والد صاحب نے اُن کی دل وجان سے تیمارداری اور دیکھ بھال کی، دو ماہ قبل والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں سب شادی شدہ اور اپنے گھروں کے ہیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ والد صاحب اب بہت اکیلے ہو گئے ہیں اور میں اُن کی دوسری شادی کروانا چاہتی ہوں، جس پر وہ بھی رضامند ہیں۔ مگر میرے بھائی اِس کے خلاف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دوسری خاتون کے آنے سے جائیداد کے معاملات متاثر ہوں گے، ہم مالی طور پر کمزور ہیں تو والد صاحب کبھی ہماری مالی مدد کر دیا کرتے ہیں، دوسری شادی سے بیٹیوں کا میکا ختم ہو جائے گا، ہم اپنے ابو سے کوئی فرمائش یا تکلیف بیان نہیں کر سکیں گے۔ سب کی الگ الگ سوچ ہے۔ میرے ابو کی ملکیت دو مکان (ایک میں رہائش پذیر ہیں اور عمارت کا بقیہ حصہ کرائے پر دے رکھا ہے، دوسرے میں ایک پورشن میں بڑے بھائی رہائش پذیر ہیں اور بقیہ حصہ کرائے پر دے رکھا ہے) ایک کارخانہ ہے جو کرائے پر دیا ہوا ہے، تمام پراپرٹی کا کرایہ والد صاحب کے پاس آتا ہے اور یہ خالصۃً ابو کی کمائی کا ہے۔ اِس مسئلے کا حل ابو یہ پیش کرتے ہیں کہ میں ایک وصیت تیار کرا لوں گا جس کے مطابق میرے بعد میری جائیداد 6 حصوں میں منقسم ہو گی، پانچوں بچوں کو ایک ایک اور ایک دوسری بیوی کے لئے۔ مگر بڑے بھائی کا کہنا ہے کہ ابو چاہے جتنی وصیت بنا لیں، ابو کے انتقال کے بعد وصیت نافذ ہو گی تو بہنوں کا حصہ بھائی سے آدھا ہو جائے گا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ شریعت میں اس عمر میں دوسری شادی، حق مہر، بیوی کے حقوق، جائیداد یا ترکے کے بارے میں کیا احکامات ہیں؟۔ ابو اپنے کسی بچے کو زیادہ سے زیادہ کتنا دے سکتے ہیں۔ مجھ سے چھوٹی دونوں بہنوں نے امی کی خدمت کی، مجھ سے چھوٹی بہن بہت ایمان دار اور ابو اور بھائی کا خاص خیال رکھنے والی ہے۔ کیا ابو اپنی مرضی

سے کسی کو زیادہ حصہ دے سکتے ہیں؟ ، (ہماراشد، بفرزون، کراچی)۔

جواب:

آپ کی سوچ اپنے والد صاحب کے بارے میں مثبت ہے، قابلِ تعریف ہے، صلۂ رحمی اور ہمدردی پر مبنی ہے۔ آپ نے پنے والد صاحب کی عمر کی مناسبت سے اُن کی ضروریات کا بجاطور پر احساس کیا ہے۔ بڑھاپے میں کوئی بیماری یا تکلیف لاحق ہوجاتی ہے، تو بیوی ایسی حالت میں جو مدد کرسکتی ہے، بعض اوقات اولاد بھی نہیں کرسکتی۔ رشتۂ ازدواج میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی حکمتیں رکھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے زوجین کو ایک دوسرے کے لئے پردہ پوش اور تسکین کا سبب قرار دیا ہے اور اِس رشتے کو مَوَدَّت اور رَحمت پر قائم فرمایا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: ''اور اُس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم کو اُن سے سکون حاصل ہو، اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم فرمادی، بے شک اِس میں غور وفکر کرنے والے لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں، (روم:21)''۔

آپ کے بھائی کی سوچ بدقسمتی سے خودغرضی پر مبنی ہے، اُن کی نظر باپ کی ضرورت، راحت یا آسائش پرنہیں ہے بلکہ اُن کی جائیداد پر ہے۔

آپ کے بھائی کا یہ خدشہ کہ باپ کی شادی کی صورت میں کسی اور وارث کے حصے پر اَثر پڑے گا، درست نہیں ہے، بیوی کا اولاد والے شوہر کے ترکے میں صرف آٹھواں حصہ ہوتا ہے۔ آپ کے والد صاحب شادی کریں یا نہ کریں، اُن کے انتقال کے بعد جب اُن کا ترکہ تقسیم ہوگا تو ہر بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں دُگنا حصہ ملے گا، یہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا طے کیا ہوا قانونِ وراثت ہے اور اِسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ، (ترجمہ: ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، (النساء: 11)''۔

ہمارا ملکی قانون بھی اِسے تسلیم کرتا ہے۔ اور اگر آپ کے والد آپ لوگوں کے حق میں کوئی وصیت کر بھی دیں، تو وہ شرعاً اور قانوناً مؤثر نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے: ''سَمِعْتُ أَبَا أُمَامَةَ، قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّ اللهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ''۔

ترجمہ: ''ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داود: 2862)''۔

اگر آپ کے والد شادی کرتے ہیں تو اُن کی ہونے والی بیوی کا جو حقِ مہر مقرر ہوگا، وہ اُس کی حق دار ہوگی، اگر والد صاحب نے اپنی زندگی میں بیوی کا حقِ مہر ادا کر دیا، تو فبہا، ورنہ اگر بیوی سے پہلے اُن کی وفات ہوجاتی ہے، تو اُن کے ترکے سے دینِ مہر کی ادائیگی ہوگی۔

اگر آپ کے والد اپنی زندگی میں اپنی کل جائیداد یا اُس کا کچھ حصہ اپنی اولاد کو ہبہ (Gift) کرنا چاہتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ کے نزدیک پسندیدہ اَمر یہ ہے کہ بیٹے اور بیٹی کو برابر برابر دیں۔ حدیث پاک میں ہے: حَدَّثَنِي النُّعْمَانُ بْنُ بَشِيْرٍ أَنَّ أُمَّهُ بِنْتَ رَوَاحَةَ سَأَلَتْ أَبَاهُ بَعْضَ الْمَوْهُوْبَةِ مِنْ مَالِهِ لِابْنِهَا، فَالْتَوَى بِهَا سَنَةً، ثُمَّ بَدَا لَهُ، فَقَالَتْ: لَا أَرْضَى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَلَى مَا وَهَبْتَ لِابْنِي، فَأَخَذَ أَبِي بِيَدِي، وَأَنَا يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ، فَأَتَى رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ! إِنَّ أُمَّ هٰذَا، بِنْتَ رَوَاحَةَ، أَعْجَبَهَا أَنْ أُشْهِدَكَ عَلَى الَّذِيْ وَهَبْتُ لِابْنِهَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ''يَا بَشِيْرُ! أَلَكَ وَلَدٌ سِوَى هٰذَا؟''، قَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ: أَكُلَّهُمْ وَهَبْتَ لَهُ مِثْلَ هٰذَا؟، قَالَ: لَا، قَالَ: فَلَا تُشْهِدْنِيْ إِذًا، فَإِنِّيْ لَا أَشْهَدُ عَلَى جَوْرٍ''۔

ترجمہ: ''نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے

ان کے والد سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ انکے بیٹے (حضرت نعمان) کو ہبہ کردیں، میرے والد نے ایک سال تک یہ معاملہ ملتوی رکھا، پھر انہیں اسکا خیال آیا، میری والدہ نے کہا میں اسوقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ تم میرے بیٹے کے ہبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کرلو، میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے۔ اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا، انہوں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ کرلوں، جو میں نے اپنے اس لڑکے کو ہبہ کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟، انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اتنا ہی مال ہبہ کیا ہے؟، انہوں نے کہا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا، (صحیح مسلم:4179)"۔

اِس حدیث کی رُو سے رسول اللہ ﷺ نے اولاد کے درمیان ہبہ میں عدمِ مساوات کو ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔

اگر کسی خاص وجہ سے اولاد میں سے کسی ایک کو زیادہ دینا چاہتے ہیں، مثلاً یہ کہ اس نے خدمت زیادہ کی ہے، یا وہ دوسروں کے مقابلے میں جسمانی، ذہنی یا مالی اعتبار سے پسماندہ ہے یا وہ دین داری میں فضیلت رکھتا ہے، توکسی حدتک اس کی گنجائش ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَلَوْ وَهَبَ رَجُلٌ شَيْئًا لِأَوْلَادِهِ فِي الصِّحَّةِ وَأَرَادَ تَفْضِيلَ بَعْضٍ عَلَى الْبَعْضِ فِي ذٰلِكَ لَا رِوَايَةَ لِهٰذَا فِي الْأَصْلِ عَنْ أَصْحَابِنَا، وَرُوِيَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى أَنَّهُ لَا بَأْسَ بِهِ إِذَا كَانَ التَّفْضِيلُ لِزِيَادَةِ فَضْلٍ لَهُ فِي الدِّيْنِ وَإِنْ كَانَا سَوَاءً يُكْرَهُ، وَرَوَى الْمُعَلَّى عَنْ أَبِي يُوسُفَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى أَنَّهُ لَا بَأْسَ بِهِ إِذَا لَمْ يَقْصِدْ بِهِ الْإِضْرَارَ وَإِنْ قَصَدَ بِهِ الْإِضْرَارَ سَوّٰى بَيْنَهُمْ يُعْطِي الْابْنَةَ مِثْلَ مَا يُعْطِي لِلْابْنِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى هٰكَذَا فِي "فَتَاوٰى قَاضِيخَان"، وَهُوَ الْمُخْتَارُ كَذَا فِي الظَّهِيْرِيَّةِ۔

ترجمہ: "اگر کوئی اپنی صحت کے عالم میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے اور اس میں بعض کو بعض

پر ترجیح دینا چاہیے، ہمارے اصحاب سے اصل (یعنی مبسوط) میں اس کی بابت کوئی روایت منقول نہیں ہے، اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جبکہ کچھ زیادہ دینے کا سبب اس کی دین داری میں فضیلت ہو، اور اگر دونوں (یا سب) دین داری میں برابر ہوں تو پھر کسی کو ترجیح دینا مکروہ ہے۔ اور المعلیٰ نے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے جب کہ مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہ ہو، اور اگر کسی کو نقصان پہنچانا مقصود ہے تو پھر سب کو مساوی دے، بیٹی کو وہی دے جو بیٹے کو دیتا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے اور "فتاویٰ قاضی خان" میں بھی اسی طرح ہے اور یہی مختار ہے اور ظہیریہ میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، صفحہ: 391)"۔

غیر شادی شدہ یا لاولد بیٹے کا کل ترکہ باپ کو ملے گا

سوال:

ایک غیر شادی شدہ نوجوان کے انتقال کی صورت میں اُس کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا، ورثاء میں اُس کے والد، تین بھائی اور دو بہنیں موجود ہیں۔ تقسیم کس طرح ہوگی؟۔

(سید مبین الدین، گلستانِ جوہر، کراچی)

جواب:

از روئے شرع کسی بھی متوفیٰ شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل مصارف تکفین وتدفین (2) متوفیٰ کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو قرض کی ادائیگی (3) اگر متوفیٰ نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت، بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں مُتوفیٰ نوجوان کے والد عصبہ محض کی حیثیت سے تمام ترکہ پائیں گے اور بھائی، بہن محروم رہیں گے۔

سراجی میں ہے: وَالتَّعْصِيبُ الْمَحْضُ وَذٰلِكَ عِنْدَ عَدَمِ الْوَلَدِ وَوَلَدِ الْاِبْنِ وَاِنْ سَفَلَ۔

ترجمہ: "محض عصبہ بننا، یہ میت کی اولاد اور پوتا وغیرہ نہ ہونے کی صورت میں ہے"۔ (ص:15)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَیَسْقُطُ الْاِخْوَۃُ وَالْاَخَوَاتُ بِالْاِبْنِ وَابْنِ الْاِبْنِ وَاِنْ سَفَلَ وَبِالْاَبِ بِالْاِتِّفَاقِ وَبِالْجَدِّ عِنْدَ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی

ترجمہ: ''(میت کے ہر قسم کے) بھائی بہن، حقیقی بیٹے یا پوتے (اگرچہ نیچے تک ہوں) کی موجودگی میں (ترکے سے) محروم ہوجاتے ہیں اور (میت کے) باپ کی موجودگی میں بھی ساقط ہوجاتے ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دادا کے ہوتے ہوئے بھی محروم ہوجاتے ہیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6،ص:450)''۔

مشترکہ جائیداد کا شرعی حکم

سوال:

ہمارے والد کا انتقال 1998ء میں اور والدہ کا 1979ء میں ہوا۔ والد صاحب کے ورثاء میں ہم پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ والد صاحب کی سامان سے بھری ایک دکان تھی، جس میں پانچوں بھائیوں نے والد صاحب کے ساتھ مل کر کام کیا۔ تین بیٹوں کو والد صاحب نے وقتاً فوقتاً کاروبار چھوڑنے پر اپنے حساب سے پیسہ دے کر کہا کہ یہ کاروبار میں تمہارا حصہ ہے۔ انتقال کے وقت سامان اور نقد رقم ملا کر بارہ لاکھ نوے ہزار روپے تھے اور دو بیٹے ساتھ کام کررہے تھے۔ انتقال سے پہلے والد صاحب برملا کہا کرتے تھے کہ دکان میں موجود تمام سامان میں میرے دو حصے ہیں یعنی نصف مال میرا ہے، بیان کردہ صورت کو مدنظر رکھتے ہوئے تقسیم کس طرح ہوگی؟۔

(سید لیاقت علی، شاہ فیصل کالونی کراچی)

جواب:

باپ کی زندگی میں جو کاروبار تھا، جو بیٹے ساتھ مل کر کام کرتے تھے، وہ مال میں شریک نہیں ہیں، تمام مال باپ کی ملکیت ہوتا ہے اور باپ کے انتقال کے بعد تمام وارثوں کا ہے، اُس میں جتنا اضافہ ہوگا، وہ ورثاء کا ہوگا۔ اگرچہ کاروبار چلانے والے چند افراد ہوں اور باقی ورثاء عملی طور پر کام نہ کررہے ہوں۔

تنویرالابصار مع الدر المختار میں ہے: یَقَعُ کَثِیْرًا فِی الْفَلَّاحِیْنَ وَنَحْوِھِمْ اَنَّ اَحَدَھُمْ یَمُوْتُ فَتَقُوْمُ اَوْلَادُہٗ عَلٰی تَرِکَتِہٖ بِلَا قِسْمَۃٍ وَیَعْمَلُوْنَ فِیْھَا مِنْ حَرْثٍ وَزِرَاعَۃٍ وَبَیْعٍ وَشِرَاءٍ وَاسْتِدَانَۃٍ وَنَحْوِ ذٰلِکَ، وَتَارَۃً یَکُوْنُ کَبِیْرُھُمْ ھُوَالَّذِیْ یَتَوَلّٰی مُھِمَّاتِھِمْ وَیَعْمَلُوْنَ عِنْدَہٗ بِاَمْرِہٖ، وَکُلُّ ذٰلِکَ عَلٰی وَجْہِ الْاِطْلَاقِ وَالتَّفْوِیْضِ۔

ترجمہ: ''اکثر کاشتکار اور دیگر (پیشوں سے وابستہ) لوگوں میں یہ ہوتا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی فوت ہو جائے، تو اُن کی اولاد ترکے کو تقسیم کیے بغیر اِسی طرح قائم رکھتی ہے اور وہ اُس زمین میں کھیتی باڑی کرتے ہیں، خرید و فروخت، قرض کا لین دین اور دوسرے اُمور جاری رکھتے ہیں، اور کبھی فوت ہونے والے کا بڑا بیٹا تمام کاموں کی نگرانی کرتا ہے اور چھوٹے اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، یہ سب ایک طرح سے غیر رسمی تفویض اختیار ہوتا ہے (یعنی وہاں کے لوگوں کا عرف یا عادت ہے)''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: فَاِذَا کَانَ سَعْیُھُمْ وَاحِدًا وَلَمْ یَتَمَیَّزْ مَاحَصَّلَہٗ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْھُمْ بِعَمَلِہٖ، یَکُوْنُ مَاجَمَعُوْہُ مُشْتَرَکًا بَیْنَھُمْ بِالسَّوِیَّۃِ، وَاِنِ اخْتَلَفُوْا فِی الْعَمَلِ وَالرَّأْیِ کَثْرَۃً وَّصَوَابًا، کَمَا اَفْتٰی بِہٖ فِی ''الْخَیْرِیَّۃِ''، وَمَا اشْتَرَاہُ اَحَدُھُمْ لِنَفْسِہٖ یَکُوْنُ لَہٗ وَیَضْمَنُ حِصَّۃَ شُرَکَائِہٖ مِنْ ثَمَنِہٖ اِذَا دَفَعَہٗ مِنَ الْمَالِ الْمُشْتَرَکِ۔

ترجمہ: ''پس جب ان کی سعی ایک ہے اور ہر ایک کی محنت کی کمائی جدا جدا نہ ہو، تو سب جمع شدہ مال میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، اگرچہ ذہنی وفکری عمل کی مقدار ایک جیسی نہ ہو، نہ یہ امتیاز ہی ہو کہ کس کی رائے یا عمل زیادہ نفع بخش ہوا اور کس کا کم، ''فتاویٰ خیریہ'' میں اِسی طرح کا فتویٰ دیا ہے۔ اور ان میں سے اگر کسی نے اپنی ذات کے لئے کچھ خریدا تو وہ اُس کا مالک ہو جائے گا اور اگر اُس نے مشترکہ مال سے قیمت دے کر خریدا تھا، تو اس میں شرکاء کا جو حصہ صرف ہوا، اس کا وہ ضامن ہوگا، (جلد 6،ص:372)''۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کے والد مرحوم کے ترکے کی شرعی تقسیم '' لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (ترجمہ: ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11)'' کے

تحت ہوگی یعنی ہر بیٹے کو دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔یعنی کل بارہ حصے ہوں گے،ان میں سے ہر بیٹے کو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔

ترکے کی تقسیم کا ایک مسئلہ

سوال:

ہمارے والد صاحب کے انتقال کو چار سال ہو گئے ہیں،ورثاء میں بیوہ، پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔والد کا ترکہ ایک مکان اور ایک دکان ہے جو حیدر آباد میں ہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد دو بھائی دکان میں کاروبار کرتے رہے لیکن پھر کاروبار بند کر دیا۔دکان کا کچھ حصہ کرایہ پر دیا ہوا ہے،جس کا کرایہ والدہ صاحبہ اور تین بھائیوں کو ملتا ہے والد صاحب پر کچھ کاروباری قرض تھا اور اس کے علاوہ اُن کی بیماری پر ایک بھائی نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر علاج میں لگایا تھا۔دکان کا کچھ حصہ جو کرائے پر دیا ہوا تھا اُس کا ایڈوانس والد صاحب نے لیا تھا،وہ ایڈوانس واپس کرنا ہے۔اب یہ معلوم کرنا ہے کہ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟۔والد صاحب پر جو کاروباری قرض تھا،دکان کا جو ایڈوانس لیا تھا، والد صاحب کے علاج پر بھائی کی بیوی کا زیور فروخت ہو کر جو رقم لگی،اِن سب کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟۔زیور جتنے کا بکا،اتنی رقم دی جائے گی یا جتنا زیور تھا،اتنے ہی وزن کا زیور واپس کرنا ہے؟۔واضح رہے کہ ہم اس پر متفق ہیں کہ اُسے زیور خرید کر دیا جائے۔

(نور محمد، بلاک 15،فیڈرل بی ایریا،کراچی)

جواب:

شرعاً ہونا تو یہ چاہئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو،تمام ورثاء کے درمیان ترکہ تقسیم کر دیا جائے کیونکہ تقسیم میں تاخیر سے پیچیدگیاں اور خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔شریعت کی رُو سے کسی بھی وفات یافتہ (فوت شدہ) شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل (۱) مصارف تکفین وتدفین (2) فوت شدہ کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو،تو قرض کی ادائیگی (3) اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس کا نفاذ،بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی

وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ کل ترکہ 88 حصوں میں تقسیم ہوگا، بیوہ کو 11 حصے، پانچوں بیٹوں کو 70 حصے (فی کس 14 حصے) اور ایک بیٹی کو 7 حصے ملیں گے۔ ترکے کی تقسیم سے قبل مُتوفّٰی کے ذمے جو کاروباری قرض، دکان کے ایڈوانس کی مد میں لی جانے والی رقم ہے، اُس کی ادائیگی تقسیم سے پہلے مُتوفّٰی کے مال سے کی جائے گی۔ دکان سے حاصل ہونے والا کرایہ بھی تمام ورثاء کے درمیان درج بالا طریقے پر تقسیم ہوگا۔

آپ کے والد صاحب نے دکان کی جو ایڈوانس رقم لی ہوئی تھی، وہ ترکے میں سے بطور قرض وضع کی جائے گی، آپ کی بھابھی سے اگر زیور قرض کے طور پر لیا گیا تھا، تو وہ بھی ترکے سے منہا ہوگا۔ اگر اس سے اتنی مقدار کے طلائی زیورات کا وعدہ ہوا تھا تو اس کے مطابق ادائیگی ہوگی۔ آپ کی والدہ اور بھائی جو کرایہ لیتے رہے، وہ اگر آپ لوگوں کی رضا سے تھا، تو آپ لوگوں کی طرف سے تبرُّع اور احسان شمار ہوگا۔

ذوی الارحام کا تقسیمِ ترکہ میں حصہ

سوال:

ایک خاتون زمانی بیگم کے شوہر اجمل حسین کا انتقال 1979ء میں ہوگیا تھا، ایک بیٹی (نورزمانی) شادی شدہ کا انتقال 1975ء میں ہوا تھا۔ زمانی بیگم کا انتقال 1989ء میں ہوا اور ترکے میں ایک مکان چھوڑا، ورثاء میں اُس وقت ایک بیٹا محمد حفیظ اور دو بیٹیاں نفیسہ اور ضمیر سلطانہ حیات تھیں۔ نفیسہ کا انتقال 2009ء میں ہوا اور اولاد کوئی نہیں تھی، صرف شوہر (الیاس احمد) حیات ہے۔ ضمیر سلطانہ کا انتقال 2012ء میں ہوا، اُس کے ورثاء میں چار بیٹے (فیصل، فیضان، سلمان، عدنان) اور چار بیٹیاں (نازیہ، شازیہ، صائمہ، فرناز) ہیں۔ محمد حفیظ کا انتقال 2013ء میں ہوا ہے، اِن کی بھی کوئی اولاد نہیں ہے، صرف ایک بیوہ طاہرہ ہے۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟۔

(طاہرہ، ناظم آباد، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست اور حقیقت پر مبنی ہے اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو ترکے کی تقسیم سے قبل کے لازمی اُمور کو نمٹانے کے بعد زمانی بیگم کا بقیہ ترکہ 576 حصوں میں تقسیم ہوگا:

طاہرہ (بیوہ محمد حفیظ): 84 حصے، نفیسہ کے شوہر الیاس کو 72 حصے، ضمیر سلطانہ کے چاروں بیٹوں کو 280 حصے (فی کس 70 حصے) ضمیر سلطانہ کی چاروں بیٹیوں کو 140 حصے (فی کس 35 حصے)

مذکورہ مسئلے میں محمد حفیظ کے ورثاء میں صرف اُس کی بیوہ طاہرہ ہے، ذوی الفروض اور عصبات میں سے کوئی وارث نہیں ہے جبکہ بہن ضمیر سلطانہ کی اولاد (بیٹے اور بیٹیاں) ذوی الارحام میں داخل ہیں۔ قانونِ وراثت کا اصول یہ ہے کہ ذوی الارحام اُس وقت وارث ہوں گے جب کہ اَصحابِ فرائض میں سے وہ لوگ موجود نہ ہوں، جن پر مال دوبارہ رَد کیا جاسکتا ہے اور عصبہ بھی نہ ہوں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَاِنَّمَا یَرِثُ ذَوُو الْاَرْحَامِ اِذَالَمْ یَکُنْ اَحَدٌ مِّنْ أَصْحَابِ الْفَرَائِضِ مِمَّنْ یُرَدُّ عَلَیْهِ وَلَمْ یَکُنْ عَصَبَةٌ وَأَجْمَعُوْا عَلٰی أَنَّ ذَوِی الْاَرْحَامِ لَایُحْجَبُوْنَ بِالزَّوْجِ وَالزَّوْجَةِ أَیْ یَرِثُوْنَ مَعَهُمَا فَیُعْطٰی لِلزَّوْجِ وَالزَّوْجَةِ نَصِیْبُهُمَا ثُمَّ یُقْسَمُ الْبَاقِیْ بَیْنَ ذَوِی الْاَرْحَامِ،

ترجمہ: ''ذوی الارحام اُس وقت وارِث ہوں گے جب اَصحابِ فرائض میں سے وہ لوگ موجود نہ ہوں، جن پر مال دوبارہ رَد کیا جاسکتا ہے اور عصبات بھی نہ ہوں، تو اِس پر اِجماع ہے کہ زوجین کی وجہ سے ذوی الارحام مجوب (محروم) نہیں ہوں گے یعنی زوجین کا حصہ لینے کے بعد ذوی الارحام پر تقسیم کیا جائے گا''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 459)

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: بَلْ یُفْتٰی بِتَوْرِیْثِ ذَوِیْ أَرْحَامِهٖ، وَکَذَاقَالَ الْهَرَوِیْ أَفْتٰی کَثِیْرٌ مِّنَ الْمَشَایِخِ بِتَوْرِیْثِ ذَوِیْ أَرْحَامِهٖ۔

ترجمہ: ''بلکہ ذوی الارحام کو جائیداد سے حصہ دینے کا فتویٰ دیا جائے گا، جیسا کہ ''ہروی'' نے فرمایا: مشائخ کی بڑی تعداد ذوی الارحام کو حصہ دینے کا فتویٰ دیتی ہے''۔

(جلد 10، ص:444)

اَصحابِ فرائض اور عصبات میں سے کوئی نہ ہونے کی وجہ سے محمد حفیظ کے ترکے میں ضمیر سلطانہ کے بیٹے اور بیٹیوں کو'' لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11)'' کے تحت ملے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: مَااِذَا کَانَ کُلُّھُمْ اَوْلَادُ وَارِثٍ ھُوَ عَصَبَۃٌ کَبِنْتَیْ اِبْنَی الْاَخِ لِاَبَوَیْنِ اَوْ لِاَبٍ اَوْ ذُوْ فَرْضٍ کَبَنَاتِ اَخَوَاتٍ مُتَفَرِّقَاتٍ اَوْ اَوْلَادُ وَارِثَیْنِ، اَحَدُھُمَا عَصَبَۃٌ، وَالْاٰخَرُ ذُوْ فَرْضٍ کَبِنْتِ اَخٍ لِاَبَوَیْنِ اَوْ لِاَبٍ، وَبِنْتِ اَخٍ لِاُمٍّ، وَاَمَّا اِذَا لَمْ یَکُنْ فِیْھِمْ وَلَدُ وَارِثٍ کَبِنْتِ اِبْنِ اَخٍ وَابْنِ بِنْتِ اُخْتٍ کِلَاھُمَا لِاُمٍّ عِنْدَ اَبِیْ یُوْسُفَ یُعْتَبَرُ الْاَقْوٰی فِیْ ھٰذِہِ الصُّوَرِ ثُمَّ یُقْسَمُ عَلَی الْاَبْدَانِ لِلذَّکَرِ ضِعْفُ مَا لِلْاُنْثٰی۔

ترجمہ: ''یعنی جب وہ سب کے سب ایک عصبہ وارث کی اولاد ہوں، جیسے حقیقی یا علاتی بھائی کے دو بیٹوں کی دو بیٹیاں یا متفرق بہنوں کی بیٹیاں جو ذوی الفروض ہوں یا ایسے دو وارثوں کی اولاد جن میں سے ایک عصبہ ہو اور دوسرا ذوی الفروض میں سے ہو، جیسے حقیقی یا علاتی بھائی کی بیٹی اور اَخیافی بھائی کی بیٹی۔ لیکن جب ان میں کوئی وارث کی اولاد نہ ہو، جیسے بھتیجے کی بیٹی اور بھانجی کا بیٹا جو دونوں اَخیافی ہوں، امام ابویوسف کے نزدیک اس صورت میں جو وراثت میں اَقویٰ ہو، اس کا اعتبار ہوگا، پھر'' لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ '' کے اصول کے تحت افراد میں تقسیم ہوگی، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:10، ص:402)''۔

دوسرے کی جائیداد پر مسجد و مدرسہ کی تعمیر

میری والدہ زیتون النساء کا انتقال 15 جنوری 2013ء کو ہوا، میں اُن کی اکلوتی بیٹی ہوں اور کوئی اولاد نہیں۔ میری والدہ کا خمیسہ گوٹھ میں ایک مکان ہے۔ کچھ لوگ اُس مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ والدہ نے اُن سے اِس مکان میں مدرسہ بنانے

کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میری والدہ نے مجھ سے کبھی اِس خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ محلے میں مسجد اور مدرسہ پہلے سے موجود ہے۔ مجھے فتویٰ عنایت فرمائیں، (رشیدہ بیگم، لیاقت آباد)۔

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ آپ کی فوت شدہ والدہ نے کوئی وصیت نہیں کی تھی اور اُس کا کوئی شرعی وقانونی ثبوت نہیں ہے، تو اُن کا ترکہ اُن کے شرعی وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ آپ نے چونکہ اپنے علاوہ کسی اور وارث کا ذکر نہیں کیا، اِس لئے کل ترکے کی تقسیم کا فارمولا یا تناسب ہم نہیں بتاسکتے۔ البتہ آپ کو کل ترکے کا نصف حصہ ملے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ

ترجمہ: ''اور اگر کسی کی وارث ایک بیٹی ہو، تو اُسے ترکے کا آدھا ملے گا، (النسا: 11)''۔

پس اس آیت کی رو سے اگر آپ کے علاوہ اور کوئی بھی وارث نہیں ہے تو باقی آدھا ترکہ بھی آپ کو بطور ردّ مل جائے۔

قریب مسجد یا مدرسہ ہو یا نہ ہو، کسی کو دوسرے کی جائیداد پر غیر قانونی قبضہ کرکے کارِ خیر کرنے کی اجازت نہیں ہے، ایسے لوگوں کو اللہ کے غضب سے ڈرنا چاہئے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا، طَوَّقَهُ اللهُ إِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ''۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا بھی ظلماً (یعنی ناحق) لے گا، تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (سزا کے طور پر) سات زمینوں کا طوق پہنائے گا، (صحیح مسلم: 4129)''۔

اور اگر کسی کے پاس مکان کو مسجد یا مدرسہ کے لئے صدقۂ جاریہ کے طور پر دینے کی کوئی وصیت ہے اور اُس کا شرعی اور قانونی ثبوت موجود ہے، تو وصیت کل ترکے کے صرف ایک تہائی تک نافذ ہوسکے گی۔

تقسیم سے قبل ترکے میں یکطرفہ تصرُّف جائز نہیں ہے

سوال:

میری والدہ زلیخا بائی کے انتقال کو چھ سال ہو چکے ہیں، ورثاء میں ہم تین بہنیں (روبینہ بانو، فرزانہ بانو، شمع بانو) اور ہمارے والد صاحب ہیں، والدہ کی تدفین کے بعد شمع بانو نے بتایا کہ ہم میاں بیوی نے کچھ عرصہ قبل والدہ سے سونے کی دو چوڑیاں یہ کہہ کر لی تھیں کہ اگر آپ زندہ رہیں تو ہم واپس کر دیں گے ورنہ معاف کر دینا لیکن اِس بات کا کوئی گواہ نہیں ہے۔ والدہ کا ایک مکان چھوٹے بہنوئی نے فروخت کروایا، والد صاحب نے تین تین لاکھ روپے کے چیک ہم تینوں بہنوں کو دیئے اور بقیہ رقم (تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ روپے) اُن کے اکاؤنٹ میں جمع ہوگئی۔ اُن کے اکاؤنٹ کو بھی میرے چھوٹے بہنوئی نے بہن کے ساتھ مل کر جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوالیا، تھوڑی تھوڑی رقم اکاؤنٹ سے نکالی جانے لگی، جنوری میں دو لاکھ پچاسی ہزار روپے نکالے گئے، کچھ دنوں بعد والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد جب بینک اسٹیٹمنٹ سامنے آیا تو چھوٹی بہن نے اقرار کیا کہ ابو نے مجھے گاڑی کے لئے رقم دی تھی، اِس کے علاوہ مزید رقم کا پتا نہیں چل سکا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ والدین کے ترکے میں ہم تین بہنیں کس تناسب سے حصہ دار بنیں گی؟، (فرزانہ بانو، صدیق آباد)۔

جواب:

شریعت کی رُو سے کسی بھی وفات یافتہ (فوت شدہ) شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل مصارف تکفین وتدفین (2) متوفی کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو قرض کی ادائیگی (3) اور اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس کا نفاذ، بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ آپ کے والدین کا ترکہ تین مساوی حصوں میں تقسیم ہوگا، تینوں بیٹیوں کو برابر برابر حصہ ملے گا۔ آپ کی بہن

اور بہنوئی نے جو چوڑیاں لی تھیں، وہ بھی مرحومہ کے ترکے میں شامل کر کے تقسیم کی جائیں گی کیونکہ شمع بانو کی طرف سے واپس کرنے کا وعدہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ چوڑیاں اُن کو ہبہ نہیں کی گئی تھیں بلکہ انہوں نے اپنی والدہ سے عاریۃً لی تھیں۔ اسی طرح جو ساڑھے پانچ لاکھ روپے کی رقم آپ کی چھوٹی بہن یا بہنوئی کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی، وہ کل ترکے میں شامل ہوگی۔

آپ کی والدہ کے ترکے میں والد کا حصہ صرف چوتھائی تھا، اس سے زیادہ پر تصرُّف کا اُنہیں شرعاً اختیار نہیں تھا، ایک بیٹی کو وہ جو کچھ نوازتے رہے، اگر وہ مرحومہ کے ترکے میں سے تھا تو یہ تقسیم سے قبل بے جا تصرُّف ہے، آپ کی والدہ کے انتقال کے بعد اگر ترکے کی مُنصفانہ تقسیم کی جاتی تو یہ مسائل جنم نہ لیتے اور آپ کے والد تقسیم میں عدل نہ کرنے کے سبب آخرت میں مواخذے سے بچ جاتے۔ تاہم افضل یہ ہے کہ ترکے کی صحیح رقم کا تخمینہ لگا کر مساوی تقسیم کا عمل اپنایا جائے۔

ترکے کی تقسیم

سوال:

میرا داماد جس کی عمر 29 سال تھی، گزشتہ دنوں انتقال کر گیا ہے، ورثاء میں بیوی، ایک بیٹا، ایک بیٹی، والدہ اور والد ہیں۔ ترکے میں ایک گاڑی بینک اکاؤنٹ اور تین کمروں کا ایک مکان جو اُس نے کاروباری وجوہات کے سبب ماں کے نام کر دیا تھا، لیکن قبضہ نہیں دیا تھا، انتقال کے وقت تک مرحوم اُسی مکان میں رہتے تھے۔ اُس کی والدہ کا آٹھ کمروں پر مشتمل اپنا ذاتی مکان بھی ہے اور والدہ اُسی مکان میں رہتی ہیں۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟۔ (افشاں، کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی فوت شدہ شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے: (1) ترکے سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کئے جاتے

ہیں (2) اس کے بعد متوفی کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو اس ترکے میں سے قرض کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اگر اُس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اُس وصیت کو پورا کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارثِ شرعی کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں حسبِ شرعِ مطہر تقسیم ہوتا ہے۔ متوفّٰی کا ترکہ 72 حصوں میں منقسم ہوگا، بیوہ کو 9 حصے، والد کو 12 حصے، والدہ کو 12 حصے، ایک بیٹے کو 26 حصے اور بیٹی کو 13 حصے ملیں گے۔

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ آپ کے داماد نے مذکورہ مکان محض کاروباری وجوہات کے سبب والدہ کے نام کیا تھا، قبضہ نہیں دیا تھا، تو شرعاً محض نام کردینے سے ملکیت تام نہیں ہوتی۔ قبضہ نہ تو حقیقی طور پر پایا گیا اور نہ ہی حکمی طور پر، پس مذکورہ مکان وفات یافتہ شخص کا ترکہ شمار ہوگا اور حسبِ بالا تناسب ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگا۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: قَالَ فِي التَّتَارْخَانِيَةِ: قَدْ ذَكَرْنَا اَنَّ الْهِبَةَ لَاتَتِمُّ اِلَّا بِالْقَبْضِ وَالْقَبْضُ نَوْعَانِ: حَقِيْقِيٌّ وَاَنَّهُ ظَاهِرٌ، وَحُكْمِيٌّ وَّذٰلِكَ بِالتَّخْلِيَةِ۔

ترجمہ: ''تاتارخانیہ میں ہے: ہم ذکر کرچکے ہیں کہ بے شک ہبہ قبضہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور قبضہ کی دو قسمیں ہیں: حقیقی: وہ تو ظاہر ہے اور حکمی تو وہ تخلیہ سے ہوتا ہے، (منحۃ الخالق علیٰ حاشیۃ البحر الرائق، جلد 7، ص:486)''۔ تخلیہ سے مراد ہبہ شدہ مکان یا زمین کو اپنے استعمال، تصرُّف اور قبضے سے نکال دینا تاکہ جس شخص کو یہ جائیداد ہبہ کی گئی ہے، وہ اس پر قبضہ کرسکے اور اس قبضے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ہم نے یہ شرعی حکم بیان کیا ہے، قانونی معاملات کے لئے کسی ماہرِ قانون سے رجوع کریں۔

ٹریفک حادثہ کی دیت

سوال:

میرے بھانجا محمد ارسل ایوب 13 اکتوبر 2011ء کو اپنے دوست عمر کی موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا، ڈیفنس خیابانِ بخاری روڈ پر ایک تیز رفتار کار جسے

عادل اقبال ڈرائیو کرر ہا تھا، کی ٹکر سے ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ عادل اقبال میرے بھانجے کا خون بہا دینے کو تیار ہے۔خونبہا کی شرعی رقم کیا ہونی چاہیے؟۔ اگر خون بہا لے لیا جائے تو روزِ قیامت ملزم کو اُس کے جرم کی سزا ملے گی یا نہیں؟۔ (شہاد القریش، باتھ آئی لینڈ، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں یہ ''قتل بالسَّبَب'' کی صورت ہے اور ''قتل بالسَّبَب'' میں قاتل کے عصبہ (وُرثاء) پر دِیَت لازم ہے اور قاتل پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَأَمَّا الْقَتْلُ بِسَبَبٍ فَمِثْلُ حَفْرِ الْبِئْرِ وَوَضْعِ الْحَجَرِ فِي غَيْرِ مِلْكِهٖ كَذَا فِي الْكَافِي وَلَوْ وَطِئَتْ دَابَّتُهٗ إِنْسَانًا فَقَتَلَتْهُ وَهُوَ سَائِقُهَا أَوْ قَائِدُهَا فَهُوَ قَتْلٌ بِسَبَبٍ، كَذَا فِي الْمُضْمَرَاتِ وَمُوْجِبُهٗ إِذَا تَلِفَ بِهٖ آدَمِيٌّ الدِّيَةُ عَلَى الْعَاقِلَةِ وَلَا يَتَعَلَّقُ بِهِ الْكَفَّارَةُ وَلَا حِرْمَانُ الْمِيرَاثِ عِنْدَنَا، كَذَا فِي الْكَافِي وَاللّٰهُ أَعْلَمُ۔

ترجمہ: '''''قتل بالسَّبَب'' یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص راستہ میں کنواں کھودے یا راستہ میں پتھر وغیرہ رکھ دے اور کوئی شخص کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جائے یا پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرے اور مر جائے، ''کافی'' میں بھی اسی طرح ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی سواری نے روند ڈالا اور وہ ہلاک ہو گیا اور یہ (یعنی جس پر قتل کا الزام ہے) اُس سواری کو چلا رہا تھا، پس یہ بھی قتل بالسَّبَب میں شامل ہے، ''مضمرات'' میں اسی طرح سے ہے۔ پس ہم (احناف) اس کے عصبات پر دیت واجب کرتے ہیں تاکہ انسانی جان رایگاں جانے سے بچ جائے اور اس شخص پر کفارہ واجب نہیں ہوگا اور اگر (قتل کے سبب سے متعلق شخص مقتول کا وارث ہے) تو وہ مقتول کی وراثت سے محروم نہیں ہوگا، ''کافی'' میں بھی اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص:3 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

حسبِ ذیل صورتیں بھی قتل بالسَّبَب میں داخل ہیں:

ا۔کوئی شخص کسی جانور کو ہانک کرلے جارہا ہو اور وہ جانور کسی شخص کو ٹکر مار کر ہلاک کر دے۔

۲۔کوئی شخص تیز رفتار گاڑی چلائے اور اس کی جھپٹ میں آ کر کوئی شخص ہلاک ہو جائے۔
۳۔کوئی اناڑی شخص گاڑی چلائے اور اس کی گاڑی کے نیچے کوئی آ کر ہلاک ہو جائے۔
۴۔کوئی شخص نشہ کی حالت میں گاڑی چلائے اور اس کی گاڑی کے نیچے آ کر کوئی شخص مر جائے''۔

قتل بالسبب قتلِ خطا ہی کی ایک قسم ہے۔قتلِ خطا کی دیت کے بارے میں علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں: قَالَ: وَالدِّيَةُ فِي الْخَطَأِ مِائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ أَخْمَاسًا: عِشْرُوْنَ بِنْتَ مَخَاضٍ، وَعِشْرُوْنَ بِنْتَ لَبُوْنٍ، وَعِشْرُوْنَ ابْنَ مَخَاضٍ، وَعِشْرُوْنَ حِقَّةً، وَعِشْرُوْنَ جَذَعَةً۔۔۔۔وَمِنَ الْعَيْنِ أَلْفُ دِيْنَارٍ، وَمِنَ الْوَرِقِ عَشَرَةُ آلَافِ دِرْهَمٍ۔

ترجمہ:''امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک قتلِ خطا میں پانچ قسم کی سو اونٹنیاں ہیں: بیس دوسرے سال کی اونٹنیاں، بیس تیسرے سال کی اونٹنیاں، بیس دوسرے سال کے اونٹ، بیس چوتھے سال کی اونٹنیاں، اور بیس پانچویں سال کی اونٹنیاں یا ایک ہزار طلائی دینار یا دس ہزار چاندی کے درہم ہوں، (الھدایۃ، جلد:8،ص:72,73)''۔ایک ہزار دینار چار اعشاریہ تین سات چار (۴،۳۷۴) کلوگرام سونے کے برابر ہے اور دس ہزار درہم تیس اعشاریہ چھ ایک آٹھ (۳۰،۶۱۸) کلوگرام چاندی کے برابر ہے یا اس کی موجودہ بازاری قیمت (Market Value) کے مطابق رقم ہے۔

آج کل چونکہ عاقلہ کی صورت موجود نہیں ہے، اس لئے عدالتیں ڈرائیور پر دیت عائد کرتی ہیں۔اور آپ کے بقول عادل اقبال جو کار ڈرائیو کر رہے تھے، وہ دیت دینے کو تیار ہیں، تو یہ اچھی بات ہے۔باقی آخرت کی جوابدہی سے بچنے کے لئے اُنہیں اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل کے ساتھ استغفار اور توبہ کرتے رہنا چاہئے، کیونکہ اُس کی بداحتیاطی کی وجہ سے ایک انسان کی جان گئی اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۞

ترجمہ: ''بے شک اللہ اُس گناہ کونہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور جو اس سے کم (گناہ) ہو اس کو جس کے لئے چاہے، بخش دیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو یقیناً اس نے بہت بڑے گناہ کا بہتان باندھا، (النساء:48)''۔

بالغ ورثاء صرف اپنے حصے کی دِیَت معاف کر سکتے ہیں

سوال:

زید کے ہاتھ میں لگی بندوق سے سہواً گولی چل گئی، بکر کو لگی اور بکر جاں بحق ہو گیا۔ بکر کے ورثاء میں والد، والدہ، بیوہ اور ایک شیر خوار بچہ ہے۔ بکر کے والد والدہ اور بیوہ نے زید کو معاف کر دیا ہے کیونکہ زید ایک غریب آدمی ہے۔ عدالت میں مقدمہ زیرِ سماعت ہے اور عدالت کی طرف سے مقرر کردہ دیت کی رقم 14 لاکھ کم وبیش یا اُس کی نصف جو بچے کے لئے ہے، بکر ادا نہیں کر سکتا۔ بچے کا دادا یعنی بکر کا والد کہتا ہے کہ میں اپنے پوتے کی طرف سے زید کو معاف کرتا ہوں۔ کیا اُس بچے کی جانب سے معاف کرنے کا اختیار دادا کو حاصل ہے؟، (مولوی محمد موسیٰ منگیانی، حب چوکی، بلوچستان)۔

جواب:

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، وہ قتلِ خطا کی ہے اور قتلِ خطا میں قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دِیَت لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا

ترجمہ: ''اور کسی مؤمن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کرے سوائے اس کے کہ (اس سے) خطاءً (یہ فعل سرزد ہو جائے)، (تو اس کا کفارہ) ایک مؤمن غلام کا آزاد کرنا ہے، (اور مزید یہ کہ) اس کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہے، سوائے اس کے کہ وہ معاف کر دیں، (النساء:92)''۔ آیت کے اختتام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ

ترجمہ: ''یعنی جو شخص (کفارے کے طور پر آزاد کرنے کے لئے غلام) نہ پائے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قبولیتِ توبہ کے لئے دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے، (النساء:92)''۔

قتلِ خطا کی دیت کے بارے میں علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں: قَالَ: وَالدِّيَةُ فِي الْخَطَأِ مِائَةٌ مِّنَ الْإِبِلِ أَخْمَاسًا: عِشْرُوْنَ بِنْتَ مَخَاضٍ، وَعِشْرُوْنَ بِنْتَ لَبُوْنٍ، وَعِشْرُوْنَ ابْنَ مَخَاضٍ، وَعِشْرُوْنَ حِقَّةً، وَعِشْرُوْنَ جَذَعَةً۔۔۔۔ وَمِنَ الْعَيْنِ أَلْفُ دِيْنَارٍ، وَمِنَ الْوَرِقِ عَشَرَةُ آلَافِ دِرْهَمٍ۔

ترجمہ: ''امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک قتلِ خطا میں پانچ قسم کی سو اونٹنیاں ہیں: بیس دوسرے سال کی اونٹنیاں، بیس تیسرے سال کی اونٹنیاں، بیس دوسرے سال کے اونٹ، بیس چوتھے سال کی اونٹنیاں، اور بیس پانچویں سال کی اونٹنیاں یا ایک ہزار طلائی دینار یا دس ہزار چاندی کے درہم ہوں، (الھدایہ، جلد:8،ص:72,73)''۔ ایک ہزار دینار چار اعشاریہ تین سات چار (۴،۳۷۴) کلوگرام سونے کے برابر ہے اور دس ہزار درہم تیس اعشاریہ چھ ایک آٹھ (۳۰،۶۱۸) کلوگرام چاندی کے برابر ہے یا اس کی موجودہ بازاری قیمت (Market Value) کے مطابق رقم ہے۔ مقتول کے ورثاء اپنے اپنے حصے کی دِیَت معاف کرسکتے ہیں، نابالغ بچے کی طرف سے معاف کرنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔ اگر قاتل ضمانت دے کہ بچہ بالغ ہونے کے بعد اگر اپنے حصے کی دِیَت کی رقم طلب کرے تو وہ اُسے ادا کرے گا، تو عدلیہ اِس ضمانت پر اُسے رہا کردے۔ عدالت یہ بھی قرار دے سکتی ہے کہ وہ اپنی آمدنی میں سے ماہانہ ایک مقررہ رقم (جو اس کی استطاعت میں ہو) بچے کے نام اکاؤنٹ میں جمع کرتا رہے۔

حلال وحرام کے مسائل

ہومیو پیتھک ادویات کی تیاری میں الکحل کے استعمال کا شرعی حکم

سوال:

مُروّجہ قاعدہ وقانون کے مطابق ہومیو پیتھک ادویات میں الکحل (Ethanol) کو بطور Career استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایتھانول گنے کی راب سے حاصل کی جاتی ہے اور ہمارا ادارہ درج ذیل طریقہ اور کلاسیفیکیشن میں ہومیو پیتھک ادویات کی تیاری کرتا ہے:

(۱) ہومیو پیتھک مدر ٹنکچر (Mother Tinctures) کی تیاری میں ایتھانول کا استعمال 50 تا 80 فیصد ہوتا ہے، لیکن تیاری کے مراحل سے گزرنے کے بعد جب مریض استعمال کرتا ہے، تو استعمال کی جانے والی خوراک میں الکحل کی مقدار تقریباً 0.59 فیصد رہ جاتی ہے (جب دوا کے 10 قطرے دو گھونٹ پانی میں ڈالے جاتے ہیں)۔

(۲) ہومیو پیتھک پوٹینسیاں (Dilutions) اس کٹیگری میں بننے والی ہومیو پیتھک ادویات میں ایتھانول کی مقدار تقریباً 90 تا 95 فیصد ہوتی ہے، جسے مریض قطروں کی صورت میں پانی میں ملا کر استعمال کرتا ہے اور جب مریض اِسے بطور دوا استعمال کرتا ہے، تو اس میں (دوا کے پانچ قطرے دو گھونٹ پانی میں ڈالنے کے بعد) الکحل کی مقدار انتہائی قلیل ہو کر صرف 0.49 فیصد رہ جاتی ہے۔

(۳) بی ایم ہومیو پیتھک ڈراپ سریز اور بقیہ ہومیو پیتھک ادویات کو 40 تا 50 فیصد ایتھانول میں تیار کیا جاتا ہے لیکن جب قطروں کی شکل میں اسے مریض استعمال کرتا ہے تو (دوا کے دس قطرے دو گھونٹ پانی میں ڈالنے کے بعد) اس میں الکحل کی مقدار صرف 0.39 فیصد رہ جاتی ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہومیو پیتھک طریقۂ علاج سے مستفیض ہوتی ہے، اس ضمن میں شرعی حکم کی صورت میں رہنمائی فرمائیں''۔

(پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل تبسم)

(بی ایم پرائیویٹ لمیٹڈ کنٹری ہیڈ (ایس اینڈ ایم) بی ایم پرائیویٹ لمیٹڈ پاکستان)

جواب:

الکحل ایک ایسا نامیاتی مُرکب ہے، جس میں بہت سارے نامیاتی مُرکبات حل ہوتے ہیں۔ الکحل کو مختلف اشیاء مثلاً ادویات (Medicine)، عطریات (Perfumes) اور مشروبات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ الکحل ایک اہم مُرکب ہے، اِس لئے کیمیائی تعاملات میں اِس کو مُحلّل Solvent کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ الکحل کسی شے میں حل کر دیا جائے تو اُس کی ماہیت میں کوئی فرق نہیں آتا، اُس کی حقیقت برقرار رہتی ہے، اگر چاہیں تو الکحل کو کیمیائی عمل سے دوبارہ علیحدہ کر سکتے ہیں۔ الکحل کی کئی اقسام ہیں:

(1) ایتھائل الکحل (2) میتھائل الکحل (3) پر پائل الکحل (4) میتھانول الکحل

یہ تمام الکحل کیمیاوی طور پر تیار کئے جاتے ہیں، انہیں Alchohol Synthetic بھی کہتے ہیں۔ صرف ایتھانول یا ایتھائل الکحل کو غذا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

الکحل کی تیاری کا عمل:

شہد (Honey)، شیرہ (Ostracized Solution)، مختلف دانے (Corns)، جَو (Barley)، اناس (Pineapple)، گندھک (Sulphur)، ادرک (Ginger) کی جڑ اور دیگر نشاستہ دار (Carbohydrate) اشیاء سے الکحل بنائی جاتی ہے۔ ایک خاص طریقۂ کار، جسے عملِ تَخمیر (Fermentation) کہتے ہیں، اُس سے گزار کر اُس نشاستہ (Carbohydrate) کو ایک کیمیائی خمیر (Enzyme) کے ذریعے شوگر میں تبدیل کرتے ہیں، پھر ایک دوسرے کیمیائی خمیر (Enzyme) کے ذریعے شوگر کو گلوکوز میں اور ایک تیسرے کیمیائی خمیر (Enzyme) کے ذریعے گلوکوز سے الکحل بنایا جاتا ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی اِس حوالے سے اپنی تحقیق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میتھے نول (Methanol) کو وسیع پیمانے پر مُحلّل (Solvent) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اِس سے Formaldehyde تیار کی جاتی ہے، یہ بہت زہریلا

مُرکّب ہے، اِس سے اندھا پن بلکہ بعض اوقات موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔اِس لئے میتھے نول کو ایتھے نول (Ethanol) میں شامل کردینے سے ایتھے نول پینے کے قابل نہیں رہتا یعنی ڈی نیچر (Denature) ہوجاتا ہے۔

ایتھے نول:(Ethanol)

زمانہ قدیم سے ایتھے نول چینی کے محلول یا غلے کے نشاستے کی تخمیر سے تیار کیا جاتا رہا ہے۔تخمیر (Fermentation) ایک حیاتی کیمیائی (Bio Chemical) عمل ہے، جو خمیر (Yeast) یا دیگر باریک جراثیموں (Micro Organisms) میں پائے جانے والے Enzymes کی موجودگی میں واقع ہوتا ہے۔ یہ Enzymes پیچیدہ نامیاتی عمل انگیز ہیں، جن کا عمل مخصوص ہوتا ہے۔عملِ تخمیر سے محلول میں 12 فیصد ایتھے نول پیدا ہوتا ہے۔تخمیر شدہ محلول کی کسری کشید (Fractional Distillation) سے 95 فیصد ایتھے نول حاصل ہوتی ہے، جسے Rectified Spirit بھی کہتے ہیں۔مکمل طور پر غیر آبیدہ الکحل (سو فیصد خالص) حاصل کرنے کے لئے 95 فیصد ایتھے نول میں CxO ملا کر آمیزے (Mixture) کو کشید (Extract) کرلیتے ہیں۔Distillate یعنی کشید شدہ محلول کو خالص یا مُطلق الکحل (Absolatute Alchohol) کہتے ہیں۔ایتھے نول (Ethanol) کو ناقابل استعمال مشروب بنادینے کے لئے اس میں میتھے نول (Mathanol) جیسی زہریلی اشیاء ملادی جاتی ہیں۔ یہ الکحل کو ڈی نیچر کرنا (Denaturing Of Alchohol) کہلاتا ہے۔جب استھائل الکحل میں میتھائل الکحل ملاکر اُسے ڈی نیچر (Denature) کردیا جاتا ہے، تو اُسے Methylated Spirit کہتے ہیں''۔(شرح صحیح مسلم، جلد سادس، ص:220)

علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابو بکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: قَالَ: وَنَبِیْذُ الْعَسَلِ وَالتِّیْنِ وَنَبِیْذُ الْحِنْطَةِ وَالذُّرَةِ وَالشَّعِیْرِ حَلَالٌ وَاِنْ لَّمْ یُطْبَخْ، وَهٰذَا عِنْدَ أَبِیْ حَنِیْفَةَ وَأَبِیْ یُوْسُفَ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ اِذَا كَانَ مِنْ غَیْرِ لَهْوٍ وَّطَرَبٍ، لِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ السَّلَامُ: ''اَلْخَمْرُ مِنْ

هَاتَيْنِ الشَّجَرَتَيْنِ"، وَأَشَارَ إِلَى الْكَرْمَةِ وَالنَّخْلَةِ، خَصَّ التَّحْرِيْمَ بِهِمَا، وَالْمُرَادُ بَيَانُ الْحُكْمِ۔۔۔۔ وَعَصِيْرُ الْعِنَبِ، إِذَا طُبِخَ حَتّٰى ذَهَبَ ثُلُثَاهُ وَبَقِيَ ثُلُثُهُ، حَلَالٌ وَإِنِ اشْتَدَّ، وَهٰذَا عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ وَأَبِي يُوْسُفَ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ، وَقَالَ مُحَمَّدٌ وَمَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ: حَرَامٌ، وَهٰذَا الْخِلَافُ فِيْمَا إِذَا قَصَدَ بِهِ التَّقَوِّيَ، أَمَّا إِذَا قَصَدَ بِهِ التَّلَهِّيَ فَلَا يَحِلُّ بِالْاِتِّفَاقِ، وَعَنْ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ مِثْلُ قَوْلِهِمَا، وَعَنْهُ: أَنَّهُ كَرِهَ ذٰلِكَ، وَعَنْهُ: أَنَّهُ تَوَقَّفَ فِيْهِ، لَهُمْ فِي إِثْبَاتِ الْحُرْمَةِ: قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ"، وَقَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَامٌ"، وَيُرْوٰى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا أَسْكَرَ الْجَرَّةُ مِنْهُ فَالْجُرْعَةُ مِنْهُ حَرَامٌ" وَلِأَنَّ الْمُسْكِرَ يُفْسِدُ الْعَقْلَ، فَيَكُوْنُ حَرَامًا قَلِيْلُهُ وَكَثِيْرُهُ كَالْخَمْرِ، وَلَهُمَا قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "حُرِّمَتِ الْخَمْرُ لِعَيْنِهَا، وَيُرْوٰى: "بِعَيْنِهَا قَلِيْلُهَا وَكَثِيْرُهَا، وَالسُّكْرُ مِنْ كُلِّ شَرَابٍ "خَصَّ السُّكْرَ بِالتَّحْرِيْمِ فِي غَيْرِ الْخَمْرِ إِذِ الْعَطْفُ لِلْمُغَايَرَةِ لِأَنَّ الْمُفْسِدَ هُوَ الْقَدَحُ الْمُسْكِرُ وَهُوَ حَرَامٌ عِنْدَنَا، وَإِنَّمَا يُحَرَّمُ الْقَلِيْلُ مِنْهُ، لِأَنَّهُ يَدْعُوْ لِرِقَّتِهِ وَلَطَافَتِهِ إِلَى الْكَثِيْرِ، فَأُعْطِيَ حُكْمَهُ، وَالْمُثَلَّثُ لِغِلْظَةٍ لَا يَدْعُوْ وَهُوَ فِي نَفْسِهِ غِذَاءٌ، فَبَقِيَ عَلَى الْإِبَاحَةِ وَالْحَدِيْثُ الْأَوَّلُ غَيْرُ ثَابِتٍ عَلٰى مَا بَيَّنَّاهُ، ثُمَّ هُوَ مَحْمُوْلٌ عَلَى الْقَدَحِ الْأَخِيْرِ، إِذْ هُوَ الْمُسْكِرُ حَقِيْقَةً۔

ترجمہ: "(صاحب "بدایۃ المبتدی" نے) فرمایا: شہد، انجیر، گیہوں، جُوار اور جَو کی نبیذ حلال ہے، اگر پکائی نہ جائے اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف (شیخین) رحمہا اللہ کے نزدیک ہے جبکہ لہو وسرور کے بغیر ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انگور اور کھجور کی جانب اشارہ کر کے فرمایا: "خمر ان دونوں درختوں کی ہوتی ہے"، آپ ﷺ نے تحریم کو ان دونوں کے ساتھ خاص فرمایا اور مراد حکم کو بیان کرنا ہے"۔۔۔۔ مزید لکھتے ہیں: ترجمہ: "انگور کا شیرہ جب پکا لیا جائے اور اس کا دو تہائی اُڑ جائے اور ایک تہائی باقی رہ جائے، تو وہ حلال ہے، خواہ وہ گاڑھا اور تیز ہو، یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہا اللہ کا نظریہ ہے اور امام محمد، امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: یہ حرام ہے، یہ اختلاف اُس وقت ہے، جب اس تیز شیرہ سے قوت

حاصل کرنے کا ارادہ کیا جائے اور اگر شیرہ لہو ولعب کے قصد سے پیا جائے تو پھر یہ بالاتفاق حرام ہے۔ امام محمد (کے اِس کے بارے میں تین اَقوال ہیں:) ایک قول شیخین (امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف) کے موافق جواز کا ہے، دوسرا قول کراہت کا ہے اور تیسرا قول توقف کا ہے۔ جو ائمہ حُرمت کے قائل ہیں، اُن کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''ہر نشہ آور چیز خمر ہے''، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ بھی روایت ہے: ''جس کا ایک مٹکا نشہ دے، اُس کا ایک گھونٹ بھی حرام ہے''، اور اس لئے کہ نشہ آور چیز عقل کو فاسد کرتی ہے، اس لئے خمر کی طرح اس کی قلیل اور کثیر مقدار حرام ہوگی۔ اور امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمہما اللہ کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''خمر بعینہٖ حرام ہے'' اور ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اس کی قلیل وکثیر مقدار بعینہٖ حرام ہے اور ہر نشہ آور شراب حرام ہے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خمر کے علاوہ دیگر مشروبات میں سے بطورِ خاص نشہ آور مقدار کو حرام کیا ہے، کیونکہ عطف تغایُر (Dissimilarity) کے لئے ہوتا ہے، نیز فسادِ عقل کا سبب وہ آخری پیالہ ہے، جو نشہ دیتا ہے اور وہ ہمارے نزدیک حرام ہے، اور خمر کی قلیل مقدار اس لئے حرام کی ہے کہ وہ اپنی رقّت اور لطافت کی وجہ سے زیادہ مقدار میں پینے کی تحریک (Stimulation) پیدا کرتی ہے، اس لئے قلیل خمر کو بھی کثیر خمر کا حکم دیا گیا ہے اور تہائی مقدار تک رہ جانے والی شراب اپنے گاڑھے پن اور حدت کی وجہ سے زیادہ پینے کی تحریک پیدا نہیں کرتی، نیز وہ فی نفسہٖ غذا ہے، اس لئے اپنی اباحت پر باقی رہے گی۔ ائمہ ثلاثہ کی پیش کردہ پہلی حدیث (جس کی کثیر مقدار نشہ آور ہو، اُس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے) ثابت نہیں ہے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں، نیز اس کی حُرمت اُس آخری جام پر محمول ہے (جس سے نشہ آ گیا ہو)، کیونکہ وہی حقیقۃً نشہ آور ہے''۔

(ہدایہ، جلد 7، ص: 296 تا 299)

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''خَمر کے علاوہ دیگر شرابوں کی قلیل

مقدار جو نشہ آور نہ ہو، وہ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک جائز ہے۔ اِس لئے الکحل بھی اگر اسی قلیل مقدار میں ہو تو وہ بھی جائز ہے، کیونکہ الکحل انگور اور کھجور سے نہیں بنائی جاتی بلکہ شہد، شیرہ، مختلف دانے، جَو، اَناس، گندھک، ادرک کی جڑ اور دیگر نشاستہ دار اشیاء سے بنائی جاتی ہے۔ جبکہ خمر کے لئے صرف انگور سے بنایا جانا کافی نہیں بلکہ انگور کا کچا شیرہ جو پڑے رہنے سے جھاگ چھوڑ دے، وہ خمر کہلاتا ہے، اِس لئے الکحل پر خمر کی تعریف صادق نہیں آتی۔ اور الکحل کی وہ مقدار جو نشہ کی حد تک نہ پہنچے، امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمہا اللہ کے نزدیک جائز ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 4، ص:322)''۔

فقہائے اُمت کا اِس پر اِجماع ہے کہ انگور یا کھجور سے کشید کیا ہوا الکحل، خواہ وہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر، اُس کی حِلّت یا طہارت کا کوئی طریقہ نہیں ہے، بہر صورت حرام اور نجس ہے۔ لیکن اگر اُس کی ماہیت تبدیل کردی جائے اور اُسے سرکہ بنالیا جائے، تو اس صورت میں حلال اور پاک ہوجائے گا۔

الکحل اور اسپرٹ کی ایک خاص مقدار نشہ آور ہوتی ہے، قلیل مقدار جو نشہ کی حد کو نہ پہنچے، امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک جائز ہے۔ مشروبات میں ایتھائل الکحل استعمال ہوتا ہے، جس کا فارمولا C_2H_5OH ہے، یہ ایک زہریلا مائع ہے، جس کا مسلسل استعمال انسانی صحت کے لئے مُضِر ہوسکتا ہے۔ فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق الکحل یا اسپرٹ کا قلیل مقدار میں استعمال اُس صورت میں جائز ہے، جب طبّی ضروریات یعنی علاج کے لئے یا قوت حاصل کرنے کے لئے مُقوّی (Tonic) کے طور پر استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر اِس کا استعمال لہو ولعب یا عیش وطَرَب (Enjoyment) کے لئے ہو تو پھر یہ استعمال مکروہِ تحریمی ہے اور ناجائز ہے۔ فقہائے کرام نے ممکنہ مفاسد سے بچنے کے لئے سَدِّ ذرائع کے طور پر امام محمد رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دیا تھا، جو حکمتِ دین کا تقاضا تھا۔ لیکن موجودہ دور میں چونکہ قلیل ترین مقدار میں الکحل کا استعمال اَدویہ سازی (Medicine Manufacturing) اور اشیائے خورد ونوش میں کثرت سے ہو رہا ہے، اِس لئے ہم امام

اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہا اللہ تعالیٰ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اِس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔

تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ آج کل مشروبات، پرفیومز اور ادویات میں جو الکحل ڈالا جاتا ہے، وہ انگور یا کھجور سے کشید کردہ نہیں ہے بلکہ دیگر اجناس سے کشید کردہ الکحل ڈالا جاتا ہے کیونکہ انگور اور کھجور سے کشید کردہ الکحل بہت قیمتی ہوتا ہے۔ مشروبات، پرفیومز اور ادویات میں الکحل اُن اشیاء کے خراب ہونے اور طویل عرصے تک قابلِ استعمال رہنے یا اپنی حالت پر قائم رکھنے کے لئے ڈالا جاتا ہے، نہ نشہ مقصود ہوتا ہے نہ ہی لہو ولعب۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تمام فقہاء کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ انگور اور کھجور سے کشید کئے گئے الکحل کی مقدار خواہ قلیل ہو یا کثیر، حرام اور نجس ہے۔ اِن کے علاوہ دیگر اشیاء سے عملِ تخمیر (Fermentation) کے بعد الکحل بنایا گیا ہو تو الکحل کی وہ مقدار جو نشہ کی حد تک نہ پہنچے، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہا اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال ہے۔ لیکن اگر کوئی ضرورت پر مبنی اِس جواز میں غُلُوّ کرتا ہے اور اِسے نشے کی عادت کے طور پر یا عَیش وطَرَب کے لئے استعمال کرتا ہے، تو یہ مکروہِ تحریمی ہے۔

الغرض اگر کسی دوا (Medicine) یا مُقَوِّی (Tonic) یا مشروب (Syrup) میں الکحل کی اتنی معمولی مقدار ملی ہو، جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، یا اُس سے قدرے زائد ہو اور نشہ آور نہ ہو، تو بھی اُس کے استعمال میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

مسئلہ مذکورہ کے بارے میں شیخ الحدیث علامہ مفتی محمد عبدالستار سعیدی کی رائے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

مفتی اہل سنت، محقق شہیر حضرت علامہ مولانا مفتی محمد منیب الرحمٰن ہزاروی مدظلہ العالی کی تمام تصانیف تحقیقی اور نافع خلائق ہیں۔

اس وقت پیش نظر کتاب میں حضرت موصوف کا ''الکحل'' کے شرعی حکم کے

بارے میں مفصل، مدلل ومبرہن فتویٰ راقم کے سامنے ہے۔

آپ نے ''الکحل'' کی ماہیت، اقسام اور اجزاء ترکیبیہ پر انتہائی فاضلانہ و محققانہ تبصرہ فرمانے کے بعد اس کا شرعی حکم بیان فرمایا ہے اور اسے کتب فقہاء کے حوالوں سے مزین فرمایا ہے۔

راقم الحروف حضرت مفتی صاحب کی تحقیق سے اتفاق کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعرفان میں مزید برکتیں عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

حافظ محمد عبدالستار سعیدی

ناظم تعلیمات جامعہ نظامیہ رضویہ، اندرون لوہاری گیٹ لاہور

11 ذوالقعدہ، 1435ھ، 7 ستمبر 2014ء

تعویذات کا شرعی حکم

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ تعویزات کا استعمال جائز ہے یا ناجائز؟، (سید محمد صمد مہدی قادری، نصرت بھٹو کالونی، کراچی)۔

جواب:

عَوْذ، مَعَاذ، اَعْیَاذ، تَعَوُّذ اور اِسْتِعَاذ کے معنی ہیں: ''پناہ مانگنا''۔ ''تعویذ'' کے معنی ہیں: دعا کرنا، حفاظت کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾

ترجمہ: ''جب تم قرآن کی تلاوت کا ارادہ کرو تو مردود شیطان کے شر سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگو، (النحل:98)''۔

عُذْتُ، اَعُوْذُ اور اَسْتَعِیْذُ کے بعد دو صلے آتے ہیں، ایک ''با'' اور ایک ''مِنْ''۔ جس کلمے پر ''با'' داخل ہو، ہمیں اُس کی حفاظت اور پناہ مطلوب ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی

ذاتِ اقدس ہے اور جس کلمے پر ''مِنْ'' داخل ہو، اُس چیز کے ضَرر اور شر سے بچنا مقصود ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی آخری دو سورتوں ''الفلق'' اور ''الناس'' کو ''مُعَوِّذَتَیْن'' کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں ''قُلْ أَعُوْذُ'' کے کلمات سے شروع ہوتی ہیں۔

سورۃ الفلق میں ''مُعَوَّذٌ بِہٖ'' (یعنی جس کی پناہ اور حفاظت مطلوب ہے)، ''رَبُّ الْفَلَقِ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ''مُعَوَّذٌ مِنْهَا'' (یعنی جس کے شر اور ضرور سے بچنا مقصود ہے)، چار چیزیں ہیں: (۱) اللہ کی ہر مخلوق کا شَر (۲) ظلمتِ شب کا شَر جب وہ چھا جائے (۳) جادو کی غرض سے گرہوں (Knots) میں پھونکنے والیوں کا شَر (۴) حاسد کا شَر جب وہ حسد پر اتر آئے۔

سورۃ ''النّاس'' میں ''مُعَوَّذٌ بِہٖ''، ''رَبُّ النَّاسِ''، ''مَلِكُ النَّاس'' اور ''اِلٰهُ النَّاس'' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہے اور اُس کا ذکر تین صفات کی تکرار کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔ اور ''مُعَوَّذٌ مِنْهَا'' چھپ کر، پیچھے ہٹ کر اور دوبارہ پلٹ کر دلوں میں برے وسوسے اور فاسد خیالات ڈالنے والا شیطان اور اُس کے چیلے (Agents) ہیں، جو انسانوں میں بھی ہو سکتے ہیں اور خود ذُرِّیتِ شیطان یعنی جنوں میں سے بھی ہو سکتے ہیں۔

اِس پناہ سے اللہ تعالیٰ کی غیبی حفاظت، حمایت، نصرت اور فضل مراد ہے اور اگر شَر محسوس و مُبصَر ہے، تو اُس کی طرف سے ایسے اسباب کا عطا ہونا اور مُقدّر فرمانا مقصود ہے، جن کی بدولت انسان تمام ضَارّ و مُضِرّ (Harmfull) چیزوں کے شَر سے محفوظ رہے اور اُن کا نقصان پہنچانے والا ہر حملہ اور مکر ناکام ہو۔

اِس تمہید سے معلوم ہوا کہ تَعَوُّذ کی روح اللہ تعالیٰ کا تائید، نصرت اور حفاظت کی طلب ہے اور ''مُعَوِّذَتَیْن'' میں اُس کا ذریعہ کلامِ الٰہی کو بنایا گیا ہے۔ عرف میں ہم جسے ''تعویذ'' کہتے ہیں، وہ بھی اسی سے ماخوذ ہے، رسول اللہ ﷺ سے بھی ''تَعَوُّذ'' کی دعائیں منقول ہیں، جن میں چند درجِ ذیل ہیں:

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُعَوِّذُ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ،

وَيَقُوْلُ: اِنَّ أَبَاكُمَا كَانَ يُعَوِّذُ بِهَا اِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ: أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ، مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ، وَّمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّامَّةٍ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتے تھے اور فرماتے تھے: بے شک تم دونوں کے والد (جدِّ اعلیٰ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام) اِن کلمات کے ساتھ حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کو (اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتے تھے، وہ فرماتے تھے:) میں اللہ کے کامل کلمات کے ساتھ ہر شیطان، ہر زہریلے جانور اور ہر نظرِ بد کے شَر سے تم کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں، (صحیح بخاری:3371)''۔

(۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ قَالَ: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب بیت الخلا تشریف لے جاتے تو فرماتے: ''اے اللہ! میں ناپاکی اور خبیث جنات کے شَر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، (سُنن ترمذی:6)''۔

(۳) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ، وَالْعَجْزِوَالْكَسَلِ، وَالْبُخْلِ، وَالْجُبْنِ، وَضَلَعِ الدَّيْنِ، وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ۔

ترجمہ: ''اے اللہ! میں رنج وغم، عاجزی ودرماندگی، سستی وکسل مندی، بخل، بزدلی اور قرض کے بار اور لوگوں (یعنی دشمنوں) کے غلبہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں''۔

(صحیح بخاری:6363)

اُس تعویذ کی دوصورتیں ہیں: ایک یہ کہ آیاتِ مبارکہ، مسنون وماثور دعائیں اور کلماتِ مبارکہ پڑھ کر کسی کو دَم کیا جائے۔ اس طرح دَم کرنا اور جھاڑ پھونک حدیث سے ثابت ہے۔ اسے احادیث میں ''رُقیہ'' بھی فرمایا گیا ہے۔ رَقٰی یَرْقِیْ رَقْیًا اور رُقْیَۃٌ کے معنی ہیں: نفع رسانی یا ضرر رسانی کے لئے ٹوٹکا یا منتر کرنا (المنجد)۔ تعویذ کی ایک صورت کاغذ پر

چند کلمات مبارکہ تحریر کر کے اُسے معروف تعویذ کی صورت میں کسی چمڑے، موم جامہ یا کسی کپڑے میں لپیٹ کر بدن کے ساتھ یعنی بازو یا گردن پر باندھنا، اسے "تَمِیْمَۃ" بھی کہتے ہیں اور اس کی جمع "تمائم" اور "تمیمات" ہے۔

بعض احادیث مبارکہ میں دَم سے منع بھی فرمایا ہے۔ جب جواز اور منع دونوں طرح کی روایات موجود ہوں، تو ہم دونوں میں تطبیق کریں گے۔ یعنی جن احادیث میں جواز ہے، اُن پر عمل جاری رہے گا، کیونکہ اُن میں عقیدے یا عمل کی کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ اور جن احادیث میں ممانعت ہے، اُنہیں دَم، جھاڑ پھونک اور منتر کی اُن تمام صورتوں پر محمول کریں گے، جن میں کوئی ایسے کلمات ہیں، جن سے عقیدے یا عمل کی کوئی خرابی لازم آتی ہے یا یہ ممانعت اُن لوگوں کے لئے جو اِن اسباب ہی کو مؤثرِ حقیقی مان کر ذاتِ مُسَبِّبُ الاسباب سے رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ مادّی دوا ہو یا روحانی دعا، یہ سب اَسباب ہیں اور مؤثّر بالذات اور مُسَبِّبُ الاسباب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور اسباب کو اختیار کرنا توکّل کی حقیقت میں شامل ہے، یہ "تَوَکُّل عَلَی اللہ" کی ضد یا اُس کے منافی ہرگز نہیں ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۞

ترجمہ: "اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا؟، تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، بھلا بتاؤ تم (معبودِ حقیقی) اللہ کو چھوڑ کر جن (باطل) معبودوں کو پوجتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے، تو وہ اس کے (پہنچائے ہوئے) ضرر کو دور کر سکتے ہیں یا اگر وہ مجھ پر رحمت فرمانا چاہے، تو وہ اُس کی رحمت کو مجھ سے روک سکتے ہیں؟، آپ فرما دیں: مجھے اللہ کافی ہے، بھروسا کرنے والے اسی پر بھروسا کرتے ہیں، (الزمر:38)"۔

(۲) وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ

يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ۝

ترجمہ: ''اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے، وہ اُس کے لئے (ہر مشکل سے) نجات کی راہ مقدر فرمادے گا، اور اُس کو (اُن راہوں سے) روزی عطا فرمائے گا، جو اُس کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوں گی اور جو اللہ پر بھروسا کرے، تو وہ اُس کے لئے کافی ہے، اللہ اپنا (ہر طے شدہ) کام پورا فرمانے والا ہے، بلاشبہ اُس نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مُقرّر کر رکھا ہے، (الطلاق:3-2)''۔

حدیثِ پاک میں ہے:

(۱) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ يَقُوْلُ: قَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَعْقِلُهَا وَأَتَوَكَّلُ أَوْ أُطْلِقُهَا وَأَتَوَكَّلُ؟، قَالَ: اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: یارسول اللہ! میں اپنی اونٹنی کو باندھ کر رکھوں اور (پھر) اللہ پر بھروسا رکھوں یا اُسے کھلا چھوڑ دوں اور اللہ پر بھروسا رکھوں، آپ ﷺ نے فرمایا: اُسے باندھ کر رکھو اور (پھر حفاظت کے لئے) اللہ پر بھروسا رکھو، (سُنن ترمذی:2517)''۔

(۲) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ، لَرُزِقْتُمْ كَمَا يُرْزَقُ الطَّيْرُ، تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطاب بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: اگر تم اللہ پر توکل کرو جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے، تو وہ تمہیں اسی طرح رزق دے گا، جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے کہ وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر واپس آتے ہیں، (سُنن ترمذی:2344)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ توکّل اسباب کو ترک کر کے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے اللہ کے بھروسے پر بیٹھے رہنے کا نام نہیں ہے، یہ بے عملی ہے، کَسَل مندی اور سُستی بلکہ ہمارے اردو محاورے میں اِسے ''حرام خوری'' بھی کہتے ہیں۔ توکّل یہ ہے کہ بندہ تمام دستیاب وسائل کو اختیار

کرے اور اپنی استطاعت کے مطابق محنت کر کے اِن اسباب کی تاثیر اور نتیجہ خیزی کے لئے ذاتِ مُسَبِّبُ الاسباب پر اعتماد کرے۔

آیاتِ مبارکہ ،مسنون و ماثور دعائیں اور کلماتِ مبارکہ پڑھ کر دَم کرنے کے جواز واستحباب کے بارے میں یہ احادیث ہیں:

(۱) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: أَمَرَنِی النَّبِیُّ ﷺ ، أَوْ: أَمَرَ أَنْ یُسْتَرْقَیٰ مِنَ الْعَیْنِ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ اُنہیں نظر لگنے کی تکلیف میں دَم کرانے کا حکم دیتے تھے،(صحیح بخاری:5738،صحیح مسلم:5714)''۔

(۲) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا: أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ رَاٰی فِی بَیْتِهَا جَارِیَةً فِی وَجْهِهَا سَفْعَةٌ، فَقَالَ: اِسْتَرْقُوا لَهَا، فَإِنَّ بِهَا النَّظْرَةَ۔

ترجمہ:''حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اُن کے گھر میں ایک لڑکی کو دیکھا جس کے چہرے پر چھائیاں تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اِس پر دَم کراؤ، اِس کو نظر لگ گئی ہے،(صحیح بخاری:5739)''۔

(۳) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَنْفِثُ فِی الرُّقْیَةِ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ جھاڑ پھونک کے موقع پر دَم فرماتے تھے،(سُنن ابن ماجہ:3528)''۔نفث کے معنی ہیں:''کچھ پڑھ کر تھوکنے کے انداز میں پھونک مارنا''۔

(۴) عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَخَّصَ فِی الرُّقْیَةِ مِنَ الْحُمَةِ وَالْعَیْنِ وَالنَّمْلَةِ۔

ترجمہ:''حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے زہر ،نظرِ بد اور چیونٹی کے کاٹے پر دَم کرنے کی اجازت فرمائی،(سُنن ترمذی:2056)''۔

(۵) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: أَذِنَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لِأَهْلِ بَیْتٍ مِنَ الْأَنْصَارِ أَنْ یَرْقُوا مِنَ الْحُمَةِ وَالْأُذُنِ۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کے ایک گھر والوں کو اجازت دی کہ وہ زہریلے جانور کے کاٹے اور کان کے درد میں مبتلا مریضوں کو دَم کیا کریں، (صحیح بخاری: 5721)''۔

(۶) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: جَاءَ النَّبِيُّ ﷺ يَعُوْدُنِيْ، فَقَالَ لِيْ: أَلَا أَرْقِيْكَ بِرُقْيَةٍ جَاءَنِيْ بِهَا جِبْرَائِيْلُ؟، قُلْتُ: بِأَبِيْ وَأُمِّيْ، بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ: بِسْمِ اللهِ أَرْقِيْكَ، وَاللهُ يَشْفِيْكَ، مِنْ كُلِّ دَاءٍ فِيْكَ، مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ، وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں اُن کلمات سے دَم نہ کروں، جو جبریل میرے پاس لے کر آئے، میں نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ضرور دَم فرمائیے، آپ ﷺ نے یہ کلمات پڑھ کر تین بار مجھے دَم کیا: بِسْمِ اللهِ أَرْقِيْكَ، وَاللهُ يَشْفِيْكَ، مِنْ كُلِّ دَاءٍ فِيْكَ، مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ، وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ۔

ترجمہ: ''اللہ کے نام سے میں تجھے دَم کرتا ہوں، اللہ ہر اُس بیماری سے جو تمہیں لاحق ہے، شفا دے اور گرہوں میں پھونکنے والی (جادوگرنیوں) کے شَر اور حاسد کے شَر سے تمہیں اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے''، (سُنن ابن ماجہ: 3524)''۔

(۷) عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ يَرْقِيْ يَقُوْلُ: اِمْسَحِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ، بِيَدِكَ الشِّفَاءُ، لَا كَاشِفَ لَهٗ إِلَّا أَنْتَ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اِن کلمات سے دَم فرماتے تھے: اِمْسَحِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ، بِيَدِكَ الشِّفَاءُ، لَا كَاشِفَ لَهٗ إِلَّا أَنْتَ (اے لوگوں کے رب! تکلیف دور فرمادے، شفا تیرے ہی پاس ہے اور ہر مرض کو دور کرنے والا بھی تو ہی ہے)، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5744)''۔ یہی روایت صحیح مسلم :5706 میں ہے، وہاں ''اَذْهِبِ الْبَاْسَ'' (اے اللہ تکلیف کو دور فرمادے) کے الفاظ ہیں۔

(۸) عَنْ عَائِشَةَ، زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهَا قَالَتْ: كَانَ إِذَا اشْتَكَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ رَقَاهُ جِبْرِيلُ، قَالَ: بِاسْمِ اللّٰهِ يُبْرِيكَ، وَمِنْ كُلِّ دَاءٍ يَشْفِيكَ، وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ، وَشَرِّ كُلِّ ذِي عَيْنٍ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ کو کوئی بیماری ہوتی، تو جبریل امین آپ کو (یہ کلمات پڑھ کر) دَم کرتے: ''بِاسْمِ اللّٰهِ يُبْرِيكَ، وَمِنْ كُلِّ دَاءٍ يَشْفِيكَ، وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ، وَشَرِّ كُلِّ ذِي عَيْنٍ'' (اللہ کے نام کی برکت سے وہ آپ کو ہر بیماری سے شفا عطا فرمائے گا اور حسد کرنے والے اور نظرِ بد والے کے شَر سے آپ کو پناہ عطا فرمائے گا)، (صحیح مسلم: 5693)''۔

(۹) عَنْ جَابِرٍ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الرُّقَى، فَجَاءَ آلُ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّهُ كَانَتْ عِنْدَنَا رُقْيَةٌ نَرْقِي بِهَا مِنَ الْعَقْرَبِ، وَإِنَّكَ نَهَيْتَ عَنِ الرُّقَى، قَالَ: فَعَرَضُوهَا عَلَيْهِ، فَقَالَ: مَا أَرَى بَأْسًا، مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يَنْفَعَ أَخَاهُ فَلْيَنْفَعْهُ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دَم کرنے سے منع فرمادیا، پھر عمرو بن حزم کے خاندان والے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! ہمیں ایک دَم آتا ہے، جس سے ہم بچھو کے ڈنکے ہوئے کو دَم کرتے تھے اور آپ نے دَم کرنے سے منع فرمادیا ہے، راوی کہتے ہیں کہ پھر اُنہوں نے اُس دَم کے کلمات آپ ﷺ پر پیش کیے (یعنی آپ ﷺ کو پڑھ کر سنائے)، آپ ﷺ نے فرمایا: میں اِن میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکتا ہو، وہ اس کو ضرور نفع پہنچائے، (صحیح مسلم: 5725)''۔

(۱۰) عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ قَالَ: كُنَّا نَرْقِي فِي الْجَاهِلِيَّةِ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! كَيْفَ تَرَى فِي ذٰلِكَ؟، فَقَالَ: اِعْرِضُوا عَلَيَّ رُقَاكُمْ، لَا بَأْسَ بِالرُّقَى مَا لَمْ يَكُنْ فِيهِ شِرْكٌ۔

ترجمہ: ''حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم زمانۂ جاہلیت میں

دَم کرتے تھے، ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! اس سلسلہ میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے دَم کے کلمات مجھے بتاؤ، اگر اُس میں کوئی شرکیہ کلمات نہ ہوں تو دَم میں کوئی حرج نہیں ہے، (صحیح مسلم:5726)"۔

(۱۱) عَنْ اَبِیْ بَکْرِبْنِ مُحَمَّدٍ اَنَّ خَالِدَةَ بِنْتَ اَنَسٍ اُمَّ بَنِیْ حَزْمٍ السَّاعِدِیَّةَ، جَاءَتْ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ، فَعَرَضَتْ عَلَیْهِ الرُّقٰی، فَاَمَرَهَا بِهَا۔

ترجمہ:"حضرت خالدہ ساعدیہ نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئیں اور ایک دَم آپ کے سامنے پیش کیا (کہ آیا یہ صحیح ہے؟)، آپ ﷺ نے اُس کی اجازت دی"۔

(سُنن ابن ماجہ:3514)

(۱۲) عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ یَتَعَوَّذُ مِنَ الْجَانِّ وَعَیْنِ الْاِنْسَانِ حَتّٰی نَزَلَتِ الْمُعَوِّذَتَانِ فَلَمَّا نَزَلَتَا أَخَذَ بِهِمَا وَتَرَکَ مَا سِوَاهُمَا۔

ترجمہ:"حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جنات (کے شر سے) اور انسانوں کی نظر بد سے (اللہ کی) پناہ طلب کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ مُعَوِّذَتان (سورۃُ الفَلَق اور سورۃُ النّاس) نازل ہوگئیں، پس جب (یہ سورتیں) نازل ہوگئیں تو آپ نے اِن دونوں کو (پڑھنا) معمول بنالیا اور اِس کے سوا جو کچھ تھا، وہ (پڑھنا) چھوڑ دیا، (سُنن ترمذی:2058)"۔

(۱۳) مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنِ اکْتَوٰی أَوِ اسْتَرْقٰی فَقَدْ بَرِئَ مِنَ التَّوَکُّلِ۔

ترجمہ:"جس شخص نے گرم لوہے سے داغ لگایا یا دَم کیا، تو وہ توکل سے بری ہوگیا، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث:2055)"۔ (یہ وعید اِس صورت پر محمول ہے کہ داغنے اور دَم کرنے کو مؤثرِ حقیقی مانے)۔

(۱۴) عَنْ جَابِرٍ، أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَوٰی سَعْدَبْنَ مُعَاذٍ مِنْ رَمِیَّتِهٖ۔

ترجمہ:"حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ کو

تیر کے زخم کی وجہ سے گرم لوہے سے داغ لگایا، (سُنن ابوداؤد: 3862)"۔

(۱۵) عَنِ الشِّفَاءِ بِنْتِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَأَنَا عِنْدَ حَفْصَةَ، فَقَالَ لِيْ: أَلَا تُعَلِّمِيْنَ هٰذِهٖ رُقْيَةَ النَّمْلَةِ كَمَا عَلَّمْتِيْهَا الْكِتَابَ۔

ترجمہ: "حضرت شفا بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: تم اس کو چیونٹی کے کاٹے کا دَم کیوں نہیں سکھاتیں، جس طرح تم نے اس کو لکھنا سکھایا ہے"۔

(سُنن ابوداؤد: 3883)

(۱۶) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "اِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ"۔ قَالَتْ: قُلْتُ: لِمَ تَقُوْلُ هٰذَا؟، وَاللّٰهِ لَقَدْ كَانَتْ عَيْنِيْ تَقْذِفُ، فَكُنْتُ أَخْتَلِفُ اِلٰى فُلَانٍ الْيَهُوْدِيِّ يَرْقِيْنِيْ فَاِذَا رَقَانِيْ سَكَنَتْ فَقَالَ: عَبْدُاللّٰهِ اِنَّمَا ذٰلِكَ عَمَلُ الشَّيْطٰنِ كَانَ يَنْخَسُهَا بِيَدِهٖ، فَاِذَا رَقَاهَا كَفَّ عَنْهَا، اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكِ أَنْ تَقُوْلِيْ كَمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: أَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ، اِشْفِ أَنْتَ الشَّافِيْ، لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاؤُكَ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "دَم کرنا اور تمائم (تعویذ لٹکانا) اور تِوَلہ (ایک قسم کا جادو) شرک ہیں"، حضرت عبداللہ کی بیوی نے کہا: آپ اس طرح کیوں کہتے ہیں، خدا کی قسم! میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا، میں فلاں یہودی کے پاس جایا کرتی تھی، وہ میری آنکھ پر دَم کرتا تھا اور جب وہ مجھ پر دَم کرتا تھا تو مجھے آرام آجاتا تھا۔ حضرت عبداللہ نے کہا: یہ شیطان کا عمل تھا، وہ اپنے ہاتھ سے آنکھ میں چبھوتا تھا اور جب وہ یہودی دَم کرتا تھا، تو وہ اپنے ہاتھ کو ہٹا لیتا تھا، تمہارے لئے یہ کافی ہے کہ تم اس طرح پڑھو، جس طرح رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے: أَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ، اِشْفِ أَنْتَ الشَّافِيْ، لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاؤُكَ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا۔

''اے لوگوں کے رب! تکلیف کو دور کردے، شفا دے، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیرے سوا کسی کے پاس ایسی شفا نہیں ہے، جو بیماری کو باقی رہنے نہیں دیتی''۔

(سُنن ابوداؤد:3879)

ہمارے ایک ممتاز عالم دین علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی زید مجدہٗ نے بیان کیا: ''میرے پاس ایک شخص آیا اس نے اسی حدیثِ پاک کے کے پیشِ نظر کہا: تعویذ گنڈا شرک ہے۔ میں نے اسے اکابرینِ امت کی عبارات سے اس حدیثِ پاک کا مفہوم ومطلب سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بارآور نہ ہوئی، تو میں نے کہا: اچھا یہ بتاؤ کہ ایک مسلمان ایک کاغذ پر سورۂ اخلاص لکھتا ہے اور اسے مروّجہ صورت میں تعویذ بنا کر طالبِ تعویذ مسلمان کو دے کر کہتا ہے کہ اسے اپنے بازو یا گلے میں باندھ لو، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی برکت سے شفا عطا فرمائے اور وہ اسی نظریہ سے تعویذ باندھ لیتا ہے تو طرفین کے اس سارے عمل میں کون سی بات شرک ہے؟، اس شخص نے کہا: اس سارے عمل میں کوئی بات بھی شرک نہیں ہے۔ میں نے کہا: جب آپ کو اس سارے عمل میں کوئی بات بھی شرک معلوم نہیں دیتی تو رسول اللہ ﷺ جن کی عقل سب سے برتر ہے وہ اسے کیسے شرک فرما سکتے ہیں، پس معلوم ہوا کہ آپ نے جس تعویذ کو شرک فرمایا ہے، وہ ہے جس میں شرک متحقق ہو اور جس تعویذ میں یہ نہیں وہ شرک بھی نہیں۔ یہ گفتگو سن کر اسے اطمینان ہوا''۔

(۱۷) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ، عَنْ أَبِیْهِ، عَنْ جَدِّهٖ، قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ یُعَلِّمُنَا کَلِمَاتٍ نَقُوْلُهُنَّ عِنْدَ النَّوْمِ مِنَ الْفَزَعِ: بِسْمِ اللهِ، أَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ، مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ، وَشَرِّ عِبَادِهٖ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ، وَأَنْ یَحْضُرُوْنَ، قَالَ: فَکَانَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرٍو یُعَلِّمُهَا مَنْ بَلَغَ مِنْ وَلَدِهٖ أَنْ یَقُوْلَهَا عِنْدَ نَوْمِهٖ، وَمَنْ کَانَ مِنْهُمْ صَغِیْرًا لَا یَعْقِلُ أَنْ یَحْفَظَهَا، کَتَبَهَا لَهٗ، فَعَلَّقَهَا فِیْ عُنُقِهٖ۔

ترجمہ: ''عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں چند کلمات سکھائے، جن کو ہم خوف ودہشت کی وجہ سے سوتے وقت

پڑھتے تھے ،وہ کلمات یہ تھے: ''بِسْمِ اللهِ، أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ، مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ، وَشَرِّ عِبَادِهٖ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ، وَأَنْ يَّحْضُرُوْنَ'' ۔(ترجمہ: ''اللہ کے نام سے میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کی پناہ میں آتا ہوں ،اُس کے غضب سے ،اس کے عذاب سے اور اُس کے برے بندوں (کے شر) سے اور شیطان کے وسوسے کے شر سے اور یہ کہ شیطان ضرر کے لئے آئیں)''۔حضرت عبداللہ بن عمرو اپنے بالغ بچوں کو سوتے وقت ان کلمات کے پڑھنے کی تلقین کرتے اور جن کم سن بچوں کو اتنی سمجھ نہیں تھی کہ اِن کلمات کو یاد کرلیں، تو وہ اِن کلمات کو لکھ کر اُن کا تعویذ اُن کے گلے میں لٹکا دیتے''۔

(مسند امام احمد بن حنبل:6696)

(۱۸) عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثَلَاثِيْنَ رَاكِبًا فِيْ سَرِيَّةٍ، فَنَزَلْنَا بِقَوْمٍ، فَسَأَلْنَاهُمْ أَنْ يَّقْرُوْنَا، فَأَبَوْا، فَلُدِغَ سَيِّدُهُمْ، فَأَتَوْنَا فَقَالُوْا: أَفِيْكُمْ أَحَدٌ يَرْقِيْ مِنَ الْعَقْرَبِ؟، فَقُلْتُ: نَعَمْ، أَنَا، وَلٰكِنْ لَّا أَرْقِيْهِ حَتّٰى تُعْطُوْنَا غَنَمًا، قَالُوْا: فَإِنَّا نُعْطِيْكُمْ ثَلَاثِيْنَ شَاةً، فَقَبِلْنَاهَا، فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ (الْحَمْدُ) سَبْعَ مَرَّاتٍ، فَبَرِءَ وَقَبَضْنَا الْغَنَمَ، فَعَرَضَ فِيْ أَنْفُسِنَا مِنْهَا شَيْءٌ فَقُلْنَا: لَا تَعْجَلُوْا حَتّٰى نَأْتِيَ النَّبِيَّ ﷺ، فَلَمَّا قَدِمْنَا ذَكَرْتُ لَهُ الَّذِيْ صَنَعْتُ، فَقَالَ: أَوَمَا عَلِمْتَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ؟، اِقْتَسِمُوْهَا وَاضْرِبُوْا لِيْ مَعَكُمْ سَهْمًا۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: ہم تیس سواروں کا ایک دستہ (Company) رسول اللہ ﷺ نے ایک سَرِیّہ میں بھیجا۔ہم نے ایک قوم کے پاس پڑاؤ ڈالا اور اُن سے ہم نے مہمان نوازی کے لئے کہا، اُنہوں نے انکار کردیا، (اسی اثنا میں) اُن کے ایک سردار کو (زہریلے جانور نے) ڈس لیا، وہ لوگ ہمارے پاس آئے اور کہا: ''تم میں کوئی بچھو کے ڈسے ہوئے کو دَم کرنے والا ہے''، میں نے کہا: ہاں، لیکن جب تک تم ہمیں بکریاں نہیں دو گے، ہم دَم نہیں کریں گے، اُنہوں نے کہا: ہم آپ لوگوں کو تیس بکریاں دیں گے۔ ہم نے یہ پیشکش قبول کرلی، میں نے سات مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر

اُسے دَم کیا، تو وہ ٹھیک ہوگیا اور ہم نے وہ بکریاں لے لیں۔ اُن کے بارے میں ہمارے دل میں تَرَدُّد پیدا ہوا (کہ ان کا لینا اور اِن سے استفادہ جائز ہے یا نہیں)، تو ہم نے اپنے ساتھیوں سے کہا: جلدی نہ کرو، تاوقتیکہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور حاضر ہو جائیں (اور آپ سے رہنمائی حاصل کریں)، چنانچہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس پہنچے اور اِس بات کا ذکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہیں معلوم نہیں؟ یہ دَم ہے، آپس میں تقسیم کرلو اور میرے لئے بھی ایک حصہ نکالو، (سُنن ابن ماجہ: 2156)''۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنا حصہ نکالنے کی بات اِس لئے کی کہ آپ کے صحابہ کو اِس کے جواز کے بارے میں کوئی شک وشبہہ نہ رہے۔

(۱۹) عَنْ جَابِرٍ قَالَ: كَانَ لِي خَالٌ يَرْقِي مِنَ الْعَقْرَبِ، فَنَهٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنِ الرُّقٰى، قَالَ: فَأَتَاهُ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! وَإِنَّكَ نَهَيْتَ عَنِ الرُّقٰى، وَأَنَا أَرْقِي مِنَ الْعَقْرَبِ، فَقَالَ: مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يَّنْفَعَ أَخَاهُ فَلْيَفْعَلْ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے ایک ماموں تھے، جو دَم کر کے بچھو کے زہر کا علاج کرتے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دَم کرنے سے منع فرمایا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ نے دَم کرنے سے منع فرمایا ہے اور میں تو بچھو کے زہر کا دَم سے علاج کرتا ہوں''، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکتا ہے، ضرور پہنچائے، (صحیح مسلم: 5723)''۔

(۲۰) عَنْ عُمَيْرٍ مَوْلٰى اٰبِي اللَّحْمِ قَالَ: شَهِدْتُ خَيْبَرَ مَعَ سَادَتِي فَكَلَّمُوْا فِيَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ، وَكَلَّمُوْهُ أَنِّي مَمْلُوْكٌ قَالَ: فَأَمَرَنِي فَقُلِّدْتُ السَّيْفَ، فَإِذَا أَنَا أَجُرُّهُ فَأَمَرَ لِي بِشَيْءٍ مِنْ خُرْثِيِّ الْمَتَاعِ، وَعَرَضْتُ عَلَيْهِ رُقْيَةً كُنْتُ أَرْقِي بِهَا الْمَجَانِيْنَ فَأَمَرَنِي بِطَرْحِ بَعْضِهَا وَحَبْسِ بَعْضِهَا۔

ترجمہ: ''ابواللحم کے مَولیٰ (آزاد کردہ غلام) عُمیر کہتے ہیں کہ میں اپنے مالکوں کے ساتھ غزوۂ خیبر میں شریک ہوا، تو لوگوں نے میرے بارے میں کچھ تحفظات ظاہر کئے اور کہا کہ

یہ تو غلام ہے (یعنی غلام کو مالِ غنیمت میں حصہ نہیں مل سکتا)، پھر میری گردن میں تلوار لٹکادی گئی (ایسا لگتا تھا کہ پست قد ہونے کی وجہ سے) میں تلوار کو زمین پر کھینچ رہا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے معمولی سا ساز و سامان مجھے دینے کا حکم فرمایا۔ پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک دَم بتایا، تو آپ ﷺ نے مجھے بعض کلمات (جو قرآن و سنّت کے خلاف ہوں گے) کو ترک کرنے اور بعض کلمات کو جاری رکھنے کا حکم فرمایا (یعنی اُن کلمات میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہوگی)، (سُنن ترمذی: 1557)"۔

(۲۱) عَنْ أَبِیْ خِزَامَةَ، قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَرَأَيْتَ أَدْوِيَةً نَتَدَاوٰى بِهَا، وَرُقًى نَسْتَرْقِيْ بِهَا، وَتُقًى نَتَّقِيْهَا، هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا؟، قَالَ: هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ۔

ترجمہ: "ابوخزامہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: "ہم علاج کے لئے بعض دوائیں استعمال کرتے ہیں، بعض چیزوں کے لئے دَم کرتے ہیں اور ہم خطرات سے بچاؤ کے بعض طریقے اختیار کرتے ہیں، (یارسول اللہ!) بتایئے، کیا یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو ٹال دیتی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تقدیر ہی کے تحت ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں بعض اُمور اسباب پر مُعلّق ہوتے ہیں اور اسباب کو اختیار کرنا تقدیر کے تابع ہے، تقدیر کے منافی نہیں)، (سُنن ابن ماجہ: 3437)"۔

بعض احادیث مبارکہ میں دَم اور جھاڑ پھونک کی ممانعت آئی ہے، جو درج ذیل ہیں:

(۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: دَم (جھاڑ پھونک)، تعویذ اور تولہ شرک ہے، (سُنن ابوداؤد: 3879)"۔

"تولہ" ایک قسم کا جادو تھا، جس کے ذریعے وہ لوگ عورت کو مرد کا دوست بناتے تھے۔

(۲) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ، أَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَكْرَهُ عَشْرَ خِصَالٍ، الصُّفْرَةَ يَعْنِي الْخَلُوْقَ، وَتَغْيِيْرَ الشَّيْبِ، وَجَرَّ الْإِزَارِ، وَالتَّخَتُّمَ بِالذَّهَبِ، وَالضَّرْبَ

بِالْكِعَابِ، وَالتَّبَرُّجَ بِالزِّينَةِ لِغَيْرِ مَحِلِّهَا، وَالرُّقَى إِلَّا بِالْمُعَوِّذَاتِ، وَتَعْلِيقَ التَّمَائِمِ، وَعَزْلَ الْمَاءِ بِغَيْرِ مَحِلِّهِ، وَإِفْسَادَ الصَّبِيِّ غَيْرَ مُحَرِّمِهِ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دس عادتوں کو ناپسند فرماتے تھے (وہ ناپسندیدہ خصلتیں یہ ہیں:) خلوق (عورتوں کی ایک قسم کی خوشبو) کا استعمال، ڈاڑھی کو کالے سیاہ خضاب سے رنگنا، اِزار (تہبند) کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلنا اور سونے کی انگوٹھی پہننا، شطرنج کھیلنا، ناروا مقام پر (عورتوں کا) اپنی زیب وزینت کی نمائش کرنا، مُعَوِّذات (شریعت میں جائز تعویذوں اور دَم کے علاوہ) جھاڑ پھونک کرنا، (بدعت وشرک پر مشتمل کلمات کے) تعویذ لٹکانا، حرام مقام پر منی ٹپکانا اور بچے کو بگاڑنا (یعنی بچے کی شیرخوارگی کے زمانے میں بیوی کے ساتھ جماع کرنا کہ اس طرح دوسرا حمل قرار پانے سے اُس بچے کی نشوونما پر اثر پڑے گا)، اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار نہیں دیا (یعنی ہرچند کہ یہ مکروہ ہے، مگر بیوی کے ساتھ مباشرت حرام نہیں ہے)، (سُنن نسائی:5103)''۔

اِن احادیث میں ایسے تعویذات کو شرک فرمایا، جو شرکیہ یا کفریہ عبارات پر مشتمل ہوں یا جن کو لٹکانے والوں کا یہ اعتقاد ہو کہ عافیت اور بیماری کا مکمل علاج اِن تعویذات کی وجہ سے ہوگا، جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں مشرکین کا عقیدہ تھا۔ لیکن جس نے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے برکت حاصل کرنے کے لئے تعویذ استعمال کیا اور اُس کا اعتقاد یہ ہو کہ مصیبت ٹالنے والا اور مرض کو دور کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، تو پھر کوئی حرج نہیں بلکہ ایسا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے ثابت ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: أَقُولُ: اَلَّذِي رَأَيْتُهُ فِي الْمُجْتَبٰى'': اَلتَّمِيمَةُ الْمَكْرُوهَةُ مَا كَانَ بِغَيْرِ الْقُرْاٰنِ، وَقِيلَ: هِيَ الْخَرَزَةُ الَّتِي تُعَلِّقُهَا الْجَاهِلِيَّةُ۔ فَلْتُرَاجَعْ نُسْخَةٌ أُخْرٰى وَفِي ''الْمُغْرِبِ'': وَبَعْضُهُمْ يَتَوَهَّمُ أَنَّ الْمَعَاذَاتِ هِيَ التَّمَائِمُ، وَلَيْسَ كَذٰلِكَ، إِنَّمَا التَّمِيمَةُ الْخَرَزَةُ، وَلَا بَأْسَ بِالْمَعَاذَاتِ إِذَا كُتِبَ فِيهَا الْقُرْاٰنُ، أَوْ أَسْمَاءُ اللّٰهِ تَعَالٰى،۔۔۔۔۔۔ وَإِنَّمَا تُكْرَهُ الْعُوذَةُ إِذَا كَانَتْ بِغَيْرِ لِسَانِ الْعَرَبِ، وَلَا يُدْرٰى مَا هُوَ؟، وَلَعَلَّهُ يَدْخُلُهُ سِحْرٌ أَوْ كُفْرٌ أَوْ غَيْرُ ذٰلِكَ، وَأَمَّا مَا كَانَ مِنَ

الْقُرْاٰنِ أَوْشَیْءٌ مِّنَ الدَّعَوَاتِ فَلَا بَأْسَ بِہٖ۔

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں کہ ''مجتبیٰ'' میں یہ مذکور ہے کہ: تعویذ اُس وقت مکروہ ہے، جب اُن میں قرآن کے علاوہ (کوئی اور خلافِ شرع) کلمات ہوں اور ایک قول یہ ہے کہ: یہ وہ سیپیاں ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں (گلے میں) لٹکائی جاتی تھیں۔ اور ''مغرب'' میں مذکور ہے کہ بعض لوگوں کا یہ وہم ہے کہ تعویذات بھی تمائم (ممنوع) ہیں، ایسا نہیں ہے کیونکہ تمیمہ (ڈوری میں پروئی ہوئی) سیپیوں کو کہتے ہیں۔ اور (ایسے) تعویذات (کے استعمال میں) کوئی حرج نہیں، جب ان میں قرآن مجید لکھا جائے یا اللہ تعالیٰ کے اسماء لکھے جائیں''۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''تعویذات اُس وقت مکروہ ہیں، جب وہ عربی زبان میں نہ ہوں اور سمجھ نہ آسکے کہ اُس میں کیا لکھا ہے؟، کیونکہ ممکن ہے کہ اُس میں سحر یا کفر ہو یا اور کوئی (خلافِ شرع) چیز ہو اور جن تعویذات میں قرآن مجید (کی آیات یا اُن کے اعداد) یا دعائیں لکھی ہوئی ہوں، تو اُن کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص:443)

ایسے تعویذات جو قرآنی آیات، اُن کے اَعداد، مَسنون و ماثور دعاؤں (جو احادیث مبارکہ اور بزرگانِ دین سے منقول ہیں) پر مشتمل ہوں، اُن کا استعمال جائز ہے۔

علامہ علی بن سلطان محمد القاری رحمہ الباری لکھتے ہیں: وَأَمَّا مَاکَانَ مِنَ الْاٰیَاتِ الْقُرْاٰنِیَّۃِ وَالْأَسْمَآءِ وَالصِّفَاتِ الرَّبَّانِیَّۃِ وَالدَّعَوَاتِ الْمَاْثُوْرَۃِ النَّبَوِیَّۃِ فَلَا بَأْسَ، بَلْ یُسْتَحَبُّ سَوَآءٌ کَانَ تَعْوِیْذًا أَوْ رُقْیَۃً أَوْ نُشْرَۃً وَأَمَّا عَلٰی لُغَۃِ الْعِبْرَانِیَّۃِ وَنَحْوِھَا فَیُمْتَنَعُ لِاِحْتِمَالِ الشِّرْکِ فِیْھَا۔

ترجمہ: ''اور رہے وہ تعویذات، جو آیاتِ قرآنیہ، اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات ربانیہ اور منقولہ دعاؤں پر مشتمل ہوں، اُن میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ (اُن کا استعمال) مستحب ہے، خواہ وہ تعویذ ہو، دَم ہو، یا نُشرہ (دَم، افسوں) ہو البتہ عبرانی زبان (غیر عربی) یا کسی اور زبان میں شرک کے احتمال کے سبب ممنوع ہے''۔ (المرقاۃ المفاتیح، جلد 8، ص:361-360)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''عملیات یعنی تعویذ وغیرہ کتابوں سے کرنا حق ہے یا باطل؟، کس طور سے جواز اور کس طریق سے ناجائز؟''۔ آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''عملیات وتعویذ اسمائے الٰہی وکلامِ الٰہی سے ضرور جائز ہیں، جبکہ اُن میں کوئی طریقہ خلافِ شرع نہ ہو، مثلاً کوئی لفظ غیر معلوم المعنی جیسے حفیظی، رمضان، کعسلھون اور دعائے طاعون میں طاسوسا، ماسوسا، ایسے الفاظ کی اجازت نہیں، جب تک حدیث یا آثار یا اَقوالِ مشائخِ مُعتَمَدین سے ثابت نہ ہو، یونہی دفعِ صَرَع (مرگی) وغیرہ کے تعویذ کہ مرغ کے خون سے لکھتے ہیں، یہ بھی ناجائز ہے، اس کے عوض مُشک سے لکھیں کہ وہ بھی اصل میں خون ہے، یونہی حُبّ وتسخیر کے لئے بعض تعویذات دروازہ کی چوکھٹ میں دفن کرتے ہیں کہ آتے جاتے اس پر پاؤں پڑیں، یہ بھی ممنوع وخلافِ ادب ہے، اسی طرح وہ مقصود جس کے لئے وہ تعویذ یا عمل کیا جائے اگر خلافِ شرع ہو، ناجائز ہوجائے گا، جیسے عورتیں تسخیرِ شوہر کے لئے تعویذ کراتی ہیں، یہ حکم شرع کا عکس ہے۔ اللہ عزّوجلّ نے شوہر کو حاکم بنایا ہے، اُسے محکوم بنانا عورت پر حرام ہے۔ یونہی تفریق وعداوت کے عمل وتعویذ کہ محارم میں کئے جائیں، مثلاً بھائی کو بھائی سے جدا کرنا، یہ قَطعِ رَحم ہے اور قَطعِ رَحم حرام۔ یونہی زن وشوہر میں نفاق ڈلوانا۔ حدیث میں فرمایا: لَیْسَ مِنَّا مَنْ خَبَّبَ اِمْرَاَۃً عَلٰی زَوْجِھَا۔

ترجمہ: ''جو کسی عورت کو اس کے شوہر سے بگاڑ دے، وہ ہمارے گروہ سے نہیں''۔ بلکہ مُطلقاً دو مسلمانوں میں تفریق بلاضرورت شرعی ناجائز ہے۔ حدیث میں فرمایا: لَاتَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا اِلٰی قَوْلِہٖ ﷺ وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا۔ ترجمہ: ''(لوگو!) ایک دوسرے سے عداوت نہ رکھو اور نہ ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرو، حضور ﷺ کے اس ارشادِ گرامی تک ''اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی ہوجاؤ''۔

غرض نفسِ عمل یا تعویذ میں کوئی امر خلافِ شرع ہو یا مقصود میں، تو ناجائز ہے، ورنہ جائز، بلکہ نفع رسانی مسلم کی غرض سے مَحمود وموجبِ اجر۔ قَالَ ﷺ: مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْکُمْ اَنْ یَّنْفَعَ اَخَاہُ فَلْیَنْفَعْہُ، رَوَاہُ مُسْلِمٌ عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔

ترجمہ: ''تم میں جس سے ہو سکے اپنے بھائی مسلمان کو کوئی نفع پہنچائے، تو پہنچائے۔ (امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اِسے روایت کیا)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص:197-196)

اوپر جس حدیث مبارک کا حوالہ دیا گیا ہے، اُس کا پورا متن حسبِ ذیل ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ، وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللهِ اِخْوَانًا۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے، خبروں کا سراغ نہ لگاؤ، (دوسروں کے پوشیدہ اَحوال) کی کھوج نہ لگاؤ، محض جوش دلانے کے لئے بڑھ چڑھ کر دام نہ لگاؤ، ایک دوسرے کے ساتھ حسد نہ کرو، ایک دوسرے کے ساتھ بغض نہ رکھو، پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو اور اللہ کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ، (صحیح بخاری:6066)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۞ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۞

ترجمہ: ''اور بے شک کفار سے بعید نہیں کہ وہ اپنی نظریں لگا کر آپ کو پھسلا دیں گے، وہ جب بھی قرآن سنتے ہیں، تو کہتے ہیں: یہ مجنون ہے، حالانکہ یہ تو صرف تمام جہانوں کیلئے رحمت ہے، (سورۃ القلم:52-51)''۔

کمپنی کے منظور شدہ پٹرول میں خیانت

سوال:

میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کرتا ہوں، کمپنی کی جانب سے ذاتی اور آفس کے استعمال کیلئے مجھے گاڑی لون پر دی گئی ہے، جس کی قسط ہر ماہ باقاعدگی سے میری تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے۔ پٹرول کے طور پر بذریعہ Shell Card اور PSO card

ہر ماہ 250 لیٹر ملتا ہے۔ متعلقہ پمپ پر کارڈ شو کروا کر حسبِ ضرورت پٹرول لے لیتے ہیں، ماہانہ جتنا پٹرول لیا جاتا ہے، ہر ماہ کے اختتام پر پٹرول پمپ کی انتظامیہ کمپنی کو اُس کی سمری بھجوا دیتی ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ بالفرض اگر ہمارا استعمال ماہانہ 100 لیٹر ہو تو کیا بقیہ 150 لیٹر پٹرول پمپ سے کیش کروا کر رقم اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں؟۔

استفسار: جو لوگ بقیہ Fuel کی رقم پمپ سے وصول کرتے ہیں، پمپ اُن کے کارڈ سے اُتنا پٹرول منہا کر کے پوری رقم اُن کے حوالے کر دیتا ہے، وہ اپنی مرضی سے پمپ کے ملازم کو 100 یا 200 روپے Tip دے دیتے ہیں۔

نوٹ: کمپنی کی جانب سے وہیکل پالیسی اسٹیٹمنٹ بھی منسلک ہے۔

(محمد رضوان، بلاک 2، ایف۔ بی ایریا، کراچی)

جواب:

کمپنیوں یا اداروں کی جانب سے اپنے ملازمین یا افسران کے لئے زیادہ سے زیادہ پٹرول کی جو حد مقرر ہوتی ہے، اُس کی کئی صورتیں ہیں:

(۱) زیادہ سے زیادہ منظور شدہ (Entitled) پٹرول کی مقدار کے برابر رقم اُن کی تنخواہ میں جمع کر دی جاتی ہے اور اس کا کم یا زیادہ استعمال ملازم کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ منظور شدہ کل رقم کا پٹرول خرید کر ملازم استعمال کرلے تو اُس کے صحیح ہونے میں کسی کو کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ملازم وہ پوری رقم پٹرول پر خرچ نہیں کرتا بلکہ کچھ بچا لیتا ہے، تو بھی جائز ہے، کیونکہ کمپنی نے اس رقم کا اُسے مالک بنا دیا ہے۔

(۲) کمپنی Shell Card یا Pso Card یا کسی خاص پٹرول پمپ کا کارڈ دیدیتی ہے اور اُس میں زیادہ سے زیادہ قابلِ استعمال پٹرول کی حد درج ہوتی ہے۔ مُقررہ حد کے برابر یا اس کے اندر رہتے ہوئے پٹرول کا استعمال ملازم کے لئے جائز ہے، لیکن استعمال کئے بغیر اُس کے عوض رقم لینا خیانت ہے۔ اور عام طور پر یہ رقم مُقررہ قیمت سے کم دی جاتی ہے اور اِس خیانت میں وہ ملازم اور پٹرول پمپ کی انتظامیہ وملازمین دونوں فریق شامل ہوتے

ہیں اور دونوں خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں اور گنہگار ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا

ترجمہ: ''جس نے ہمیں دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں، (صحیح مسلم :283)''۔ اور اگر بالفرض ملازم کو پٹرول کے عوض پوری قیمت دیدی جاتی ہے، تو یہ بھی خیانت ہے اور اس ملازم کا پٹرول پمپ کے ملازم کو ٹپ (Tip) دینا رشوت دینے اور لینے کے زمرے میں آتا ہے اور دونوں حرام کے مرتکب ہیں۔

(۳) یہ کہ ملازم نقد رقم دے کر پمپ سے پٹرول خرید تا ہے اور اس کے عوض پمپ سے رسید لے لیتا ہے، مہینے کے اختتام پر وہ رسیدیں کمپنی میں جمع کرتا ہے اور اس کے عوض رقم اس کی تنخواہ میں جمع ہو جاتی ہے۔ اگر یہ سارا عمل شفاف (Transparent) ہے، تو اس کے جواز میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔ لیکن اگر کچھ پٹرول تو ملازم عملاً خرید کر پمپ والوں کو قیمت ادا کر دیتا ہے اور رسید (Cash Memo) لے لیتا ہے، تو اس مقدار کی حدتک معاملہ بالکل درست ہے، لیکن اگر ملازم پٹرول کی کچھ مقدار عملاً خریدتا تو نہیں ہے مگر اُس کی رسید (Cash Memo) بنوالیتا ہے اور مثلاً ایک ہزار کی رسید کے عوض دو تین سو روپے پمپ کے ملازمین کو نقد دے دیتا ہے اور مہینے کے اختتام پر کمپنی سے رسید پر درج پوری رقم لے لیتا ہے، تو یہ خیانت ہے اور کمپنی اور پمپ کے ملازمین دونوں کے لئے حرام ہے۔

آپ نے جو کمپنی کی پالیسی کی نقل منسلک کی ہے، اس میں پٹرول اور CNG کی Mex.Limit of Entitlement درج ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ملازم زیادہ سے زیادہ اتنی مقدار میں پٹرول /CNG استعمال کر سکتا ہے۔ ملازم کو اِس کے فروخت کا استحقاق نہیں ہے، لہٰذا اس پر دوسری صورت کا اطلاق ہوگا۔

لباسِ شہرت کا حکم

سوال:

آج کل مردوں بالخصوص نعت خواں حضرات بڑے چمکدار اور بھڑکیلے لباس

پہنے نظر آتے ہیں اور بعض ایسا لباس پہنتے ہیں کہ خواتین کا سا گمان ہوتا ہے۔شریعت مُطہرہ کی نگاہ میں اُن کا یہ عمل کیسا ہے؟۔(محمد امیر ممتازی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

شریعت میں لباس کے لئے قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اُس میں تین امور کی رعایت ہونی چاہئے: (۱) اصل میں اس لباس کا استعمال جائز ہو، مثلاً ریشمی یا سنہری لباس، سرخ یا زرد، زعفرانی رنگ کا لباس مرد کے لئے جائز نہیں۔(۲) ستر کی رعایت ہو۔(۳) لباس کی وضع قطع کفار، فساق وفُجار کے طرز وطریقے پر نہ ہو۔مردوں کے لئے ایسا لباس پہننا حرام ہے، جس سے عورتوں کی مشابہت ہو۔رسول اللہ ﷺ نے ایسے مردوں اور عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔حدیث پاک میں ہے: لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الرَّجُلَ يَلْبَسُ لِبْسَةَ الْمَرْأَةِ، وَالْمَرْأَةَ تَلْبَسُ لِبْسَةَ الرَّجُلِ۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ اس مرد پر لعنت کرے جو عورت جیسا لباس پہنے اور اس عورت پر بھی لعنت کرے جو مرد جیسا لباس پہنے''۔(سُنن ابوداؤد: 4098)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ، وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اُن مردوں پر لعنت فرمائی، جو عورتوں کی وضع قطع اختیار کرتے ہیں اور اُن عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں کی وضع قطع اپنائیں''۔(صحیح بخاری: 5885، سُنن ترمذی: 2784)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اِعْلَمْ اَنَّ الْكِسْوَةَ مِنْهَا فَرْضٌ وَهُوَ مَايَسْتُرُ الْعَوْرَةَ وَيَدْفَعُ الْحَرَّ وَالْبَرْدَ۔۔۔۔ كَمَا فِي ''الْمُلْتَقَى'' بَيْنَ النَّفِيْسِ وَالْخَسِيْسِ، اِذْخَيْرُ الْاُمُوْرِ أَوْسَاطُهَا۔ وَلِلنَّهْيِ عَنِ الشُّهْرَتَيْنِ: وَهُوَمَاكَانَ فِيْ نِهَايَةِ النَّفَاسَةِ أَوِالْخَسَاسَةِ، وَمُسْتَحَبٌّ: وَهُوَ الزَّائِدُ لِاَخْذِ الزِّيْنَةِ وَاِظْهَارِ نِعْمَةِ اللهِ تَعَالٰى، قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: اِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ يَّرٰى أَثَرَ

نِعْمَتِهٖ عَلٰی عَبْدِهٖ۔ وَمُبَاحٌ: وَهُوَ الثَّوْبُ الْجَمِيْلُ لِلتَّزَيُّنِ فِي الْأَعْيَادِ وَالْجُمَعِ وَمَجَامِعِ النَّاسِ لَا فِيْ جَمِيْعِ الْأَوْقَاتِ لِأَنَّهٗ صَلَفٌ وَخُيَلَاءُ، وَرُبَّمَا يَغِيْظُ الْمُحْتَاجِيْنَ فَالتَّحَرُّزُ عَنْهُ أَوْلٰی وَمَكْرُوْهٌ: وَهُوَ اللُّبْسُ لِلتَّكَبُّرِ۔ وَيُسْتَحَبُّ الْأَبْيَضُ۔

ترجمہ: ''فرض لباس وہ ہے جو سترِ عورت کا کام دے (یعنی بدن کے جس حصے کو پردے میں رکھنا ہے، اُسے چھپادے) اور (موسم کی) گرمی وسردی سے محفوظ رکھے۔۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ''ملتقی'' میں تصریح ہے کہ لباس متوسط ہونا چاہئے نہ بہت زیادہ نفیس اور نہ ہی بے انتہا خسیس، اس لئے کہ درمیانی کام بہتر ہوتے ہیں اور دونوں طرح کے لباسِ شہرت کی ممانعت آئی ہے، یعنی جو نہایت نفیس ہو یا نہایت خسیس ہو۔ اور مستحب لباس وہ ہے جو زینت اور نعمتِ الٰہی کے اظہار کے لئے ہو، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ يَّرٰی أَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰی عَبْدِهٖ ''بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اپنی نعمت کے اثر کو دیکھنا پسند فرماتا ہے، (سُنن ترمذی: 2819)''۔ مباح لباس وہ ہے کہ جو جمیل ہو اور عید، جمعہ، لوگوں کے اجتماع کے مواقع پر زینت کے لئے پہنا جائے نہ کہ اکثر اوقات میں، اس لئے کہ (اکثر اوقات میں پہننا) تکبر اور بڑائی (ظاہر کرنے) کے لئے ہے اور بسا اوقات یہ ناداروں کو غصہ دلاتا ہے (کیونکہ ان کے اندر احساسِ محرومی پیدا ہوتا ہے)، پس اس سے بچنا بہتر ہے۔ اور مکروہ لباس وہ ہے جو تکبُّر کے لئے پہنا جائے اور سفید لباس پہننا مستحب ہے''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 427)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے ایسے لباس کو ''لباسِ شہرت'' میں شامل فرمایا ہے۔ اُنہوں نے لکھا: ''لباسِ شہرت پہننا یعنی اس قدر چمکیلا نادر ہو، جس پر انگلیاں اُٹھیں اور بالقصد اتنا ناقص وخسیس کرنا بھی ممنوع ہے جس پر نگاہیں پڑیں، یونہی ہر انوکھی اچنبھے کی ہیئت، وضع وتراش خراش کہ وجہِ انگشت نمائی ہو۔ سُنن ابی داؤد وسُنن ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سندِ حسن کے ساتھ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ أَلْبَسَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَوْبًا مِثْلَهٗ وَعِنْدَ ابْنِ مَاجَةَ ثَوْبٌ

مَذَلَّةٌ زَادَ اَبُوْدَاوٗدَ فِیْ رِوَایَةٍ ثُمَّ تُلْهَبُ فِیْهِ النَّارُ۔

ترجمہ: ''جس نے شہرت کالباس پہنا، اس کو اللہ تعالیٰ بھی ایسا ہی لباس پہنائے گا اور ابن ماجہ میں (لباسِ شہرت کی جگہ) ''لباسِ ذلت'' اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے: ''پھر اس (لباس) میں جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی'' کے الفاظ ہیں''۔

جو شہرت کے کپڑے پہنے گا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ویسا ہی لباسِ شہرت پہنائے گا، جس سے میدانِ محشر میں معاذ اللہ! ذلت و تفضیح (رسوائی) ہو، پھر اُس میں آگ لگا کر بھڑکا دی جائے گی، والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

فِیْ رَدِّ الْمُحْتَارِ عَنِ الدُّرِّ الْمُنْتَقٰی نَهٰی عَنِ الشُّهْرَتَیْنِ وَهُوَ مَاکَانَ فِیْ نِهَایَةِ النَّفَاسَةِ اَوِالْخَسَاسَةِ۔ اَقُوْلُ: وَلَایَخْتَصُّ بِهِمَا بَلْ لَوْکَانَ بَیْنَهُمَا وَکَانَ عَلٰی هَیْأَةٍ عَجِیْبَةٍ غَرِیْبَةٍ تُوْجِبُ الشُّهْرَةَ وَشُخُوْصَ الْاَبْصَارِ کَانَ لِبَاسَ شُهْرَةٍ قَطْعًا۔

ترجمہ: ''ردالمحتار میں الدُّرُّ المنتقٰی سے منقول ہے کہ دو شہرتوں سے منع فرمایا، ایک حد سے زیادہ نفاست اور دوسری حد سے زیادہ رسوائی سے۔ (میں کہتا ہوں) ان دونوں سے خاص نہیں بلکہ عجیب و غریب حالت بنانا جو شہرت کا باعث ہو اور لوگوں کے لئے نظارہ بنے، وہ سب قطعاً شہرت کا لباس ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 614-613، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

''ہجرت کا نواں سال ''عام الوفود'' کہلاتا ہے، اس سال جو وفد آئے ان میں سب سے پہلے آنے والا، نجران کا وفد تھا۔ جب نجران کا وفد مدینہ منورہ پہنچا تو وہ نہایت قیمتی اور زرق برق لباس زیبِ تن کئے، سونے، ہیرے جواہرات کے زیورات پہنے اور نہایت شان و شوکت اور تکبر و غرور کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسجد نبوی شریف میں داخل ہوئے، اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عصر کی نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ یہ لوگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا لیکن آپ نے جواب نہیں دیا، اُنہوں نے گفتگو کا آغاز کیا، لیکن آپ خاموش رہے، آپ کے اس طرزِ عمل سے وہ حیرت زدہ ہو گئے۔ یہ لوگ

حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف سے شناسا تھے کیونکہ ان کے درمیان باہمی تجارتی روابط قدیم زمانہ سے تھے۔ یہ لوگ ان دونوں حضرات کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ کے نبی نے ہمیں گرامی نامہ تحریر فرمایا۔ ہم اس والا نامہ کو پڑھ کر یہاں حاضر ہوئے لیکن حضور نے نہ ہمارے سلام کا جواب دیا اور نہ ہمارے ساتھ گفتگو کی۔ اب ہم آپ سے مشورہ کرتے ہیں کہ ہم کیا کریں؟، ان دونوں حضرات نے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا۔ رمز شناس نبوت نے فرمایا: انہیں کہو کہ یہ ریشمی اور زرنگار قبائیں اتار دیں، سونے کی انگوٹھیاں انگلیوں سے نکال دیں اور اپنے سفر کا سادہ لباس پہن کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ انہوں نے سیدنا علی مرتضیٰ کے اس ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے سادہ لباس پہنا اور حاضر خدمت ہو کر سلام عرض کیا تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے سلام کا جواب دیا اور ان سے گفتگو شروع کی''۔

(مُلخص از ضیاء النبی، جلد چہارم، ص:651)

نعت خواں حضرات محبتِ رسول کے اُشعار پڑھتے ہیں تو اُس کا تقاضا یہ ہے کہ قول وفعل میں مطابقت ہو اور اِتباعِ سنّت کو اختیار کریں اور لباس اور وضع میں بھی حتی الامکان سنّت کی پیروی کریں، شریعت کے احکام کا تعلق ظاہر حال سے ہوتا ہے نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور آخرت میں جزا وسزا کا مدار نیتوں پر ہوگا۔

سود حرام ہے

سوال:

ایسا شخص جو سود پر رقم دیتا اور لیتا ہو، اُس کے ساتھ کھانا پینا، تعلقات رکھنا کہاں تک جائز ہے؟۔ (عبدالستار، کراچی)۔

جواب:

سود حرامِ قطعی ہے، قرآن مجید میں سود کی حُرمت کا متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ

ترجمہ: ''اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے''۔(البقرہ:275)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَۚ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! دُگنا چوگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ، (آل عمران:130)''۔

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِؕ

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے''۔(البقرہ:276)

سود لینے والے کے متعلق ارشاد فرمایا: اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّؕ

ترجمہ: ''جولوگ سود کھاتے ہیں، وہ قیامت کے دِن صرف اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو، (البقرہ:275)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ۝

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود چھوڑ دو اگر تم مومن ہو، پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو، اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے اصل مال تمہارا حق ہیں، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم ظلم کئے جاؤ گے''۔

(البقرہ:279-278)

سود لینے، دینے کو حلال جاننا کفرِ صریح ہے، ایسے شخص پر توبہ فرض ہے، از سرِ نو اسلام قبول کرے اور اگر شادی شدہ ہے تو تجدیدِ نکاح بھی کرے۔ اگر ایسا نہ کرے تو دیگر مسلمانوں پر لازم ہے کہ اُس سے قطع تعلق کریں۔ ہاں البتہ اگر وہ اسے حرام جانتا ہے، لیکن اس میں مبتلا ہے، جیسا کہ آج کل مسلمان بڑی تعداد میں اس میں مبتلا ہیں، تو ایسے لوگوں کو حکیمانہ دعوت اور موعظۂ حسنہ سے سمجھاتے رہنا چاہئے اور دلیل سے قائل کرنا چاہئے۔

اپنے نام کے ساتھ شامل لفظِ محمد پر درود کا اشارہ لکھنا

سوال:

بعض لوگ جن کے نام میں لفظ ''محمد'' بھی شامل ہوتا ہے، اُس پر '' ؐ '' لکھ دیتے ہیں، جیسے محمدؐ اقبال، نذر محمدؐ، محمد عبداللہ وغیرہ۔ کیا عام افراد کے نام پر نشانِ درود شریف لکھنا شریعت کی رُو سے جائز ہے؟، اگر ناجائز ہے، تو اس عمل سے ایمان یا عقیدہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟، (نیاز احمد، میر پور، آزاد کشمیر)۔

جواب:

صلی اللہ علیہ وسلم کو مختصر کر کے بطور اشارہ ''ص'' لکھنا جائز نہیں ہے، ہم اس مسئلے پر ایک تفصیلی فتویٰ (''تفہیم المسائل'' جلد پنجم) جاری کر چکے ہیں۔ باقی رہا یہ مسئلہ کے جن لوگوں کے نام ''محمد''، ''احمد''، ''علی''، ''حسن'' یا ''حسین'' ہوتے ہیں، وہ اپنے ناموں کے ساتھ ''ص''، ''ؐ'' یا ''ؑ'' لکھتے ہیں، یہ شرعاً ممنوع ہے کہ اِس جگہ جو نام لکھا جارہا ہے، اُس سے مراد تو یہ شخص ہے، اِس پر درود کے اشارے کی ضرورت نہیں۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''لوگوں کے نام کے آگے جو محمد ہے اُس پر حرف '' ؐ '' اس طرح لکھنا جائز ہے یا نہیں؟'' آپ نے جواب میں لکھا: ''حرف '' ؐ '' لکھنا جائز، نہ لوگوں کے نام پر، نہ حضور ﷺ کے اسم کریم پر، لوگوں کے نام پر تو یوں نہیں کہ وہ اشارہ درود کا ہے اور غیر انبیاء وملائکہ علیہم الصلوٰۃ والسلام پر بالاستقلال درود جائز نہیں ہے اور نامِ اقدس پر یُوں نہیں کہ وہاں پورے درود شریف کا حکم ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لکھے فقط '' ؐ '' یا ''صلم'' یا ''صلعم'' جو لوگ لکھتے ہیں، سخت شنیع (بری بات) وممنوع ہے یہاں تک کہ تاتارخانیہ میں اس کو تخفیف شانِ اقدس ٹھہرایا، والعیاذ باللہ تعالیٰ''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 23 ص:388)

کھانے کے دوران سلام کرنا اور جواب دینا

سوال:

کھانا کھاتے ہوئے شخص کو سلام کرنا چاہئے یا نہیں ؟،اِسی طرح کھانا کھاتے ہوئے سلام کا جواب دینا ضروری ہے یا نہیں؟،(سید شفاعت علی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

''السلام'' اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ مسلمانوں کو جو ایک دوسرے سے ملاقات کے موقع پر سلام کی تعلیم دی گئی ہے، یہ ایک دوسرے کے لئے دعائیہ کلمات بھی ہیں اور اسلام کا شِعار بھی ہے۔ سلام کرنا سنت ہے اور اُس کا جواب دینا واجب ہے۔

قرآن مجید میں سلام کا جواب اچھے الفاظ سے دینے کا حکم ہے: وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا

ترجمہ: ''اور جب تم کو کسی لفظ کے ساتھ سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر لفظ کے ساتھ سلام کرو یا اُسی لفظ کو لوٹا دو، (النساء:86)''۔

احادیثِ مبارکہ میں سلام کا حکم اور فضائل بیان کئے گئے ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خَمْسٌ تَجِبُ لِلْمُسْلِمِ عَلَى أَخِيْهِ: رَدُّ السَّلَامِ

ترجمہ: ''پانچ چیزیں ایک مسلمان کے لئے اُس کے مسلمان بھائی پر واجب ہیں: (اُن میں سے ایک) اپنے بھائی کے سلام کا جواب دینا ہے، (صحیح مسلم:5644)''۔ایک روایت میں فرمایا: حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ: اِذَا لَقِيْتَهٗ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ

ترجمہ: ''مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں: (اُن میں سے ایک) جب تم اپنے بھائی سے ملو، تو اُس کو سلام کرو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:5645)''۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أَفْشُوا السَّلَامَ

تَدخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ۔

ترجمہ: ''بکثرت (ایک دوسرے کو) سلام کرو اور سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ، (سُنن ترمذی:1855)''۔

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِيْ، وَالْمَاشِيْ عَلَى الْقَاعِدِ، وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ۔

ترجمہ: ''سوار پیدل کو سلام کرے، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور کم لوگ زیادہ لوگوں کو سلام کریں، (صحیح مسلم:5640)''۔

فقہاءِ کرام کی تصریحات کی روشنی میں جب کوئی کھانے میں مشغول ہو، تو اُسے سلام نہیں کرنا چاہئے، یہ حکم اُس وقت ہے کہ جب کھانے والے کے منہ میں لقمہ ہے اور وہ چبا رہا ہے تو چونکہ اُس وقت وہ جواب دینے سے عاجز ہے لہٰذا اُس وقت سلام نہ کیا جائے ہاں اگر کھانے کے لئے بیٹھا ہی ہے یا کھا چکا ہے تو سلام کیا جا سکتا ہے کہ اُس وقت وہ جواب دینے سے عاجز نہیں۔

شیخ محمد بن محمد بن شہاب المعروف ابن بزاز الکردری حنفی متوفی 827ھ لکھتے ہیں:

مَرَّ عَلٰى قَوْمٍ يَأْكُلُوْنَ اِنْ كَانَ مُحْتَاجًا وَعَرَفَ اَنَّهُمْ يَدْعُوْنَهُ اِلَيْهِ سَلَّمَ وَاِلَّا لَا۔

ترجمہ: ''ایسے لوگوں پر گزر ہوا جو کھانے میں مشغول ہیں، اگر یہ بھوکا ہے اور جانتا ہے کہ اسے وہ لوگ کھانے میں شریک کرلیں گے تو سلام کرے ورنہ نہیں''۔

(فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ، جلد 6، ص:354)

سلام کا جواب نہ دینے کے لئے دو عذر ہیں:

(۱) حقیقی طور پر عاجز ہونا مثلاً کھانا کھانے میں مشغول ہے۔

(۲) شرعی عذر کے سبب جواب نہ دینا مثلاً نماز پڑھنے یا قرآن مجید کی تلاوت کرنے کے سبب جواب دینے سے عاجز ہونا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: يُكْرَهُ عَلٰى عَاجِزٍ عَنِ الرَّدِّ حَقِيْقَةً كَاٰكِلٍ اَوْ شَرْعًا كَمُصَلٍّ

وَّقَارِیٍٔ، وَلَوْسَلَّمَ لَایَسْتَحِقُّ الْجَوَابَ۔

ترجمہ: ''اُس شخص پر سلام کرنا مکروہ ہے جو حقیقتاً سلام کا جواب نہیں دے سکتا، جیسے کھانا کھانے والا شخص، یا وہ شخص جو شرعاً جواب دینے سے عاجز ہو جیسے نماز یا تلاوتِ قرآن میں مشغول شخص، اگر کوئی (ان تینوں کاموں میں سے کسی کام میں مشغول شخص کو) سلام کرے تو سلام کے جواب کا مستحق نہیں ہوگا''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (کَاٰکِلٍ) ظَاھِرُہٗ اَنَّ ذَالِکَ مَخْصُوْصٌ بِحَالِ وَضْعِ اللُّقْمَۃِ فِی الْفَمِ وَالْمَضْغِ، وَاَمَّا قَبْلُ وَبَعْدُ فَلَایُکْرَہُ لِعَدَمِ الْعَجْزِ، وَبِہٖ صَرَّحَ الشَّافِعِیَّۃُ۔ وَفِیْ ''وَجِیْزِ الْکَرْدِیِّ'': مَرَّ عَلٰی قَوْمٍ یَّاْکُلُوْنَ: اِنْ کَانَ مُحْتَاجًا وَّعَرَفَ اَنَّھُمْ یَدْعُوْنَہٗ سَلَّمَ، وَاِلَّا فَلَا۔ وَھٰذَا یَقْتَضِیْ بِکَرَاھَۃِ السَّلَامِ عَلَی الْاٰکِلِ مُطْلَقًا اِلَّا فِیْمَا ذَکَرَہٗ۔ (وَلَوْسَلَّمَ لَایَسْتَحِقُّ الْجَوَابَ) اَقُوْلُ: فِی ''الْبَزَّازِیَّۃِ'': وَاِنْ سَلَّمَ فِیْ حَالِ التِّلَاوَۃِ فَالْمُخْتَارُ اَنَّہٗ یَجِبُ الرَّدُّ، بِخِلَافِ حَالِ الْخُطْبَۃِ وَالْاَذَانِ وَتَکْرَارِ الْفِقْہِ۔ وَاِنْ سَلَّمَ فَھُوَ اٰثِمٌ۔ ''تَاتَرْخَانِیَۃ''۔ وَفِیْھَا: وَالصَّحِیْحُ اَنَّہٗ لَایَرُدُّ فِیْ ھٰذِہِ الْمَوَاضِعِ۔

ترجمہ: ''(کھانے والے کو سلام کرنے کے بارے میں) ظاہر یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص حال ہے کہ کھانے کا لقمہ اُس کے منہ میں ہو اور وہ چبا رہا ہو، (اس وقت وہ جواب دینے سے عاجز ہے) اُس کے بعد یا اُس سے پہلے (یعنی کھانے کے لئے بیٹھا ہی ہے یا کھانا کھا چکا ہے) سلام کرنا مکروہ نہیں ہے، کہ اب عجز باقی نہیں رہا۔ اور اصحابِ شافعیہ نے اِس میں صراحت فرمائی ہے۔ ''وجیز الکردی'' میں ہے: ایسے لوگوں پر گزر ہوا جو کھانے میں مشغول ہیں، اگر یہ بھوکا ہے اور جانتا ہے کہ اسے وہ لوگ کھانے میں شریک کرلیں گے تو سلام کرے ورنہ نہیں۔ اور یہ کھانے والے پر مطلقاً سلام کی کراہت کا مقتضی ہے مگر جو اس میں ذکر کیا گیا۔ (اگر سلام کیا تو جواب کا مستحق نہیں ہوگا) میں کہتا ہوں: ''بزازیہ'' میں ہے: اگر تلاوتِ قرآن کے وقت سلام کیا تو مختار یہ ہے کہ اُس کا جواب دے، بخلاف خطبہ، اذان اور فقہ کا مذاکرہ کرنے والے شخص کے۔ اگر اِس صورت میں سلام کیا تو سلام کرنے والا گنہگار ہوگا۔

''تاتارخانیہ'' میں ہے: صحیح یہ ہے کہ اِن جگہوں پر سلام کا جواب نہ دیا جائے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص:509)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: وَیُکْرَہُ السَّلَامُ فِی الْحَمَّامِ، وَعَلٰی مَنْ یَّأْکُلُ أَوْ یُقَاتِلُ لِاشْتِغَالِہٖ،

ترجمہ: ''حمام میں سلام کرنا مکروہ ہے اور کھانا کھانے والے یا لڑائی میں مشغول شخص کو سلام کرنا مکروہ ہے''۔۔۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

وَمَنْ سَلَّمَ فِیْ حَالَةٍ لَا یُسْتَحَبُّ فِیْهَا السَّلَامُ مِمَّا سَبَقَ، لَمْ یَسْتَحِقَّ جَوَابًا لِسَلَامِہٖ

ترجمہ: ''اور جس نے ایسی حالت میں سلام کیا، جس میں سلام کرنا پسندیدہ نہیں تھا جیسا کہ پیچھے گزرا تو وہ اپنے سلام کے جواب کا مستحق نہیں ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وأدلتہٗ، جلد 4، ص:2685)

بعض مقامات پر خلافِ ادب ہونے کی وجہ سے سلام کرنا مکروہ ہے اور بعض جگہ مشغولیت کے سبب مکروہ ہے۔ مثلاً: (۱) کوئی حمام میں ہے (۲) کوئی شخص کھانے میں مشغول ہے (۳) کوئی شخص تلاوتِ قرآن میں مشغول ہے (۴) کوئی شخص ذکر وتسبیح میں مشغول ہے (۵) کوئی شخص حج، عمرے کے تلبیہ میں مشغول ہے (۶) کوئی شخص حدیث پڑھنے، پڑھانے میں مشغول ہے (۷) کوئی خطبہ دے رہا ہے (۸) کوئی وعظ کررہا ہے (۹) کوئی فقہی مسائل بتانے میں مشغول ہے (۱۰) کوئی علم دین میں مشغول ہے (۱۱) کوئی اذان یا اقامت میں مشغول ہے (۱۲) کوئی قضائے حاجت میں مشغول ہے (۱۳) قاضی عدالتی فرائض میں مشغول ہے۔

انبیاء کرام وصحابہ کرام کے کردار پر مبنی فلمیں وڈرامے

سوال:

چند دنوں سے ہمارے علاقے میں کیبلز کے ذریعے کچھ فلمیں چلائی جارہی ہیں، جن میں مختلف اشخاص کی صورت میں مُقدّس ہستیوں انبیاءِ کرام علیہم السلام وصحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کردار فرضی طور پر ادا کیا جارہا ہے اور اِن اشخاص کو ان مُقدّس

ہستیوں کے نام سے موسوم کیا جا رہا ہے، جیسے قصہ یوسف علیہ السلام میں ایک نوجوان کو حضرت یوسف اور ایک بوڑھے شخص کو حضرت یعقوب اور دیگر لوگوں کو برادرانِ یوسف کا کردار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اسلامی جنگی واقعات میں کچھ اشخاص کو مختلف صحابۂ کرام کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ازروئے شرع کیا یہ درست ہے؟۔ اِن مقدس ہستیوں کے کردار کو ادا کرنے کے لئے فرضی طور پر کسی شخص کو اُس نام سے پکارنا توہین کے زمرے میں آتا ہے، ایسی فلمیں بنانے اور دیکھنے کا کیا حکم ہے؟۔

(غلام نبی سکندری خطیب مدنی مسجد اوستا محمد، بلوچستان)

جواب:

انبیاءِ کرام علیہم السلام اور اُمَمِ سابقہ کے اَحوال، تعلیمِ اُمّت اور درسِ عبرت کے لئے بیان کرنا مستحسن بھی ہے اور شریعت کا مطلوب بھی۔ قرآن مجید نے اُمَمِ سابقہ کی بداعمالیوں کے نتیجے میں اُن پر عذابِ الٰہی نازل ہونے اور اُن کے صفحۂ ہستی سے مٹائے جانے کو ''آیتِ الٰہی'' سے تعبیر کیا ہے تاکہ ہر دور کے لوگ اُن کے عروج وزوال کے اسباب کا مطالعہ کر کے سبق حاصل کریں، اسبابِ زوال سے اجتناب کریں اور اسبابِ عروج کو اختیار کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَأَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ کی (قدرت کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں، جن (کے پاس) سے یہ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں (یعنی اُن کے آثار کو دیکھ کر سبق حاصل نہیں کرتے)، (یوسف:105)''۔

اِسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: ''کتنے ہی باغات اور چشمے اور (ہری بھری) کھیتیاں اور عزّ وشرف کے مقامات

(خوش رنگ عمارتیں) اور نعمتیں ہیں، جن میں وہ محوِ عیش تھے، (اپنے پیچھے) چھوڑ گئے، اِسی طرح ہوا، اور ہم نے ان سب چیزوں کا دوسروں کو وارث بنا دیا، تو پھر اُن پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین، اور نہ ہی کوئی اُن کی راہ دیکھنے والا رہا، (الدخان:25تا29)''۔ لیکن انبیاء کرام ورُسُلِ عُظام علیہم السلام کی سوانح کو تمثیلی انداز میں یعنی (Movie) بنا کر پیش کرنا کئی وجوہ سے خلافِ ادب بھی ہے اور حرام بھی ہے۔ ان مووِیز میں ایسے اداکاروں کو میک اَپ کر کے انبیاءِ کرام کے نام پر پیش کیا جاتا ہے، جو غیر مسلم ہوتے ہیں اور اگر مسلمان بھی ہوں تو فاسق و فاجر ہوتے ہیں۔ پھر ان مووِیز کو افسانوی رنگ دینے اور پُرکشش بنانے کے لئے ان میں کئی اضافات کئے جاتے ہیں اور انبیاءِ کرام علیہم السلام کی طرف کسی ایسی بات کی نسبت کرنا جو اُنہوں نے کہی نہ ہو، حرام ہے۔ اور جب تک اس میں اضافات شامل نہ کئے جائیں، کہانی میں افسانوی رنگ نہیں آتا اس لئے ناظرین کو ٹیلی ویژن اسکرین کے ساتھ جوڑے رکھنے کے لئے کہانی کو مصنوعی طریقے سے مربوط کیا جاتا ہے، جبکہ قرآن کا اندازِ بیان مختلف ہے، قرآن مجید میں کسی بھی نبی یا رسول کی سوانح ترتیب کے ساتھ نہیں بیان کی گئی بلکہ جہاں اُس سے جس قدر ہدایت اور عبرت مقصود ہوتی ہے، اسے بیان کر دیا جاتا ہے۔ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی حُرمت ہر مسلمان کے دل پر نقش ہوتی ہے اور ان مووِیز یا ڈراموں کی وجہ سے ابتذال (Vulgarity,Indecorum) کی صورت بن جاتی ہے۔ اس لئے اس طرح کی مووِیز کو نہ دکھایا جائے، جہاں اسے روکا جا سکتا ہو، روکا جائے اور دیکھنے سے اجتناب کیا جائے کیونکہ لہو و لعب کا نظارہ کرنا بھی اُس کی حوصلہ افزائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

ترجمہ: ''ان لوگوں کو چھوڑ دو، جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے انہیں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے، (الانعام:70)''۔ یہی مضمون سورۂ اعراف:51 میں بھی ہے۔

(2) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ

ترجمہ: ''اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو بیہودہ باتوں کو اختیار کرتے ہیں تاکہ (جہالت کے سبب) لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے گمراہ کردیں، (لقمان:6)''۔

نامحرم عورت کو سلام کرنا

سوال:

کیا نامحرم عورت کو سلام کرنا ٹھیک ہے؟۔

(محمد آفتاب قادری، بفرزون، نارتھ کراچی)

جواب:

سلام کرنا سنت ہے اور اُس کا جواب دینا واجب ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لئے دعائیہ کلمات بھی ہیں اور اسلام کا شِعار بھی ہے۔ فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق نامحرم عورت کو سلام کرنا ممنوع ہے لیکن عورت اگر بوڑھی ہو تو سلام کر سکتے ہیں۔

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

وَقَالَ ابْنُ بَطَّالٍ: اَلسَّلَامُ عَلَى النِّسَآءِ جَائِزٌ اِلَّا عَلَى الشَّوَابِّ مِنْهُنَّ فَاِنَّهُ يُخْشٰى اَنْ يَّكُوْنَ فِيْ مُكَالَمَتِهِنَّ بِذٰلِكَ خَائِنَةُ الْاَعْيُنِ اَوْ نَزَغَاتُ الشَّيَاطِيْنِ، هٰذَا قَوْلُ قَتَادَةَ، اِلَيْهِ ذَهَبَ مَالِكٌ وَّطَائِفَةٌ مِّنَ الْعُلَمَاءِ وَقَالَ الْكُوْفِيُّوْنَ: لَايُسَلِّمُ الرَّجُلُ عَلَى النِّسَاءِ اِذَا لَمْ يَكُنْ مِنْهُنَّ ذَوَاتُ مَحَارِمَ، وَقَالُوْا: لَايَسْقُطُ عَلَى النِّسَآءِ الْاَذَانُ وَالْاِقَامَةُ وَالْجَهْرُ بِالْقِرَاءَةِ فِي الصَّلَاةِ وَيَسْقُطُ عَنْهُنَّ رَدُّ السَّلَامِ، فَلَايُسَلِّمُ عَلَيْهِنَّ۔ قُلْتُ: هٰذَا لَيْسَ مَذْهَبُ الْحَنَفِيَّةِ فَاِنَّ عِنْدَهُمْ: لَا اَذَانَ وَلَا اِقَامَةَ عَلَى النِّسَآءِ۔

ترجمہ: ''علامہ ابن بطال نے کہا: جوان عورتوں کے علاوہ دیگر (بوڑھی) عورتوں کو سلام کرنا جائز ہے کیونکہ جوان عورت سے بات کرنے میں نظر کی خیانت یا شیطان کے بہکانے کا خدشہ ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے اور امام مالک اور علماء کی ایک جماعت کا بھی یہی مسلک ہے، علماءِ کوفہ فرماتے ہیں: جب عورتوں میں محرم نہ ہو تو پھر مرد اُن کو سلام نہ کریں اور انہوں نے

کہا کہ: عورتوں سے اذان، اقامت اور جہری نمازوں میں قراءت ساقط نہیں ہوتی اور سلام کا جواب دینا ساقط ہو جاتا ہے، اس لئے عورتوں کو سلام نہ کیا جائے، (علامہ عینی فرماتے ہیں:) میں کہتا ہوں: یہ فقہاء احناف کا مذہب نہیں ہے، کیونکہ اُن کے نزدیک عورتوں پر اذان اور اقامت واجب نہیں ہے"۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد 22، ص:380)

علامہ حسن بن منصور اوزجندی حنفی متوفیٰ ۲۹۵ھ لکھتے ہیں: وَاِنْ سَلَّمَتِ الْمَرْأَةُ الْاَجْنَبِيَّةُ عَلٰى رَجُلٍ اِنْ كَانَتْ عَجُوْزًا رَدَّ السَّلَامَ عَلَيْهَا بِصَوْتٍ يَسْمَعُ، وَاِنْ كَانَتْ شَابَّةً رَدَّعَلَيْهَا فِیْ نَفْسِهٖ، وَالرَّجُلُ اِذَا سَلَّمَ عَلٰى امْرَأَةٍ اَجْنَبِيَّةٍ فَالْجَوَابُ فِيْهِ يَكُوْنُ عَلَى الْعَكْسِ۔

ترجمہ: "اگر اجنبیہ عورت نے مرد کو سلام کیا اور وہ بوڑھی ہے تو اس طرح سلام کا جواب دے کہ وہ بھی سنے۔ اور اگر عورت جوان ہو تو دل ہی میں جواب دے (کہ وہ نہ سنے)۔ اور اگر کسی مرد نے اجنبی عورت کو سلام کیا تو اُس کے جواب میں ایسا ہی ہے یعنی بوڑھی عورت مرد کے سلام کا بلند آواز سے جواب دے اور جوان عورت دل میں اس کے سلام کا جواب دے، (فتاویٰ قاضی خان علی ہامش الہندیہ، جلد 3، ص:423)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَلَا يُكَلِّمُ الْاَجْنَبِيَّةَ اِلَّا عَجُوْزًا عَطَسَتْ اَوْ سَلَّمَتْ فَيُشَمِّتُهَا وَيَرُدُّ السَّلَامَ عَلَيْهَا۔

ترجمہ: "اجنبی عورت سے کلام نہ کرے، اگر بوڑھی عورت کو چھینک آئی اور اس نے (الحمدللہ کہا) یا سلام کیا، تو اُس کی چھینک اور سلام کا جواب دے"۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: اَیْ وَاِلَّا تَكُنْ عَجُوْزًا بَلْ شَابَّةً لَا يُشَمِّتُهَا، وَلَا يَرُدُّ السَّلَامَ بِلِسَانِهٖ۔ قَالَ فِی "الْخَانِيَةِ" وَكَذَا الرَّجُلُ مَعَ الْمَرْأَةِ اِذَا الْتَقَيَا يُسَلِّمُ الرَّجُلُ اَوَّلًا، وَاِذَا سَلَّمَتِ الْمَرْأَةُ الْاَجْنَبِيَّةُ عَلٰى رَجُلٍ: اِنْ كَانَتْ عَجُوْزًا رَدَّ الرَّجُلُ عَلَيْهَا السَّلَامَ بِلِسَانِهٖ بِصَوْتٍ تَسْمَعُ، وَاِنْ كَانَتْ شَابَّةً رَدَّعَلَيْهَا فِیْ نَفْسِهٖ۔ وَكَذَا الرَّجُلُ اِذَا سَلَّمَ عَلَى امْرَأَةٍ اَجْنَبِيَّةٍ فَالْجَوَابُ فِيْهِ عَلَى الْعَكْسِ۔

ترجمہ: "یعنی اگر عورت بوڑھی نہ ہو بلکہ جوان ہو تو نہ اُس کی چھینک کا جواب دے نہ زبان

سے اُس کے سلام کا جواب دے۔ ''خانیہ'' میں ہے: اِسی طرح مرد اور عورت کی ملاقات ہو تو مرد عورت کو پہلے سلام کرے، جب کوئی اجنبی عورت مرد کو سلام کرے تو اگر وہ بوڑھی عورت ہے تو مرد بلند آواز سے اُس کے سلام کا جواب دے اور اگر وہ جوان ہے تو دل میں اس کے سلام کا جواب دے، اسی طرح بوڑھی عورت مرد کے سلام کا بلند آواز سے جواب دے اور جوان عورت دل میں اس کے سلام کا جواب دے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9،ص:450-449)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اجنبی بوڑھی عورت کو اونچی آواز سے سلام کرنے اور اس کے سلام کا جواب دینے کی اجازت ہے، جوان عورت کو سلام نہ کریں اور اگر اس نے سلام کر دیا ہو تو دل میں جواب دیں۔

ڈبے سمیت مٹھائی کی خرید وفروخت

سوال:

ہمارے آؤٹ لیٹس (دکانوں) میں جو خریدار آتا ہے، ہم سے مٹھائی کی قیمت پوچھتا ہے کہ کیا کلو ہے؟، ہم کسٹمر کو مٹھائی کی قیمت بتا دیتے ہیں، مثلاً 500 روپے کلو ہے، تو ہم اسے ایک ڈبے میں ڈال کر جس کی قیمت عموماً اُس مٹھائی کی قیمت سے آدھی ہوتی ہے اور جو اُس مٹھائی کے 10% کے برابر ہوتا ہے، اس کسٹمر کو دے دیتے ہیں۔ کچھ کسٹمرز اعتراض کرتے ہیں کہ آپ اس مٹھائی کے ساتھ ڈبے کا وزن بھی کر رہے ہیں جو کہ غلط ہے۔ ہم جواباً یہ کہتے ہیں کہ تمام مارکیٹ میں یہ ایک عمومی طریقہ رائج ہے، آپ جہاں بھی جائیں گے، اکثریت اسی طریقے سے کر رہی ہے۔ جبکہ چند دکاندار ڈبے اور مٹھائی کا وزن الگ الگ کرتے ہیں۔ اگر کوئی دکاندار اِس نیت سے زیادہ وزنی ڈبے بنوالے کہ مٹھائی کے وزن میں 100 گرام یا اس سے زیادہ کمی ہو اور منافع زیادہ ہو۔ دکاندار کا یہ عمل دھوکا دہی کے زمرے میں تو نہیں؟، اگر دکاندار یہ لکھ کر لگا دے کہ مٹھائی کا وزن ڈبے کے ساتھ کیا جائے گا، تمام مارکیٹ کا ڈبے کے ساتھ وزن کر کے مٹھائی فروخت کرنا درست

ہے؟۔(شیخ محمد حسین، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی)

جواب:

بعض معاملات میں شرعاً عرف کا اعتبار ہوتا ہے، عام طور پر عرف یہی ہے کہ ڈبے کا وزن مٹھائی میں شامل ہوتا ہے۔علامہ محمد خالد الاتاسی لکھتے ہیں: اَلْمَعْرُوْفُ عُرْفًا كَالْمَشْرُوْطِ شَرْطًا أَيِ الْمَعْرُوْفُ الْمُعْتَادُ بَيْنَ النَّاسِ، وَإِنْ لَمْ يُذْكَرْ صَرِيْحًا، فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الصَّرِيْحِ، لِدَلَالَةِ الْعُرْفِ عَلَيْهِ۔

ترجمہ:"جو (لوگوں کا) عرف ہو، وہ شرط کے قائم مقام ہے۔یعنی جو عادت لوگوں کے درمیان معروف ہو اگرچہ صریحاً ذکر نہ کی جائے، وہ بمنزلہ صریح کے ہوتی ہے، کیونکہ عرف اُس پر دلالت کرتا ہے،(شرح المجلّۃ، مادّہ 43، جلد 1، ص:100)"۔

تاہم اگر ضرورت سے زیادہ بڑا ڈبہ ہو یا وزن زائد ہو تو مٹھائی کا وزن پورا کر کے ڈبے کی قیمت علیحدہ سے چارج کی جانی چاہئے۔

عموماً عرف یہی رہا ہے کہ مٹھائی یا اسی قسم کی دوسری اجناس شاپرز میں یا کاٹن پیک میں دستیاب بازاروں، ڈیپارٹمنٹل اسٹورز، جنرل شاپس سے خریدی جاتی ہیں، اُن کی قیمت متعین ہوتی ہے، لفظی ایجاب وقبول کے بغیر خریدار قیمت ادا کر کے چیز لے جاتے ہیں۔ اِس قسم کی بیع کو"بیعِ تعاطی" کہا جاتا ہے، جو لفظی ایجاب وقبول کے بغیر محض چیز لینے اور دینے سے ہوجاتی ہے، جس طرح ایجاب وقبول سے بیع لازم ہوجاتی ہے، یہاں بھی ثمن (قیمت) دینے اور چیز لینے سے بیع لازم ہوجائے گی۔صحیح قول کے مطابق بیع تعاطی کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی حنفی لکھتے ہیں: وَالْمَعْنٰى هُوَ الْمُعْتَبَرُ فِىْ هٰذِهِ الْعُقُوْدِ، وَلِهٰذَا يَنْعَقِدُ بِالتَّعَاطِىْ فِى النَّفِيْسِ وَالْخَسِيْسِ هُوَ الصَّحِيْحُ لِتَحَقُّقِ الْمُرَاضَاةِ۔

ترجمہ:"ان عقود میں معنیٰ ہی کا اعتبار ہوتا ہے، اسی لئے بیع تعاطی نفیس اور خسیس (یعنی ادنیٰ اور اعلیٰ) دونوں (چیزوں) میں منعقد ہوجاتی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ یہاں فریقین کی

باہمی رضامندی موجود ہے"، (ہدایہ، جلد 5، ص:4)"۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: اِحْتَرَازٌ مِنْ قَوْلِ الْكَرْخِيِّ اَنَّهُ قَالَ: اِنَّمَا يَنْعَقِدُ بِالتَّعَاطِيْ فِي الْخَسِيْسِ فَقَطْ وَأَرَادَ بِالْخَسِيْسِ الْأَشْيَاءَ الْمُحْتَقَرَةِ كَالْبَقْلِ وَالرَّغِيْفِ وَالْبَيْضِ وَالْجَوْزِ اِسْتِحْسَانًا لِلْعَادَةِ۔

ترجمہ: "(صاحب ہدایہ علامہ ابوالحسن نے) صحیح کہہ کر علامہ کرخی کے قول سے احتراز کیا ہے کیونکہ علامہ کرخی کہتے ہیں کہ بیع تعاطی صرف خسیس اور معمولی اشیاء میں جائز ہے اور خسیس اشیاء سے علامہ کرخی کی مراد سبزی، روٹی، انڈے اور اخروٹ ہے۔ اس بیع کا جواز استحسان کی بنا پر ہے، (فتح القدیر، جلد 6، ص:234)"۔

یہ فعل دھوکا دہی (غرر) کے زمرے میں نہیں آتا، کیونکہ دھوکا دہی میں فریقین کے مابین انجام پوشیدہ ومخفی رہتا ہے اور جھگڑے کا امکان موجود رہتا ہے۔ شمس الائمہ امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ "غرر" کی تعریف میں لکھتے ہیں: اَلْغَرَرُ: مَايَكُوْنُ مَسْتُوْرَ الْعَاقِبَةِ۔

ترجمہ: "وہ شے جس کا انجام پوشیدہ ہو، "غرر" کہلاتی ہے، (المبسوط، جلد 12، ص:196)"۔

علی بن محمد جرجانی متوفی 816ھ لکھتے ہیں: اَلْغَرَرُ: مَايَكُوْنُ مَجْهُوْلَ الْعَاقِبَةِ لَايَدْرِيْ أَيَكُوْنُ أَمْ لَا

ترجمہ: "غرر سے مراد وہ شے ہے جس کا انجام معلوم نہ ہو اور (بائع ومشتری دونوں میں سے) کوئی بھی نہ جانتا ہو کہ مبیع (صحیح حالت میں) ہوگی یا نہیں، (التعریفات، ص:208)"۔

فتاویٰ رضویہ جلد 17، صفحہ 150 پر امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ملاوٹ ملا ہوا گھی یا پانی کی ملاوٹ والے دودھ پر غرر کا اطلاق اس لئے نہیں ہوتا کہ بائع اور خریدار دونوں پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔

اگر دکاندار جان بوجھ کر زیادہ وزن کا ڈبہ بنواتا ہے کہ مٹھائی کی مقدار کم رکھ کر زیادہ نفع کمائے تو یہ بلاشبہ خیانت اور "غش" کے زمرے میں آئے گا۔ آپ کی تجویز کے مطابق اگر دکاندار یہ لکھ کر لگادے کہ ڈبے کا وزن مٹھائی کے وزن میں شامل ہے تو یہ بہتر ہے۔ اسی

طرح یہ تجویز بھی قابلِ عمل ہے کہ دکاندار مٹھائی پوری تول کردے اور ڈبے کی قیمت علیحدہ وصول کرلے۔

ٹریول ایجنٹ سے پاسپورٹ گم ہونے کی ذمہ داری اور اس کا حکم

سوال:

سائل امریکہ میں قیام پذیر ہے، اپریل 2011ء میں ہم نے Citi Travels سے عمرہ پر جانے کا معاہدہ کیا، چار افراد کے لئے ٹکٹ ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار روپے اور ایک لاکھ بہتر ہزار روپے سعودی عرب میں قیام، کرائے اور ویزے کی فیس وغیرہ کی مد میں ادا کئے۔ ٹریول ایجنٹ کے مانگنے پر تین پاکستانی پاسپورٹ اور ایک امریکن پاسپورٹ ویزے لگوانے کے لئے دے دیئے۔ اگلے دن ٹریول ایجنٹ نے بتایا کہ ہمارے پاسپورٹ سمیت دوسرے پانچ ہزار چھ سو پاسپورٹ چوری ہوگئے ہیں۔ چونکہ ہم صرف عمرے کی ادائیگی کے لئے امریکہ سے پاکستان آئے تھے، سعودی عرب روانگی 22 جون اور پاکستان واپسی 6 جولائی اور پھر امریکہ روانگی 20 جولائی پہلے سے بک تھی، ٹریول ایجنٹ اس سارے پروگرام سے واقف تھا۔ ہمارے تقاضے اور مشترکہ کوشش سے نئے پاسپورٹ، شناختی کارڈ بنوائے گئے، جس کا تمام خرچہ ٹریول ایجنٹ نے برداشت کیا۔ پروگرام کے مطابق ہم عمرے سے واپس آئے تو پتا چلا کہ چوری کئے گئے پاسپورٹ برآمد کرلئے گئے ہیں اور ٹریول ایسوسی ایشن کا ایک ملازم اِس میں ملوث ہے۔ ہمارے کینسل شدہ پاسپورٹ ہمیں 20 جولائی تک نہیں ملے اور ہم امریکہ چلے آئے۔ یہاں امیگریشن کی سخت کارروائی سے گزرنا پڑا، مزید برآں پاکستان میں پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بنوانے میں جو تکالیف اٹھانا پڑیں، وہ الگ ہیں۔ اب ٹریول ایجنٹ نے ایک فتویٰ حاصل کیا ہے کہ چونکہ پاسپورٹ واپس مل گئے ہیں اِس لئے ٹریول ایجنٹ کا خرچہ ہم پر عمرے کے لئے جائز نہیں اور تقاضا کیا ہے کہ ہم یہ رقم انہیں واپس کریں۔ ہم معلوم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ:

۱۔ کیا ٹریول ایجنٹ کا پاسپورٹ بنوانے اور ویزہ حاصل کرنے کا خرچہ تاوان کی مد میں تصور

کیا جائے گا؟۔ ۲۔کیا منسوخ شدہ پاسپورٹ اور شناختی کارڈ جو کہ ناقابلِ استعمال ہیں، شرعی طور پر گمشدہ چیز کی واپسی کے زمرے میں آئیں گے اور اس کے بدلے میں خرچ کی گئی رقم کی واپسی کا شرعی جواز بنتا ہے؟۔

۳۔کیا ٹریول ایجنٹ کا ہم سے رقم کی واپسی کا مطالبہ کرنا جائز ہے؟۔ ۴۔کیا ایسی صورت میں ہمارا عمرہ پر جانا کسی بھی طرح شرعی طور پر نا جائز ہو سکتا ہے؟۔

۵۔کیا عمرے کے پاسپورٹ کا ٹریول ایجنٹ کے آپس کے جھگڑے اور چپقلش کی وجہ سے اُنہی کے ملازم کا چوری کرنا اور پھر واپس مل جانا، اس کا شرعی جواز پیدا نہیں کرتا کہ اُن کے خلاف عدالتی کارروائی کی جائے،(فریدالدین غوری)۔ THOMAS 3123 PAINE DR.MISSOURI CITY TX 77459 ,USA

جواب:

آپ کی بیان کردہ صورتِ مسئلہ میں جوابات حسبِ ذیل ہیں:

1۔آپ کے ٹکٹ اور سعودی عرب میں قیام اور سفر کے مصارف ضائع نہیں ہوئے، اُن کا مالی نقصان نہ آپ کو اٹھانا پڑا اور نہ ہی ٹریول ایجنٹ کو، اور آپ نے اُن سے حسبِ معاہدہ استفادہ کیا۔

2۔آپ کو جو زائد مشقت اور ذہنی اذیت برداشت کرنی پڑی، وہ چونکہ عمرہ کی عبادت کیلئے تھی، اس لئے آپ اُس پر اللہ تعالیٰ سے اجر پائیں گے، ان شاء اللہ العزیز، اپنی نیت اچھی رکھیں۔ یہ چیزیں کسی حادثے یا غفلت کے نتیجے میں خدانخواستہ آپ سے گم ہو جاتیں، تب بھی آپ کو اس مشقت سے گزرنا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آزمائش سے محفوظ فرمائے۔ اپنی کوتاہی پر زائد مشقت اور محنت ٹریول ایجنٹ کو بھی برداشت کرنی پڑی۔

3۔پاسپورٹ حساس دستاویزات ہیں اور یہ ٹریول ایجنٹ کی ضمان اور حفاظت میں تھیں اور اُس کی ذمہ داری تھی کہ ان کی ہر ممکن حفاظت کرتا۔ اگر اُس نے یہ دستاویز تالے میں محفوظ رکھی ہوئی تھیں اور ملازم نے تالا توڑ کر چوری کی تو اس میں اُس (ٹریول ایجنٹ) کی تعدّی یا

قصور نہیں ہے اور اس صورت میں دوبارہ بنوانے کا خرچہ ٹریول ایجنٹ کے ذمے نہیں ہے بلکہ اُس کے اخراجات آپ برداشت کریں گے اور اِس زائد خرچہ پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اجر ملے گا۔لیکن اگر اس نے دفتر میں کھلے رکھے ہوئے تھے تو اس میں اُس کا قصور واضح ہے اور اس صورت میں دوبارہ بنوانے کا خرچ اس کے ذمے ہوگا۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَلَوْ أَدْخَلَ الْمُسْتَعِيرُ الْحَمْلَ فِي بَيْتِهٖ وَتَرَكَ الدَّابَّةَ الْمُسْتَعَارَ فِي السِّكَّةِ فَهَلَكَتْ فَهُوَضَامِنٌ سَوَاءٌ رَبَطَهَا أَوْ لَمْ يَرْبِطْهَا

ترجمہ: ''اگر مُستعیر سامان کو گھر میں لے جائے اور عاریت پر لئے ہوئے جانور کو گلی میں چھوڑ دے، پس اگر وہ گم ہو جائے تو مُستعیر ضامن ہوگا، خواہ اس نے جانور کو باندھ دیا ہو یا نہیں باندھا ہو، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4،ص:366)''۔

4۔اس کی مزید ذمہ داری یہ ہے کہ ''پاسپورٹ اینڈ امیگریشن ڈیپارٹمنٹ'' سے ان دستاویزات پر Cancelled کی مہر لگوا کر آپ کو دے تاکہ آپ کے پاس گمشدگی اور بعد میں برآمدگی کا دستاویز ثبوت ہو اور کوئی دوسرا شخص ان کا غیر قانونی استعمال نہ کر سکے اور آپ کو آئندہ کوئی قانونی دشواری پیش نہ آئے۔

سود کی حُرمت کا حکم

سوال:

ایک مسلمان شخص کو غیر مسلم بینک سے سود لینا حلال ہے یا حرام؟۔امریکہ اور کینیڈا کے غیر مسلم بینکوں میں مسلمانوں کی رقوم بھی ہوتی ہیں۔کیا اُن بینکوں سے سود پر قرض لینا جائز ہے اور اُن بینکوں میں جو رقم جمع ہے اُس پر جو منافع ملتا ہے، وہ لینا جائز ہے یا نہیں؟،(کاظم، ناظم آباد کراچی)۔

جواب:

سود حرام قطعی ہے، قرآن مجید میں سود کی حُرمت کا متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا

ترجمہ: ''اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے، (البقرہ:275)''۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! دُگنا چوگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ، (آل عمران:130)''۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، (البقرہ:276)''۔

سود لینے والے کے متعلق ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۗ

ترجمہ: ''جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ قیامت کے دن صرف اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو، (البقرہ:275)''۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود چھوڑ دو اگر تم مومن ہو، پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو، اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے اصل مال تمہارا حق ہیں، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم ظلم کئے جاؤ گے''۔

(البقرہ:279-278)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''سود لینا قطعاً حرام ہے، اللہ عزوجل نے مطلقاً فرمایا: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا اللہ نے حلال کی بیع اور حرام کیا سود۔ اس میں ربّ العزت جل جلالہ نے کوئی تخصیص نہ فرمائی کہ فلاں سے سود لینا حرام اور فلاں سے حلال ہے بلکہ مطلقاً حرام فرمایا اور وہ مطلقاً ہی حرام ہے کافر سے ہو خواہ مسلم سے۔ ہاں اپنا

کسی پر آتا ہوا یا اور کوئی مال جائز شرعی کسی حیلۂ شرعیہ سے حاصل کرنا دوسری بات ہے، والتفصیل فی فتاوٰنا (اور تفصیل ہمارے فتاویٰ میں ہے)"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 17، ص:323)

ہمارا موقف یہ ہے کہ ہر صورت میں سود لینے سے اجتناب کریں۔

گانے باجے کی محافل کا شرعی حکم

سوال:

شادی کی تاریخ 12 ربیع الاول مقرر کی گئی اور شادی کی رات (11 اور 12 کی درمیانی شب) محفل موسیقی کا پروگرام رکھا، باقاعدہ دعوت نامے تقسیم کئے گئے، سمجھانے اور منع کرنے والے شخص سے آج تک دشمنی ہے۔ ایسی بابرکت رات محفلِ موسیقی کا اہتمام کرنا شریعت کی رُو سے کیسا ہے؟۔ (فقیر محمد سومرو، محمود آباد، کراچی)

جواب:

نفسِ مسئلہ پر بات کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے موجودہ دور میں شادی کی تقریبات میں جو کچھ لہو ولعب اور غیر شرعی رسوم انجام دی جاتی ہیں، شریعتِ مُطہرہ میں اُن کی ہر سطح پر مذمت کی گئی ہے۔ رسوم کی بنا عُرف پر ہے، جب تک کسی رسم کی ممانعت شریعت سے ثابت نہ ہو، اُسے حرام یا ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یہ لازم ہے کہ ایسی رسومات کو ادا کرنے کے لئے کسی فعلِ حرام کا ارتکاب نہ ہو۔ شریعت کی رُو سے نکاح کی حقیقت یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں لڑکا، لڑکی براہِ راست یا وکیل کے ذریعے ایجاب وقبول کرلیں۔ نکاح کی تقریب سادگی سے منعقد ہوجائے اور اِس کے بعد باوقار انداز میں رخصتی۔

مسئلہ یہ نہیں کہ نکاح کی تقریب کس دِن یا رات میں منعقد کی جائے اور سوال یہ نہیں کہ "ایسی بابرکت رات محفلِ موسیقی کا اہتمام کرنا شریعت کی رُو سے کیسا ہے؟"، بلکہ گانے باجے، راگ رنگ وموسیقی کی محافل مطلقاً ناجائز وحرام ہیں کسی بھی وقت اُن کی حُرمت میں کوئی کمی

واقع نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: اِنَّ الْغِنَاءَ یُنْبِتُ النِّفَاقَ فِی الْقَلْبِ۔

ترجمہ: ''گانے باجے کی آواز دل میں نفاق پیدا کرتی ہے، (سُنن ابوداؤد: 4888)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: قَالَ: ابْنُ مَسْعُوْدٍ: صَوْتُ اللَّهْوِ وَالْغِنَاءِ یُنْبِتُ النِّفَاقَ فِی الْقَلْبِ کَمَا یُنْبِتُ الْمَاءُ النَّبَاتَ۔ قُلْتُ: وَفِی ''الْبَزَّازِیَّةِ'': اسْتِمَاعُ صَوْتِ الْمَلَاهِیْ کَضَرْبِ قَصَبٍ وَنَحْوِهٖ حَرَامٌ لِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: ''اسْتِمَاعُ الْمَلَاهِیْ مَعْصِیَةٌ وَالْجُلُوْسُ عَلَیْهَا فِسْقٌ وَالتَّلَذُّذُ بِهَا کُفْرٌ'' اَیْ بِالنِّعْمَةِ، فَصَرْفُ الْجَوَارِحِ اِلٰی غَیْرِ مَا خُلِقَ لِاَجْلِهٖ کُفْرٌ بِالنِّعْمَةِ لَا شُکْرٌ، فَالْوَاجِبُ کُلَّ الْوَاجِبِ اَنْ یَّجْتَنِبَ کَیْ لَا یَسْمَعَ لِمَا رُوِیَ اَنَّهٗ عَلَیْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ اَدْخَلَ اِصْبَعَهٗ فِیْ اُذُنِهٖ عِنْدَ سَمَاعِهٖ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: گانے باجے کی آواز دل میں اس طرح نفاق پیدا کرتی ہے جیسے پانی پودوں (اور سبزے) کو اُگاتا ہے، ''فتاویٰ بزازیہ'' میں ہے: لہو ولعب کی آواز سننا جیسے لکڑی بجانا اور اسی طرح کوئی اور چیز بجانا حرام ہے اس لئے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے: لہو ولعب کا سننا نافرمانی ہے اور اس کے پاس بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لطف اندوز ہونا کفرانِ نعمت ہے، تو اعضاء کو اُس کام میں صرف کرنا، جس کے لئے وہ نہیں بنائے گئے کفرانِ نعمت ہے، شکرِ نعمت نہیں ہے، تو کمال واجب یہ ہے کہ اُس کام سے کنارہ کش ہو جائے تاکہ اُس لہو ولعب کی آواز کو نہ سُن سکے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ کا گانے بجانے کی کسی محفل کے پاس سے گزر ہوا، تو اپنے کانوں میں انگشتِ مبارک داخل فرمالیں''۔

(الدرالمختار علی ردالمحتار، جلد 9، ص: 424،425)

آپ نے سوال کیا ہے کہ ایسی بابرکت رات محفل موسیقی کا اہتمام کرنا کیسا ہے؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسے لوگوں کی ناپاک جسارت ہے، اس مبارک دن کی تقدیس وحُرمت کی پامالی ہے اور اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کو دعوت دینا ہے، کیونکہ بظاہر ایسے مبارک دِن

شادی ونکاح کی تقریب منعقد کرنا، خیر و برکت کے حصول کے لئے ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے یومِ ولادت کی برکات حاصل کرنے کے لئے ہے، لہٰذا ایسے مبارک دن اس طرح کے غیر شرعی افعال کی حُرمت وقباحت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

آپ نے سوال میں لکھا ہے کہ ''اُن کے اِس عمل پر اُن کو سمجھانے والے شخص سے آج تک دشمنی ہے''، اُن کا یہ طرزِ عمل ناپسندیدہ ہے۔ جولوگ اللہ کے لئے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اللہ ہی کے لئے تعلق توڑتے ہیں، ان کے لئے حسبِ ذیل احادیث ہیں: ایک طویل حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فِي ظِلِّهِ، يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: (وَعَدَّ مِنْهَا) وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ۔

ترجمہ: ''انسانوں کے سات طبقات یا گروہوں کو اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی سایۂ رحمت میں رکھے گا، جس دن اُس کے سائے کے سوااور کسی کا سایا نہیں ہوگا: (اُن سات طبقات کو بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:) وہ دوافراد جن کی باہمی محبت کا سبب صرف رضائے الٰہی ہو، ان کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق جوڑنا یا توڑنا، اُس کا سبب صرف رضائے الٰہی ہو، (صحیح بخاری:660)''۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: الْمُتَحَابُّونَ فِي اللهِ فِي ظِلِّ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جولوگ اللہ کی رضا کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے ہیں، وہ قیامت کے روزعرش کے سائے میں ہوں گے، (مسند امام احمد بن حنبل:22031)''۔

عَنْ مُعَاذٍ، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ يَأْثِرُ عَنِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ: وَجَبَتْ مَحَبَّتِي لِلَّذِينَ يَتَحَابُّونَ فِيَّ، وَيَتَجَالَسُونَ فِيَّ، وَيَتَبَاذَلُونَ فِيَّ۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیثِ قدسی بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اُن لوگوں کی محبت میں نے اپنے اوپر لازم فرمادی ہے،

جن کا باہمی رشتۂ محبت میری رضا کے لئے قائم ہو، وہ میری خاطر ایک دوسرے کی صحبت اختیار کرتے ہیں اور میری ہی رضا کے لئے اپنی جانیں نچھاور کر دیتے ہیں"۔

(مسند امام احمد بن حنبل:22132)

متفرقات

گیس/بجلی پانی/ کی چوری کا مسئلہ اور اس کا شرعی حکم

سوال:

آج کل لوگوں میں بجلی ،قدرتی گیس اور پانی چوری کرنے کا رجحان بہت زیادہ ہوگیا ہے، چوری کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں، جیسے میٹر کی رفتار کو کم کرنا، کنڈا لگا لینا، میٹر کو بند کردینا، گیس کے چوری چھپے کنکشن لگالینا وغیرہ۔ وہ اس چوری جیسے بڑے گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ وہ کسی مادّی چیز کے بغیر اجازت اٹھالینے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں کسی بھی ذریعے سے ان چیزوں کی چوری کرنا گناہ ہے یا نہیں ؟۔(۲) جو لوگ بل ادا کرنے کی حیثیت رکھنے کے باوجود چوری کرتے ہیں، اُن کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟۔

(۳) چوری کا علم رکھتے ہوئے اُس پر خاموشی اختیار کرنا، ادارے کو مُطلع نہ کرنا، شریعت میں کیا حکم رکھتا ہے؟۔ برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی مکمل وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

سیدہ نسرین حسین، ڈپٹی جنرل منیجر (کارپوریٹ کمیونیکیشن)
مٹھار میمن، جی۔ایم سینٹر کے۔ای۔ایس۔سی کراچی

جواب:

آج کل ہمارا ملک جن مسائل کا شدت سے شکار ہے، اُن میں قدرتی گیس اور بجلی کی قلت کا مسئلہ سرِفہرست ہے۔ جب بجلی اور گیس کی طلب (Demand)، رَسد (Supply) سے بڑھ جاتی ہے تو بجلی وگیس کی ترسیل میں کمی کرنی پڑتی ہے، جسے Load Shedding کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے گھریلو صارفین (Domestic Consumers) کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ملکی صنعت بھی بحران کا شکار ہوتی ہے۔ اس مشکل کا ایک سبب تو بجلی اور گیس کی پیداوار میں حقیقتاً کمی ہے اور دوسرا سبب ان دونوں کا غیر قانونی استعمال ہے، جس کی طرف آپ کے سوال میں نشان دہی کی گئی

ہے۔بجلی اور گیس بھی دونوں مادّی اشیاء(Materialistic Objects) ہیں۔

علامہ جمال الدین ابن منظور افریقی لکھتے ہیں: ''اہلِ عرب چور اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی محفوظ جگہ میں چھپ کر جائے اور دوسرے کا مال لے کر چلا جائے۔اگر وہ چھپ کر لینے کے بجائے کُھلّم کھلاّ لے تو وہ اُچکّا اور لُٹیرا ہے اور اگر زبردستی چھینے تو غاصب ہے''۔

(لسان العرب،جلد10،ص:156)

شرعی اعتبار سے مال کی تعریف:

ڈاکٹر وھبہ الزُّحیلی لکھتے ہیں: ''لغت میں مال ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جسے ذخیرہ کیا جاسکے اور انسان اُسے عملاً جمع کرے،خواہ وہ عین (Assets,Goods) ہو،جیسے سونا، چاندی حیوان،نباتات وغیرہ یا اُس سے حاصل ہونے والی منفعت(Usufruct) یا بعض چیزوں کے منافع جیسے سوار ہونا یا رہائش وغیرہ۔اور جس چیز کو انسان عملاً جمع نہ کر سکے وہ مال نہیں ہے،جیسے ہوا میں پرندہ،دریا میں مچھلی،دور دراز جنگلات میں درخت اور زمین میں پوشیدہ (Hiden) معدنیات(Minerals) وغیرہ''۔

فقہِ حنفی میں مال کی تعریف:

''جس چیز کو حاصل کرنا اور ذخیرہ کرنا اور اُس سے فائدہ اُٹھانا ممکن ہو''۔اِس تعریف کی رُو سے کسی چیز کے مال ہونے کے لئے دو اُمور ضروری ہیں:

(۱) اُس کا جمع کرنا اور ذخیرہ کرنا ممکن ہو۔پس جن چیزوں کو ذخیرہ کرنا ممکن نہیں،وہ مال نہیں ہے،جیسے: اُمورِ مَعنوِیّہ مثلاً علم،صحت،شرَف اور ذہانت وغیرہ یا جن پر کنٹرول ممکن نہ ہو،جیسے کھلی ہوا،سورج کی حرارت اور چاند کی روشنی۔

(۲) اُس سے عادتاً نفع اُٹھانا ممکن ہو،پس جس چیز سے شریعت کی رُو سے نفع اُٹھانا اصلاً ممکن ہی نہ ہو،جیسے مُردار کا گوشت،زہریلا کھانا وغیرہ یا وہ نفع لوگوں کے نزدیک مُعتَد بہ (Countable) نہ ہو،جیسے گندم کے چند دانے،پانی کے چند قطرے یا مُٹھی بھر مٹی

وغیرہ، خمر اور خنزیر مسلمانوں کے نزدیک مال نہیں ہے''۔

مَجَلَّۃُ الاحکام العدلیہ زیرِ مادہ:126 میں ہے: ''مال وہ ہے جس کی طرف انسان کی طبیعت مائل ہو اور جسے حاجت کے لئے ذخیرہ کیا جاسکتا ہو، خواہ وہ مالِ منقول (Movable) ہو یا غیرِ منقول (Immovable)۔ اِس تعریف کو ناقص بھی قرار دیا گیا ہے، کیونکہ بعض چیزیں مال ہیں لیکن اُنہیں زیادہ دیر تک ذخیرہ نہیں کیا جاسکتا جیسے سبزیاں۔ دیگر فقہاءِ کرام کے نزدیک ہر وہ چیز جو قیمت رکھتی ہو اور اُس کے تَلَف کئے جانے پر ضمان لازم ہو، وہ مال ہے۔ یہ مال کی قانونی تعریف ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد 04، ص:77-2876 مُلخصًا)

سرقہ کی تعریف کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں: هِيَ اَخْذُ الْعَاقِلِ الْبَالِغِ عَشَرَةَ دَرَاهِمَ أَوْمِقْدَارَهَا خُفْيَةً عَمَّنْ هُوَمُتَصَدٍّ لِلْحِفْظِ مِمَّالَا يَتَسَارَعُ اِلَيْهِ الْفَسَادُ مِنَ الْمَالِ الْمُتَمَوَّلِ لِلْغَيْرِمِنْ حِرْزٍ بِلَا شُبْهَةٍ

ترجمہ: ''عاقل بالغ کا (کسی محفوظ جگہ سے) کسی کے دس درہم (یا اس کے برابر یا زائد مالیت) کا ایسا مال اٹھالینا، جس کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہو اور اس کا مال غیر ہونے میں کسی شبہے یا تاویل کی گنجائش نہ ہو اور وہ چیز جلد خراب ہونے والی بھی نہ ہو، سرقہ کہلاتا ہے''۔

(فتح القدیر، جلد 5، ص:339، گجرات انڈیا)

علامہ شامی نے سرقہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں: وَهِيَ نَوْعَانِ: لِأَنَّهٗ اِمَّا أَنْ يَكُوْنَ ضَرَرُهَابِذِي الْمَالِ أَوْبِهٖ وَبِعَامَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ، فَالْأَوَّلُ يُسَمّٰى بِالسَّرِقَةِ الصُّغْرٰى وَالثَّانِيْ بِالْكُبْرٰى۔

ترجمہ: ''سرقہ کی دو قسمیں ہیں: اگر چوری کئے ہوئے مال کے نقصان کا تعلق فقط صاحبِ مال کے ساتھ ہو تو وہ ''سرقہ صغریٰ'' ہے اور اگر وہ نقصان فردِ واحد کے ساتھ خاص نہ ہو بلکہ اس نقصان کی زد عام مسلمانوں (یا عام لوگوں) پر پڑتی ہو، تو وہ ''سرقہ کبریٰ'' کہلائے گا۔۔۔ علامہ شامی آگے لکھتے ہیں: وَقَدِ اشْتَرَكَا فِي التَّعْرِيْفِ وَاَكْثَرِ الشُّرُوْطِ اھ أَيْ لِأَنَّ الْمُعْتَبَرَفِيْ كُلٍّ مِنْهُمَا اَخْذُ الْمَالِ خُفْيَةً۔

ترجمہ: ''اور (چھوٹے اور بڑے) سرقہ کی ان دونوں قسموں کی تعریف اور اکثر شرائط ایک ہی ہیں، کیونکہ ان دونوں اقسام میں جو مفہوم معتبر ہے، وہ یہ کہ (مالک یا محافظ کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے) خفیہ طور پر کسی کے مال کو چرانا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6،ص:102)

ان تعریفات کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ بجلی یا گیس جس کی سپلائی گھروں، فیکٹریوں، کارخانوں وغیرہ تک پہنچائی جاتی ہے، میٹر لگا کر خرچ کا حساب رکھا جاتا ہے اور جتنا صرف کیا اتنے کی ادائیگی واجب ہوتی ہے، بجلی یا گیس کے میٹر کو مصنوعی طریقے سے ٹمپر (Temper) کر کے یا اُس کی رفتار کم کر کے یا کنڈا لگا کر جو بجلی/گیس استعمال کی جاتی ہے اور بل میں شامل نہیں ہوتی، یہ خیانت ہے اور غبن ہے۔ اِس مد میں جو رقم بچائی جارہی ہے، جو کچھ کمایا جارہا ہے، وہ سب باطل اور حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ترجمہ: ''اے مومنو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، (النساء:29)''۔

مذکورہ بالا فقہی حوالوں سے معلوم ہوا کہ شرعی طور پر کسی کا مال لینا چوری ہے اور مالیت تمول الناس (یعنی لوگوں کے اس کے حاصل کرنے کی رغبت) سے ثابت ہوتی ہے جیسا کہ علامہ شامی نے تصریح کی ہے، وَالْمَالِیَّةُ تَثْبُتُ بِتَمَوُّلِ النَّاسِ۔ یعنی کسی چیز کا مال ہونا اس امر سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگ اس کے حاصل کرنے اور جمع کرنے میں رغبت رکھتے ہیں۔ بجلی پر تموّل کا تو اطلاق ہوتا ہے کیونکہ اس کی خرید و فروخت مال کے عوض ہوتی ہے، اگرچہ اس کو ذخیرہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ گیس کو سلنڈر میں محفوظ کرلیا جاتا ہے، اس میں LPG اور CNG دونوں قسم کی قدرتی گیس شامل ہے۔

ٹمپرنگ (Tempring) کر کے میٹر کو بند کردینا یا میٹر کے باہر سے بجلی کے تار کو کنکٹ کر کے استعمال کرنا چوری بھی ہے، خیانت بھی ہے، فعلِ حرام بھی ہے۔ یہ عامۃُ النّاس کی بھی حق تلفی ہے اور ایک طرح سے سرقۂ کبریٰ ہے۔ حکومت اس کے لئے اپنی حکمت

ومصلحت کے مطابق تعزیر مقرر کرسکتی ہے اور قانون سازی کر کے اسے عدالت کے دائرے میں لایا جاسکتا ہے، لیکن یہ وہ سرقہ نہیں ہے جس پر قطعِ ید (ہاتھ کاٹنے) کی شرعی سزا مقرر ہے، کیونکہ اس کے لئے باقاعدہ شرائط مقرر ہیں، جو یہاں نہیں پائی جاتیں۔ بجلی کے میٹر کی رفتار کو کم کرنا یا میٹر کو بند کردینا یا کنڈا لگا کر غیر قانونی طریقے سے بجلی استعمال کرنا چوری ہے اور چونکہ بجلی کی چوری کا نقصان صرف فردِ واحد کے ساتھ نہیں بلکہ عوام الناس کیساتھ ہے، لہٰذا علامہ شامی کی تصریح کی رو سے یہ سرقہ کبریٰ کے مشابہ ہے، لوگوں کو چاہئے کہ غیر قانونی طریقے سے بجلی کے استعمال سے گریز کریں۔ لیکن جس طرح صارفین کا بجلی کے حصول اور استعمال میں غیر قانونی طریقہ اختیار کرنا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح بجلی یا گیس سپلائی کرنے والے محکمے یا ادارے کی طرف سے بجلی کے میٹروں کی رفتار کو تیز کرنا یا ان کی غفلت کی وجہ سے میٹر کا چلتے چلتے بند ہوجانا اور بعد میں اپنے من پسند معیار کے مطابق اوسط رقم (Everage) کا بل بھیجنا اور صارف سے زائد قیمت لینا، یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔

اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ روزانہ کئی کئی گھنٹے لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے، بجلی کی سپلائی بند رہتی ہے مگر جب بل آتا ہے، تو معمول سے زائد ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر صارف کو میٹر کے ناقص ہونے کی شکایت ہو، تو اس کے جانچنے کا کوئی غیر جانبدارانہ عادلانہ نظام نہیں ہے، محکمہ یا ادارہ اپنے ظلم کے خلاف خود ہی منصف ہوتا ہے۔

بجلی کی چوری کی اکثر یا بعض صورتوں میں محکمے یا ادارے کے اہلکار اور ذمہ داران شریک ہوتے ہیں اور رشوت لے کر جرم کی ترغیب دیتے ہیں۔ پس جب تک اصلاح کا ایک جامع، غیر جانبدار اور انصاف پر مبنی نظام نہ ہو، تو پھر عوام کا استحصال ہوتا رہے گا اور اگر بجلی کی سپلائی کا ادارہ قومی ہے تو قومی نقصان ہوگا۔ غیر جانب دار تجزیوں میں بتایا گیا ہے کہ بجلی کی ترسیل اور سپلائی کے محکمے یا ادارے کی ناقص کارکردگی کی وجہ سے بعض صورتوں میں چالیس فیصد ضیاع ہوتا ہے، جسے فنی اصطلاح میں Line Loss کہتے ہیں۔ اور ان تمام مصارف کو مجموعی مصارف میں شامل کر کے ان حقیقی صارفین کی طرف منتقل کردیا جاتا ہے جو

کوئی خیانت نہیں کرتے، دیانت داری سے بل ادا کرتے ہیں، لہٰذا محکمانہ یا اداراتی سطح پر دانستہ یا نادانستہ غفلت کا بوجھ بے قصور صارفین پر ڈالنا بھی ''اَکْلُ الْاَمْوَالِ بِالْبَاطِلِ'' (باطل طریقوں سے مال کھانے) اور ''تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' (یعنی ظلم اور گناہ کے کاموں میں تعاون) کے ذیل میں آتا ہے۔

بجلی کے میٹر میں ردوبدل کرنا خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور یہ شرعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح بجلی کے محکمے کا میٹروں کو تیز کر کے صارفین سے زائد بل لینا، یہ بھی خیانت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی صریح خلاف ورزی ہے کہ: لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔

ترجمہ: ''آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ (النساء: 29)''۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی کا ظلم ہمارے لئے ظلم کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، یہ شیطان کے بہکاوے اور تزویرات ہیں، جو انسان کے نفس کو گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ ۝

ترجمہ: ''بلکہ انسان اپنے نفس (کے حسن وقبح اور خیر وشر) پر خوب آگاہ ہے، خواہ وہ (فریب نفس کے لئے) کتنے ہی عذر تراشتا رہے، (سورۃ القیامہ: 15-14)''، اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ترجمہ: ''ہر نفس اپنے اوپر نگہبان ہے، (الطارق: 4)''۔ حدیث پاک میں ہے: عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ'' فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ''اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْاِثْمُ مَاحَاكَ فِيْ نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ''۔

ترجمہ: ''نواس بن سمعان بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ (کی پہچان) کی بابت دریافت کیا، تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے، اور برائی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے (یعنی جس پر تمہارے دل میں چبھن اور کسک محسوس ہو) اور تجھے یہ بات ناگوار ہو کہ لوگوں کو اس کا پتہ چل جائے، (سنن ترمذی: 2389)''۔

حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو قبل اس کے کہ وہ اپنے دل کی بات کہتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے دل کا حال بیان کرتے ہوئے خود ہی فرمایا: کہ تم نیکی اور گناہ کی بابت پوچھنے آئے ہو؟، انہوں نے عرض کی: جی ہاں، پھر آپ نے فرمایا: اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے، جس پر تمہارے دل کو اطمینان وقرار نصیب ہوجائے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تمہیں دل میں تردُّد ہو (کہ کروں یا نہ کروں)، اگرچہ لوگ تمہیں (اپنے من پسند) فتوے دیتے رہیں، (مسند احمد، جلد 4، ص: 228)''۔

اکلِ حرام اور کسبِ حرام کا اثر عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پر بھی پڑتا ہے اور اس سلسلے میں احادیث موجود ہیں: عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ''لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ، وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ''۔ ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1)''۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ''أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا وَإِنَّ اللهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ، فَقَالَ: {يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿51﴾} وَقَالَ: {يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ} ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ، أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ، يَا رَبِّ! يَا رَبِّ! وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! بے شک اللہ پاک ہے اور صرف پاک (صدقات کو) قبول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم رسولوں کو دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو بیشک تم جو بھی عمل کرتے ہو، مجھے اس کا بخوبی علم ہے، (المومنون: 51)''۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے مومنو! ہمارے دیئے

رزق میں سے پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ''۔ پھر آپ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ غبار آلود ہے، بال پراگندہ ہیں، طویل سفر کر کے آیا ہے، اور اپنے ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی طرف پھیلا کر پکارتا ہے: اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگار! حالانکہ اس کا کھانا حرام کا ہے، پینا حرام ہے اور لباس حرام کا ہے اور اسے حرام ذرائع سے غذا دی جاتی ہے، تو کیسے اس کی دعا قبول ہوگی، (صحیح مسلم:2344)''۔

اگر غیر قانونی استعمال کا سدِّ باب کر دیا جائے اور ہر صارف کو بل ادا کرنا پڑے تو بجلی کی طلب (Demand) اور صرف (Consumption) میں بھی کمی آئے گی، بلکہ بہت ممکن ہے کہ یہ ادارے خسارے سے نکل کر نفع بخش بن جائیں اور حکومت کو زرِ تلافی (Subsidy) سے بھی نجات مل جائے۔

اور اسے نفع بخش کاروبار سمجھ کر مزید ادارے اس شعبے میں سرمایہ کاری کے لئے بخوشی آگے آئیں گے اور صنعتوں کو فروغ ملے گا۔ یہی صورت حال پانی کی چوری کی بھی ہے۔

کراچی جیسے میگا پولیٹن شہر میں اگر شہری خدمات کے ادارے مقامی حکومت کی تحویل میں دیدیئے جائیں، تو شہری انتظامیہ بجلی کے غیر قانونی استعمال کو کافی حد تک کنٹرول کر سکتی ہے۔ اگر ہر صارف (Consumer) کو حقیقی بل ادا کرنا پڑے تو کمپنی کے مالی وسائل میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔ شہری حکومت بین الاقوامی اداروں سے شہری خدمات کے اداروں کو جدید بنانے کے معاہدات کر کے خود ادائیگی کر سکتی ہے، جس میں بجلی کی ترسیل کا زیرِ زمین جدید نظام اور اوور ہیڈ یا انڈر گراؤنڈ ریل کا جدید ترین نظام وغیرہ شامل ہیں۔

فساد فی الارض

سوال:

اسلامی تعلیمات کے مطابق فساد فی الارض کن جرائم سے متعلق ہے؟،

(محمد خالد قادری، گلستانِ جوہر کراچی)

جواب:

''فسادفی الارض'' کے معنی ،جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے،ہر وہ صورت جس سے معاشرے کا سکون درہم برہم ہوجائے ،امن وامان غارت ہوجائے ،لوگوں کا چین وسکون چھن جائے اور لوگ احساسِ عدم تحفظ (Sence of Insecurity) کا شکار ہو جائیں، جان و مال اور آبرو خطرے میں پڑ جائے اور ریاست وحکومت کا نظام مفلوج ہو جائے ۔حکومت اور حاکم کا مفسدین ،مجرموں اور ظالموں پر کنٹرول باقی نہ رہے اور نظامِ عدل اور قومی سلامتی کے ادارے لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہوجائیں ۔اس کا انتہائی درجہ انارکی (Anarchy)،لاقانونیت (Lawlessness) اور جنگل کا قانون ہے، اسے عربی میں ''فَوضیٰ'' (Anarchy) اور فوضویّت (Anarchism) کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس سنگین جرم کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جنگ (حرابہ یا محاربہ) اور ''فسادفی الارض'' سے تعبیر کیا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اِن جرائم اور ان کی سزا کے بارے میں فرمایا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝ اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْۤا اَوْ يُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ:''جس شخص نے جان کے بدلے جان (یعنی حقِ قصاص) یا زمین میں فساد پھیلانے کے (جرم) کے بغیر کسی شخص کو قتل کیا تو گویا اُس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے (کسی بےقصور) شخص کی جان (قتلِ ناحق سے) بچالی تو گویا اُس نے تمام انسانوں (کی جان) کو بچالیا اور بیشک ان کے پاس ہمارے رسول روشن معجزات لے کر آئے پھر اس کے باوجود ان

میں سے بہت سے لوگ زمین میں یقیناً حد سے بڑھنے والے تھے۔اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں ڈاکے ڈالتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو چن چن کر قتل کیا جائے یا اُن کو سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ ایک جانب سے اور پیر دوسری جانب سے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو (اپنے وطن کی) زمین سے نکال دیا جائے (یعنی حبسِ دوام میں ڈال دیا جائے) یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے، ماسوا ان لوگوں کے جنہوں نے اپنے اوپر تمہارے قابو پانے سے پہلے توبہ کرلی، جان لو! اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے، (مائدہ:32 تا 34)''۔

اِن جرائم میں بلا امتیاز قتل وغارت ہے یعنی اس سے قطع نظر کہ کون زَد میں آتا ہے یا کون نشانہ بنتا ہے یا جان کس کی جاتی ہے، جس طرح بعض اوقات پاکستان میں دہشتگردی کے مُتعدد واقعات میں مزارات، مساجد، بازاروں اور عام گزرگاہوں پر ہوئے اور اندھادھند فائرنگ، خودکش حملوں، ریموٹ کنٹرول بمب یا عام بمب بلاسٹ کے ذریعے بلا امتیاز بے قصور لوگوں کو قتل کردیا جاتا ہے، جس میں بوڑھے، عورتیں، جوان اور بچے سب شامل ہوتے ہیں۔حدیث پاک میں ایسے حالات کو علاماتِ قیامت سے تعبیر فرمایا گیا ہے: لَایَدْرِی الْقَاتِلُ فِیْمَ قَتَلَ، وَلَا الْمَقْتُوْلُ فِیْمَ قُتِلَ

ترجمہ:''ظالم قاتل کو معلوم نہ ہو کہ وہ کسی شخص کی جان کس جرم میں لے رہا ہے اور مظلوم مقتول کو خبر نہ ہو کہ اس کی جان کس جرم میں لی جارہی ہے، (صحیح مسلم:7295)''۔

اسی طرح ڈاکہ زنی، بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان (Rainsom) خواہ تاوان میں نقد رقم طلب کی جائے یا مَغوی (Kidnaped) افراد کی رہائی کی پیشکش سنگین جرائم میں مُلوّث مجرموں کے عوض کی جائے۔بعض اوقات ڈاکہ، قتل وغارت اور آبروریزی (Rape) سب جرائم ایک ہی واردات میں جمع ہوجاتے ہیں، اس لئے جرم کی سنگینی اور نوعیت کے اعتبار سے سزا بھی سنگین مُقرر کی گئی ہے، یعنی عبرت آموز طریقے سے قتل کرنا یا سولی چڑھانا یا مخالف سمت سے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دینا (یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یا دایاں

پاؤں اور بایاں ہاتھ) یا یا حبسِ دوام (Life Imbrisonment) میں رکھ کر معاشرے کو اُس کی ایذا رسانی سے محفوظ رکھنا ہے۔ کسی خاص صورت میں یہ سزائیں جمع بھی ہوسکتی ہیں، جیسا کہ اہلِ عُرَینہ کے واقعے میں ہوا۔

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ نَاسًا مِنْ عُرَيْنَةَ قَدِمُوا عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ الْمَدِيْنَةَ، فَاجْتَوَوْهَا۔ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: اِنْ شِئْتُمْ أَنْ تَخْرُجُوا اِلَى اِبِلِ الصَّدَقَةِ، فَتَشْرَبُوا مِنْ أَلْبَانِهَا وَأَبْوَالِهَا، فَفَعَلُوا، فَصَحُّوا، ثُمَّ مَالُوا عَلَى الرُّعَاةِ فَقَتَلُوهُمْ، وَارْتَدُّوا عَنِ الْاِسْلَامِ، وَسَاقُوا ذَوْدَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ، فَبَعَثَ فِي اِثْرِهِمْ، فَأُتِيَ بِهِمْ، فَقَطَعَ أَيْدِيَهُمْ وَأَرْجُلَهُمْ، وَسَمَلَ أَعْيُنَهُمْ، وَتَرَكَهُمْ فِي الْحَرَّةِ حَتّٰى مَاتُوا۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عُرَینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ آئے، اُنہیں وہاں کی آب وہوا موافق نہیں آئی، رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: اگر تم چاہو تو صدقہ کی اونٹنیوں کی چراگاہ میں جاؤ اور ان کا دودھ اور پیشاب پیو، اُنہوں نے اسی طرح کیا اور تندرست ہوگئے۔ پھر انہوں نے اونٹوں کے چرواہوں پر حملہ کیا اور ان کو قتل کردیا اور دینِ اسلام سے مُرتد ہوگئے اور رسول اللہ ﷺ کے اونٹ لے کر بھاگ گئے، نبی ﷺ تک یہ خبر پہنچی تو آپ نے ان کے تعاقب میں لوگوں کو بھیجا، ان کو پکڑ کر لایا گیا، آپ ﷺ نے ان کے ہاتھوں اور پیروں کو کٹوادیا اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروائیں اور ان کو تپتے ہوئے میدان میں چھوڑ دیا، حتیٰ کہ وہ مر گئے''۔ (صحیح مسلم:4350)

رسول اللہ ﷺ کے اس فیصلے سے یہ معلوم ہوا کہ جرم کی سنگینی کے اعتبار سے سزا کے لئے سنگین صورت اختیار کی جاسکتی ہے اور اس طرح کی عبرتناک سزاؤں کا نفاذ علانیہ ہونا چاہیے تاکہ ظالموں اور دہشت گردوں کے لئے عبرت کا سبب بنے اور معاشرے کو امن وعافیت اور سلامتی نصیب ہو۔ کیونکہ اُنہوں نے کئی جرائم کا ارتکاب کیا، دین اسلام سے پھر گئے اور

مُرتد ہو گئے، چرواہوں کو قتل کیا، مویشیوں کو لوٹ کر لے گئے اور یہ ایک طرح سے ریاست سے بغاوت تھی۔

حسنِ کارکردگی پر ترقی یا انعام

سوال:

فساد فی الارض میں مُلوّث افراد کے قلع قمع کرنے والے سرکاری افسران کو حکومت کی جانب سے عام ڈیوٹی انجام دینے والے افسران کے مقابلے میں صرف کارکردگی کی بنیاد پر مقررہ وقت سے پہلے ترقی دینا شریعت کی رُو سے کیسا ہے؟۔

جواب:

مجرمین کو سزا دینا حکومتِ وقت کا کام ہے، جرائم کی روک تھام اور مجرموں کو قانون کی گرفت میں لانا قانون نافذ کرنے والے اداروں کا کام ہے، بنیادی طور پر یہ ان کے فرائضِ منصبی کا حصہ ہے۔ لیکن ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ غیر معمولی حالات میں جو شخص اپنی جان کو انتہائی خطرے میں ڈال کر اپنے ہدف پر غالب آجائے، تو رسول اللہ ﷺ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور جنگ میں فتح کی صورت میں وہ اضافی فوائد کے مستحق سمجھے جاتے تھے، مثلاً جب اسلام کا کوئی بڑا اور خطرناک دشمن ہدف ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے: ''مَنْ قَتَلَ كَافِرًا فَلَهُ سَلَبُهُ'' یعنی جو مجاہد کسی کافر (یعنی بڑے دشمنِ دین) کو قتل کرے گا، تو مقتول سے چھینا ہوا مال تقسیمِ غنیمت کے وقت اس کے عام حصے کے علاوہ اُسے ملے گا، (سنن ابوداؤد: 2718)۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: بَعَثَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي جَيْشٍ قِبَلَ نَجْدٍ، وَانْبَعَثَتْ سَرِيَّةٌ مِنَ الْجَيْشِ، فَكَانَ سُهْمَانُ الْجَيْشِ اثْنَا عَشَرَ بَعِيرًا، وَنَفَّلَ أَهْلَ السَّرِيَّةِ بَعِيرًا بَعِيرًا، فَكَانَتْ سُهْمَانُهُمْ ثَلَاثَةَ عَشَرَ ثَلَاثَةَ عَشَرَ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نجد کی طرف ایک لشکر کے ساتھ روانہ کیا، پھر مجاہدین کے ایک دستے کو بطور کمک روانہ کیا۔ اس لشکر

کے ہر مجاہد کے حصہ میں بارہ بارہ اونٹ آئے، آپ نے بطور کُمک آنے والے کو ایک ایک اونٹ زیادہ عطا کیا، تو ان کا حصہ تیرہ تیرہ اونٹ ہو گئے، (سُنن ابوداؤد: 2735)"۔

عَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ بَدْرٍ جِئْتُ بِسَيْفٍ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ اللهَ قَدْ شَفَى صَدْرِي مِنَ الْمُشْرِكِينَ أَوْ نَحْوَ هٰذَا، هَبْ لِي هٰذَا السَّيْفَ، فَقَالَ: هٰذَا لَيْسَ لِي وَلَا لَكَ، فَقُلْتُ عَسٰى أَنْ يُعْطٰى هٰذَا مَنْ لَا يُبْلِي بَلَائِي، فَجَاءَنِي الرَّسُولُ فَقَالَ۔ إِنَّكَ سَأَلْتَنِي وَلَيْسَ لِي، وَإِنَّهُ قَدْ صَارَ لِي وَهُوَ لَكَ، قَالَ: فَنَزَلَتْ (يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ) اَلْاٰيَةَ۔

ترجمہ: "حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے دن میں (مالِ غنیمت سے) ایک تلوار لے کر آیا، میں نے کہا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو مشرکین سے ٹھنڈا کر دیا ہے یا اس طرح کے کچھ الفاظ اُنہوں نے کہے، آپ یہ تلوار مجھے عطا فرما دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ نہ میری ملکیت ہے نہ تمہاری"، میں نے دل میں سوچا کہ شاید آپ یہ تلوار کسی ایسے شخص کو عطا فرما دیں گے، جس نے (جہاد میں) میری طرح مشقت نہ اٹھائی ہوگی، پھر تھوڑی دیر بعد رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "تم نے مجھ سے یہ تلوار مانگی تھی، (مگر) اُس وقت یہ میری ملکیت میں نہیں تھی اور اب یہ میری ملکیت میں آچکی ہے، سو اب یہ تمہاری ہے"۔ (سعد) کہتے ہیں کہ اس موقع پر (سورۂ انفال کی پہلی آیت) نازل ہوئی: "(يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ کی پوری آیت نازل ہوئی)"، یہ مسلمان آپ سے مالِ غنیمت سے زائد چیزوں کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجیے غنیمتیں اللہ اور رسول کی ہیں تو اللہ سے ڈرو (غنیمت کی تقسیم میں اختلاف نہ کرو) اور اپنے باہمی معاملات کو درست رکھو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اگر تم مومن ہو (انفال: 1)، (سُنن ترمذی: 3079)"۔

اِن اداروں سے وابستہ سرکاری افسران ریاستی آئین وقانون کے ماتحت ہوتے ہیں، اُن کی ترقی وتنزُّلی کے لئے ملکی قوانین وضابطے حُجت ہوتے ہیں۔ اگر ترقی دیا جانا اُس آفیسر کا

استحقاق ہے، تو اُس کے حق کو روکنا یقیناً استحصال ہے، جسے آئین وقانون کے ساتھ ساتھ شریعت بھی ناپسند کرتی ہے۔ لیکن اگر حکومت کے قانون یا اُس محکمے میں ملازمت کے قوانین میں ایسی گنجائش موجود ہے کہ غیر معمولی صورتِ حال میں شجاعت اور جاں نثاری کا غیر معمولی کارنامہ انجام دینے پر قومی سلامتی کے اداروں کے افسران اور جوانوں کے لئے خصوصی انعامات یا عام معمول اور میرٹ سے ہٹ کر خصوصی انعام دیا جاسکتا ہے یا اگلے اسکیل اور عہدے پر ترقی دی جاسکتی ہے، تو حکومت ایسے قانون بنا کر اس پر عمل درآمد کرسکتی ہے، لیکن اس میں دیانت وامانت اور میرٹ کے اصولوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا اور ایک ضابطہ اور طریقۂ کار وضع کرنا بہتر ہوگا تاکہ جانب داری کا تاثُّر پیدا نہ ہو۔ مُسلّح اَفواج کے افسران اور جوانوں کو اُنہی قوانین کی رُو سے تمغے (Medals) عطا کئے جاتے ہیں اور بعض صورتوں میں ان تمغوں کے ساتھ نقد رقوم بھی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان خصوصی قوانین کے تحت، جن کا تعلق کسی کی غیر معمولی کارکردگی سے ہے، کسی ملازم کو عام ضابطے یا میرٹ سے ہٹ کر اگلے درجے میں ترقی (Promotion to the next Cadre) دینے کی گنجائش موجود ہے، تو اس پر عمل درآمد ہوسکتا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کے لئے بھی ایک باقاعدہ محکمانہ کمیشن، بورڈ یا کمیٹی قائم ہو تاکہ جانب داری کا تاثر پیدا نہ ہو۔ لیکن اگر یہ اعزاز وانعام کسی افسرِ اعلیٰ کا صوابدیدی اختیار ہے، تو وہ اسے استعمال کرکے کسی حق دار کو انعام یا ترقی دے سکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق ادارۂ قومی احتساب (National Accountability Bureau) کے افسران جب لوگوں کی کرپشن کے ذریعے جمع کی ہوئی ناجائز دولت برآمد کرتے ہیں، وہ عدالت کے توسط سے قومی خزانے میں جمع ہوتی ہے اور سال کے اختتام پر ملازمین کو اضافی بنیادی تنخواہیں (پانچ یا سات یا جو بھی فارمولا ہو) بطور انعام یا صلۂ کارکردگی (Reward) دی جاتی ہے، اسی طرح بعض محکموں میں اسنادِ تحسین ملتی ہیں، جو اعترافِ خدمات کی علامت ہوتی ہے۔

کارکردگی میں تساہل وتغافل

سوال:

شرعی اعتبار سے ریاستی اُمور میں ''فساد فی الارض'' کے خاتمے کے لئے انتھک محنت کرنے والے سرکاری افسران اور مصلحت پسندی کی بنیاد پر آنکھیں بند کر کے ڈیوٹی دینے والے افسران میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟۔

جواب:

یقیناً فرق ہے اور ہونا چاہئے اور اپنی منصبی ذمہ داری کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر ادا کرنے والے کے لئے غیر معمولی جزا وانعام کا ضابطہ بنانا اور نافذ کرنا درست ہے، اسی طرح منصبی فرائض تن دہی سے ادا نہ کرنے والے، کام چوری کے عادی یا ملکی سلامتی اور اپنے ادارے کو نقصان پہنچانے والے یا سلامتی کے راز دشمن کو پہنچانے والے کے لئے بھی ضابطۂ کار بنانا اور اُس کو نافذ کرنا درست ہے، جس میں سزا یا ملازمت سے معزولی یا تنزّلی یا ترقی سے محرومی، الغرض فرائضِ منصبی میں تساہل، غفلت یا جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مقرر کی جاسکتی ہے، لیکن ان ضوابط کا نفاذ عادلانہ بنیاد پر ہونا چاہئے اور انتقام یا ذاتی پسند وناپسند کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہئے۔ اور جو شخص اپنے فرائض کو دیانت داری سے انجام دیتا ہے، تو یہ اس کا کسبِ حلال ہے اور کسبِ حلال پر بھی عند اللہ اجر ملتا ہے۔

مرد کے لئے سترِ عورت کی مقدار

سوال:

مرد کے لئے سترِ عورت کہاں سے کہاں تک ہے؟۔ اگر نیکر ایسا پہنا ہو، جس سے گھٹنے نظر آرہے ہوں بلکہ ایک فٹ گھٹنوں سے اوپر ہو، تو ایسے لوگوں کے سامنے تلاوت کلام پاک کرنا جائز ہے یا ناجائز؟۔ ایسے شخص کو سلام کرنا، بات چیت کرنا کیسا ہے؟، کیا ایسی حالت میں کھانا کھانے کا جواز ہے؟۔

(محمد جمیل مروت، ڈیرہ اسماعیل خان)

جواب:

حدیث پاک میں ہے: مَاتَحْتَ السُّرَّۃِ اِلَی الرُّکْبَۃِ مِنَ الْعَوْرَۃِ۔

ترجمہ: ''(مرد کے لئے) ناف کے نیچے سے گھٹنے تک ستر (عورت) ہے''۔

(سنن دار قطنی، جلد 2،ص:93)

سترِ عورت ہر حال میں واجب ہے، خواہ نماز میں ہو یا نہیں، تنہا ہو یا کسی کے سامنے، بلا کسی صحیح ضرورت کے تنہائی میں بھی ستر کھولنا جائز نہیں اور لوگوں کے سامنے یا نماز میں ستر بالاجماع فرض ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَھِیَ لِلرَّجُلِ مَاتَحْتَ سُرَّتِہٖ اِلٰی مَاتَحْتَ رُکْبَتِہٖ)

ترجمہ: ''مرد کے لئے ناف کے نیچے سے گھٹنوں کے نیچے تک عورت ہے، یعنی اس کا چھپانا فرض ہے''۔

ردالمحتار مع الدرالمختار میں ہے: فَالرُّکْبَۃُ مِنَ الْعَوْرَۃِ لِرِوَایَۃِ الدَّارَقُطْنِیِ: ''مَاتَحْتَ السُّرَّۃِ اِلَی الرُّکْبَۃِ مِنَ الْعَوْرَۃِ'' لٰکِنَّہٗ مُحْتَمِلٌ، وَالْاِحْتِیَاطُ فِیْ دُخُوْلِ الرُّکْبَۃِ، وَلِحَدِیْثِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: ''اَلرُّکْبَۃُ مِنَ الْعَوْرَۃِ''۔

ترجمہ: ''دارقطنی کی اِس روایت کی رُو سے ''(مرد کے لئے) ناف کے نیچے سے گھٹنے تک ستر (عورت) ہے''، گھٹنا ستر میں داخل ہے لیکن اس میں دونوں احتمال ہیں کہ آیا غایت (Limit) گھٹنا مُغیّا یعنی سترِ واجب کی مقدار میں داخل ہے یا نہیں؟، اور احتیاط یہ ہے کہ گھٹنا (ستر میں) داخل ہے، اس پر دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''گھٹنا عورت ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2،ص:70)''۔

مرد کے لئے ناف سے لے کر گھٹنے تک بدن کا حصہ عورت (یعنی شرمگاہ) ہے اور اس کا ہمیشہ پردے میں رکھنا واجب ہے۔ لہٰذا اگر بالغ لڑکے ایسا شارٹ کٹ نیکر یا چڈّا پہنتے ہیں جن سے رانیں یا ناف سے نیچے بدن کا حصہ برہنہ رہ جاتا ہو تو یہ مکروہِ تحریمی ہے۔ ایسے لااُبالی نوجوانوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ ایسا لباس پہنیں جو سترِ شرعی کے لئے کافی ہو اور اگر وہ

سمجھانے سے باز نہ آئیں تو حاکمِ مجاز انہیں تعزیراً سزا دے سکتا ہے اور اس کی مقدار حاکم کی صوابدید پر منحصر ہے۔

تلاوتِ قرآن کریم کے آداب میں سے یہ ہے کہ تلاوت کرنے والا باوضو، قبلہ رُو اور اچھے کپڑے پہن کر تلاوت کرے اور سننے والوں پر بھی لازم ہے کہ اِن آداب کی رعایت کریں۔ جو لوگ فرض کی مقدار تک ستر عورت کے تارک ہوں، ان کی مجلس میں تلاوت خلافِ ادب ہے۔ ہمارے ہاں ایک قومی شِعار بن گیا ہے کہ تقریبات کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں ان تقریبات میں لباس شرعی سے عاری نوجوان کھلاڑی بھی ہوتے ہیں اور بہت سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، جو پورا لباس پہنے ہوئے ہوتے ہیں، تو ایسی مجالس میں تلاوت جائز ہے۔

سلام کرنا اگرچہ مسلمانوں کے ایک دوسرے پر عام حقوق میں سے ایک حق ہے، احادیث مبارکہ میں ہے: (۱) حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خَمْسٌ تَجِبُ لِلْمُسْلِمِ عَلَى أَخِيهِ : رَدُّ السَّلَامِ،

ترجمہ: ''پانچ چیزیں ایک مسلمان کے لئے اُس کے مسلمان بھائی پر واجب ہیں: (اُن میں سے ایک) اپنے بھائی کے سلام کا جواب دینا ہے، (صحیح مسلم :5644)''۔ ایک روایت میں فرمایا: حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ: إِذَا لَقِيتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ۔ ترجمہ: ''مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں: (اُن میں سے ایک) جب تم اپنے بھائی سے ملو، تو اُس کو سلام کرو، (صحیح مسلم :5645)''۔ تاہم جو فرض کی حد تک بھی سترِ عورت کے تارک ہوں، اُن کو سلام نہ کرنا بہتر ہے، کیونکہ سلام اکرام مسلم کی علامت ہے اور ایسا فاسق اکرام کے لائق نہیں ہے۔ اسی طرح ایسے لباس میں کھانا خلافِ ادب ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کے پاس شرعی احکام کی تبلیغ کے لئے جاتا ہے، تو دین کی طرف ان کو مائل کرنے کے لئے سلام کر سکتا ہے۔

شوہر کا غیر شرعی اور غیر اَخلاقی مطالبہ

سوال:

میری شادی کو 12 سال ہو چکے ہیں، میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ کچھ عرصے سے میرے شوہر مجھ سے یہ تقاضا کر رہے ہیں کہ میں اُن کا Sex Orgun اپنے منہ سے Suck کروں۔ میری رہنمائی فرمائیں کہ کیا یہ تقاضا شرعی طور پر درست ہے اور مجھے کیا کرنا چاہیے؟، (ایک دینی بیٹی، کراچی)۔

جواب:

آپ کے شوہر کا مطالبہ غیر شرعی اور غیر اَخلاقی ہے، نفیس اور سلیم الطبع شخص کسی طور اِن چیزوں کو گوارا نہیں کر سکتا، طبی طور پر بھی نقائص و بیماری سے خالی نہیں۔ شرعی اعتبار سے اِس عمل کے مکروہِ تنزیہی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، ہاں اگر اِس عمل سے مادۂ منویہ منہ یا حلق میں داخل ہو جائے، تو مکروہِ تحریمی ہے۔ علماء نے بیت الخلاء میں تھوکنے کو نامناسب لکھا ہے۔ شریعتِ مُطہرہ میں تو طہارت رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور طہارت رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند بھی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ﴿۲۲۲﴾

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں اور طہارت رکھنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (البقرۃ:222)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فِی ''النَّوَازِل'': اِذَا أَدْخَلَ الرَّجُلُ ذَکَرَهٗ فِیْ فَمِ امْرَأَتِهٖ قَدْ قِیْلَ یُکْرَهُ وَقَدْ قِیْلَ بِخِلَافِهٖ کَذَا فِی ''الذَّخِیْرَة''۔

ترجمہ: ''''نوازل'' میں ہے: کوئی شخص اپنی بیوی کے منہ میں آلۂ تناسل داخل کرے، (بعض فقہاء نے) اسے مکروہ قرار دیا ہے اور (بعض فقہاء نے) اِس کے خلاف قول کیا ہے (یعنی کراہت کا قول نہیں) جیسا کہ ''ذخیرہ'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:372)

ہاں! اگر شوہر جماع کی لذت کی خاطر Spacial Orgun ہاتھ سے مَس کرنے کو کہتا ہے، تو اِس کی رخصت موجود ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: قَالَ أَبُوْیُوْسُفَ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سَأَلْتُ أَبَاحَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی عَنْ رَّجُلٍ یَمَسُّ فَرْجَ امْرَأَتِہٖ وَھِیَ تَمَسُّ فَرْجَہٗ لِتَحَرَّکَ آلَتُہٗ ھَلْ تَرٰی بِذٰلِکَ بَأْسًا، قَالَ۔ لَا وَأَرْجُوْأَنْ یُّعْطَی الْأَجْرَ کَذَا فِی ''الْخُلَاصَۃِ''۔

ترجمہ: ''امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا: میں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ سے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا کہ مرد عورت کی فرج کو چھوتا ہے اور عورت مرد کے آلۂ تناسل کو، تاکہ ایستادہ ہوجائے، کیا آپ کے نزدیک اس میں (شرعاً) حرج ہے؟، آپ نے فرمایا: نہیں (کوئی حرج نہیں) اور میں اُمید کرتا ہوں کہ اِس پر اُسے اجر ملے گا، جیسا کہ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:328)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّس سِرُّہ العزیز لکھتے ہیں: ''زوجین کا وقتِ جماع ایک دوسرے کی شرمگاہ کو (ہاتھ سے) مَس کرنا بلا شبہ جائز بلکہ بہ نیتِ حَسَنہ مُستَحسَن و مُوجِبِ اَجر ہے، کَمَا رُوِیَ عَنْ نَفْسِ سَیِّدِنَا الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ (جیسا کہ خود ہمارے سردار امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا گیا ہے)، مگر اُس وقت رؤیتِ فرج سے حدیث میں ممانعت فرمائی اور فرمایا: فَإِنَّہٗ یُوْرِثُ الْعَمٰی (وہ نابینائی کا سبب ہوتا ہے)، علماء نے فرمایا کہ اس بات کا احتمال ہے کہ اس کے اندھے ہونے کا سبب ہو یا وہ اولاد اندھی ہو جو اس جماع سے پیدا ہو یا معاذ اللہ دل کا اندھا ہونا کہ سب سے بدتر ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص:-270)

آپ کے شوہر کو اِس طرح کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے اور آپ پر اُن کے اِس مطالبے کو پورا کرنا واجب نہیں ہے۔ اگر شوہر بیوی سے کوئی غیر اَخلاقی یا غیر شرعی مطالبہ کرے، تو بیوی پر ایسے امور میں شوہر کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: لَا طَاعَۃَ فِیْ مَعْصِیَۃِ اللہِ، إِنَّمَا الطَّاعَۃُ فِی الْمَعْرُوْفِ ترجمہ: ''یعنی کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت

لازم نہیں ہے (خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بڑا ہو) جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، اطاعت تو فقط نیک کاموں میں لازم ہے، (صحیح مسلم: 4781)"۔

مجھ سے ایک خاتون نے روتے ہوئے کہا کہ مفتی صاحب جس منہ اور زبان سے میں تلاوت کرتی ہوں، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی ہوں، تسبیحات اور درود پاک پڑھتی ہوں، میں کیسے برداشت کرلوں کہ اُس سے آلۂ تناسل کو Sucking کروں یا منی اُس پر ٹپکائی جائے۔

ہمارے مرد مغرب کی نقالی میں زنا، عملِ قومِ لوط، ہم جنس پرستی اور غیر فطری جنسی تلذُّذ (Sexual Enjoyment) شراب نوشی اور نشہ بازی کی سفلی و مادّی عشرتوں میں کھوجائیں گے، تو روحانی ارتقاء، ایمان کی حلاوت، کردار کی طہارت اُنہیں کیسے نصیب ہوگی اور نشاۃ اسلام اور غلبۂ اسلام کا خواب کیسے اپنی تعبیر پائے گا۔

مساجد میں جوتوں کی حفاظت کا مسئلہ

سوال:

ایک صاحب اپنی چپل اچھی طرح سے جھاڑ کر مسجد میں دیوار کے کنارے اس طرح رکھتے ہیں کہ اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر، اُن صاحب کی چپل پہلے بھی پیچھے رکھنے کے سبب چوری ہو چکی ہے۔ 27 اپریل نمازِ جمعہ ختم ہونے کے بعد ایک دکاندار صاحب مسجد کے اندر ہی اُن صاحب پر برس پڑے، شور شرابہ کیا کہ چپل یہاں کیوں رکھی ہے، اُن صاحب نے جواب دیا کہ چوری کے ڈر سے۔ عام طور سے لوگ چپل مسجد کے اندر ہی محفوظ جگہ پر رکھتے ہیں تاکہ چوری نہ ہو۔ کیا ایک شریف النفس انسان کو یوں لوگوں کے سامنے رسوا کرنا اور مسجد کے تقدس کو پامال کرنا درست ہے، ایسے شخص کی شریعت میں کیا سزا ہے؟، (مقبول الحسن، اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

آپ کی تحریر میں دو سوالوں کی وضاحت طلب کی گئی ہے: (۱) مسجد میں چپل کہاں رکھی جائے (۲) مذکورہ شخص کا طرزِ عمل شریعت میں کیسا ہے؟۔ جوتوں یا چپلوں میں

اگر نجاست نہ لگی ہو، تو مسجد کے کسی گوشے میں رکھ دینا چاہئے، جبکہ مسجد سے باہر کوئی معقول جگہ جوتوں کی حفاظت کی نہ ہو یا چوری ہو جانے کا خدشہ ہو۔ صف میں دائیں یا بائیں جانب یا سجدے کی جگہ کے آگے سامنے نہ رکھیں۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ فَلَا يَضَعْ نَعْلَيْهِ عَنْ يَمِينِهِ، وَلَا عَنْ يَسَارِهِ فَتَكُوْنَ عَنْ يَمِيْنِ غَيْرِهِ! إِلَّا أَنْ لَّا يَكُوْنَ عَنْ يَسَارِهِ أَحَدٌ، وَلْيَضَعْهُمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے، تو اپنے جوتے اپنے دائیں جانب نہ رکھے اور اپنی بائیں جانب بھی نہ رکھے (کیونکہ اگر اس کی بائیں جانب کوئی اور نمازی ہے) تو یہ اُس دوسرے نمازی کی دائیں جانب ہوگی، ہاں! اگر اس کے بائیں جانب کوئی اور نمازی نہیں ہے (تو اپنے بائیں جانب رکھ سکتا ہے)، نمازی اپنا جوتا (حفاظت کی خاطر) اپنے دونوں پیروں کے درمیان رکھ لے، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 654)''۔ چونکہ دائیں جانب رحمت کا فرشتہ بندے کی نیکیاں شمار کرتا ہے، لہٰذا اُس کا ادب کرتے ہوئے نہ اُس جانب تھوکے، نہ جوتے رکھے، ہاں! اگر مسجد کی سائڈ والی دیوار کے ساتھ جوتے اِس طرح رکھے جائیں کہ پیچھے کھڑے کسی نمازی کے سامنے نہ ہوں، تو حرج نہیں۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز لکھتے ہیں: ''اب عُرفِ عام تمام بلاد کا یہی ہے کہ دربارِ شاہی میں بحضورِ سلطانی باتیں کرنے کھڑا ہو اور جوتا سامنے رکھے، بے ادب گنا جائے گا، فقیر نے بچشمِ خود دیکھا ہے کہ کعبۂ معظمہ پر پھوہار برسی، میزابِ رحمت سے بوندیں ٹپک رہی تھیں، مسلمان حاضر تھے، اُن بوندوں کو لیتے اور چشم و دل سے ملتے، ان میں کوئی ہندی شخص جوتا ہاتھ میں لئے کھڑا تھا، ترکی خادم دوڑا اور اُس کی گردن دبا دی، تُنَاجِیْ رَبَّكَ وَ نَعْلَاكَ بِيَدِكَ یعنی جوتیاں ہاتھ میں لئے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے، بلکہ سُنَنِ ابنِ ماجہ میں حدیثِ ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یوں ہے:

فَاجْعَلْهُمَا بَيْنَ رِجْلَيْكَ وَلَا تَجْعَلْهُمَا عَنْ يَمِيْنِكَ وَلَا عَنْ يَمِيْنِ صَاحِبِكَ وَلَا وَرَائَكَ فَتُؤْذِيَ مَنْ خَلْفَكَ۔ ترجمہ: ''پس اپنے جوتے پیروں کے درمیان میں رکھو اور اپنے دائیں جانب رکھو۔ نہ اپنے بائیں جانب کھڑے نمازی کی دائیں جانب رکھو اور نہ اپنے پیچھے رکھو، جو تیرے پیچھے ہے (جوتے اُس کے آگے ہوں گے) اور اُسے تکلیف ہوگی، (سُنن ابن ماجہ :1432)''۔ انجاح الحاجہ میں لکھا ہے: لِأَنَّكَ إِذَا وَضَعْتَهُمَا تَكُوْنَانِ قُدَّامَ مَنْ كَانَ فِي الصَّفِّ الْمُؤَخَّرِ فَيَتَأَذّٰى وَرَحْمَةُ اللهِ تَعَالٰى تَنْزِلُ عَلَيْهِمْ فَيَكُوْنُ هٰذَا الْفِعْلُ إِسَاءَةً۔ ترجمہ: ''اس لئے کہ جب تو اپنے جوتوں کو اپنے پیچھے رکھے گا، تو وہ پچھلی صَف میں کھڑے ہونے والے نمازی کے سامنے ہوں گے اور اُسے اذیّت ہوگی، حالانکہ اُن (سب نمازیوں) پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہو رہی ہوگی، لہٰذا یہ (اپنے پیچھے جوتیاں رکھنا) برا عمل ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص:316-315)''۔

جوتے قبلے کی جانب بھی نہ رکھیں، حدیث پاک میں ہے: اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ رَاٰى بُصَاقًا فِيْ جِدَارِ الْقِبْلَةِ، فَحَكَّهُ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، فَقَالَ: إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ يُصَلِّيْ، فَلَا يَبْصُقْ قِبَلَ وَجْهِهِ، فَإِنَّ اللهَ قِبَلَ وَجْهِهِ إِذَا صَلّٰى۔ ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے دیوارِ قبلہ کی جانب تھوک دیکھا، تو آپ ﷺ نے اُسے کھرچ دیا، پھر آپ ﷺ نے لوگوں کی طرف مُتوجہ ہوکر فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھتا ہے، تو وہ اپنے سامنے نہ تھوکے، کیونکہ جب وہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ اُس کے سامنے ہوتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت اُس کی جانب متوجہ ہوتی ہے)، (صحیح بخاری:406)''۔

جہاں تک اُس دکاندار کے طرزِ عمل کا تعلق ہے، تو اُنہیں چاہئے تھا کہ بہتر انداز سے آپ پر مسئلہ واضح کرتے، مسجد میں شور شرابہ کرنا مسجد کی بے حرمتی ہے۔ مساجد کے احترام کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَجَانِيْنَكُمْ وَشِرَارَكُمْ وَبَيْعَكُمْ وَخُصُوْمَاتِكُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِكُمْ وَإِقَامَةَ حُدُوْدِكُمْ وَسَلَّ سُيُوْفِكُمْ۔

ترجمہ: ''اپنی مساجد کو بچوں، پاگلوں، شریر لوگوں، خرید وفروخت کے معاملات، باہمی

جھگڑوں، اپنی آوازیں بلند کرنے اور (مجرموں پر) حدودِ الٰہی قائم کرنے اور ایک دوسرے پر تلواریں سونتنے سے بچاؤ، (سُنن ابن ماجہ:750)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَکَذَا کُلُّ مُوْذٍ وَلَوْبِلِسَانِہٖ۔ ترجمہ:''اور اسی طرح ہر وہ شخص جو (لوگوں کو) اذیت دیتا ہو، خواہ زبان سے اذیت دے، (اُسے مسجد آنے سے منع کیا جائے گا)، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص:377، بیروت)''۔

مورخہ 19 مئی 2012ء کے اخبارات میں ایک خبر کے مطابق لانڈھی کے علاقے مانسہرہ کالونی میں بسم اللہ مسجد سے چپل چوری کے معاملے پر دو گروہوں میں جھگڑے کے دوران فائرنگ سے چار افراد ہلاک اور خاتون سمیت چار افراد زخمی ہوگئے''۔ (روزنامہ جنگ، کراچی) ہماری قوم بحیثیت مجموعی مغلوب الغضب ہوگئی، اُس کے یقیناً اسباب بھی ہیں، لیکن یہ اتنے شدید رَدِ عمل کا جواز نہیں ہے۔ بحیثیت مسلمان ہماری بدنصیبی ہے کہ مساجد سے جوتیاں چوری ہوجاتی ہیں، اگر کوئی شخص قیمتی جوتے پہن کر آتا ہے، تو اُسے نماز کے دوران بھی اُس کی فکر لاحق رہتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مساجد کی انتظامیہ جوتے رکھنے کے لئے کوئی مناسب انتظام کرے، جس سے نمازیوں کے جوتوں کی حفاظت بھی ہو اور مسجد، نمازیوں اور نماز کا تقدُّس بھی پامال نہ ہو۔ حدیث پاک میں حفاظت کی خاطر پیروں کے درمیان جوتوں کو رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی ہے۔ لیکن آج کل مساجد کے فرش آئینے کی طرح شفاف ہوتے ہیں یا اُن پر قیمتی قالین ہوتے ہیں اور اگر سب نمازی پیروں کے درمیان جوتے رکھیں، تو اِس سے بھی پچھلی صف والوں کو ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ محلوں میں گھروں سے نماز کے لئے آنے والے اکثر نمازی آج کل عام قسم کی چپلیں پہن کر آتے ہیں تاکہ خدانخواستہ گم ہونے کی صورت میں زیادہ نقصان نہ ہو۔ لیکن دفاتر اور مارکیٹوں، صنعتی اور کاروباری اداروں میں لوگ قیمتی جوتے پہن کر جاتے ہیں اور اُن کے لئے جوتوں کی حفاظت مسئلہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا ایک مناسب صورت یہ ہے جو لوگ حرم شریف میں کرتے ہیں کہ ایک کپڑے کی تھیلی ساتھ رکھ لیں اور جوتے اس میں ڈال کر اپنے پیروں کے درمیان رکھ لیا کریں۔

عمرے کا ٹکٹ آپ کا استحقاق نہیں تھا

سوال:

ہمارے محلے میں ایک ہال میں ماہِ رمضان میں سات روزہ نمازِ تراویح کا اہتمام ہوتا ہے، گذشتہ رمضان المبارک میں انتظامیہ کی جانب سے ختم قرآن کے موقع پر عمرے کے لئے پہلے دو ٹکٹ کا اعلان ہوا، پھر تین ٹکٹ کر دیئے گئے۔ اِس قرعہ اندازی میں میرے علاوہ محلے کے دو اور لوگوں کے نام نکلے۔ انتظامیہ کے ایک ذمہ دار بکر نے شناختی کارڈ کی کاپی جمع کرتے ہوئے کہا کہ ان شاء اللہ آپ لوگوں کو ٹکٹ مل جائیں گے، ہمیں اندازہ تھا کہ ماہِ ربیع الاول میں ویزا کا اجراء شروع ہوگا۔ تین ماہ بعد بکر نے کہا کہ آپ لوگوں کو پچیس پچیس ہزار روپے کی رقم ادا کی جارہی ہے جو کہ اس وقت کے ٹکٹ کے برابر ہے، میں نے رقم لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ مجھے ٹکٹ مہیا کریں کیونکہ اعلان ٹکٹ کا ہوا تھا۔ بکر اسپانسر والے شخص سے ملوانے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے یہی رقم ملی ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لئے آپ سے شرعی وضاحت درکار ہے۔

(ثناء اللہ خان، خداداد کالونی، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ انتظامیہ کی طرف سے آپ کو عمرے کا ٹکٹ از قسم تبرُّع دیا جارہا ہے، یہ آپ کا استحقاق نہیں ہے اور نہ ہی کسی کارگزاری کا محنتانہ۔ آپ نے اپنے سوال میں لکھا ہے کہ ''پچیس ہزار روپے جو آپ کو دیئے جارہے ہیں، اُس وقت کے ٹکٹ کے برابر ہیں''، اگر ایسا ہی ہے تو آپ کا اعتراض بے جا ہے۔ ہاں! اگر اسپانسر کرنے والے شخص نے زیادہ رقم دی اور ظہور صاحب نے وہ رقم پوری نہیں دی تو وہ خیانت کے مرتکب ہوں گے۔

یہ ٹکٹ آپ کا استحقاق نہیں تھا، نہ ہی انتظامیہ پر شرعاً لازم تھا، یہ اُن کی طرف سے تبرُّع اور فضل واحسان تھا۔ تاہم چونکہ اُنہوں نے عمرے کے ٹکٹ کا اعلان کیا تھا، کسی مقدار رقم کا

نہیں، تو انہیں چاہئے کہ اپنی سہولت کے مطابق ٹکٹ لے کر دے دیتے، کیونکہ ایفاءِ عہد شرعاً واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (۱) وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ ترجمہ: '' عہد کو پورا کیا کرو، بے شک (آخرت میں) عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی، (بنی اسرائیل: 34)''۔

(۲) کامیاب اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ ترجمہ: ''اور وہ جو اپنے عہد اور امانتوں کی پاس داری کرتے ہیں، (المومنون: 8)''۔

رسول اللہ ﷺ نے منافقین کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ''آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ''۔

ترجمہ: '' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے''۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 33)

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: '' ایفائے عہد شرعاً محبوب (پسندیدہ) اور اُس کا خُلف (وعدے کی خلاف ورزی) ناپسندیدہ و مکروہ، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص: 176)''۔

جن لوگوں نے وہاں نمازیں پڑھیں، اُنہوں نے رضائے الٰہی کے لئے پڑھیں یا ٹکٹ کی لالچ میں آج کل محافل نعت، مجالس اور عبادات میں ترغیب کے لئے جو عمرے کے ٹکٹ کی قرعہ اندازیوں کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، نیتوں کا حال تو اللہ جانتا ہے، لیکن اس میں نمود و نمائش کا عنصر زیادہ ہو گیا اور اس سے انسان اجر سے محروم ہو جاتا ہے۔

تعطیلات کے ایام کی تنخواہ کا جواز

سوال:

ہم اپنے اسکول میں ٹیچرز کو ہفتہ و اتوار چھٹی دیتے ہیں، جس کی تنخواہ اُنہیں دی

جاتی ہے۔اس کے علاوہ سیریس بیماری کے دنوں میں چھٹی کی تنخواہ بھی دیتے ہیں۔لیکن اگر اِس کے علاوہ کوئی چھٹی کرے،تو اُس کی تنخواہ کاٹی جاتی ہے۔مزید اسکول قواعد کے مطابق ہفتہ واتوار کی تعطیل سے پہلے یا کسی سرکاری تعطیل سے پہلے اگر ٹیچر چھٹی کرلے تو اُس کی اِس تعطیل کے دنوں کی (یعنی اگلے یا پچھلے دن کو تعطیل کے ایام کے ساتھ شمار کرکے) تنخواہ کاٹی جاتی ہے۔کیا یہ طریقہ صحیح ہے یا اس میں کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت ہے؟۔

(پروفیسر سید عبدالرزاق گیلانی،کراچی)

جواب:

ایامِ تعطیلات کی تنخواہ شرعاً تنخواہ کا حصہ اور مدرّس کا حق ہے۔فقہاء کرام نے ائمہ اور مدرسین کے لئے چھٹی کے زمانے کی تنخواہ لینا جائز لکھا ہے،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَفِی ''الْقُنْیَةِ'' مِنْ بَابِ الْاِمَامَةِ: اِمَامٌ یَتْرُكُ الْاِمَامَةَ لِزِیَارَةِ اَقْرِبَائِهٖ فِی الرَّسَاتِیْقِ اُسْبُوْعًا اَوْ نَحْوَهٗ اَوْلِمُصِیْبَةٍ اَوْلِاسْتِرَاحَةٍ لَابَاْسَ بِهٖ وَمِثْلُهٗ عَفْوٌفِی الْعَادَةِ وَالشَّرْعِ۔

ترجمہ:''قنیہ''باب الامامت میں ہے کہ اگر امام ہفتے بھر کے لئے دیہات میں اپنے رشتے داروں کی ملاقات کے لئے یا کسی کام کے لئے گیا یا کچھ دن آرام کے لئے گیا یا کسی پریشانی میں مبتلا رہا اور ان ایام میں فرائض امامت ادا نہ کئے،تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اتنی غیر حاضری شرعاً اور عرفاً معاف ہے''۔(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 6،ص:493)

سرکاری ونجی اداروں میں بھی عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ سال میں ایک مہینے کی چھٹی مع تنخواہ دی جاتی ہے،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قَالَ فِی ''الْاَشْبَاهِ'': وَقَدِ اخْتَلَفُوْافِیْ اَخْذِ الْقَاضِیْ مَا رُتِّبَ لَهٗ فِیْ بَیْتِ الْمَالِ فِیْ یَوْمِ بِطَالَتِهٖ، فَقَالَ فِی ''الْمُحِیْط'': اِنَّهٗ یَأْخُذُ لِاَنَّهٗ یَسْتَرِیْحُ لِلْیَوْمِ الثَّانِیْ، وَقِیْلَ: لَا، وَفِی ''الْمُنْیَةِ'': اَلْقَاضِیْ یَسْتَحِقُّ الْكِفَایَةَ مِنْ بَیْتِ الْمَالِ فِیْ یَوْمِ الْبِطَالَةِ فِی الْاَصَحِّ۔

ترجمہ:''الاشباہ والنظائر میں ہے:بیت المال سے قاضی کا جو مشاہرہ مقرر ہے،بے کاری یعنی

چھٹیوں کے ایام کے عوض وہ تنخواہ لے سکتا ہے یا نہیں؟ اِس میں فقہاء کا اختلاف ہے، ''محیط'' میں فرمایا: ایامِ تعطیلات کی تنخواہ لے گا کیونکہ وہ دوسرے دن کام کی استعداد میں اضافہ کرنے کے لئے آرام کرتا ہے اور بعض نے کہا کہ (تنخواہ) نہیں لے گا۔ اور ''منیہ'' میں ہے: صحیح ترین قول یہ ہے کہ قاضی ایامِ تعطیلات کی تنخواہ کفایت کے مطابق لینے کا مستحق ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص: 444)

اسکول، کالج اور مدارس کے ملازمین اجیر خاص کے زمرے میں آتے ہیں، اجیر خاص اصطلاحِ فقہ میں اُسے کہتے ہیں جو ایک مُعیّن وقت میں تسلیمِ نفس یعنی اپنے کام پر حاضر رہنے کا پابند ہو، اگرچہ اُس کا کام انجام نہ پاسکے، تب بھی وہ اُجرت کا مستحق ہوگا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَهُوَ الْأَجِيْرُ (الْخَاصُّ) يُسَمّٰى أَجِيْرُوَحْدٍ (وَهُوَ مَنْ يَعْمَلُ لِوَاحِدٍ عَمَلاً مُؤَقَّتًا بِالتَّخْصِيْصِ وَيَسْتَحِقُّ الْأَجْرُ بِتَسْلِيْمِ نَفْسِهٖ فِي الْمُدَّةِ وَاِنْ لَمْ يَعْمَلْ كَمَنِ اسْتُؤْجِرَ شَهْرًا لِلْخِدْمَةِ

ترجمہ: ''اجیر خاص وہ ہوتا ہے، جو ایک مُعیّن وقت میں کسی ایک شخص کے کام کو انجام دے، ایسا شخص جب اپنی خدمات آجر کے سپرد کردے، تو مقررہ اُجرت کا حق دار ہوجاتا ہے، خواہ اُس نے کام نہ کیا ہو (یعنی آجر نے اس دوران اُس سے کام نہ لیا ہو)، جیسے کسی کو ماہوار تنخواہ پر نوکر رکھ لیا ہو (اور وہ ڈیوٹی پر موجود ہو، خواہ اُس سے کام لیا گیا ہو یا نہ، وہ تنخواہ کا حق دار ہوگا)، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص: 81)''۔

بعض معاہدات اور عقود مشروط ہوتے ہیں اور بہتر یہ ہے کہ عقد اجارہ کے وقت تمام شرائط کو بیان کردیا جائے تاکہ بعد میں فریقین میں کوئی تنازع پیدا نہ ہو اور فقہی قاعدہ ہے کہ ''اَلْمَعْهُوْدُ كَالْمَشْرُوْطِ'' (یعنی معہود مشروط کی مثل ہے) کے تحت جن ایام کی بلا رخصت چھٹی کی، صرف اُن ایام کی تنخواہ وضع کی جاسکتی ہے، ہفتہ وار یا سرکاری تعطیلات کی تنخواہ وضع کرنا درست نہیں ہے۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز لکھتے ہیں: ''مدرسین وامثالہم اجیر خاص ہیں اور اجیر خاص پر وقت مقررہ معہودہ میں تسلیمِ نفس (یعنی اپنے آپ کو

آجر کے مقررہ کام کے لئے فارغ رکھنا) لازم ہے، اور اسی سے وہ اُجرت کا مستحق ہوتا ہے اگرچہ کام نہ کیا ہو، مثلاً مُدرّس وقت معہودہ پر مہینہ بھر برابر حاضر رہا اور طالب علم کوئی نہ تھا کہ سبق پڑھاتا، مُدرّس کی تنخواہ واجب ہوگئی، ہاں! اگر تسلیمِ نفس میں کمی کرے مثلاً بلا رخصت چلا گیا یا رخصت سے زیادہ دن لگائے یا مدرسہ کا وقت چھ گھنٹے تھا، اس نے پانچ گھنٹے دیئے یا حاضر تو رہا، لیکن وقتِ مقررہ پر خدمتِ مُفَوَّضَہ کے سوا اور کسی اپنے ذاتی کام اگرچہ نماز نفل یا دوسرے شخص کے کام میں صرف کیا کہ اس سے بھی تسلیم منتقض (ٹوٹ گئی) ہوگئی، یونہی اگر آتا اور خالی باتیں کرتا چلا جاتا ہے، طلبہ حاضر ہیں اور پڑھاتا نہیں کہ اگرچہ اُجرت کام کی نہیں تسلیمِ نفس کی ہے، مگر یہ منع نفس ہے نہ کہ تسلیم۔ بہر حال جس قدر تسلیمِ نفس میں کمی کی ہے اتنی تنخواہ وضع ہوگی، معمولی تعطیلیں مثلاً جمعہ وعیدین ورمضان المبارک کی یا جہاں مدارس میں سہ شنبہ کی چھٹی بھی معمولی ہے، وہاں یہ بھی اس حکم سے مُستثنیٰ ہیں کہ ان ایام میں بے تسلیمِ نفس بھی مستحقِ تنخواہ ہے، سوا اس کے اور کسی صورت میں تنخواہ کل یا بعض ضبط نہیں ہوسکتی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 19 ص:506)''۔

تاہم اگر شرائطِ ملازمت میں یہ شامل ہے کہ تعطیل کے ایام سے پہلے اگر کوئی چھٹی کرے گا تو اُس چھٹی سمیت تعطیل کے ایام کی بھی تنخواہ کاٹی جائے گی، یا اس پر عُرف اور تعامُل (General Practice) ہے، تو درست ہے اور مشروط کی طرح ہے۔ علامہ محمد خالد الاتاسی لکھتے ہیں: اَلْمَعْرُوْفُ عُرْفًا کَالْمَشْرُوْطِ شَرْطًا أَیِ الْمَعْرُوْفُ الْمُعْتَادُ بَیْنَ النَّاسِ، وَاِنْ لَّمْ یُذْکَرْ صَرِیْحاً، فَھُوَ بِمَنْزِلَةِ الصَّرِیْحِ، لِدَلَالَةِ الْعُرْفِ عَلَیْهِ۔

ترجمہ: ''جو (لوگوں کا) عرف ہو، وہ شرط کے قائم مقام ہے، یعنی جو عادت لوگوں کے درمیان معروف ہو، اگرچہ صریحاً ذکر نہ کی جائے، وہ بمنزلہ صریح کے ہوتی ہے، کیونکہ عرف اُس پر دلالت کرتا ہے''۔ (شرح المجلّۃ، مادّہ 44-43، جلد 1، ص:100)''۔ پس جو عرف بن جائے، وہ مشروط کی طرح ہے۔ الغرض شرائط ملازمت میں یہ درج کر دیا گیا ہے یا تعطیلات کے بارے میں کسی ادارے یا محکمے میں یہ ضابطہ طے شدہ ہے کہ اختتام ہفتہ

(Weekend) یا تعطیلات عیدین یا ان مواقع پر جو چھٹیاں Notified ہوتی ہیں یا جنہیں Gazzetted Holidays کہا جاتا ہے، اُن سے ایک دِن پہلے اور ایک دِن بعد جو چھٹی کرے گا، تو یہ سرکاری چھٹیاں بھی ذاتی رخصت شمار ہوں گی، تو یہ درست تسلیم کیا جائے گا۔

لقطہ کے بارے میں شرعی حکم

سوال:

ہمارے یہاں (طبا ہارٹ انسٹیٹیوٹ ہسپتال میں) مریضوں کے ساتھ کئی اور لوگ آتے ہیں اور اکثر چھوٹی بڑی چیزیں بھول جاتے ہیں۔ اگر ہمیں نام پتا مل جاتا ہے تو انہیں وہ چیزیں واپس دے دیتے ہیں، لیکن بعض دفعہ اصل مالک کا پتا نہیں چلتا وہ چیزیں ہمارے پاس جمع رہتی ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا ہم اُنہیں فروخت کر کے اُس رقم کو غریب مریضوں پر خرچ کر سکتے ہیں، اصل مالک کے انتظار میں یہ چیزیں کتنی مدت تک رکھنا چاہئیں؟۔

(طبا ہارٹ انسٹیٹیوٹ، کراچی)

جواب:

شریعت کی اصطلاح میں ایسی چیز کو لُقطہ کہتے ہیں، جو کسی شخص کو راستے میں گری پڑی ہوئی مل جائے۔ حدیث پاک میں ہے : عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، وَسُئِلَ عَنِ اللُّقَطَةِ؟، فَقَالَ: لَا تَحِلُّ اللُّقَطَةُ، مَنِ الْتَقَطَ شَيْئًا فَلْيُعَرِّفْهُ سَنَةً، فَإِنْ جَاءَهُ صَاحِبُهَا فَلْيَرُدَّهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ لَمْ يَأْتِ صَاحِبُهَا فَلْيَتَصَدَّقْ بِهَا۔

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے لُقطہ (گری پڑی چیزوں) کے بارے میں سوال ہوا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لُقطہ حلال نہیں ہے، جو شخص پڑا مال اٹھائے، اُس کی ایک سال تشہیر کرے اگر مالک آجائے تو اُسے دیدے اور نہ آئے تو صدقہ کردے، (سنن دار قطنی: 4309)“۔

لُقطہ کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم وہ اشیاء ہیں جو قیمتی نہیں ہیں اور اُن کا مالک اُن کی تلاش میں

سرگرداں نہیں ہوتا، جیسے کھجور کی گٹھلیاں، انار کے چھلکے، ردی کاغذ، خالی بوتلیں، رَدّی کپڑے وغیرہ۔ دوسری قسم وہ چیزیں جن کے بارے میں علم ہوتا ہے کہ اُن کا مالک اُن کو طلب کرے گا، جیسے قیمتی اشیاء۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: رَخَّصَ لَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِي الْعَصَا وَالسَّوْطِ وَالْحَبْلِ وَأَشْبَاهِهِ يَلْتَقِطُهُ الرَّجُلُ يَنْتَفِعُ بِهٖ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے عصا اور کوڑے اور رسّی اور اِس جیسی چیزوں کے بارے میں رخصت دی ہے کہ کوئی شخص اٹھالے تو اُس سے فائدہ اٹھالے، (سُنن ابوداوٗد: 1717)''۔

علامہ برہان الدین ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: اَللُّقَطَةُ أَمَانَةٌ إِذَا أَشْهَدَ الْمُلْتَقِطُ أَنَّهٗ يَأْخُذُهَا، لِيَحْفَظَهَا، وَيَرُدَّهَا عَلٰى صَاحِبِهَا لِأَنَّ الْأَخْذَ عَلٰى هٰذَا الْوَجْهِ مَأْذُوْنٌ فِيْهِ شَرْعًا، بَلْ هُوَ الْأَفْضَلُ عِنْدَ عَامَّةِ الْعُلَمَاءِ، وَهُوَ الْوَاجِبُ إِذَا خَافَ الضِّيَاعَ عَلٰى مَا قَالُوْا۔

ترجمہ: ''لُقطہ اُس شخص کے پاس امانت ہے جو اُسے اٹھائے، بشرطیکہ اٹھاتے وقت اُس نے اِس بات پر کوئی گواہ مقرر کرلیا ہو کہ وہ اِس کی حفاظت کرے گا، اور اس کے مالک سے ملاقات ہوجانے کی صورت میں اُسے واپس کردے گا، اِس غرض سے اُفتادہ چیز کو اٹھانے کی شرعاً اجازت ہے، بلکہ عام علماء کے نزدیک ایسے مال کو اسی طرح پڑا رہنے سے اٹھالینا ہی افضل ہے۔ اور اگر اُس مال کے ضائع ہوجانے کا خوف ہو تو اُسے اٹھالینا واجب ہے''۔

(ہدایہ، جلد 4 ص: 336)

اُس شے کے مالک تک پہنچانے کے لئے ایک مدت تک اُس کا اعلان یا تشہیر کرانا ضروری ہے، اِس مدت کو فقہاء نے مختلف بیان کیا ہے، علامہ برہان الدین ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: قَالَ (الْقُدُوْرِيُّ) فَإِنْ كَانَتْ أَقَلَّ مِنْ عَشَرَةِ دَرَاهِمَ: عَرَّفَهَا أَيَّامًا، وَإِنْ كَانَتْ عَشَرَةً فَصَاعِدًا: عَرَّفَهَا حَوْلًا۔ قَالَ الْعَبْدُ الضَّعِيْفُ: وَهٰذِهٖ رِوَايَةٌ عَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ

اللهُ، وَقَوْلُهُ: أَيَّامًا مَعْنَاهُ: عَلَى حَسَبِ مَا يَرَى الْإِمَامُ، وَقَدَّرَهُ مُحَمَّدٌ رَحِمَهُ اللهُ فِي "الْأَصْلِ" بِالْحَوْلِ عَنْ غَيْرِ تَفْصِيلٍ بَيْنَ الْقَلِيلِ وَالْكَثِيرِ، وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ رَحِمَهُمَا اللهُ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "مَنِ الْتَقَطَ شَيْئًا فَلْيُعَرِّفْهُ سَنَةً" مِنْ غَيْرِ فَصْلٍ- وَجْهُ الْأَوَّلِ: أَنَّ التَّقْدِيرَ بِالْحَوْلِ وَرَدَ فِي لُقَطَةٍ كَانَتْ مِائَةَ دِينَارٍ تُسَاوِي أَلْفَ دِرْهَمٍ، وَالْعَشَرَةُ وَمَا فَوْقَهَا فِي مَعْنَى الْأَلْفِ فِي تَعَلُّقِ الْقَطْعِ بِهِ فِي السَّرِقَةِ، وَتَعَلُّقِ اسْتِحْلَالِ الْفَرْجِ بِهِ، وَلَيْسَتْ فِي مَعْنَاهَا فِي حَقِّ تَعَلُّقِ الزَّكَاةِ، فَأَوْجَبْنَا التَّعْرِيفَ بِالْحَوْلِ احْتِيَاطًا، وَمَا دُونَ الْعَشَرَةِ لَيْسَ فِي مَعْنَى الْأَلْفِ بِوَجْهٍ مَّا، فَفَوَّضْنَا إِلَى رَأْيِ الْمُبْتَلَى بِهِ- وَقِيلَ: الصَّحِيحُ أَنَّ شَيْئًا مِّنْ هٰذِهِ الْمَقَادِيرِ لَيْسَ بِلَازِمٍ، وَيُفَوَّضُ إِلَى رَأْيِ الْمُلْتَقِطِ يُعَرِّفُهَا إِلَى أَنْ يَّغْلِبَ عَلَى ظَنِّهِ أَنَّ صَاحِبَهَا لَا يَطْلُبُهَا بَعْدَ ذَالِكَ، ثُمَّ يَتَصَدَّقُ بِهِ،

ترجمہ:" (صاحبِ قدوری رحمہ اللہ نے) فرمایا اگر وہ لُقطہ دس درہم سے کم کا ہو تو چند دنوں تک اس کی شناخت اور تشہیر کراتا رہے اور اگر وہ دس درہم یا اس سے زیادہ کا ہو تو ایک سال تک اُس کی تشہیر کرے۔ مصنف علیہ الرحمہ نے کہا کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ ایک روایت ہے۔ یہاں جو چند دن تشہیر (PUBLICISE) کرنے کا قول کیا ہے، اُس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی سمجھ کے مطابق مناسب دنوں تک تشہیر کرے۔ امام محمد رحمہ اللہ علیہ نے اصل (مبسوط) میں قیمت میں کمی بیشی کے فرق کے بغیر ایک سال کی مدت مقرر کی ہے اور امام مالک و امام شافعی رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:" جو شخص لُقطہ اٹھائے، وہ ایک سال تک اُس کا اعلان کرے"۔ حدیث میں بھی تھوڑی چیز کی قیمت کی تفصیل میں جائے بغیر یہ مدت مقرر کی گئی ہے۔ پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ ایک سال کی تعیین ایسے لقطہ کے بارے میں ہے جو سو دینار (سونا) جو ہزار درہم (چاندی) کے مساوی ہو اور ہم نے دس درہم اور اس سے زیادہ کو بھی ہزار کے معنی میں اِس بنا پر لیا ہے کہ دس درہم کی قیمت کے مال کی چوری پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور (کم از کم) دس درہم مہر مقرر ہونے سے عورت (شوہر پر) حلال ہو جاتی ہے۔ لیکن زکوٰۃ کے مسئلہ میں دس درہم ہزار درہم کے معنی

میں نہیں ہوتے، اس لئے دس درہم میں بھی ہم نے احتیاطاً ایک سال کی تشہیر کی شرط لازم کی ہے۔ اور جو مقدار دس درہم سے کم ہو وہ کسی طرح سے بھی ہزار درہم کے معنی میں نہیں ہے، اس لئے ہم نے اس کی تشہیر کے بارے میں مدت کو مُلتقِط (مال اٹھانے والے) کے اپنے ذاتی فیصلے پر چھوڑ دیا ہے اور بعض فقہاء نے فرمایا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ ان مدتوں میں کوئی مدت بھی لازمی نہیں ہے بلکہ ملتقِط کی اپنی رائے پر موقوف ہے، وہ برابر اعلان کرتا رہے یہاں تک کہ اس کے غالب گمان میں یہ بات آجائے کہ اب اس کا مالک اُسے تلاش نہیں کرے گا، اس کے بعد اُسے صدقہ کردے، (ہدایہ، جلد 4، ص:338-337)''۔

پس آپ وہ اشیاء اپنے ادارے میں کسی جگہ اسٹور کرتے رہیں اور اِس دوران اُن اشیاء کے مالکان کی تلاش کے لئے مناسب تشہیر کے ذرائع اختیار کریں، جس کی مدت آپ کی صوابدید پر منحصر ہے، مالک کے نہ ملنے کی صورت میں آپ اُسے صدقہ کردیں یا فروخت کر کے اُس رقم کو غریب و نادار مریضوں کے علاج معالجے میں صرف کریں۔ اِس مسئلے پر شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی نے تبیان القرآن جلد 5، صفحات 695 تا 704 تفصیلی بحث فرمائی ہے، وہاں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ہماری رائے میں آپ کے لئے تشہیر کی یہی صورت کافی ہے کہ اس مقصد کے لئے ہاسپٹل میں ایک نوٹس بورڈ آویزاں کردیں اور اُس پر اُن اشیاء کی فہرست کہ اگر کوئی اُن کا مالک ہے تو نشانی بتا کر لے جائے، آج کے دور میں ایک سے تین ماہ کی مدت بھی کافی ہے، مدت میں کمی بیشی چیز کی نوعیت پر منحصر ہے، کیونکہ جس کو اپنی چیز کی تلاش میں دلچسپی ہوگی، وہ اس عرصے میں رجوع کرلے گا، کیونکہ طویل مدت کے لئے اِن اشیاء کی حفاظت بھی ایک مسئلہ ہے۔

کسی تقصیر یا تعدّی کے بغیر امانت ضائع ہونے پر ضمان نہیں

سوال:

میری سابقہ بیوی کی سونے کی چوڑیاں جن کی مالیت 2006ء میں 42,500/= روپے تھی، گھر میں ڈکیتی پڑنے پر چلی گئیں، اب علیحدگی ہوجانے کے بعد وہ

مطالبہ کررہے ہیں کہ آج کے سونے کی قیمت کے مطابق ہمیں رقم دی جائے۔کیا اُن کا مطالبہ درست ہے؟،(عبداللہ رضا،کراچی)۔

جواب:

مذکورہ صورت میں آپ پر کوئی ضمان (جرمانہ) نہیں، کیونکہ آپ کی جانب سے کوئی تَعَدِّی یا قصور (Negligence) نہیں ہے۔ڈکیتی کے وقت گھر میں تمام افراد ہی موجود رہے ہوں گے اور اُن چوڑیوں کے علاوہ یقینی طور پر اور مال بھی گیا ہوگا،علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(وَلَا تُضْمَنُ بِالْهَلَاكِ مِنْ غَيْرِ تَعَدٍّ)

ترجمہ:''تَعَدِّی کے بغیر ہلاکت پر ضامن نہیں ہوں گے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 8،ص:413)''۔اگر خاتون نے وہ چوڑیاں بطور امانت بھی آپ کے پاس رکھوائی تھیں، تب بھی آپ پر ضمان نہیں ہے: فَاِنَّهٗ اَمِيْنٌ وَلَا ضَمَانَ عَلَى الْاَمِيْنِ اِلَّا بِالتَّعَدِّىْ وَلَا تَعَدِّىْ مِنَ الْمَقْهُوْرِ الْمَغْلُوْبِ (کیونکہ یہ امین ہے اور امین پر ضمان نہیں ہوتا ماسوائے تَعَدِّی کے جبکہ مجبور و مغلوب تَعَدِّی کرنے والا نہیں ہوتا)۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا: ایک شخص نے زید سے کچھ زیور عاریت لئے اور وہ زیورات گم ہوگئے اب وہ اس کے بدلے میں بخوشی نیا زیور بنادینا چاہتے ہیں،وہ لینا جائز ہے یا نہیں؟،آپ نے جواب میں لکھا:''جبکہ وہ زیور اُس شخص کی تقصیر کے بغیر گم ہوگئے تو اس کے بدلے میں اس سے کچھ لینا ہی ناجائز و تاوان ہے۔اور ناجائز بات میں کسی کی خوشی وناخوشی کو دخل نہیں،بہت لوگ سود بخوشی دیتے ہیں،پھر کیا اُس کا لینا حلال ہو جائے گا، اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ کیا جھوٹ اور گناہ سے لیتے ہو،آپس کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔لہٰذا علماء فرماتے ہیں اگر باہم شرط قرار پائی ہو کہ جاتا رہے تو تاوان دیں گے تو یہ شرط بھی مردود و باطل ہے، درمختار میں ہے: وَلَا تُضْمَنُ بِالْهَلَاكِ مِنْ غَيْرِ تَعَدٍّ وَشَرْطُ الضَّمَانِ بَاطِلٌ

ترجمہ:''تَعَدِّی کے بغیر ہلاکت پر ضامن نہیں ہوں گے اور (اِس صورت میں) ضمان کی

شرط باطل ہے''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 19، ص:156)

عورتوں کے حجاب کی شرعی حیثیت

سوال:

میرے شوہر مذہبی رجحان کے مالک ہیں، نکاح سے پہلے میں دوپٹے کی صورت میں پردہ کرتی تھی، نکاح کے بعد اپنی مرضی سے عبایا اور اسکارف لینا شروع کردیا۔ میرے شوہر کی جاب سعودی عرب میں ہے، وہاں جاکر میرے شوہر نے کہا کہ عبایا اور اسکارف آدھا پردہ ہے آپ کو نقاب بھی لگانا ہوگا ورنہ آپ میرے ساتھ کہیں آجا نہیں سکتیں۔ میں نے اُن کی مرضی سے نقاب لگانا شروع کردیا لیکن اُس میں مجھے گھٹن محسوس ہوئی، شادی سے پہلے بھی گھبراہٹ اور بے چینی کی شکایت رہتی تھی، تقریباً تین سال سے اُس کا علاج کروا رہی تھی اب تک ادویات جاری ہیں۔ سعودی عرب میں تقریباً 75 فیصد خواتین اسکارف اور عبایا کی صورت میں پردہ کرتی ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا پردہ اسکارف اور عبایہ سے بھی ہوسکتا ہے؟۔(ڈاکٹر رفعت جہاں، بفرزون، کراچی)

جواب:

حجاب کے احکام سورۂ احزاب میں بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ترجمہ:''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہیے کہ وہ (گھر سے نکلتے وقت) اپنی چادروں کا کچھ حصہ (اپنے منہ پر) لٹکا لیا کریں، (الاحزاب:59)''۔

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:''جلباب وہ چادر ہے جس کو عورت کمبل کی طرح اوپر سے اوڑھ لیتی ہے، ابوعبید نے کہا ہے کہ ازہری نے یہ بیان کیا ہے کہ ابن الاعرابی نے جو یہ کہا ہے کہ جلباب ازار (تہبند) ہے، اس سے مراد وہ چادر نہیں ہے جو کمر پر باندھی جاتی ہے بلکہ اس سے مراد وہ چادر ہے جس سے تمام جسم کو ڈھانپ لیا جاتا ہے''۔(لسان العرب،

جلد 1،ص:273)

علامہ غلام رسول سعیدی قاضی ناصرالدین بیضاوی شافعی کے حوالے سے اِس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''یُغَطِّیْنَ وُجُوْهَهُنَّ وَاَبْدَانَهُنَّ بِمَلَاحِفِهِنَّ اِذَا بَرَزْنَ لِحَاجَةٍ وَّمِنْ لِلتَّبْعِیْضِ فَاِنَّ الْمَرْاَةَ تُرْخِیْ بَعْضَ جِلْبَابِهَا وَتَتَلَفَّعُ بِبَعْضٍ

ترجمہ:''(جب عورتیں کسی کام سے باہر نکلیں تو) اپنے چہرے اور بدن کو ڈھانپ لیں، ''مِن'' تبعیض کے لئے ہے کیونکہ عورتیں چادر کے بعض حصے کو (چہرہ پر) لٹکا لیتی ہیں اور بعض کو بدن کے گرد لپیٹ لیتی ہیں، بیضاوی علی ہامش الخفاجی، جلد 7،ص:185''۔

(تبیان القرآن، جلد 9،ص:559)

اَزواجِ مُطہرات اور مسلم خواتین جب کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلتیں تو نقاب پہنتیں یا چادروں سے اپنے چہروں کو ڈھانپ لیتی تھیں۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الْمَدِیْنَةَ، وَهُوَ عَرُوْسٌ بِصَفِیَّةَ بِنْتِ حُیَیٍّ، جِئْنَ نِسَاءُ الْاَنْصَارِ فَاَخْبَرْنَ عَنْهَا، قَالَتْ: فَتَنَكَّرْتُ وَتَنَقَّبْتُ فَذَهَبْتُ، فَنَظَرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِلٰی عَیْنِیْ فَعَرَفَنِیْ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب خیبر سے مدینہ تشریف لائے، تو اُس وقت آپ نے حضرت صفیہ بنت حُیَیّ سے شادی کی ہوئی تھی، انصار کی عورتوں نے آکر حضرت صفیہ کے متعلق بیان کیا، میں نے اپنا حلیہ بدلا اور نقاب پہن کر گھر سے نکلی۔ رسول اللہ ﷺ نے میری آنکھ کو دیکھ کر پہچان لیا''۔

(سُنن ابن ماجہ:1980)

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت ایسا اسکارف یا نقاب پہن سکتی ہے، جس میں آنکھ کھلی ہو اور اُسے دیکھنے میں دشواری نہ ہو۔

جوان عورتوں کو نامحرم مردوں کے سامنے چہرہ چھپانے کا حکم ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَتُمْنَعُ) الْمَرْاَةُ الشَّابَّةُ (مِنْ كَشْفِ الْوَجْهِ بَیْنَ الرِّجَالِ) لَا لِاَنَّهٗ عَوْرَةٌ بَلْ

(لِخَوْفِ الْفِتْنَةِ) كَمَسِّهٖ وَاِنْ اَمِنَ الشَّهْوَةَ لِاَنَّهٗ أَغْلَظُ

ترجمہ: ''جوان عورت کو (نامحرم) مردوں کے سامنے چہرہ کھولنے سے منع کیا جائے گا، اِس لئے نہیں کہ اُس کا ستر واجب ہے بلکہ فتنہ کے خوف سے منع کیا گیا ہے، جیسے عورت کا چھونا، خواہ شہوت کا اندیشہ نہ ہو، کیونکہ چھونا دیکھنے سے زیادہ سنگین بات ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2،ص:72)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (فَاِنْ خَافَ الشَّهْوَةَ (أَوْشَكَّ (اِمْتَنَعَ نَظَرُهٗ اِلٰى وَجْهِهَا) فَحَلُّ النَّظَرِ مُقَيَّدٌ بِعَدَمِ الشَّهْوَةِ وَاِلَّا فَحَرَامٌ، وَهٰذَا فِيْ زَمَانِهِمْ، وَأَمَّا فِيْ زَمَانِنَا فَمُنِعَ مِنَ الشَّابَّةِ۔ قُهُسْتَانِيٌّ وَغَيْرُهٗ

ترجمہ: ''اگر شہوت کا خوف یا شک ہو تو مرد کا عورت کے چہرہ کی جانب نظر کرنا منع ہے، نظر کا حلال ہونا شہوت نہ ہونے کے ساتھ مقید ہے ورنہ تو حرام ہے اور یہ یعنی شہوت نہ ہونے کی صورت میں عورت کو دیکھنے کا جواز اگلے لوگوں کے زمانہ میں تھا اور ہمارے زمانے میں تو جوان عورت کا چہرہ دیکھنا ہر طرح ممنوع ہے یعنی فسادِ زمانہ کے سبب، جیسا کہ ''قہستانی'' وغیرہ میں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9،ص:451)''۔

عبایہ ستر کی ضرورت کو پورا کرتا ہے لیکن حجاب یا پردے کے لئے اسکارف کافی نہیں بلکہ چہرے کے پردے کے لئے قرآن کریم میں چادر سے چہرہ ڈھانپنے کا حکم ہے۔ یہ ضرورت حجاب کے مختلف طریقوں سے پوری ہوسکتی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو گھٹن اور بے چینی ہوتی ہے تو آپ باریک کپڑے کا نقاب چہرے پر لٹکا سکتی ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ضرورت کی بنا پر عورت کا چہرہ دیکھنا جائز ہے، جیسے قاضی کو فیصلہ کرنے کے لئے، گواہی دینے کے لئے، نکاح کا پیغام دینے کے لئے، اِسی طرح ڈاکٹر کا مریضہ کو ضرورت کی حد تک علاج کے لئے دیکھنا وغیرہ۔

آپ کے شوہر اگر آپ کو مکمل پردے یعنی چہرے کو باپردہ رکھنے کا کہتے ہیں، تو آپ کو خوشدلی سے اُسے قبول کرنا چاہئے، اس میں خیر ہے۔ آپ جب یہ سوچ کر پردہ کریں گی کہ

یہ میرا دینی فریضہ ہے تو اس پر آپ کو اجر ملے گا اور آپ کی گھٹن دور ہو جائے گی اور اگر آپ دل سے اسے قبول نہیں کرتیں اور شوہر کے اصرار پر مجبوراً آپ کو پردہ کرنا پڑ رہا ہے، تو پھر آپ اجر سے محروم رہیں گی اور گھٹن بھی محسوس ہوگی۔

گداگری کی لعنت

سوال:

موجودہ دور میں گداگری کی شرح میں اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ یہ جاننا دشوار ہے کہ کون مستحق ہے اور کون پیشہ ور؟، ایسے حالات میں ایک عام انسان کس طرح اندازہ کرے اور ہر جگہ موجود اِن گداگروں کو صدقہ وخیرات یا اِن کے سوال پر انہیں دینا چاہئے یا نہیں؟، (محمد اعیان، نارتھ کراچی)۔

جواب:

صدقہ وخیرات کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں، جو اللہ کی راہ میں وقف ہیں، معاشی تگ ودَو کی فرصت نہیں، شدید حاجت مند ہونے کے باوجود خودداری اور عزتِ نفس کے سبب لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(۱) لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ۔

ترجمہ: "(صدقہ وخیرات کے مستحق) ایسے نادار لوگ ہیں جو خود کو اللہ کی راہ میں (دینی کاموں کے لئے) وقف کئے ہوئے ہیں، جو زمین میں چل پھر کر (روزی کمانے کی) مہلت نہیں پاتے، ناواقف (حال) شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے اُنہیں غنی سمجھتا ہے۔ (اے مخاطب!) تم اُن (کی حقیقتِ حال کو اُن) کی صورت سے پہچان لو گے، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے، (البقرہ:273)"۔

(۲) فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: ''پس وہ دشوار گھاٹی سے نہیں گزرا اور آپ کیا سمجھے وہ دشوار گھاٹی کیا ہے؟، (قرض یا غلامی سے) گردن چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا، ایسے یتیم کو جو رشتہ دار بھی ہو اور ایسے مسکین کو جو خاک آلود ہو، (البلد: 11 تا 16)''۔

ہمارے معاشرے میں سوال کرنے والے لوگوں کی اکثریت پیشہ ور بھکاریوں کی ہے، ان کو خیرات وغیرہ دینا، اِن کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ بغیر حاجتِ شدیدہ کے سوال کرنا شرعاً حرام ہے۔ احادیث مبارکہ میں اِس کی شدید الفاظ میں مذمت اور وعید بیان فرمائی گئی ہے:

(۱) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ بِهٰذَا الطَّوَّافِ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ، فَتَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ، وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ، قَالُوْا: فَمَا الْمِسْكِيْنُ؟، يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ: اَلَّذِيْ لَايَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ، وَلَا يُفْطَنُ لَهُ، فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ، وَلَايَسْأَلُ النَّاسَ شَيْئًا۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (درحقیقت) مسکین وہ نہیں ہے، جو لوگوں میں گھومتا رہتا ہے اور ایک دو لقمہ، ایک دو کھجوریں لے کر چلا جاتا ہے (یا آج کل پانچ دس روپے ہاتھ میں تھما دیئے جاتے ہیں)۔ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! پھر مسکین کون ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اس کی ضروریات سے اس کو مستغنی کردے اور نہ اس (ظاہری حال سے اُس کی تنگ دستی) کا پتا چلے تاکہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ وہ (اپنی عزتِ نفس کی وجہ سے) لوگوں سے سوال کرتا پھرتا ہو (کہ کچھ گزر اوقات ہو جائے)''۔ (صحیح مسلم: 2391)

(۲) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا، فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ لِيَسْتَكْثِرْ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لئے لوگوں سے سوال کرتا ہے، وہ (آگ کے) انگاروں کا سوال کرتا ہے، خواہ سوال کم کرے یا زیادہ، (صحیح مسلم: 2397)''۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ، حَتّٰى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِي وَجْهِهٖ مُزْعَةُ لَحْمٍ۔

ترجمہ: ''آدمی ہمیشہ لوگوں سے مانگتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب قیامت کے دِن وہ (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) حاضر ہوگا، تو اس کے چہرے پر گوشت کا (ایک) ٹکڑا (بھی) نہیں ہوگا (یعنی وہ وجاہت ووقار سے محروم ہوگا)، (صحیح بخاری:1474، صحیح مسلم:2396)''۔

(۴) عَنْ قَبِيصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ الْهِلَالِيِّ قَالَ: تَحَمَّلْتُ حَمَالَةً، فَأَتَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَسْأَلُهُ فِيهَا فَقَالَ: أَقِمْ حَتّٰى تَأْتِيَنَا الصَّدَقَةُ، فَنَأْمُرَ لَكَ بِهَا، قَالَ: ثُمَّ قَالَ: يَا قَبِيصَةُ إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ إِلَّا لِأَحَدِ ثَلَاثَةٍ: رَجُلٌ تَحَمَّلَ حَمَالَةً فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ، حَتّٰى يُصِيبَهَا ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيبَ قِوَامًا مِنْ عَيْشٍ - أَوْ قَالَ سِدَادًا مِنْ عَيْشٍ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ حَتّٰى يَقُومَ ثَلَاثَةٌ مِنْ ذَوِي الْحِجَا مِنْ قَوْمِهٖ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ، حَتّٰى يُصِيبَ قِوَامًا مِنْ عَيْشٍ - أَوْ قَالَ سِدَادًا مِنْ عَيْشٍ فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ، يَا قَبِيصَةُ! سُحْتًا يَأْكُلُهَا صَاحِبُهَا سُحْتًا۔

ترجمہ: ''حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں ایک بڑی رقم کا مقروض ہوگیا تھا، میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ آپ سے اس کے متعلق سوال کروں، آپ نے فرمایا: (اس وقت تک ہمارے پاس) ٹھہرو جب تک صدقہ کا مال آجائے، ہم اُس میں سے تمہیں دینے کا حکم کریں گے، پھر فرمایا: اے قبیصہ! تین اشخاص کے سوا کسی کے لئے سوال کرنا جائز نہیں ہے، ایک وہ شخص جو مقروض ہو اس کے لئے اتنی مقدار کا سوال جائز ہے جس سے اس کا قرض ادا ہوجائے، اس کے بعد وہ سوال سے رُک جائے، دوسرا وہ شخص جس کے مال کو کوئی آفت ناگہانی پہنچی ہو جس سے اس کا مال تباہ ہو گیا ہو، اس کے لئے اتنا سوال کرنا جائز ہے جس سے اس کا گزارہ ہوجائے، تیسرا وہ شخص جو فاقہ زدہ ہو اور اس کے قبیلے کے تین عقلمند آدمی اس بات پر گواہی دیں کہ واقعی یہ فاقہ زدہ

ہے، تو اس کے لئے بھی اتنی مقدار کا سوال کرنا جائز ہے جس سے اس کا گزارہ ہو جائے۔
اے قبیصہ! ان تین شخصوں کے علاوہ سوال کرنا حرام ہے اور جو (ان کے علاوہ کسی اور صورت میں) سوال کر کے کھاتا ہے، وہ حرام کھاتا ہے، (صحیح مسلم:2402)''۔

(۵) حُبشی بن جُنادہ سَلولی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ الْمَسْاَلَةَ لَا تَحِلُّ لِغَنِيٍّ وَّلَا لِذِیْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ، اِلَّا لِذِیْ فَقْرٍ مُّدْقِعٍ، اَوْ غُرْمٍ مُّفْظِعٍ، وَمَنْ سَاَلَ النَّاسَ لِيُثْرِيَ بِهٖ مَالَهٗ كَانَ خُمُوْشًا فِيْ وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَرَضْفًا يَّاْكُلُهٗ مِنْ جَهَنَّمَ، وَمَنْ شَاءَ فَلْيُقِلَّ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْثِرْ۔

ترجمہ: ''نہ غنی کے لئے سوال کرنا جائز اور نہ تندرست آدمی ہی کے لئے، سوال کرنا صرف اُس کے لئے جائز ہے جس کو فقر ہلاک کر رہا ہو یا جو قرض کے بوجھ سے گھبرا رہا ہو۔ جس نے اپنے مال میں اضافے کے لئے سوال کیا، تو قیامت کے دِن اُس کے چہرے پر خراشیں ہوں گی اور وہ جہنم کے پتھر کھا رہا ہوگا، پس جو چاہے (اس عذاب کو) کم کرے اور جو چاہے زیادہ کرے، (سُنن ترمذی:653)''۔

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے پاس اتنی رقم نہ ہو جس سے وہ ایک دن کی خوراک حاصل کر سکے یا اس کے گھر میں اتنا اثاثہ نہ ہو، جس کو فروخت کر کے وہ ایک دن کی خوراک حاصل کر سکے اور اس پر ایک دن کا فاقہ گزر جائے، اس کے لئے اتنی رقم کا سوال کرنا جائز ہے، جس سے وہ ایک دن کی خوراک حاصل کر سکے یا اس کے پاس ستر ڈھانپنے کے لئے کپڑا نہ ہو تو وہ اپنی ستر پوشی کے لئے رقم کا سوال کر سکتا ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: (وَلَا) يَحِلُّ اَنْ (يَّسْاَلَ) شَيْئًا مِّنَ الْقُوْتِ (مَنْ لَّهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ) بِالْفِعْلِ اَوْ بِالْقُوَّةِ كَالصَّحِيْحِ الْمُكْتَسِبِ، وَيَاْثَمُ مُعْطِيْهِ اِنْ عَلِمَ بِحَالِهٖ لِاِعَانَتِهٖ عَلَى الْمُحَرَّمِ (وَلَوْ سَاَلَ لِلْكِسْوَةِ) اَوْ لِاشْتِغَالِهٖ عَنِ الْكَسْبِ بِالْجِهَادِ اَوْ طَلَبِ الْعِلْمِ (جَازَ) لَوْ مُحْتَاجًا۔

ترجمہ: ''اور ایسے شخص کے لئے سوال کرنا جائز نہیں ہے، جس کے پاس ایک دِن کی خوراک

ہو، خواہ وہ خوراک بالفعل موجود ہو یا اُس شخص میں کسب (کمانے) کی صلاحیت ہو، بایں طور کہ وہ تندرست اور کمانے والا ہو۔اور اگر خیرات دینے والا اس کے حال کو جاننے کے باوجود شخص اُس کو بھیک دے، تو وہ گنہگار ہوگا، کیونکہ وہ ایک حرام کام میں مدد کر رہا ہے۔اور اگر سائل ضرورت مند ہو اور کپڑوں کا سوال کرے یا جہاد یا طلبِ علم کے لئے خوراک کا سوال کرے اور اِن چیزوں کی اُس کو ضرورت بھی ہو تو، اُس کا سوال کرنا جائز ہے اور اُس کو دینا بھی جائز ہے"۔(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:276)

یہ تمام تفصیلات اور احکام اِس بات کو واضح کرتے ہیں کہ انسان دستِ سوال دراز کرنے سے اجتناب کرے اور بہت شدید حاجت وضرورت کے وقت ہی سوال کرسکتا ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم العالی لکھتے ہیں: "فقیر وہ شخص ہے جس کے پاس اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے صرف ایک دن کی خوراک ہو اور وہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے خرچ کیلئے کمانے پر قادر ہو، اس کے لئے زکوٰۃ لینا اور اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، لیکن اس کے لئے سوال کرنا جائز نہیں ہے اور مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس ایک دن کی خوراک بھی نہ ہو اور وہ کمانے پر قادر نہ ہو، اس کے لئے ایک دِن کی خوراک کی مقدار کا سوال کرنا جائز ہے اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ بغیر ضرورت کے سوال کرنا جائز نہیں ہے"۔

(تبیان القرآن، جلد 11، ص:373)

اس دور میں پیشہ ور گداگری کو کنٹرول کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ دارالکفالت قائم کرکے حقیقی معذوروں اور ناقابلِ کار یا ایسے انتہائی عمر رسیدہ لوگ، جن کی کوئی کفالت کرنے والا نہ ہو، کی کفالت کا انتظام کرے اور پیشہ ور گداگری کو ممنوع قرار دیدے۔

معافی دینے کے لئے ہاتھ جوڑنے یا پاؤں پکڑنے کا مطالبہ کرنا ناجائز ہے

سوال:

ایک صاحب کا طرزِ عمل یہ ہے کہ جب اُن کا کوئی بیٹا، بیٹی، بہو، داماد، سمدھی، سمدھن وغیرہ یا کوئی بھی رشتے دار کوئی غلطی کرے تو وہ اُس کو معاف کرنے کے لئے کہتے

ہیں کہ:''میرے آگے ہاتھ جوڑو اور میرے پاؤں پکڑو''، اِس کے باوجود بھی اُن کی مرضی ہے کہ وہ اُسے معاف کریں یا نہ کریں۔ زبانی معذرت یا معافی قبول نہیں کرتے۔ کیا یہ سب ازروئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟، (شکیلہ بیگم، P.I.B کالونی، کراچی)۔

جواب:

شرعاً عفو اور معافی کا معنیٰ ہے:''کسی قصوروار اور خطاکار کا اپنی خطا کا اعتراف کر کے اُس پر نادم وشرمندہ ہونا اور اس پر غیر مشروط طور پر معافی طلب کرنا''، جبکہ اعتذار اور معذرت کے معنیٰ ہیں: کسی کا اپنی غلطی کا کوئی عذر، جواز یا مجبوری پیش کر کے اپنے لئے رعایت کا طلب گار ہونا۔ جب کوئی خطاکار اپنی غلطی کا اعتراف کرے، اُس پر نادم ہو جائے اور معافی مانگے تو سنّتِ الٰہیہ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ امر یہ ہے کہ اُسے معاف کر دیا جائے۔ مذکور صاحب کا یہ عمل غیر اَخلاقی اور شرعاً ناپسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ خانہ سے حسنِ سلوک کی تعلیم دی اور کمالِ انسانیت کا معیار قرار دیا۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل کے لئے اچھا ہو اور میں تم میں اپنے اہل کیلئے سب سے بہترین ہوں، (سُنن ابن ماجہ: 1977)''۔

شریعتِ مُطہرہ میں عفو ودرگزر کی تعلیم دی گئی ہے۔ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ

ترجمہ:''(اور اہلِ فضل کو چاہئے کہ) وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے، (النور: 22)''۔

فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۚ

ترجمہ:''جو معاف کردے اور اصلاح کرے تو اُس کا اجر اللہ (کے ذمہ کرم) پر ہے، (الشوریٰ: 40)''۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝
ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ مغرور متکبر کو پسند نہیں کرتا، (النساء:36)''۔
احادیثِ مبارکہ میں ہے:
عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ۔
ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا، بندے کے معاف کرنے سے اللہ اُس کی عزت ہی بڑھاتا ہے اور جو شخص بھی اللہ کی رضا کے لئے عاجزی کرتا ہے، اللہ اُس کا درجہ بلند کرتا ہے''۔
(صحیح مسلم:6587)
عَنْ جَرِيْرٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ، يُحْرَمِ الْخَيْرَ
ترجمہ: ''حضرت جریر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص نرمی سے محروم رہا وہ خیر سے محروم رہا، (صحیح مسلم:6493)''۔
حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَسْتَطِيْعُ أَنْ يُنْفِذَهُ دَعَاهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ حَتّٰى يُخَيِّرَهُ فِيْ أَيِّ الْحُوْرِ شَاءَ۔
ترجمہ: ''جو شخص اپنے غضب کے تقاضے کو پورا کرنے پر قادر ہو، اِس کے باوجود وہ اپنے غصے کو ضبط کرلے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کو تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا اور اس کو یہ اختیار دے گا کہ وہ جس بڑی آنکھوں والی حور کو چاہے لے لے، (سُنن ترمذی:2021)''۔
کسی سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ معافی مانگنے کے لئے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے یا اُس کے پاؤں پکڑے، یہ عُجب اور تکبُّر کی علامت ہے اور دوسروں کو اپنے مقابلے میں حقیر جاننا ہے۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ، قَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ

حَسَنَةً، قَالَ: إِنَّ اللهَ تَعَالٰى جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ۔

ترجمہ: ”عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، تو ایک شخص نے عرض کیا: ایک شخص چاہتا ہے کہ اُس کا لباس اچھا ہو اور اُس کے جوتے اچھے ہوں (یعنی کیا یہ بھی تکبر ہے؟)، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے، تکبُّر حق کا انکار اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے، (صحیح مسلم: 265)“۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! اَلرَّجُلُ مِنَّا يَلْقٰى أَخَاهُ أَوْصَدِيقَهُ أَيَنْحَنِيْ لَهُ؟، قَالَ: لَا، قَالَ: أَفَيَلْتَزِمُهُ وَيُقَبِّلُهُ؟، قَالَ: لَا قَالَ: أَفَيَأْخُذُ بِيَدِهٖ وَيُصَافِحُهُ؟، قَالَ: نَعَمْ۔

ترجمہ: ”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا اپنے دوست سے ملے تو کیا اس کے آگے جھکے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، اُس شخص نے عرض کی: کیا اُس سے چمٹ جائے اور اُسے بوسہ دے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں“، اُس نے عرض کیا کیا اُس کا ہاتھ پکڑے اور مصافحہ کرے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں““۔

(سُنن ترمذی: 2728)

اِس حدیث کی رُو سے دوسروں کو اپنے آگے جھکانا اور پاؤں پکڑانا یا پاؤں کا بوسہ لینے کا مطالبہ کرنا منع ہے۔

قرضِ حسن کا مطالبہ

سوال:

کیا قرضِ حسن کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟، (فیصل گھڑیالی، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا

حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: ''کوئی ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے، تو اللہ اُس قرض (کے اجر) کو اس کے لئے بڑھاتا رہے اور اس کے لئے عزت والا اجر ہے، (الحدید:11)''۔ کائنات کی ہر شے کا مالک اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، بندوں کو جو کچھ دیا، سب اُسی کی عطا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مُتعدد مقامات پر اپنی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب فرمائی اور اُس پر بیش بہا اجر بھی بیان فرمایا۔ اُس خرچ کرنے کو مجازاً ''قرض'' سے تعبیر فرمایا یعنی اللہ کے بندوں کو دینا گویا اللہ کو قرض دینا ہے۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں:

(۱) وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ

ترجمہ: ''اور اللہ نے فرمایا: بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی نصرت وتعظیم کرتے رہے اور اللہ کو ''قرضِ حسن'' دیا تو میں ضرور تم سے تمہارے گناہوں کو مٹادوں گا اور میں ضرور تمہیں ایسے باغات میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، (المائدہ:12)''۔

(۲) اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: ''بلاشبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جنہوں نے اللہ کو ''قرضِ حَسَن'' دیا، ان کے لئے ان کی نیکیوں کو دگنا کیا جائے گا اور ان کے لئے عزت کا اجر ہے، (الحدید:18)''۔

(۳) اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ۙ

ترجمہ: ''اگر تم اللہ کو ''قرضِ حَسَن'' دو، تو وہ اسے تمہارے لئے دگنا کردے گا اور تمہیں بخش

دے گا اور اللہ نہایت قدر دان بہت علم والا ہے، (التغابن: 17)"۔

(۴) وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ط

ترجمہ "اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو "قرضِ حسن" دو، (المزمل: 20)"۔

امام المفسرین امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: "قرض حسن" سے مراد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل کرنے کے لئے اس کی اطاعت کے کاموں میں مال خرچ کرو، وہ دگنا اجر عطا فرمائے گا، کیونکہ وہ بڑا قدر دان ہے، اپنی ذات سے قربت حاصل کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے، وہ بڑے حلم والا (بردبار) ہے، سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا، وہ بخشنے والا ہے، تمہیں بخش دے گا، بعض اہلِ علم کے نزدیک "قرضِ حسن" اللہ کی راہ میں حلال اور طیب مال خرچ کرنا ہے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد خوش دلی سے خرچ کرنا ہے، درحقیقت انسان کے پاس مال وجان کی صورت میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی کا ہے، اسی کا دیا ہوا ہے، وہ جب چاہے سلب فرمالے، اس کے باوجود وہ بندوں سے یہ کہے کہ مجھے قرض دو، تو یہ "انفاق فی سبیل اللہ" پر برانگیختہ کرنے کے لئے ایک اثر انگیز اور لطف وکرم سے معمور پیرایۂ بیان ہے، (تفسیر کبیر، جلد 1، ص: 557)"۔

بندوں کو قرضِ حسن دینے سے مراد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو محض رضاءِ الٰہی کے لئے، کسی خوف، طمع اور صلے کی تمنا کے بغیر اپنے مال میں سے دے دینا، اور اگر وہ مقروض ادائیگی پر قادر نہ ہو تو اسے معاف کر دینا یا کم از کم مہلت دے دینا۔

احادیثِ مبارکہ میں اپنے مقروض کو مہلت دینے والے قرض خواہ کے لئے بہت بڑا اجر بیان کیا گیا ہے، اِس سلسلے میں چند احادیثِ مبارکہ پیشِ خدمت ہیں:

(1) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جس شخص نے تنگ دست (مقروض) پر آسانی کی، اللہ تعالیٰ اُس پر دنیا اور آخرت میں آسانی فرمائے گا، (سُنن ابن ماجہ: 2417)''۔

(2) عَنْ بُرَیْدَۃَ الْاَسْلَمِیِّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا کَانَ لَہٗ بِکُلِّ یَوْمٍ صَدَقَۃٌ وَّمَنْ اَنْظَرَہٗ بَعْدَ حِلِّہٖ کَانَ لَہٗ مِثْلُہٗ، فِیْ کُلِّ یَوْمٍ صَدَقَۃٌ۔

ترجمہ: ''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے تنگ دست (مقروض) کو قرض کی ادائیگی میں مہلت دی، تو اُس کو ہر گزرنے والے دن صدقہ کرنے کا اجر ملے گا، اور جس نے قرض کی ادائیگی کا وقت پورا ہونے کے بعد مقروض کو مہلت دی، تو اُس قرض خواہ کو ہر روز قرض کی کل رقم کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا، (سُنن ابن ماجہ: 2418، مسند امام احمد بن حنبل: 22970)''۔

(3) امام احمد بن حنبل نے اپنی سند کے ساتھ یہی حدیث حضرت سلیمان بن بریدہ سے روایت کی ہے، اُس میں اِن الفاظ کا اضافہ ہے:

فَاِذَا حَلَّ الدَّیْنُ فَاَنْظَرَہٗ فَلَہٗ بِکُلِّ یَوْمٍ مِثْلَیْہِ صَدَقَۃٌ۔

ترجمہ: ''جب قرض کی ادائیگی کا مُقرر وقت آجائے اور پھر بھی قرض خواہ مقروض کو مہلت دے تو اُسے ہر دن اُس قرض کی رقم کی دُگنی مقدار کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا''۔

(مسند امام احمد بن حنبل: 23046)

اس سلسلے میں ایک ایمان افروز واقعہ ملاحظہ فرمایئے: امام احمد رضا خان قادری سے ایک صاحب نے دریافت کیا: ''حضور میرے کچھ روپے ایک صاحب پر ہیں، وہ نہیں دیتے''، انہوں نے جواباً فرمایا: اس زمانہ میں قرض دینا اور یہ خیال کرنا کہ وصول ہو جائے گا، ایک مشکل خیال ہے، میرے پندرہ سو روپے لوگوں پر قرض ہیں، جب قرض دیا، یہ خیال کر لیا کہ دے دیا تو خیر، ورنہ طلب نہ کروں گا، جن صاحبوں نے قرض لیا، دینے کا نام نہ لیا، پھر خود ہی فرمایا: جب یوں قرض دیتا ہوں تو ہبہ کیوں نہیں کر دیتا؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا: جب کسی کا دوسرے پر قرض ہو اور اس کی میعاد گزر جائے، تو ہر روز

اسی قدر روپیہ کی خیرات کا ثواب ملتا ہے، جتنا قرض ہے۔ اس ثوابِ عظیم کے لئے میں نے قرض دیئے، ہبہ نہ کئے کہ پندرہ سو روپے روز میں کہاں سے خیرات کرتا؟۔۔۔

(4) عَنْ اَبِی الْیَسَرِ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا، اَوْ وَضَعَ عَنْهُ، اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ، قَالَ قَالَ مُعَاوِیَةُ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے تنگ دست کو مہلت دی یا اُس کو معاف کردیا، اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے سائے میں رکھے گا، فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے کہا: اُس دن اللہ کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا، (مسند امام احمد بن حنبل: 15521)''۔

ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں مقروض کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کے قرض کو معاف کردینا مستحب ہے، خواہ پورا قرض معاف کیا جائے یا اس کا کچھ حصہ معاف کیا جائے، ان احادیث کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی نیک کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے، ہوسکتا ہے اسی کی وجہ سے نجات ہوجائے، اسی طرح کسی گناہ اور برے کام کو بھی معمولی نہیں سمجھنا چاہئے، کیا معلوم اسی پر گرفت ہوجائے۔

تنگ دست مقروض کو مہلت دینے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ

ترجمہ: ''اور اگر (مقروض) تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو اور (قرض معاف کرکے) تمہارا صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے، (البقرہ: 280)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''قرضِ حسن دے کر مانگنے کی ممانعت نہیں، ہاں مانگنے میں بیجا سختی نہ ہو، وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (اگر مقروض تنگدست (اور نادار) ہو تو اُسے آسانی تک مہلت دینی چاہئے) اور اگر مدیون نادار ہے جب تو اسے مہلت دینا فرض ہے یہاں تک کہ اس کا ہاتھ پہنچے اور جو دے سکتا ہے اور بلاوجہ لے تو لعل کرے، وہ ظالم ہے اور اُس پر تشنیع و ملامت جائز۔ قَالَ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَطْلُ الْغَنِیِّ ظُلْمٌ، وَلَیُّ الْوَاجِدِ یُحِلُّ مَالَہٗ وَعِرْضَہٗ،

ترجمہ: ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: مالدار کا (قرض ادا کرنے میں) ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اور پانے والے کا کترانا اور پہلو بچانا اس کے مال اور عزت کو مباح کر دیتا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص:585)

صحیح بخاری میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں: وَیُذْکَرُ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم لَیُّ الْوَاجِدِ یُحِلُّ عُقُوْبَتَہٗ وَعِرْضَہٗ، قَالَ سُفْیَانُ: عِرْضُہٗ یَقُوْلُ: مَطَلْتَنِیْ، وَعُقُوْبَتُہُ الْحَبْسُ۔

ترجمہ: ''اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت ہے کہ جس کے پاس قرض ادا کرنے کی گنجائش ہو، اُس کا تاخیر کرنا اُس کی سزا اور اُس کی عزت کو حلال کر دیتا ہے، عزت کو حلال کرنا یہ ہے کہ قرض خواہ کہے: تم مجھ سے ٹال مٹول کر رہے ہو اور اس کی سزا اس کو قید کرنا ہے، (صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، باب:13، لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالٌ)''۔ حق دار (یعنی قرض خواہ) کو اپنی دی ہوئی قرض کی رقم کے مطالبے میں سخت سست کہنے کا حق حاصل ہے۔ پس اُسے ملامت کیا جاسکتا ہے اور اسے قید کیا جاسکتا ہے اور اُن سب صورتوں میں عزت پامال ہوتی ہے۔

دکان سے چوری کا ذمہ دار کون؟

سوال:

میں پچھلے ڈیڑھ سال سے ایک نجی ادارے میں کیشیر کے طور پر کام کر رہا ہوں، میرے ساتھ ایک اور ملازم بھی یہی ڈیوٹی دیتا ہے، مگر زیادہ ذمہ داری میری ہے۔ جس دراز میں کیش رکھا جاتا ہے، اُس کی تین چابیاں ہیں، ایک میرے پاس، دوسری سیٹھ کے پاس اور تیسری چابی ملازم (سردار خان) کے پاس ہے۔ 16 اکتوبر اتوار کو میں رات ایک بجے تین مختلف جگہوں پر الگ الگ ایک ہی دراز میں =/8,845 روپے، =/139,000 روپے اور تیسری جگہ =/50,270 روپے خود چیک کر کے اُن پر سلپ لگا کر دراز اچھی طرح بند کر کے اور آفس کے تالے چوکیدار سے لگوا کر گھر چلا گیا۔

صبح میری ڈیوٹی ایک بجے شروع ہوتی ہے، میں نے حسبِ معمول دراز اپنی چابی سے کھولی،

اُس میں =/8,845 روپے اپنی جگہ ویسے ہی رکھے تھے، =/139,000 روپے سردار خان نے بینک میں جمع کرادیئے تھے، لیکن =/50,270 روپے اپنی جگہ پر نہیں تھے۔ میں نے فوراً سردار خان کو بلایا اور پوچھا پیسے کہاں ہیں، اُنہوں نے کہا کہ یہ جگہ خالی تھی اور دراز کھلی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ صبح آٹھ بجے آتے ہیں، کسی کو رپورٹ کی؟، بولے: نہیں، میں نے صبح آنے والے اسٹاف سے پوچھ گچھ کی اور کچھ معلوم نہ ہونے پر میں نے سیٹھ کے سامنے خود کو اور سردار خان کو بھی حاضر کردیا۔ اتفاق سے اتوار کے دن سیٹھ کم ہی آتے ہیں اور اُس دن بھی نہیں آئے تھے، لہٰذا معاملہ دو آدمیوں کے درمیان ہے، میں چور ہوں یا دوسرا ملازم چور ہے۔ میں پہلے قسم اٹھانے کو تیار ہوں کہ رات کو پیسے گن کر تالا لگا کر اچھی طرح چیک کرکے آفس بند کرکے گیا تھا، وہ کہتے ہیں: دراز کھلی تھی، =/50,270 روپے بھی نہیں تھے اور دراز تھوڑی باہر نکلی ہوئی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسری رقم کیسے بچی۔ فتویٰ یہ چاہئے کہ قسم دونوں کو اٹھانی پڑے گی یا کسی ایک کو؟۔

(محمد خالد، سندھ ٹرانسپورٹ کمپنی، کورنگی)

جواب:

بظاہر آپ کی حیثیت امین کی سی ہے لہٰذا اگر آپ نے اس کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کی تو آپ پر کوئی ضمان نہیں۔ ہاں اگر حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی کی تو ضمان ہوگا جیسا کہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ایسی ایک صورت لکھتے ہیں: اگر متولی نے کوئی بے احتیاطی نہ کی تو اس پر تاوان نہیں لِاَنَّهٗ كَالْوَصِيِّ اَمِيْنٌ فَالْقَوْلُ قَوْلُهٗ بِيَمِيْنِہٖ۔ (کیونکہ وہ (متولی) وصی کی طرح امین ہے تو قسم کے ساتھ اس کی بات مان لی جائے گی) اور اگر بے احتیاطی کی مثلاً صندوق کھلا چھوڑ دیا غیر محفوظ جگہ رکھا تو اس پر تاوان ہے لِاَنَّ الْاَمِيْنَ بِالتَّعَدِّيْ ضَمِيْنٌ۔ (کیونکہ حد سے تجاوز (لاپرواہی اور بے احتیاطی) کی وجہ سے امین پر ضمان لازم ہوتا ہے)، (فتاویٰ رضویہ، جلد:16، ص:570)"۔

کسی پر حکم ثابت کرنے کے لئے حُجتِ شرعیہ کی ضرورت ہے اور حُجتِ شرعیہ تین ہیں۔

علامہ زین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

لِاَنَّ الْقَاضِیَ لَا یَقْضِیْ اِلَّا بِالْحُجَّۃِ وَھِیَ الْبَیِّنَۃُ أَوِ الْاِقْرَارُ أَوِ النُّکُوْلُ۔

ترجمہ:'' قاضی فقط حجت کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور اس کی تین صورتیں ہیں (۱) گواہ (۲) یا مدّعیٰ علیہ کا اقرار (۳) یا مدّعیٰ علیہ کا قسم کے ساتھ انکار''۔

(الاشباہ والنظائر، ص:215)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: عَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَیْبٍ، عَنْ اَبِیْہِ، عَنْ جَدِّہٖ: اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ فِیْ خُطْبَتِہٖ: ''اَلْبَیِّنَۃُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلَی الْمُدَّعٰی عَلَیْہِ''۔

ترجمہ:'' عمرو بن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبولِ دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی:1339)''۔

حدیث پاک میں ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جس شخص نے جھوٹی قسم کھا کر مال حاصل کیا، تو وہ (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر غضب فرمائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے طور پر یہ آیت نازل فرمائی:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓىٕكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝

ترجمہ:'' بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے عوض تھوڑی قیمت خریدتے ہیں (یعنی دنیوی مفاد اور مالی منفعت کے عوض جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں)، اُن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ ان سے کوئی کلام فرمائے گا اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف نظر کرم فرمائے گا اور نہ اُن کو (گناہوں کے میل سے) پاک فرمائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، (سورۂ آل عمران:77)۔ پھر حضرت اشعث بن قیس آئے اور کہا کہ ابوعبدالرحمٰن نے تم سے کیا حدیث بیان کی ہے؟،

انہوں نے بتایا: اِس اِس طرح حدیث بیان کی ہے، تو انہوں نے کہا: کہ انہوں نے سچ بیان کیا، یہ آیت میرے ہی متعلق نازل ہوئی ہے، میرا ایک شخص کے ساتھ ایک کنویں کے معاملے میں نزاع تھا، تو ہم یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لے کر گئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یا تو تمہارے پاس (اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے) دو گواہ ہوں اور یا وہ شخص (مدعٰی علیہ) قسم کھائے''، میں نے عرض کی: وہ تو جھوٹی قسم کھا لے گا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرے، تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر غضب ناک ہوگا''، تو اللہ تعالیٰ نے (نبی ﷺ کے اس فرمان کی) تصدیق کے طور پر یہ آیت نازل فرمائی، پھر رسول اللہ ﷺ نے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر: 77 تلاوت فرمائی جو اوپر مذکور ہے''۔ (صحیح بخاری: 16-2515)

صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا بیان درست ہے تو آپ نے اپنی ذمہ داری پوری کی، رقم رکھ کر تالا لگا دیا اور چوکیدار سے آفس کا کمرہ بند کرا دیا۔ آپ نے مال کی حفاظت میں کوئی غفلت یا کوتاہی نہیں کی، لہٰذا آپ پر اس مال کا ضمان نہیں ہے۔ اگر آپ کی دیانت یا بیان پر مالک کو شبہ ہے تو وہ آپ کو قسم دے سکتے ہیں، سیٹھ مالک ہے، اُس کے پاس تجوری کی چابی کا ہونا اور آپ کے پاس کیشئر کی حیثیت سے چابی کا ہونا سمجھ میں آتا ہے، لیکن تیسرے شخص (سردار خان) کے پاس چابی کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں! اگر نظم یہ ہو کہ آپ دوسرے ملازم سردار خان کے سامنے رقم گن کر رکھیں اور پھر وہ خود تجوری اور آفس کو مُقفّل کرے تو وہ ذمہ دار قرار پائے گا۔ پھر اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ جب دفتر بند تھا، چابی اس کے پاس ہے تو تجوری کیسے کھل گئی۔ لہٰذا اب اُسے قسم دی جا سکتی ہے اور آئندہ کے لئے مسئولیت اور ذمہ داری کا طریقہ کار واضح طور پر مُتعیّن کرنا ضروری ہے۔ چوکیدار کا دراز کھلا دیکھنا اور کسی ذمے دار کو رپورٹ نہ کرنا یہ معاملے کو مشتبہ بنا دیتا ہے۔

بطور جرمانہ وصول کی گئی رقم کا شرعی حکم

سوال:

ایک آدمی نے تقریباً چھ ہزار روپے چوری کئے، پکڑے جانے پر رقم واپس کر دی، لیکن اہلِ علاقہ نے اُس پر پندرہ ہزار روپے تاوان رکھ دیا، جس کی رقم چوری ہوئی تھی اُس نے یہ تاوان لینے سے انکار کر دیا، تو لوگوں نے وہ رقم مسجد میں دے دی۔ اُس پر یہ جرمانہ لگانا شرعاً کیسا ہے؟۔ اُس رقم کا مسجد میں لگانا کیسا ہے؟۔ (محمد اسلم سعیدی، کراچی)

جواب:

شریعت میں مال پر جرمانہ جائز نہیں، ہاں! کوئی شخص اگر کسی شخص کا مال ضائع کر دے تو اس سے مال کی قیمت لی جاسکتی ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے: اَلْمَالُ بِالْمَالِ یعنی اگر کسی کا مالی نقصان ہو جائے تو وہ اس کے بدلے مال لے سکتا ہے۔ شریعت میں تعزیر بالمال منسوخ ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: مَعْنَی التَّعْزِیْرِ بِاَخْذِ الْمَالِ عَلَی الْقَوْلِ بِهٖ اِمْسَاکُ شَیْئٍ مِّنْ مَّالِهٖ عِنْدَ مُدَّةٍ لِیَنْزَجِرَ ثُمَّ یُعِیْدُهُ الْحَاکِمُ اِلَیْهِ، لَا اَنْ یَّاْخُذَهُ الْحَاکِمُ لِنَفْسِهٖ اَوْ لِبَیْتِ الْمَالِ کَمَا یَتَوَهَّمُهُ الظَّلَمَةُ، اِذْ لَا یَجُوْزُ لِاَحَدٍ الْمُسْلِمِیْنَ اَخْذُ مَالِ اَحَدٍ بِغَیْرِ سَبَبٍ شَرْعِیٍّ۔ وَفِیْ ''شَرْحِ الْاٰثَارِ'': اَلتَّعْزِیْرُ بِالْمَالِ کَانَ فِیْ اِبْتِدَاءِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ نُسِخَ۔

ترجمہ: ''(جن فقہاءِ کرام نے) تعزیر بالمال (یعنی مالی جرمانے کے جواز کی) بات کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کا وہ مال کچھ مدت کے لئے روک لیا جائے تاکہ وہ جرم سے باز آجائے، پھر حاکم وہ مال واپس کر دے گا، یہ معنی نہیں کہ حاکم اس مال کو اپنے لئے یا بیت المال کے لئے وصول کرے جیسا کہ ظالم (حکمرانوں) نے سمجھ رکھا ہے، کیونکہ کسی مسلمان کو شرعی وجہ کے بغیر کسی کا مال لینا جائز نہیں ہے۔ ''شرح الآثار'' میں ہے: تعزیر بالمال ابتداءً اسلام میں جائز تھی پھر منسوخ ہوگئی، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص: 77)''۔ پس جب اُس شخص نے چوری کیا ہوا مال واپس کر دیا، تو اب اہلِ علاقہ کا مالی جرمانہ لینا ناجائز ہے۔ جس کی چوری ہوئی تھی، اُس نے اچھا کیا کہ جرمانے کی رقم نہیں لی۔ ظلم و زیادتی کے ذریعے لئے

ہوئے مال کو مسجد پر خرچ کرنا اور اُس پر اجر کی امید رکھنا حرام ہے۔البتہ وہ شخص خود رضا کارانہ طور پر دے دے تو یہ باعثِ اجر ہے۔اگر شرعی عدالت اور شرعی حدود نافذ ہوں تو مجرم کے اقرار یا گواہوں کے ذریعے اگر جرم شرعی معیار پر ثابت ہو جائے،تو مجرم کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

ترجمہ:''چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے (دائیں) ہاتھ کو کاٹ دو، یہ ان کے کیے ہوئے کی سزا ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک تعزیر ہے اور اللہ بہت غالب نہایت حکمت والا ہے،(المائدہ:38)''۔لیکن یہ ریاست کا کام ہے،کسی برادری، قبیلے،پنچایت،انجمن یا گاؤں اور محلے کے لوگوں کو اس کا اختیار نہیں ہے۔

قتلِ خطا میں قاتل پر کفّارہ واجب ہے

سوال:

میرے بیٹے کے دوست کی شادی تھی اور دولہا کے قریبی عزیز و دوست خوشی میں ہوائی فائرنگ کر رہے تھے،اس دوران اُس کے دوست عدنان کے پستول میں گولی پھنس گئی،جسے نکالنے کے لئے میرے بیٹے کو دی،پھنسی ہوئی گولی اتفاقیہ چل پڑی اور میرے بیٹے کی ہتھیلی میں سوراخ کرتے ہوئے مووی بنانے والے محمد اویس کو لگ گئی اور وہ ہسپتال میں فوت ہو گیا۔میرے مالی حالات اچھے نہیں ہیں،18 سال سے کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔میرے حالات کے پیشِ نظر سنتِ رسول ﷺ کے مطابق حقِ مصالحت کیا دیا جاسکتا ہے؟،(دین محمد،حسرت موہانی کالونی،کراچی)

جواب:

تقریبات کے مواقع پر فائرنگ اور آتش بازی کی ممانعت کا قانون موجود ہے اور آئے دن حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔قانون کی پابندی ہر شخص پر ضروری ہے۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے،وہ ''قائم مقام خطا'' کی ہے،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَأَمَّا مَاجَرٰی مَجْرَی الْخَطَأِ فَهُوَمِثْلُ النَّائِمِ يَنْقَلِبُ عَلٰى رَجُلٍ فَيَقْتُلُهُ فَلَيْسَ هٰذَا بِعَمْدٍ وَّلَاخَطَأٍكَذَا فِي ''الْكَافِيْ''، وَكَمَنْ سَقَطَ مِنْ سَطْحٍ عَلٰى اِنْسَانٍ فَقَتَلَهُ أَوْ سَقَطَ مِنْ يَدِهٖ لَبِنَةٌ أَوْخَشَبَةٌ وَأَصَابَتْ اِنْسَانًا وَّقَتَلَتْهُ أَوْكَانَ عَلٰى دَابَّةٍ فَوَطِئَتْ دَابَّتُهٗ اِنْسَانًا هٰكَذَا فِي ''الْمُحِيْط''۔ وَحُكْمُهٗ حُكْمُ الْخَطَأِ مِنْ سُقُوْطِ الْقِصَاصِ وَوُجُوْبِ الدِّيَةِ وَالْكَفَّارَةِ وَحِرْمَانِ الْمِيْرَاثِ كَذَا فِي ''الْجَوْهَرَةِ النَّيِّرَةِ''۔

ترجمہ:''اور ''قتلِ قائم مقام خطا'' کی مثال یہ ہے کہ کسی سونے والے شخص پر کوئی شخص گرا، جس سے وہ (سونے والا شخص) ہلاک ہوگیا پس نہ یہ قتلِ عمد (دانستہ) ہے اور نہ ہی قتلِ خطا،''کافی'' میں بھی اسی طرح ہے۔ ایک مثال یوں ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی انسان پر گرا اور اس طرح اسے ہلاک کردیا یا ایک انسان کے ہاتھ سے (کوئی بھاری چیز) اینٹ یا لکڑی گر گئی اور وہ دوسرے شخص پر آلگی اور اس کی ہلاکت واقع ہوگئی، یا کوئی شخص سواری پر تھا اور اس کے جانور نے کسی شخص کو روند ڈالا ''محیط'' میں بھی اسی طرح سے ہے۔ اور اس کا حکم بھی قتلِ خطا کے حکم کی طرح ہے کہ قصاص ساقط ہوجائے گا اور دِیَت اور کفارہ واجب ہوگا اور قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا،''الجوہرۃ النیرۃ'' میں اسی طرح مذکور ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6،ص:3)

قتل خطا میں قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دیت لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ

ترجمہ:''اور کسی مؤمن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مؤمن کو قتل کرے سوائے اس کے کہ (اس سے) خطاءً (یہ فعل سرزد ہوجائے)، (تو اس کا کفارہ) ایک مؤمن غلام کا آزاد کرنا ہے، (اور مزید یہ کہ) اس کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہے، سوائے اس کے کہ وہ معاف کردیں۔

آیت کے اختتام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ۔

ترجمہ: ''یعنی جو شخص (کفارے کے طور پر آزاد کرنے کے لئے غلام) نہ پائے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قبولیتِ توبہ کے لئے دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے، (النساء:92)''۔

نابالغ بچوں کو دی ہوئی اشیاء کا شرعی حکم

سوال:

کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ جو چیزیں بچے کی ملکیت میں ہوں، اُن چیزوں کا استعمال دوسروں کے لئے جائز نہیں، جبکہ ہمارے ہاں ایک بچے کی چیزیں مثلاً جھولا، کپڑے اور کھلونے وغیرہ دوسرے چھوٹے بچوں کو دے دیئے جاتے ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ ولی/سرپرست نابالغ بچے کے لئے لباس، کھلونے، اسٹیشنری، ٹافیاں وغیرہ خریدتا یا دیتا ہے یا اسی طرح کوئی رشتے دار ایسی اشیاء دیتا ہے اور بچے خود بھی استعمال کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی دیتے ہیں، ہمارے عرف میں یہ ہبہ ہے یا عاریت یا اباحت؟، (محمد شاہد عطاری، رکن مجلسِ شوریٰ، دعوتِ اسلامی)۔

(عالمی مرکز فیضانِ مدینہ، پرانی سبزی منڈی، کراچی)

جواب:

والدین اپنے نابالغ بچوں کو جو اشیاء (خواہ کھانے پینے کی ہوں، لباس کی قسم سے ہوں یا کھلونے وغیرہ ہوں) بطورِ اباحت دیتے ہیں، یعنی وہ کوئی چیز جتنی چاہیں کھالیں یا جتنا چاہیں استعمال کرلیں اور جو چیز پس انداز ہو، وہ بچ رہتی ہے، اور نان نفقہ فراہم کرنا شریعت کی رُو سے والدین کا فریضہ بھی ہے، اس میں ہمارے عرف وعادت میں ملکیت کا کوئی تصور کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بچے ان چیزوں کو ضائع کردیتے ہیں، بعض اوقات وہ دوسرے بہن بھائیوں، چچازاد، پھوپھی زاد یا دیگر عزیزوں اور رشتہ داروں کے بچوں کو دے دیتے ہیں، بعض اوقات ملازمین کے بچوں کو وہ چیزیں دیدی جاتی

ہیں اوراسی طرح بڑے بہن بھائیوں کی استعمال شدہ اشیاء چھوٹے بہن بھائیوں کے استعمال میں آتی رہتی ہیں، ان سب میں ہبہ، عاریت یا ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک جھولا، کپڑے، کھلونے، اسٹیشنری اور ٹافیاں اِسی قبیل سے ہیں، خواہ خود والدین اپنے بچوں کو دیں یا قریبی رشتے دار اور احباب دیں۔ یہ عادت ظاہرہ ہے اور اس سے شاید ہی کوئی محفوظ ہو، سوائے اس کے کہ جو انتہائی درجے کا اَورَع و اَتقیٰ ہو، شیخ الاسلام علامہ ابوبکر محمد بن احمد سرخسی لکھتے ہیں: وَفِی النَّزْعِ عَنِ الْعَادَةِ الظَّاهِرَةِ نَوْعُ حَرَجٍ، وَهٰذَا بَعِيْدٌ، لِأَنَّ التَّعَامُلَ بِخِلَافِ النَّصِّ لَايُعْتَبَرُ ترجمہ: ''اور (لوگوں کو) اُن (کے معمول یا) عادتِ جاریہ سے نکالنے میں ایک طرح کا حرج ہے اور یہ بعید ہے، کیونکہ نص کے خلاف تعامل (Practice) معتبر نہیں ہے، (المبسوط، جلد 10، ص:152)''۔ لیکن ہمارے زیرِ بحث مسئلے میں کوئی نَص شرعی نہیں ہے۔ ہاں! بعض کتب فقہ میں اس کے بارے میں کچھ جزئیات ملتی ہیں، جو بظاہر ہمارے مذکورہ بالا موقف کے خلاف نظر آتی ہیں، مثلاً صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''نابالغ کو مٹھائی اور پھل وغیرہ کھانے کی چیزیں ہبہ کی جائیں، اُن میں سے والدین کھاسکتے ہیں، یہ اُس وقت ہے کہ قرینہ سے معلوم ہو کہ خاص اِس بچہ کو ہی دینا نہیں، بلکہ والدین کو دینا مقصود ہے مگر اُن کی عزت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ چیز حقیر معلوم ہوتی ہے اُن کو دیتے ہوئے لحاظ معلوم ہوتا ہے، بچہ کا نام لے دیتے ہیں اور اگر قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ خاص اسی بچہ کو دینا مقصود ہے تو والدین نہیں کھاسکتے مثلاً کوئی چیز کھارہا ہے کسی کا بچہ وہاں پہنچ گیا، ذرا سی اُٹھا کر بچہ کو دیدی یہاں معلوم ہورہا ہے کہ والدین کو دینا مقصود نہیں ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو چیز کھانے کی نہ ہو، وہ نابالغ کو دی جائے، تو والدین کو بغیر حاجت استعمال درست نہیں''۔

(بہارِ شریعت، ہبہ کا بیان، جلد سوم، ص:79-78)

حضرت صدر الشریعہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر فقہاءِ کرام نے اس حوالے سے ایسی جزئیات اپنی کتب میں نقل فرمائی ہیں، جو اُن کے اپنے عرف وعادت پر مبنی تھیں، کسی نصِ شرعی

(قرآن یا حدیث) پر مبنی نہیں تھیں، لہٰذا جب عرف تبدیل ہوگیا، تو اعتبار اُس نئے عرف کا ہوگا اور اب ان جزئیات پر فتویٰ دینا جائز نہیں ہوگا۔

فقہاء فرماتے ہیں: ''مَنْ لَّمْ یَعْرِفْ عُرْفَ زَمَانِہٖ فَھُوَجَاھِلٌ'' یعنی جو اپنے زمانے کے لوگوں کے عرف ورواج کو نہ جانتا ہو، وہ جاہل ہے۔ اس کا فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ نقل فرماتے ہیں: وَفِی الْقُنْیَۃِ لَیْسَ لِلْمُفْتِیْ وَلَا لِلْقَاضِیْ أَنْ یَّحْکُمَا عَلٰی ظَاھِرِ الْمَذْھَبِ وَیَتْرُکَا الْعُرْفَ، ترجمہ: ''اور ''قُنیہ'' میں ہے: مفتی اور قاضی کے لئے جائز نہیں کہ عرف کو چھوڑ کر ظاہر مذہب پر فیصلہ کریں''۔

(شرح عقود رسم المفتی، ص:46)

اکثر معاملات میں مدار عرف پر ہے اور عرف نصِ شرع کی طرح حاکم ہوتا ہے۔ دوست رشتہ دار بچوں کو جو نقد رقم عیدی کے طور پر یا کسی خوشی کے موقع پر یا ملاقات کے وقت دیتے ہیں، ہمارے عرف میں وہ بچوں کے ماں باپ کے ساتھ لین دین کا معاملہ کرتے ہیں، اسی لئے یہ چیزیں بچے کو والدین کی عدم موجودگی میں نہیں دی جاتیں، والدین کو دکھا کر یا باور کرا کے دی جاتی ہیں یعنی اگر یہ ہبہ بھی ہو تو اصل موہوب لہٗ بچے کے والدین ہوتے ہیں، بچے صرف واسطہ اور سبب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ والدین مناسب مواقع پر ان ہدایا کا اپنی اپنی توفیق کے مطابق بدل دیتے ہیں۔ شادی کی تقریبات میں اِسے ''نیوتا'' کہتے ہیں۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''شادی وغیرہ تمام تقریبات میں طرح طرح کی چیزیں بھیجی جاتی ہیں، اس کے متعلق ہندوستان میں مختلف قسم کی رسمیں ہیں، ہر شہر میں ہر قوم میں جدا جدا رسوم ہیں، ان کے متعلق ہدیہ اور ہبہ کا حکم ہے یا قرض کا۔ عموماً رواج سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دینے والے یہ چیزیں بطور قرض دیتے ہیں، اسی وجہ سے شادیوں میں اور ہر تقریب میں جب روپے دیئے جاتے ہیں، تو ہر ایک شخص کا نام اور رقم تحریر کر لیتے ہیں، جب اُس دینے والے کے یہاں تقریب ہوتی ہے تو یہ شخص جس کے یہاں دیا جا چکا ہے، فہرست نکالتا ہے اور اُتنے روپے ضرور دیتا ہے، جو اُس نے

دیئے تھے اور اس کے خلاف کرنے میں سخت بدنامی ہوتی ہے اور موقع پا کر کہتے بھی ہیں کہ نیوتے کا روپیہ نہیں دیا اگر یہ قرض نہ سمجھتے ہوتے تو ایسا عرف نہ ہوتا جو عموماً ہندوستان میں ہے، (بہارِ شریعت، ہبہ کا بیان، جلد سوم، ص:79-78)''۔

صدر الشریعہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا موقف یہی معلوم ہوتا ہے کہ سماجی تقریبات (ختنہ، عقیقہ، شادی وغیرہ) میں بالعموم لین دین غیر علانیہ قرض ہی ہوتا ہے اور دلیل یہ ہے کہ اُس کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے، خواہ یہ تحریر کی صورت میں یا ذہن میں محفوظ ہو۔ اور جس کی طرف سے مُتبادل موقع پر بدل نہ آئے، تو اُسے اگر ظاہر نہ بھی کیا جائے، تب بھی کم از کم دل میں یا اپنے حلقے میں ملامت ضرور کرتے ہیں۔ تو جو چیزیں بچے کو یا بچے کے نام سے دی جا رہی ہیں، وہ والدین ہی پر قرض ہوتا ہے۔ بعض لوگ بااثر لوگوں کو براہِ راست یا اُن کے بچوں کو ہدایا دیتے ہیں، تو اُس کا صلہ بھی بچوں کے والدین سے کسی نہ کسی حمایت کی صورت میں معہود فی الذہن (Understood) ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں بھی بچے کے والدین کی ملک ہوتی ہیں اور وہ اِن کا بدل بھی کسی نہ کسی صورت میں دیتے ہیں اور اُن میں تصرُّف بھی کرتے ہیں۔

بعض اشیاء قابلِ تلف (Perishable) ہوتی ہیں اور وقت گزرنے کے بعد بعض ناقابلِ استعمال (Out Dated) ہو جاتی ہیں۔ اب اگر ایسی تمام اشیاء کو بچے کی ملک یا بچے کے نام ہبہ (Gifted) قرار دیا جائے اور اُن پر تصرُّف کا کسی کو اختیار نہ رہے، تو اُن کی حفاظت ایک مسئلہ بن جائے گی، جن کے ہاں پانچ دس بچے ہیں، اُن کو تو باقاعدہ ایک کمرہ ایسے گودام کے لئے بچوں کے بالغ ہونے تک مختص کرنا پڑے گا، کیونکہ آج کل کھلونے اور بعض دیگر اشیاء کافی جگہ گھیرتی ہیں۔

پس لوگوں کو عُسر اور مَشقت میں ڈالنا اور حرج میں مبتلا کرنا حکمتِ شریعت کے منافی ہے اور اس پر معاشرے میں عام طور پر عمل تو ویسے بھی نہیں ہوتا، تو لوگوں کو حکم شرعی کی حکم عدولی کا مرتکب قرار دینا پڑے گا۔ دین و شریعت کی روح یُسر اور دفعِ حرج ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد

فرماتا ہے: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ترجمہ: ''اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا، (البقرہ:185)''۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ترجمہ: ''اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی، (الحج:78)''۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: (۱) عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آسانی پیدا کرو اور مشکل نہ پیدا کرو اور بشارت دو اور لوگوں کو مُتنفر نہ کرو، (صحیح بخاری:69)''۔

(۲) أَخْبَرَنِي أَبُوْ مَسْعُوْدٍ: أَنَّ رَجُلًا قَالَ: وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنِّيْ لَأَتَأَخَّرُ عَنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ مِنْ أَجْلِ فُلَانٍ، مِمَّا يُطِيْلُ بِنَا، فَمَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ فِيْ مَوْعِظَةٍ أَشَدَّ غَضَبًا مِنْهُ يَوْمَئِذٍ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ، فَأَيُّكُمْ مَا صَلّٰى بِالنَّاسِ، فَلْيَتَجَوَّزْ، فَإِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَالْكَبِيْرَ وَذَا الْحَاجَةِ۔

ترجمہ: ''ابومسعود بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میں فلاں شخص کی وجہ سے جو (امامت کرتا ہے اور) طویل نماز پڑھاتا ہے، فجر کی نماز سے رہ جاتا ہوں، تو میں نے اس دن کی طرح رسول اللہ ﷺ کو وعظ کے دوران اتنی شدید غضب کی کیفیت میں نہیں دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو لوگوں کو (دین اور عبادت سے) مُتنفر کرتے ہیں، سو تم میں سے جو شخص نماز میں لوگوں کی امامت کرے، تو وہ نماز میں اختصار سے کام لے، کیونکہ مقتدیوں میں کمزور اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، جنہیں کوئی حاجت درپیش ہوتی ہے''۔
(صحیح بخاری:702)

(۳) عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ''إِنِّيْ لَأَقُوْمُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيْدُ أَنْ أُطَوِّلَ فِيْهَا، فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ، فَأَتَجَوَّزُ فِيْ صَلَاتِيْ، كَرَاهِيَةَ أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمِّهِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں (بعض اوقات) نماز (باجماعت) کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور طویل نماز پڑھنا چاہتا ہوں کہ اچانک میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے اپنی نماز مختصر کردیتا ہوں کہ کہیں (بچے کا رونا) اُس کی ماں کے لئے تکلیف کا باعث نہ ہو، (صحیح بخاری: 707)''۔ مقامِ غور ہے کہ نماز تو رکنِ اسلام ہے اور نماز میں طویل قیام، رکوع وسجود اللہ عزّوجل اور اس کے رسول مکرم ﷺ کو پسندیدہ ہیں، لیکن دفعِ حرج کے لئے آپ ﷺ خود بھی اختصار فرماتے اور امام کو بھی تنبیہ کے انداز میں یہی ہدایت فرمائی۔

کتبہ:۔ منیب الرحمٰن　　　　الجواب صحیح

مفتی منیب الرحمٰن　　　　الجواب صحیح غلام رسول سعیدی غفرلہ

رئیس دارالافتاء　　　　علامہ غلام رسول سعیدی

دارالعلوم نعیمیہ، کراچی　　　　شیخ الحدیث والتفسیر دارالعلوم نعیمیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے حضرت قبلہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب کی اِس تحقیق سے اتفاق ہے کہ والدین کی طرف سے بچوں کو دی جانے والی اشیاء جیسے کپڑے، کھلونے، اسٹیشنری کا سامان وغیرہ اباحت کے طور پر دی جاتی ہیں۔ اِن اشیاء کے مالک بچے نہیں بلکہ اُن کے والدین ہوتے ہیں، جنہوں نے اُنہیں وہ اشیاء استعمال کے لئے دی ہوتی ہیں۔ البتہ ایسی اشیاء جن کے بارے میں یقین سے معلوم ہو کہ وہ بچے کو ہی دی گئی ہیں، بلاشبہ اُن کا مالک بچہ ہے۔ والدین کو بلاضرورت شرعیہ اُن میں تصرُّف جائز نہیں، جیسے اسکول کی طرف سے بچوں کو دیئے جانے والے بعض انعامات۔ ایسے ہی تقریر، نعت، قرأت وغیرہ کے مقابلوں میں ملنے والے تحائف۔ دورانِ نعت بچے پر نچھاور کئے جانے والے نوٹ اور انہیں ملنے والے لفافے، یونہی والدین جن تحفوں کے بارے میں صراحت کردیں کہ ہم نے آپ کو ان کا مالک کردیا ہے۔ بچے اُن

اشیاء کے مالک ہیں، اُنہیں اباحت پر محمول نہیں کیا جاسکتا، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مفتی محمد ابراہیم القادری الرضوی غفرلہ

الجواب صحیح

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

رئیس دار الافتاء جامعہ غوثیہ رضویہ، سکھر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے حضرت علامہ مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب زید مجدہم کی اِس اِضافی رائے سے اتفاق ہے، اگرچہ یہ نادر ہے اور اس میں کوئی عُسر اور حرج بھی نہیں ہے۔ نعت خوانی، تقریری مقابلے، کھیلوں کے مقابلے اور اس طرح کے مواقع یا مسابقات میں حصہ لینے والے بچوں کا فیصد یا تناسب بہت معمولی ہے، اسی طرح انعامات میں ملنے والے کپ وغیرہ کا بطور یادگار محفوظ رکھنے کا رواج ہمارے معاشرے میں موجود ہے ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ باپ بیٹے / بیٹی یعنی اپنے چھوٹے بچوں کو عیدی وغیرہ یا کسی کامیابی کی خوشی میں کوئی پیسے دے تو یہ تصریح کرتا ہو کہ اب تم اس کے مالک ہو۔ ہاں! نابالغ اولاد کے نام پر بعض لوگ بنکوں میں اکاؤنٹ کھولتے ہیں یا ان کے نام کوئی انشورنس یا تکافل پالیسی (یہاں انشورنس کا جواز یا عدمِ جواز زیرِ بحث نہیں ہے) لے لیتے ہیں، تو وہ عام طور پر ان کے بالغ ہونے پر اختتام کو پہنچتی (Mature) ہے۔ پس نوادر کو اپنے مورد تک محدود رکھا جائے گا اور ان کی بنا پر کوئی قاعدہ کُلیہ یا ضابطہ عامہ نہیں بنایا جاسکتا ہے، کیونکہ فقہ کا مُسلّمہ اصول ہے کہ: ''مَا أُبِيحَ لِلضَّرُورَةِ يُقَدَّرُ بِقَدْرِهَا'' یا ''اَلضَّرُورَاتُ تُقَدَّرُ بِقَدْرِهَا''۔

ترجمہ: ''جو چیز ضرورت کی بنا پر مباح قرار دی گئی ہو، اسے اسی حد تک محدود رکھا جائے گا'' یا ''ضرورت کی بنا پر مباح قرار دیا گیا امر اپنے دائرے میں محدود رہے گا''۔ یعنی اسے اباحتِ کلی

یا اباحتِ عامّہ کے طور پر نہیں لیا جائے گا تاکہ دین میں یسر اور دفع حرج کی گنجائش تو رہے، مگر تعیش و ابتذال نہ ہو اور دین کو خواہشاتِ نفس کے تابع نہ بنا دیا جائے، ھٰذا ما عندی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مفتی منیب الرحمٰن

منیب الرحمٰن

رئیس دارالافتاء

دارالعلوم نعیمیہ، بلاک 15، فیڈرل بی ایریا، کراچی

تائید وتوثیق وتصویب مفتیانِ عظام

نمبر شمار	اسمائے گرامی	مدرسہ/ دار العلوم/ جامعہ	مہر وتوثیقی دستخط
1	علامہ مفتی محمد رفیق حسنی	مہتمم ومفتی وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم بلاک 15 گلستانِ جوہر کراچی	[illegible]
2	علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی	مہتمم ومفتی جامعہ نضرۃ العلوم 10-B ہرڈ یوس روڈ گارڈن، کراچی	[illegible]
3	علامہ مفتی احمد علی سعیدی	استاذِ حدیث ومفتی دار العلوم نعیمیہ بلاک 15، F.B ایریا، کراچی	احمد علی سعیدی [illegible]
4	علامہ مفتی محمد جان نعیمی	دار العلوم مجددیہ نعیمیہ صاحبداد گوٹھ، ملیر کراچی	[illegible]
5	علامہ مفتی ابوبکر صدیق الشاذلی	دار الافتاء طوبیٰ ملیر کراچی	[illegible]
6	علامہ مفتی محمد وسیم اختر المدنی	دار الافتاء فیضانِ شریعت بہادر آباد، کراچی	[illegible]
7	علامہ مفتی محمد اسماعیل نورانی	مفتی ومن کبار الاساتذہ جامعہ انوار القرآن بلاک 5 گلشن اقبال، کراچی	الجواب حق والحق احق ان یتبع محمد اسماعیل نورانی عفی عنہ ۱۵ محرم الحرام [illegible]

8	صاحبزادہ علامہ سید ارشد سعید کاظمی شاہ	شیخ الحدیث جامعہ انوار العلوم ملتان	
9	علامہ مفتی ابوالخیر سید حسین الدین شاہ	مہتمم جامعہ رضویہ ضیاء العلوم D بلاک سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی	
10	علامہ مفتی محمد صدیق ہزاروی	شیخ الحدیث جامعہ ہجویریہ، لاہور	
11	علامہ مفتی ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر	مہتمم و مفتی رکن الاسلام جامعہ مجددیہ حیدرآباد	
12	علامہ مفتی ہدایت اللہ پسروری	مہتمم جامعہ غوثیہ ہدایت القرآن ملتان	
13	علامہ مفتی محمد ضیاء اللہ	مفتی جامعہ جنیدیہ غفوریہ، پشاور	
14	علامہ مفتی محمد تنویر القادری	مفتی جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ، لاہور	
15	علامہ مفتی فضلِ جمیل رضوی	مہتمم جامعہ سبحانیہ رضویہ، درگئی مالاکنڈ	
16	علامہ مفتی محمد اسماعیل رضوی	مفتی و شیخ الحدیث دار العلوم امجدیہ، کراچی	
17	مفتی ندیم اقبال سعیدی	مفتی دار العلوم امجدیہ، کراچی	ابو الانوار ندیم اقبال سعیدی مفتی و ناظم تعلیمات دار العلوم امجدیہ کراچی

18	حافظ عبدالستار سعیدی	ناظمِ تعلیمات جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ، لاہور	
19	مفتی سید صابر حسین	استاذ الفقہ جامع انوار القرآن، گلشن اقبال، کراچی	
20	صاحبزادہ مفتی محمد طاہر شہزاد سیالوی	پرنسپل جامعہ حنفیہ غوثیہ بیرون بھاٹی گیٹ، لاہور	

ضروری یادداشت

ضروری یادداشت

ضروری یادداشت

ضروری یادداشت

ضروری یادداشت

ضروری یادداشت

پروفیسر مفتی مُنیب الرحمٰن

کی زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی مؤثر تصنیف

تفسیر سورۃ النسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر، اندازِ بیان مؤثر و دلکش

قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ



ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گنج بخش روڈ، لاہور فون 7221953-7220479 فیکس 7238010

الکرم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 7225085-7247350

انفال سینٹر، اردو بازار، کراچی 2210212-2212011-2630411